اہل فارس

کی فکری و عملی میراث اور علامہ اقبال

ڈاکٹر ابو معاذ

مکتبہ خدام القرآن لاہور

اہلِ فارس

کی فکری و عملی میراث

اور

علّامہ اقبال

تصنیف

ڈاکٹر ابو معاذ

پی ایچ ڈی (فارسی ادب)

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور

36 کے ماڈل ٹاؤن لاہور، فون: 5869501-3

نام کتاب ——— اہل فارس کی فکری و عملی میراث اور علامہ اقبال

مصنف ——— ڈاکٹر ابو معاذ

طبع اوّل (اپریل 2008ء) ——— 1100

ناشر ——— ناظم نشر و اشاعت، مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مقامِ اشاعت ——— 36۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور

فون: 3-5869501

مطبع ——— شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور

قیمت ——— 250 روپے

email:publications@tanzeem.org
website:**www.tanzeem.org**

فہرست

پیش گفتار	5
ابتدائیہ	11
عجم کی فکری اساس	51
ساسانی عہد اور ایران	67
آنحضور ﷺ اور سلطنت فارس	101
اسلام کے بعد کا دَور	137
صفوی دَور اور ایران میں شیعیت کا فروغ	157
ایران کا عہدِ قاچاریہ	185
پہلوی دَور	227
علامہ اقبال اور ایران کا ''اسلامی انقلاب''	255
علامہ اقبال اور شعر فارسی	267
ایران میں افکارِ اقبال کا اثر	311
برصغیر میں شیعیت کا فروغ	401
نقشہ جات	411

پیش گفتار

یہ معروضات ان حقائق پر مشتمل ہیں جن کا ادراک راقم الحروف کو علامہ اقبال کے کلام کو سمجھنے کی کوشش کے دوران ہوا۔ آریائی اقوام کا ایک خاص مزاج اور نفسیاتی کیفیت ہے۔ ایشیائی آریائی اقوام کو ابتدا ہی سے یہ واضح احساس رہا ہے کہ وہ دیگر اقوامِ مشرق سے برتر ہیں۔ ان کے اسی احساس کے پیش نظر برصغیر میں اپنے قدم جمانے کے بعد اپنی نسل کو مقامی اقوام سے مکمل طور پر علیحدہ رکھنے کی کوشش نے ذات پات کی تقسیم پیدا کر کے برہمنیت کو مذہبی تقدس کے روپ میں پیش کیا اور مقامی غیر آریائی باشندوں کو انتہائی پست درجے تک پہنچا دیا۔ ان کی مظاہر فطرت سے دلچسپی اور عقیدت نے انہیں گنگا کے پانیوں کے تقدس اور ہمالہ کے مختلف مقامات کے احترام پر اُکسایا۔ سورج، چاند اور ستاروں کی کیفیات کو مختلف مذہبی اور دینی احساسات میں سمویا، آگ کو مقدس سمجھا، شادی بیاہ ہو یا موت کی رسومات، آگ کے الاؤ اُن کا مرکز ٹھہرے، آگ کی سیوا کرنے والے برہمن کو ڈکشٹ کا لقب دیا۔ ان لوگوں نے دیو مالائی نظام کا وہ نقشہ پیش کیا جس میں جذب ہو کر البیرونی کے ''ماللھند'' کے معروضات کی رو سے خود کو فکری اعتبار سے دنیا جہان سے منقطع کر لیا اور ہندوستان میں جنم لینے والی اور باہر سے درآمد ہونے والی تمام تحریکوں کو خود میں جذب کر کے ان کو مختلف تأویلوں کی زنجیروں میں جکڑ کر اپنا پابند بنا لیا۔ بدھ مذہب کا قلع قمع کر دیا، جین تہذیب کا وجود مٹا دیا اور اسلام کو بتدریج ہندومت میں جذب کرنے کی منظم، مسلسل اور سائنٹیفک کوشش کی، مگر

اپنے فطری استحکام اور نظریاتی اساس کی بنیاد پر اسلام نے اس سرزمین میں خود کو بچانے میں کامیابی حاصل کر لی۔

ایران اور اس کے توابع (افغانستان' تاجکستان' آذربائیجان' ازبکستان اور ترکمانستان) میں ان لوگوں نے اپنی نو آبادیاں قائم کرنے کے بعد دنیا کی پہلی اور سب سے بڑی بادشاہت قائم کر لی۔ زراعت کا ایک نظام وضع کیا' ایک منظم سوسائٹی قائم کی' ایک تہذیب' کلچر' فرہنگ' مدنیت' جنگی تزویراتی نظام اور فکری برتری کا احساس پیدا کیا اور پھر یہ لوگ دور دور تک پھیل گئے۔ عدل و انصاف پر مبنی نظام' شعر و ادب' صنعت و حرفت اور نظم و نسق نے ان کی دھاک دنیا بھر پر بٹھا دی۔ یہ لوگ زردشتی مذہب کی ابتدائی صورت کو اختیار کرنے کے بعد توحیدی نظام کی برکت سے مستفید ہوئے۔ ہر چند کہ بعد میں مذہب میں تحریف سے توحید کی جگہ ثنویاتی جدل (Dualistic Conflict) نے لے لی اور پھر یہ نظام اسلام کی آمد سے ذرا پہلے زوال کا شکار ہو گیا' مگر صدیوں کے فخر و مباہات نے انہیں دنیا بھر میں ممتاز (distinct) بنا دیا۔

جب آنحضور ﷺ نے عرب و عجم کے امتیازات کا خاتمہ کر دیا تو ایران اور اس سے توابع کی آریائی اقوام نے بہت ہی قلیل عرصہ میں اسلام قبول کر لیا۔ یہ لوگ اسلام کی قوت بن گئے۔ ایرانی دفاعی اور جارحانہ تزویراتی نظام اب اسلام کو ورثے میں مل گیا۔ جنگِ خندق اور طائف کی فتح اس نظام کو اپنانے کی اعلیٰ ترین مثالیں ہیں۔ اسلام نے حکمت کو مومن کی میراث قرار دیا اور پھر اسی سرزمین سے غزالیؒ' رازیؒ' البیرونیؒ' ابنِ سینا' رومیؒ' سعدیؒ' حافظ اور خاقانیؒ جیسے مفکرین پیدا ہوئے' جنہوں نے عجمیت کی حکمت کو اسلام کے تابع کر دیا۔ ان کا مزاج اور سوچ عرب سوچ سے مختلف تھی اور یہی فکرِ عجم تھی اور پھر یہ اسلام کے مزاج کے ساتھ جب شیر و شکر ہوئی تو اسلامی اُمہ میں ایک خاص مزاج پیدا ہو گیا۔ بقول اقبال ؎

عرب کے سوز میں سازِ عجم ہے — حرم کا راز توحیدِ اُمم ہے
تہی وحدت سے ہے اندیشۂ غرب — کہ تہذیبِ فرنگی بے حرم ہے

تاریخ کے مختلف مراحل میں شیطانِ بزرگ کے کارندوں نے بارہا عرب وعجم کے تعصبات کو ہوا دے کر وحدت کا پارہ پارہ کرنے کی کوشش کی، مگر حرم سے محبت نے ان کو یکجا کیے رکھا اور کیے رکھے گی۔

ان صفحات میں راقم الحروف نے ایک ادنیٰ سی کوشش کی ہے کہ فکرِ عجم کے چہرے پر پڑی ہوئی گرد کو صاف کیا جائے اور اس کا صحیح چہرہ سامنے آ سکے۔ کہیں کہیں اس کے منفی پہلوؤں کو بھی اُجاگر کیا گیا ہے، مگر مثبت پہلوؤں پر توجہ مبذول کرائی گئی ہے۔ باہمی افتراق وانتشار کی بنیاد پر بحث کی گئی ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ ان کو ختم کیا جا سکے اور صحیح فکر کی جانب ایک رہنمائی فراہم کی جا سکے۔ وہ تمام اقوام جن کی فکری اساس ایک ہے، وہ ایک غیر فطری isolation میں اپنی توانائیاں ضائع کر رہی ہیں۔ اگر ان کی فکری وحدت کا احساس پیدا ہو سکے تو پھر بقول اقبال ع

''خیمہ ہائے ما جدا منزل یکے است''

یا پھر: ؎

نہ ایرانیم و نے ترک و تتاریم　　چمن زادیم و از یک شاخساریم
تمیزِ رنگ و بو بر ما حرام است　　کہ ما پروردۂ یک نو بہاریم

(نہ ہم ایرانی ہیں نہ تاتار کے ترک، چمن میں جنم لینے والے تمام مرغانِ سحر ایک ہی شاخسار کے مکین ہیں۔ ہم پر رنگ ونسل کی تمیز حرام ہے، کیونکہ ہم ایک ہی نو بہار کے پروردہ ہیں۔)

یہی فکری وحدت بتدریج ملّی وحدت میں ڈھل سکتی ہے۔ سید جمال الدین افغانی کی وحدتِ اسلامی کی کوشش اور اقبال کے نظریات ایک نہ ایک دن حقیقت کا روپ دھار سکتے ہیں۔ فکری احیاء (Renaissance) کی یہی سرزمین ہے۔ یہی ''فکرِ عجم'' ہمارا اثاثہ ہے اور یہی نکتہ اقبال کے جوانانِ عجم کے نام پیغام میں مضمر ہے جس میں آپ نے فرمایا ہے: ع

''آتشے در سینہ دارم از نیاگانِ شما''

(میرے دل میں آپ کے بزرگوں کی آگ کے الاؤ روشن ہیں۔)

اور اسی غزل میں کہا ہے کہ ؏

''ساختم طرحِ حرم در کافرستانِ شما''

(میں نے آپ کے کافرستان میں حرم کی بنیاد رکھ دی ہے۔)

اور یہ حرم وہی ہے جس کی بابت اقبال نے کہا ہے: ؎

زمانہ کہنہ بتاں را ہزار بار آراست

من از حرم نگذشتم کہ پختہ بنیاد است

(زمانے نے بار بار پرانے بتوں کو سجا کر بت کدوں کی رونق بحال کی۔ میں آج تک حرم سے باہر نہیں نکل سکا' کیونکہ اس کی بنیاد بہت مضبوط ہے۔)

آج ہم عجم کے افکار کو اسلام کا تابع بنا کر سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی طرح خود کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھرانے کے افراد بنادیں اور تمام تعصبات سے بالاتر ہو کر اپنی تمام تر صلاحیتوں اور فکری استعداد کو اسی اعلیٰ وارفع مقصد کا پابند بنادیں۔

عجم کے افکار میں غیرت ہے اور اپنے نظریۂ حیات اور مقصد کے دشمن سے کوئی رورعایت نہیں ہے۔ عرب کے افکار میں عرب کے صحرا کی طرح کی وسعت ہے' دریا دلی ہے اور ترحّم کے جذبات ہیں۔ جنگِ خندق کے اگلے برس قحط اور بدحالی سے مجبور ہو کر مکہ کا سردار ابوسفیان مدینہ منورہ کے لیے روانہ ہوا۔ صحیح مسلم شریف میں حضرت عیاض بن عمرو رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق وہ مسجد نبوی میں پہنچا تو وہاں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ درس دے رہے تھے اور ابوسفیان کو دیکھ کر (آپ کو جنگ خندق کا زمانہ یاد آتے ہی) آپؓ نے فرمایا کہ خدا جانے کب خدا کے دشمنوں کی گردن تک خدا کی تلوار پہنچ پائے گی! حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ وہاں موجود تھے (اور قریش کے سردار کی تذلیل دیکھتے ہوئے روایتی عرب مہمان نوازی اور اپنی وسعتِ قلبی کے باعث) آپؓ نے کہا کہ سلمان! یہ بوڑھا قریش کا سردار ہے' اس سے اس طرح تو پیش نہ آئیں! حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے یہ ماجرا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیان

کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ تم نے اس شخص (سلمان ؓ) کو ناراض کیا ہے جس کی ناراضگی کے باعث تم سے اللہ بھی ناراض ہو گیا ہے۔ چنانچہ آنحضور ﷺ کے ایماء پر حضرت صدیق اکبر ؓ کو حضرت سلمان فارسی ؓ سے معافی مانگنا پڑی۔ حضرت سلمان ؓ نے فرمایا: ''آپ تکلیف نہ فرمائیں' خداوند آپ پر اپنا کرم فرمائے!''

تاریخ کے جھروکوں سے جھانکنے پر معلوم ہوتا ہے کہ اہل عجم کا یہی طرۂ امتیاز رہا ہے کہ انہوں نے اپنے مخالفین کے خلاف ایک غیر مبہم اور جاندار موقف اختیار کیا ہے اور پورے عزم واستقلال کے ساتھ مشکلات کا مقابلہ کیا ہے۔

اس بات کو علامہ اقبال نے ''جاوید نامہ'' میں ایک تمثیلی انداز میں اجاگر کیا ہے۔ آپ آسمانوں کے اس تصوراتی سفر میں ایک جگہ ابوجہل کی روح کو آہ وزاری اور نوحہ و ماتم کرتے ہوئے دیکھتے ہیں جو چیخ چیخ کر عرب کی سطوتِ رفتہ کی یاد میں رو رہی ہے۔ وہ گزشتہ عہدِ جاہلیت کے عرب شعراء اور عرب قومیت کے علمبرداروں کو پکارتی ہے' لات' منات اور ہبل کو آواز دیتی ہے اور پھر ایک مقام پر حالات کا تجزیہ اس انداز میں کرتی ہے: ؎

ایں مساوات ایں مواخات اعجمی است
خوب می دانم کہ سلمان مزدکی است
ابن عبداللہ فریبش خوردہ است
رستخیز اندر عرب آوردہ است

(یہ اسلامی مساوات اور مواخات کے تصورات عجمی ہیں اور مجھے خوب معلوم ہے کہ سلمان فارسیؓ ایران کے پانچویں صدی عیسوی کے اشتراکیت کے علمبردار پیغمبر مزدک کا پیروکار ہے۔ دراصل محمدؐ بن عبداللہ نے سلمان فارسی کی چالاکی کے چکر میں آ کر عجمی نظریات اپنا لیے ہیں اور وہ قیامت جو عجم میں برپا تھی وہ عرب کی وادیوں میں قائم ہو چکی ہے۔)

یہ تو خیر ایک تمثیل تھی۔ درحقیقت کفارِ مکہ اسلام کے ابتدائی عہد میں اس بات کا برملا

اظہار کر رہے تھے کہ نعوذ باللہ رسول اللہ ﷺ کو کوئی عجمی قرآن سکھا رہا ہے۔ یہ ان کی سمجھ سے بالاتر تھا کہ عرب کا مزاج کسی ایسے انقلاب کا کیونکر متحمل ہوسکتا ہے۔ اسی طرح جنگ خندق کی تزویراتی تدابیر کو دیکھ کر ابوسفیان نے کہا تھا کہ یہ کسی عرب کی سوچ نہیں ہو سکتی۔ عرب و عجم کی فکری، سماجی اور ثقافتی اقدار کے امتیازات نے اسلامی تاریخ میں اپنے دوررس اثرات چھوڑے ہیں۔ اسی طرح ان اقدار کی ہم آہنگی نے اسلامی معاشرت اور ثقافت میں ایک خوبصورت بوقلمونی اور حسین امتزاج پیدا کیا ہے۔

یہی غیرت اور جرأتِ رندانہ ہے جو عجم کی نفسیاتی کیفیت (psyche) میں پنہاں ہے اور یہی مسلمانانِ عجم کو تحرک اور قیام کا درس دیتی ہے۔ باقی تفصیل آپ کو کسی حد تک اگلے صفحات میں مل جائے گی۔

باقیٔ ایں گفتہ آید بے گماں
در دلِ ہر کس کہ دارد نورِ جاں

ڈاکٹر ابومعاذ
۲۱/اپریل ۲۰۰۷ء

ابتدائیہ

عجم کی سرزمین اہلِ عرب کے معیار سے گونگوں کا مسکن تھی' جہاں کے لوگ گفتگو کے فن سے نابلد تھے۔ اس سے مراد فارسی زبان کے لوگوں کا وطن تھا' جہاں کے لوگ عربی زبان بولنے اور سمجھنے سے عاری تھے۔ اس طرح یہ خطہ ان آریائی اقوام کا ملک تھا جو ایشیا میں آ کر آباد ہوئے تھے۔ اس سے مراد ایران (فارس) ہی نہیں بلکہ وہ تمام علاقے تھے جو فارسی زبان کی کسی بھی بولی کا استعمال کرتے تھے۔ آج بھی انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مطابق ''پشتو'' فارسی کی مشرقی بولی ہے۔ بلوچی زبان بھی فارسی ہی کی بولی ہے۔ قدیم سنسکرت اور قدیم فارسی (پہلوی) بھی ایک ہی زبان کی دو مختلف صورتیں تھیں۔ لیکن وادیٔ سندھ سے مشرق کی جانب ہندوستان کے علاقوں کی زبان مقامی زبانوں کے امتزاج کے باعث آہستہ آہستہ فارسی سے دور ہٹتی چلی گئی۔ مگر گزشتہ دو سو برس کا زمانہ چھوڑ کر اگر ماضی قدیم پر نظر دوڑائی جائے تو تمام ہندوستان فارسی زبان کے زیر اثر رہا ہے۔ بادشاہ تو فارسی بولتے ہی تھے' دربار کے جملہ امور اور فرامین بھی اسی زبان میں تھے۔ عوام بھی اسی زبان سے آشنا تھے' اسی لیے صوفیاء اور علماء کی تعلیمات' تحریریں اور کتب اِسی زبان میں تھیں۔ حکیموں کے نسخے اور گھریلو حساب کتاب کے دفتر و طومار بھی اسی زبان میں تھے۔ اس طرح تمام ایران' افغانستان' موجودہ پاکستان' کشمیر' تاجکستان' ازبکستان' ترکمانستان' آذربائیجان' کرغزیا اور سنکیانگ کے چینی علاقے کو عجم ہی تصور کیا جاتا تھا' جہاں پر فارسی زبان' تہذیب' ادب اور ثقافت کی گہری چھاپ تھی۔ اسلام سے پہلے یہ علاقے ایک بہت بڑی بادشاہت کا حصہ تھے اور یہ شاہی نظام دنیا کا سب سے بڑا نظام تھا جس کی حدود کا دائرہ کار کبھی کبھی آرمینیا' جارجیا' ایشیائے کوچک' جزیرہ نمائے عرب' شام و فلسطین' مصر' قبرص اور بحیرۂ روم کے دیگر جزائر تک پھیلتا رہا اور

وہاں سے سمٹتا رہا۔ یونانیوں کے جملہ مقبوضات کو روندتا ہوا داریوش اور اس کا لشکر ایتھنز بلکہ یورپ میں مزید آگے تک جا پہنچا اور پھر اُس شکست کا انتقام لینے کے لیے سکندرِ اعظم عجم پر ایک طوفان کی صورت میں چھا گیا اور تمام عجمی مفتوحات کو روندتا ہوا وادیٔ سندھ کی مشرقی حدود تک بڑھتا ہوا گنگا جمنا وادی کے علاقوں میں داخل ہوئے بغیر واپس لوٹ گیا۔ اسی زمانے کے ٹیکسلا کے مضافات میں جنڈیال کے کھنڈرات میں نمایاں کھنڈر آج بھی زرتشتی مذہب کے آتش کدے کا ہے۔ اگر تاریخی ریکارڈ کا مطالعہ کیا جائے تو ٹیکسلا کا آغاز ایرانی شہنشاہ داریوش کے عہد میں ہوا۔ بعد میں یہ شہر کئی بار ایران کے مقبوضات میں شامل رہا۔ پھر یہ شہنشاہیت رومیوں سے برسرِ پیکار رہی اور یورپ کے رومیوں کو بار بار اپنے مقبوضات کے دفاع کے لیے سرگرم رہنا پڑا۔ رومیوں کے عیسائیت قبول کرنے کے بعد ایران میں مذہبی اتحاد کی تحریک زور پکڑ گئی۔

عجم کی عظیم سلطنت کا اپنا مذہب تھا جو مجوسیت کی صورت میں اپنی تمام تر فکری عظمتوں کا آئینہ دار تھا۔ اس مذہب کا بانی زردشت (زرتشت) تھا اور اس کا زمانہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے قریب تر تھا۔ اس مذہب کا مرکز اہورامزدا (خدائے برتر) کی ہستی تھی جس کے دو پرتو تھے۔ یعنی یزدان (خدائے نیکی) اور اہرمن (خدائے بدی)۔ اس مذہب کے اہم ستون گفتارِ نیک' پندارِ نیک' کردارِ نیک اور رفتارِ نیک' (یعنی اچھی گفتگو' اچھی فکر' اچھا کردار اور اچھے اعمال) تھے۔ اس مذہب میں بت پرستی بالکل نہیں تھی' حالانکہ سلطنت عجم کے مغرب میں عرب' یونان اور روم (عیسائیت قبول کرنے سے قبل) بُت پرستی کے اہم مراکز تھے۔ اسی طرح مشرق میں گنگا جمنا کی وادی میں ہندوستانی آریائی قبائل بھی اس لعنت میں مبتلا تھے۔ اس مذہب کی اپنی عظیم کتاب ''اوستا'' تھی جو بارہ ہزار گائے کی کھالوں پر مرقوم تھی۔ اسے سکندرِ اعظم نے شیراز کے قریب تختِ جمشید کے مقام پر نذرِ آتش کر دیا تھا۔ دیگر مذہبی صحیفے بعد کے اَدوار میں پہلوی زبان میں ژند اور پاژند کی صورت میں موجود تھے۔ اس مذہب میں ثنویت یعنی Dualism کا پرچار کیا جاتا تھا' یعنی کائنات میں جدال اور جنگ جاری ہے' یعنی نیکی کی افواج بدی کی

افواج سے برسرِ پیکار ہیں اور ازل سے ابد تک یزدان اور اہرمن کے مابین جنگ جاری ہے۔ یزدان کی علامت نور اور گرمی ہے اور اہرمن کی علامت تاریکی اور سردی ہے اور اچھے لوگ یزدان کی صفات سے متصف ہیں' بقول رومی :۔

کارِ مرداں روشنی و گرمی است

کارِ دوناں حیلہ و بے شرمی است

(یعنی مردوں کا کام روشنی اور گرمی ہے اور رزیل لوگوں کا کام حیلہ اور بے شرمی ہے۔)

چونکہ روشنی وگرمی قابلِ احترام تھی اس لیے روشنی وگرمی کے تمام منابع بھی محترم سمجھے جاتے تھے۔ اس تصور نے آفتاب یعنی سورج کے احترام (جو کہ پرستش کی حدوں کو چھورہا تھا) کے نظریے کو فروغ بخشا اور اسی مناسبت سے آگ کی تعظیم کی جانے لگی جو کہ رفتہ رفتہ آتش پرستی پر منتج ہوئی اور مجوسیوں کی عبادت گاہیں بتدریج آتش کدوں کا روپ دھارنے لگیں۔ دیگر اقوام نے انہیں آتش پرست قرار دیا' جبکہ قرآن نے انہیں مجوسی قرار دیا۔ آگ کا احترام کسی نہ کسی طرح دوسری آریائی اقوام مثلاً کافرستان کے کافروں اور ہندوؤں میں بھی نظر آنے لگا' لیکن آتش پرستوں سے مراد اہلِ عجم ہی لیے جانے لگے۔ اہلِ عجم کا چونکہ سیاسی مرکز فارس (ایران کا عراق سے متصل جنوب مغربی علاقہ اور عراق کا نصف مشرقی حصہ) میں تھا' اس لیے اہلِ عجم کو غلطی سے فارسی یا Persian کہا جانے لگا اور اس کی تہذیب کو بھی فرہنگِ فارس (Persian Civilization) کہا جانے لگا۔

عظیم بادشاہت کی سرپرستی میں یہ تہذیب بتدریج ترقی کے مراحل طے کرتی ہوئی دنیا کی عظیم تہذیب کا روپ دھار گئی اور اس کا دبدبہ مشرق ومغرب پر طاری ہوگیا۔ اس کے عظیم بادشاہ اساطیری شخصیات کا روپ دھار گئے۔ کوروش اعظم کا ذکر تو بائبل کے عہد نامۂ قدیم میں بھی انتہائی اچھے الفاظ میں آیا ہے اور مولانا ابوالکلام آزاد اور کچھ دوسرے دانشوروں کی رائے میں اس شخصیت کا دوسرا نام ذوالقرنین تھا جس کا ذکر

قرآن پاک میں آیا ہے۔ یہ بادشاہ آج سے ڈھائی ہزار سال قبل ایران کا وہ عظیم فرمانروا تھا جس نے عدل وانصاف پر مبنی سیاسی نظام کی داغ بیل ڈالی اور بابل کے استعماری حکمرانوں کو شکست فاش سے دوچار کر کے ان کے ہاں ستر برسوں سے مقید پینتالیس ہزار یہودیوں کو رہا کروا کے انہیں بیت المقدس اور سرزمین فلسطین میں ازسرنو آباد کروایا۔ بیت المقدس کی تعمیر نو کے جملہ اخراجات بھی خود برداشت کیے۔ یہ بادشاہ بھی قرائن کی رو سے مجوسی تھا اور ان دنوں مجوسیت میں توحید کے جملہ پہلو اور نیکی کا درس مکمل طور پر موجود تھا۔ تو کیا وہ دین دینِ برحق تھا؟ یہ سوال علامہ اقبال نے زردشت کے دین کی بابت کیا ہے' مگر اس کا واضح جواب کسی کے پاس نہیں' تو کیا اوستا اور ژند و پاژند کی ابتدائی حالتیں الہامی تھیں؟ یہ سوال اگرچہ جواب طلب ہے مگر اہم ضرور ہے' تو کیا یہ لوگ اہل کتاب تھے یا کافر تھے؟

اتنا ضرور ہے کہ یہ لوگ حکمرانی کے اعلیٰ وارفع اصولوں سے باخبر تھے اور ان کا نظام بڑی حد تک عدل وانصاف پر مبنی تھا۔ آج بھی حکمت آموز حکایات جو ہمیں سعدی کی گلستان و بوستان' نظامی کی خمسہ اور فردوسی کے شاہنامہ میں ملتی ہیں' ان کے مرکزی کردار شاہانِ عجم یعنی خسرو نوشیروان' اردشیر' بہرام گور اور قباذ وغیرہ تھے اور ان میں دارا' خسرو کیقباد اور جمشید کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ کچھ تو ضرور تھا جس کے باعث یہ لوگ اتنے بڑے نظام کو احسن طریقے سے چلا رہے تھے۔ شہنشاہ کی مرکزی شخصیت اس قدر لائق احترام ہوتی چلی گئی کہ بتدریج اس میں اُلوہی خوبیاں بھی بیان ہونے لگیں اور شہنشاہ کو خدائے بزرگ و برتر کا پرتو (ظِل اللہ فِی الْاَرْض) سمجھا جانے لگا۔ یہ عقیدہ رومیوں نے بھی اپنا لیا اور شاہِ برطانیہ کی شخصیت تک جا پہنچا۔ تمام مسلمان سلاطین اور بادشاہوں نے بھی "**ظِل اللّٰہ فی الارض**" کا لقب اختیار کر لیا۔ شاہی خون اور خاندانی نجابت کے نظریات اس قدر پختہ ہو گئے کہ ایک خاندان کے علاوہ کسی دوسرے خاندان کے فرد کی بادشاہت کو ناممکن سمجھا جانے لگا۔ اسی طرح شہنشاہ کی ذات دین و دنیا کا مرکز بن کر رہ گئی۔ رعایا کا کام اس شاہ کی غیر مشروط اطاعت تھی اور شاہ کے ادنیٰ خدمت گزار

(His Majesty's humble servants) کا نظریہ فروغ پانے لگا۔

اس نظام میں معاشی پہلو' زمین کا نظم ونسق' سماجی نظام اور جنگی فنون وتزویر (strategy) پر بھی سخت توجہ دی گئی۔ اسی طرح دفتری نظام (Beurocracy) کا ڈھانچہ بھی وجود میں آ گیا۔ معاشی خوشحالی نے فنونِ لطیفہ کو فروغ دیا۔ ذہنی فراغت نے تفکر کی راہیں کھول دیں اور منطق و استدلال اور فلسفہ کی بحث سے اہم مراکز گونج اُٹھے۔ فنِ تعمیر کی علامات آج دجلہ کے کنارے مدائن کے کھنڈرات میں ایوانِ خسرو کی صورت میں نظر آ رہی ہیں یا پھر قصر شیرین اور تختِ جمشید (پرسی پولیس) کے مقامات پر آج اسی طرزِ تعمیر پر مبنی مساجد' خانقاہوں اور مدرسوں کی عمارات (خصوصاً وسطی ایشیا میں) نظر آتی ہیں۔

عام لوگوں میں دین زرتشت نے ایک ٹھہراؤ اور وقار پیدا کر دیا تھا' زندگی کا ایک مقصد اُن کے سامنے اُجاگر کر دیا تھا۔ وہ حسبِ توفیق بدی کی طاقتوں سے نبرد آزما ہو کر اہرمن کو شکست و ہزیمت سے دوچار کرنے میں مگن تھے۔ علامہ اقبال اہرمن کے زرتشت سے خطاب کو جاوید نامہ میں یوں بیان فرماتے ہیں: ؎

از تو مخلوقاتِ من نالاں چو نے   از تو مارا فرو دیں مانند دے
در جہاں خوار و زبونم کردۂ   نقشِ خود رنگیں ز خونم کردۂ
زندہ حق از جلوۂ سینائے تست   مرگِ من اندر یدِ بیضائے تست

(تیری وجہ سے میری تمام مخلوقات یعنی افواج نوحہ و ماتم کرتے کرتے بنسری کی طرح ہم آواز ہو چکی ہیں' ہماری بہاریں ٹھٹھر رہی ہیں۔ تیرے دین نے اس جہاں میں مجھے ذلیل وخوار کر کے رکھ دیا ہے اور تو نے میرے خون سے اپنے نقوش کو رنگ اور آب وتاب عطا کر دی ہے۔ یزدان تیرے کوہِ طور کے روشن جلووں کے باعث زندہ ہو گیا ہے اور تیرے یدِ بیضا کے کرشمے میں میری موت کا پیغام موجود ہے۔)

لیکن یہ نظام بھی بتدریج انحطاط پذیر ہونے لگا۔ مذہب کے مغ (پروہت) لالچ اور دنیاوی جاہ وجلال کے تعاقب میں گم ہو گئے۔ آفتاب' آتش' شاہ کی ذات اور دیگر

علامات کی پرستش کی جانے لگی۔ توحید پہلے ثنویت کی نذر ہوئی' اب شرک کی علامات نمودار ہونے لگیں۔ انصاف کی جگہ استحصال نے لے لی۔ دنیاوی جاہ و جلال اور حرص و آز کے ردِّعمل کے طور پر ایک مذہبی مصلح' مانی نے اپنے صوفیانہ خیالات اور ترکِ دنیا کے نظریات کو فروغ دیا' مگر تیسری صدی عیسوی میں وہ تختۂ دار پر چڑھ گیا۔ پھر استحصال کے خلاف مزدک نے اپنے اشتراکیت پر مبنی مذہب کی تبلیغ کی' مگر وہ بھی اپنے ہزاروں ساتھیوں سمیت شہزادۂ خسرو (جو بعد میں نوشیروان عادل کے نام سے شہنشاہ بنا) کی فوجوں کے ہاتھوں تہہ تیغ ہو گیا۔ دین مزدیسنی (مجوسیت) کا احیاء کیا گیا' مگر اب یہ مذہب فلسفیانہ موشگافیوں کا شکار ہو گیا۔ بادشاہ کاہل ہونے لگے' وہ میدانِ جنگ کی بساط کے بجائے شطرنج کی چالوں میں منہمک ہونے لگے۔

امتدادِ زمانہ کے باوجود ابھی بھی کچھ اہم سیاسی' سماجی اور ثقافتی ادارے بچے ہوئے تھے' مغربی ایران میں جندی شاپور کی عظیم یونیورسٹی موجود تھی جس کے فارغ التحصیل لوگ ابھی تک طائف اور حدودِ حجاز میں بھی پائے جاتے تھے۔ زرتشتی مجوسیوں کی مختصر جماعت مکہ کے قریب صحرائے عرب میں قیام پذیر تھی۔ بحرین ایرانیوں کا صوبہ تھا۔ یہ یاد رہے کہ اُس دَور کا بحرین موجودہ بحرین سے مختلف تھا اور دریائے دجلہ اور فرات کی درمیانی سرزمین کو بحرین کہا جاتا تھا۔ یمن میں ایران کا گورنر موجود تھا' بلکہ وہاں کا وائسرائے ہمیشہ شاہی خاندان کا ایک اہم شہزادہ ہوا کرتا تھا۔ عرب ایرانیوں سے فکری' تہذیبی' سیاسی' مذہبی' جنگی اور معاشی غلبے کے باعث مرعوب تھے۔ رومیوں کے مقابلے میں بت پرست عرب ایرانیوں کے وفادار تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب رومی سلطنت نے عیسائیت اختیار کر لی تھی۔ عیسائی راہب ایران میں تبلیغ کے لیے خفیہ طور پر سرگرمِ عمل تھے۔ عیسائی عورتیں خسرو نوشیروان اور خسرو پرویز کے حرم میں موجود تھیں اور اپنے اپنے مذہب پر کاربند تھیں۔ عیسائیوں کے منحرف فرقے مثلاً نسطوری اور یعقوبی رومی سلطنت سے جلاوطنی کے بعد ایران میں سکون و اطمینان کی زندگی گزار رہے تھے۔ نسطوریوں کا ایران میں یورپی تعلیمات کی نشر و اشاعت میں اہم حصہ تھا۔ ایرانیوں کا یہودیوں سے

گٹھ جوڑ ہمیشہ سے موجود تھا اور یہود کی ایک بڑی تعداد ایران میں کاروبار میں منہمک تھی۔ جب بھی ایرانی بیت المقدس پر حملے کا سوچتے یہودی ایرانی فوج میں شامل ہوکر عیسائیت کی بیخ کنی کا عہد کیا کرتے تھے۔خسرو پرویز کے زمانے میں بیت المقدس پر حملے کے وقت پچیس ہزار یہودی ایرانی فوج میں موجود تھے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا' ابتدا میں عیسائی راہب ایران میں آزادانہ گھومتے پھرتے تھے' مگر رومیوں کے عیسائیت کو سرکاری مذہب کا درجہ دینے کے باعث ایران میں عیسائیت کی اشاعت پر پابندی عائد کردی گئی تھی۔اب عیسائی راہب ایران سے آہستہ آہستہ غائب ہورہے تھے اور اسی طرح کے ایک قافلے کے ساتھ رام ہرمز کا ایک نوجوان روز بہ مہیار بھی ایران چھوڑ کر شام کی جانب روانہ ہوگیا۔روز بہ ایک معزز کسان گھرانے کا فرد تھا جس نے جنگ وحرب کا فن بھی سیکھا ہوا تھا اور آتش کدوں میں بیٹھ کر ژند و پاژند اور اوستا کی تعلیم بھی حاصل کی تھی۔روز بہ کا باپ بہت بڑا زمیندار تھا اور اس کے تمام جاہ وجلال کا دارومدار شاہ کی وفاداری اور زرتشتی مذہب پر عمل پیرا ہونے میں تھا' مگر روز بہ اپنے بوڑھے باپ سے ہمیشہ زرتشتی عقائد میں اُبھرنے والی خامیوں پر اعتراض کیا کرتا اور عیسائیت کی حقانیت پر استدلال کرتا تھا۔ باپ سے تعلقات کی کشیدگی پیدا ہوئی تو روز بہ مہیار نے محسوس کیا کہ اب ایران کی سرزمین اس پر تنگ ہوچکی ہے' چنانچہ وہ عیسائی راہبوں کے کارواں کے ساتھ وہاں سے دور چلا گیا۔اس کی قسمت میں سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے نام سے عجم کے شاہوں کے زوال کے بعد اسلام کا پہلا وائسرائے بن کر ایران میں واپس آنا لکھا تھا۔آج مدائن میں ایوانِ کسریٰ کے قریب آپ رضی اللہ عنہ کی قبر اُس اُجڑے دیار میں ایسی علامت ہے جو بقول اقبال:

آں مسلماناں کہ میری کردہ اند — در شہنشاہی فقیری کردہ اند
در امارت فقر را افزودہ اند — مثل سلماں در مدائن بودہ اند

(وہ مسلمان جنہوں نے حکومت کی ہے' انہوں نے شہنشاہوں کے دیار میں فقیری کی بنیاد رکھ دی ہے' انہوں نے حکمرانی میں فقیری کا اضافہ کر دیا ہے' یعنی جہانداری کو حق کا تابع کر دیا ہے۔ اگر دیکھنا ہو تو دیکھ لو جس طرح مدائن میں

سلمان ؓ ہوا کرتے تھے۔)

یہ انحطاط پذیر سلطنت اندر سے کھوکھلی ہو چکی تھی۔ باہر سے رومیوں کا دباؤ اس پر بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ سورۃ الروم کی پیشین گوئی پوری ہو رہی تھی۔ ہر طرف ہُو کا عالم تھا۔ فضا میں ایک سکوت طاری تھا' ایک جمود تھا۔ ذہن تاریکیوں میں ڈوب رہے تھے۔ مایوسی کا دَور دَورہ تھا۔ اب دین مجوسی حالات کے چیلنج کو قبول کرنے سے عاری ہو چکا تھا' بظاہر ایک ملک' ایک قوم اور ایک تہذیب کے ساتھ موجود تھا' مگر وہ اپنا وقت گزار کر ضُعفِ پیری میں مبتلا تھا۔ حضرت اقبال نے انتہائی خوبصورت الفاظ میں یہ نقشہ کچھ اس طرح کھینچا ہے:ـ

پیریٔ ایراں زمانِ یزدگرد　　چہرۂ او بے فروغ از خونِ سرد
دین و آئین و نظامِ او کہن　　شید و تارِ صبح و شامِ او کہن
موجِ مے در شیشۂ تاکش نبود　　یک شرر در تودۂ خاکش نبود

(یزدگرد کے زمانے تک پہنچتے پہنچتے ایران بوڑھا ہو چکا تھا اور اس کا خون رگوں میں جم چکا تھا۔ اس طرح اس کے چہرے کا نور اور جلوہ چھن چکا تھا۔ اس کا دین' اس کا آئین اور اس کا نظام فرسودہ ہو چکے تھے۔ اس کے صبح و شام کے خورشید اور ظلمات سب کچھ پرانے ہو چکے تھے' اس کے انگوروں کی بیلوں میں شراب کی کوئی لہر باقی نہیں تھی' وہ ایک راکھ کا تودہ تھا جس کی تہہ میں ایک بھی چنگاری باقی نہیں تھی۔)

لیکن خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ خسرو پرویز کے زمانے میں اسلام کا آغاز ہو چکا تھا۔ آنحضور ﷺ مکہ سے مدینہ منورہ ہجرت فرما چکے تھے۔ آپؐ کی نگاہیں دنیا کے طول و عرض کا احاطہ کر رہی تھیں۔ صلح حدیبیہ سے فارغ ہو کر آپؐ نے سوچا کہ کیوں نہ عجم کی عظیم سلطنت کو اسلام میں سمو کر اس کے تمام تر فکری اور تہذیبی ورثہ کو مشرف بہ اسلام کر لیا جائے اور پھر اس قوم سے ایک کام لیا جائے کہ وہ اسلام کی عظیم وارث بن جائے۔ یہ سلطنت ایران کی نہیں عجم کی وہ عظیم سرزمین تھی جو وادیٔ سندھ سے سنکیانگ اور ازبکستان سے آذربائیجان تک پھیلی ہوئی تھی۔ آپؐ نے اس کے فرمانروا کو واضح الفاظ میں لکھا:

((اَسْلِمْ تَسْلِمْ فَاِنْ اَبَیْتَ فَعَلَیْکَ اِثْمُ الْمَجُوْسِ))

(فقہ السیرۃ للالبانی'ص ۳۵۸)

''اسلام قبول کر لے اور سلامتی میں آ جا (یعنی اس تباہی و بربادی کے چنگل سے آزاد ہو جا) 'اگر تو نے اب بھی انکار کیا تو پھر تمام زردشتیوں کے گناہوں' غلطیوں' زیادتیوں اور کمزوریوں کی نحوست تمہیں (مع تمہاری بادشاہت کے) نگل لے گی۔''

مگر بدبختی خسرو پرویز کا مقدر ٹھہر چکی تھی۔ اس نے نامۂ مبارک کو پھاڑ کر اپنی تباہی کا دیباچہ لکھ دیا۔ آنحضور ﷺ کو عجم کی عظیم سلطنت کی تباہی نظر آنے لگی۔ آپ ؐ نے فرمایا:

((هَلَكَ كِسْرىٰ ثُمَّ لَا يَكُوْنُ كِسْرىٰ بَعْدَهٗ)) (صحیح البخاری)

''(مجھے نظر آ گیا ہے کہ) خسرو ہلاک ہو گیا اور اب کوئی خسرو جنم نہیں لے گا۔''

مگر اس تہذیب کے کچھ ورثاء خوش قسمت بھی تھے۔ روز بہ مہیار (سلمان) ؓ مدینہ میں رسول اللہ ﷺ کی جنگی تدابیر و تزویرات کے مشیر کی صورت میں جنگ خندق کی تزویراتی صورت گری کر چکے تھے۔ بحرین کے ایرانی حکمران اسلام قبول کر کے وہاں مسجد آباد کر چکے تھے۔ یمن کے ایرانی شاہی خاندان کے شہزادے اسلام کی دولت سے مالا مال ہو چکے تھے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ ایران کی شہنشاہیت کا انقراض ایک تقدیرِ مُبرم ٹھہر چکا ہے' مگر وہاں کا فکری' ثقافتی' جنگی' معاشی اور سماجی اثاثہ اسلام کو منتقل ہونے والا تھا۔ ہر وہ فکر جو اسلام کی روح سے متصادم تھی' اسے چھوڑ دیا گیا تھا اور باقی کو اسلام میں سمو لیا گیا۔ اس کی مثال سلمان فارسیؓ کے اصحابِ صفہ کو وہ لیکچر تھے جو منافقوں کی بے چینی کا باعث بن رہے تھے۔ اسی ورثہ کو اسلام میں سمونے کی سب سے بڑی مثال آنحضور ﷺ کا سلمان فارسی ؓ کو اپنے اہل بیت میں شمار کرنا تھا۔ اب وہ تہذیب اسلام کے رنگ میں رنگ کر نیا جنم لے رہی تھی اور وہ تھی ''فکرِ عجم'' جو اسلامی فکر عجم تھی' جس کے بعد کے علمبردار رازی' غزالی' فارابی' رومی' سعدی شیرازی اور حضرت اقبال تھے۔ جب سورۃ الجمعہ کی یہ آیات نازل ہوئیں:

﴿هُوَ الَّذِىْ بَعَثَ فِى الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ

وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿٢﴾
وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿٣﴾

''وہی ذات پاک ہے جس نے ان پڑھ (غیر تعلیم یافتہ) لوگوں میں اپنا رسول بھیجا ہے جواُن پراُس کی آیات کی تلاوت کر کے سناتا ہے' انہیں پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب اور دانائی (کے اسرار و رموز) سکھاتا ہے۔ وہ لوگ اس سے پہلے واضح طور پر گمراہی میں مبتلا تھے۔ اور بعد کے زمانے کے لوگوں میں بھی (وہی رسول مبعوث ہوا ہے) جواُن سے ابھی مل نہیں پائے۔ اور وہ غالب بھی ہے دانا بھی۔''

آنحضور ﷺ سے جب ''لَمَّا يَلْحَقُوْا'' کی بابت پوچھا گیا تو آپؐ نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر فرمایا کہ یہ اور اس کی قوم' اور اِس کی قوم کا ایک شخص حق کو ثریا سے بھی اُتار لائے گا۔

اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قوم جس کی فکری اور تہذیبی روایات انتہائی مستحکم اور قدیم تھیں' اُس کے افراد نے جب اسلام کو قبول کر لیا تو اُنہوں نے اسلام کی حقانیت کو دنیا پر آشکار کر کے احیائے اسلام کی بنیاد رکھ دی۔

آنحضور ﷺ کی رحلت کے دس برس کے عرصہ میں یہ سلطنت اختتام پذیر ہوگئی اور پھر یہ نظام ایک نئے روپ میں سامنے آ گیا۔ علامہ اقبال نے اِس کو انتہائی خوبصورت الفاظ میں یوں بیان فرمایا ہے :۔

تا ز صحرائے رسیدش محشرے — آں کہ داد او را حیاتِ دیگرے
ایں چنیں حشر از عنایاتِ خدا ست — پارس باقی رومۃ الکبریٰ کجاست؟
آنکہ رفت از پیکر او جانِ پاک — بے قیامت بر نمی آید ز خاک
مردِ صحرائی بہ ایراں جاں دمید — باز سوئے ریگ زارِ خود رمید
کہنہ را از لوحِ ما بسترد و رفت — برگ و سازِ عصرِنو آورد و رفت

(پھر ایک وقت وہ بھی آن پہنچا جب صحرائے عرب سے ایک محشر برپا ہوتے ہوئے ایران پر چھا گیا۔ اُس نے ایران کو ایک نئی زندگی عطا کر دی۔ اِس طرح کی قیامت کا برپا ہونا بھی اللہ کی عنایت ہی تھی' کیونکہ فارس اب بھی باقی ہے مگر

رُومۃ الکبریٰ کہاں نظر آ رہا ہے؟ جس جسم سے روح ایک بار نکل جائے تو قیامت برپا ہوئے بغیر اس میں کب زندگی واپس لوٹتی ہے؟ مردِ صحرائی (مسلمان فاتحین) نے ایران میں جان ڈال دی‘ مگر وہ پھر اپنے ریگ زار کو واپس لوٹ گیا‘ ہماری تختی سے قدیم نشانات مٹا گیا اور ایک نئے دَور کا ساز و سامان عطا کر گیا۔)

حضرت عمر فاروق ؓ نے حضرت سلمان فارسی ؓ کو ایران کا گورنر مقرر کیا۔ آپؓ کی حکمت عملی کے باعث انتہائی مختصر عرصہ میں پوری قوم نے اسلام قبول کر لیا اور چند شدت پسند مذہبی گروہ اپنی سرگرمیوں کو دُور دراز کے خطوں تک مرکوز کر کے نومسلم معاشرے سے علیحدہ ہو گئے۔ یہ لوگ بیابانوں اور پہاڑوں میں مقیم ہو گئے۔ دو چار صدیاں اِن حالات میں بسر کر کے یہ لوگ مرتبانوں میں آتشِ مقدس لے کر کشتیوں کے ذریعے ہندوستان کے ساحل کو روانہ ہو گئے۔ ہندوستان کے صوبہ گجرات میں ایرانی بستیاں اسلام سے قبل بھی موجود تھیں اور یہ علاقہ ایرانی بادشاہت کا حصہ رہا تھا‘ اس لیے ان لوگوں نے اُدھر کا رُخ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ بمبئی اور کراچی میں پارسیوں کی مختصر آبادیاں ابھی تک موجود ہیں۔

آخری ساسانی بادشاہ یزدگرد کی بڑی بیٹی حضرت شہر بانوؒ اہل اسلام کے ہاتھوں ایران کی فتح کے بعد حضرت امام حسین ؓ کے عقد میں آئیں اور یہاں پر شاہی خاندان اور خاندانِ نبوی ؐ کا اتصال ہو گیا۔ ایرانیوں کے دل میں شاہی خاندان کا جو احترام موجود تھا وہ قبولیتِ اسلام کے بعد اس خاندان سے عقیدت میں ڈھل گیا۔ بعد ازاں حضرت علی ؓ نے اپنا دارالخلافہ مدینہ منورہ سے کوفہ میں منتقل کیا تو کوفہ ایرانی علاقے میں موجود اسلامی فوج کی نوتشکیل شدہ چھاؤنی تھی اور اس کے اردگرد ایرانی قبائل آباد تھے۔ حضرت امیر معاویہ ؓ کا دارالخلافہ دمشق میں تھا اور دمشق گزشتہ دور میں رُومی سلطنت کا شہر تھا۔ اس کے گرد و پیش میں وہ لوگ آباد تھے جو صدیوں سے رومیوں کے اطاعت گزار رہے تھے۔ اس طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے باہمی سیاسی اختلاف اور تصادم کی صورت میں گزشتہ اَدوار کے رومی اور عجمی جذبات کے اثرات مقامی آبادیوں پر دوبارہ

اپنا رنگ جمانے لگے۔ عہدِ قدیم کے تعصبات از سرِ نو زندہ ہو گئے۔ حضرت علی ؓ کی شہادت اور حضرت امام حسن ؓ کی دستبرداری کے بعد کے ایام میں دمشق کی حکومت یزید کو مل گئی، جبکہ کوفہ کے لوگوں نے حضرت امام حسین ؓ کی اطاعت کا دم بھرنا شروع کر دیا۔ شومیٔ قسمت سے حضرت امام حسینؓ کی شہادت کا المناک واقعہ پیش آیا، مگر کوفہ کے گرد و نواح کے لوگوں کی محبت کا مظاہرہ مختار بن ابوعبید ثقفی کی تحریک کی صورت میں ہوا۔ حضرت حسین ؓ کے فرزند حضرت امام زین العابدینؒ حضرت شہر بانو ؒ کے بطن سے تھے۔ اس طرح آپ کی رگوں میں دونوں خاندانوں (خاندانِ علی ؓ اور خاندانِ ساسانی) کا خون دوڑ رہا تھا۔ یہ چیز اہلِ عجم کی توجہ اور عقیدت کا مرکز بن گئی۔ اب آپ کو اور آپ کے ورثاء کو انتہائی تقدس کا درجہ حاصل ہو گیا۔ یہ لوگ اثنا عشری سلسلہ کے امام کہلائے، مگر ان ائمہ کا احترام عجم کے سنّی لوگ بھی کرتے تھے۔ حضرت امام ابوحنیفہ ؒ کا حضرت امام باقر ؒ سے فکری مکالمہ اور حضرت جعفر صادق ؒ کی شاگردی اس امر کے زندہ ثبوت ہیں۔ سادات کا احترام تمام ممالک عجم کا خاصہ رہا ہے۔

عجم کی فکری تجدید کے علاوہ علمی اعتبار سے اہلِ عجم نے زبردست کارنامے سرانجام دیے۔ امام ابوحنیفہ ؒ بھی فارسی گو تھے۔ اِسی طرح صحاحِ ستہ کے ائمہ اور صوفیاء کے سلسلے بھی عجم سے وابستہ تھے۔ برصغیر کے سادات کے خاندانوں کے ساتھ شیرازی، کرمانی، تبریزی، ہمدانی اور بخاری کے لاحقے بھی تقدس کی علامت بننے لگے۔

ابتدائی دور کے سنیوں نے بھی ائمۂ اثنا عشری کا احترام ملحوظِ خاطر رکھا تو اہلِ تشیع نے بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا احترام ملحوظِ خاطر رکھا۔ شاہنامہ کا مؤلف استاد ابوالقاسم فردوسی طوسی (جسے وفات پائے ایک ہزار برس گزر چکے ہیں) کے بارے میں تمام تر روایات یہی ہیں کہ وہ شیعہ تھا، حتیٰ کہ چہار مقالہ کے مؤلف نظامی عروضی سمرقندی نے یہاں تک لکھا ہے کہ اس کے عقائد کے باعث اسے سنیوں کے قبرستان میں دفن نہیں کیا گیا تھا اور اسے اپنے باغ میں قبر نصیب ہوئی تھی۔ شاہنامہ کے دیباچہ میں وہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور اصحاب کرام رضی اللہ عنہم کا ذکر بہت اچھے الفاظ میں کرتا ہے، تاہم حضرت

علی رضی اللہ عنہ کا ذکر وہ باقی اصحاب کی نسبت زیادہ طمطراق سے کرتا ہے۔صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں شاہنامہ کے درج ذیل اشعار ملاحظہ ہوں :۔

چہ گفت آں خداوندِ تنزیلِ و وحی خداوندِ امر و خداوندِ نہی
کہ خورشید بعد از رسولان مہ نتابید ہر کس ز بوبکرؓ بہ
عمرؓ کرد اسلام را آشکار بیارا ست گیتی چو باغِ بہار
پس از ہر دواں بود عثمانؓ گزیں خداوند شرح و خداوند دیں
چہارم علی بود جفتِ بتولؓ کہ او را بخوبی ستاید رسولؐ

(آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم یعنی صاحبِ تنزیلِ وحی اور صاحب امر ونہی نے یوں فرمایا ہے کہ چشمِ آفتاب نے انبیاء علیہم السلام کے بعد اگر کسی اور چہرے کو روشنی بخشی ہے تو وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ذات گرامی ہے۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اسلام کی حقانیت واضح ہوئی اور آپؓ کی فتوحات نے دنیا کو باغِ بہار کر دیا۔ان دونوں کے بعد منتخب ذات حضرتِ عثمان رضی اللہ عنہ کی ہے' جو حیاء کا پیکر تھے اور دین کے محافظ۔چوتھے نمبر پر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے شوہر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ذکر ہے' جن کی خوبیوں کے باعث آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی آپؓ کی تعریف کی ہے۔)

پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مدح میں بہت اشعار کہتے ہوئے یہ شعر کہا ہے:۔

اگر چشم داری بہ دیگر سرای بہ نزدِ نبی و وصی گیر جای

(اگر اگلے جہان میں تمہیں بخشش کی اُمید ہے تو پھر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے وصی یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قرب حاصل کرو!)

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ فردوسی نے ماقبل اسلام کے ایران کی تاریخ تحریر کی ہے اور شاہانِ عجم کی بہت تعریف کی ہے' کسی حد تک عربوں کے خلاف تعصب کا ثبوت بھی دیا ہے۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ایران پر حملہ کرنے کے لیے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو روانہ کرنے کے بارے میں بھی یوں کہا ہے :۔

چناں بد کجا سرفرازِ عرب کہ از تیغ او روز گشتی چو شب
عمرؓ آں کہ بد مؤمناں را امیر ستودہ ورا خالق بے نظیر

گزیں سعد وقاصؓ را با سپاہ   فرستادہ تا رزم جوید ز شاہ
چو بخت عرب بر عجم چیرہ شد   ہمہ بخت ساسانیاں تیرہ شد
ہماں زشت شد خوب وشد خوب زشت   شدہ راہ دوزخ پدید از بہشت

(عرب کب اس طرح سر اونچا کر کے میدان میں نکلے ہوں گے کہ ان کی تلواروں نے دن کو رات میں بدل دیا ہو۔ حضرت عمرؓ جو کہ مؤمنوں کے امیر تھے ان کی تعریف تو خالق بے نظیر نے بھی کی تھی۔ انہی کے حکم سے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کو ایک لشکر کے ہمراہ روانہ کیا گیا تھا جس نے شاہ کا مقابلہ کرنا تھا۔ عرب خوش قسمت تھے جن کی خوش بختی عجم کی بدبختی بن گئی۔ عجم تو بہشت کے راستوں سے ہوتا ہوا دوزخ میں پہنچ گیا۔)

اسی طرح صاف ظاہر ہے کہ اہل تشیع بھی اس دَور میں اعتدال کی راہ پر گامزن تھے اور ہمیں اس دَور میں شیعہ سنی تنازعہ نظر نہیں آتا۔

عجمی اثرات کے غلبہ سے اسلام کی ابتدائی چند صدیوں میں تصوف کا آغاز ہوا۔ چار میں سے تصوف کے تین سلسلوں نے حضرت علیؓ کو آنحضورﷺ کا روحانی جانشین قرار دیا ہے اور صوفیاء کے افکار پر ابتدائی عہد کے تشیع کے اثرات بھی پائے جاتے ہیں' اور معلوم ہوتا ہے کہ صوفیانہ تحریک حضرت علیؓ سے ارادت کے اظہار کی علمبردار تھی۔ ابتدا میں یہ روحانی تربیت کا ایک کورس تھا جو ایک استاد کامل کی رہنمائی میں مکمل ہوتا تھا۔ اسے طریقت کا نام دیا گیا' مگر مشکل اس وقت آن پڑی جب طریقت کو دین یعنی شریعت کے مقابلے میں لا کھڑا کیا گیا اور شریعت وطریقت کی بحث چھیڑ دی گئی۔ ایک اور مصیبت یہ نازل ہوئی کہ تصوف (طریقت) کے انتہائی دقیق عالمانہ نکتے عامۃ الناس اور کم پڑھے لکھے لوگوں کے زیر بحث آ گئے۔ عظیم اصحابِ تصوف نے اشاعتِ اسلام کے لیے بہت کاوشیں کیں۔ اس کی اہم مثال حضرت علی ہجویریؒ کی ہے جن کی کتاب **کشفُ المحجوب** طریقت اور شریعت کا حسین امتزاج ہے اور اس میں کہیں بھی لغزش نظر نہیں آتی۔ آپ ابراہیم غزنوی کے عہد میں لاہور میں آئے اور بقول اقبال: ؎

خاکِ پنجاب از دمِ او زندہ شد   از شعاعِ مہر اُو تابندہ شد

عہد فاروقؓ از جمالش تازہ شد　　حق ز نامِ اُو بلند آوازہ شد

(آپ کے سانسوں کی گرمی سے خاکِ پنجاب میں زندگی کی لہر دوڑ گئی اور وہ
آپ کے آفتاب کی شعاعوں سے چمک اٹھی۔ آپ کے جمال نے حضرت عمر
فاروق رضی اللہ عنہ کے دور کی یاد تازہ کر دی اور ہر طرف حق کا غلغلہ پھیل گیا۔)

برصغیر میں اسلام کی اشاعت کے لیے آنے والے بیشتر صوفیاء کرام کا تعلق بھی عجم سے تھا۔ اس طرح ان کی کاوشوں سے جو اسلام یہاں ہندوستان میں پھیلا اس میں فکرِ عجم کی آمیزش بھی موجود تھی۔ حضرت جلال الدین تبریزیؒ نے بنگال میں، حضرت معین الدین چشتیؒ سیستانی (ایرانی) نے اجمیر شریف میں اور حضرت شاہ علی ہمدانیؒ نے کشمیر میں اسلام کی اشاعت فرمائی۔ عجم میں اس طرح ابتدائی دَور میں فقہ حنفی کی ترویج ہوئی اور غزالی اور رازی کے افکار اور رومی و جامی کے اشعار اسلام کی روح کے ساتھ لازم و ملزوم ٹھہرائے جانے لگے۔ صوفیاء نے اسلام کے ساتھ برصغیر میں فارسی کو بھی متعارف کروایا، کیونکہ یہی ان کی مادری اور ثقافتی زبان تھی۔ آج سے ہزار برس قبل اس دَور کے عظیم ترین فارسی شاعر مسعود سلمان لاہور میں پیدا ہو کر وہیں مدفون ہو گئے۔ اِسی طرح فارسی کے عظیم ترین آخری فلسفی شاعر علامہ اقبال سیالکوٹ میں پیدا ہو کر لاہور میں دفن ہو گئے۔ اس طرح یہ علاقے تصوف، فکر، فلسفہ و منطق، شاعری اور فارسی ادب کے گہوارے بن گئے، یعنی فکرِ عجم مکمل طور پر یہاں پر بھی چھا گئی۔ بات یہاں تک جا پہنچی کہ ہندو اور سکھ عقائد بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ گورو گوبند سنگھ کی سوانح عمری اور شاعری میں ظفر نامہ ان کی فارسی میں اعلیٰ استعداد کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ تاہم جب ہندوؤں نے ان افکار کا مطالعہ کیا اور پھر ان سے اپنے افکار کو ہم آہنگ کر لیا تو پھر فکرِ عجم کی ہندوانہ صورت (version) کو ہم پر مسلط کرنا چاہا۔ تحریری طور پر یہ اجزاء بھگت کبیر کی شاعری اور دارا شکوہ کی کتب میں موجود ہیں اور عملی طور پر اس کا نمونہ اکبر کا دینِ الٰہی تھا۔ مانی (تیسری صدی عیسوی کے ایرانی مدعیٔ نبوت) کے ترکِ دنیا کے تصورات بعض صوفیانہ عقائد کی بنیاد بن گئے۔ وحدت الوجود کی توضیح انتہائی نامناسب انداز

میں کی گئی۔ یہ وہ مقام تھا جس کا بیان علامہ اقبال نے بال جبریل میں ساقی نامہ میں یوں کیا ہے:

وہ صوفی کہ تھا خدمتِ حق میں مرد محبت میں یکتا حمیت میں فرد
عجم کے خیالات میں کھو گیا یہ سالک مقامات میں کھو گیا
بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے!

اسی طرح آگے لکھتے ہیں:

تمدن' تصوف' شریعت' کلام بتانِ عجم کے پجاری تمام

یہ یاد رہے کہ ہماری مرادِ فکرِ عجم کی یہ انحطاط پذیر صورت نہیں ہے۔

اب ہم تاریخ میں واپس چلتے ہیں۔ بنوعباس کے عہد میں ایرانیوں (اہل عجم) کے تعلقات حکمرانوں کے ساتھ مدوجزر کا شکار رہے ہیں۔ کبھی بلخ کا خاندان برامکہ بنوعباس کی آنکھوں کا تارا بن کر اقتدار کے سیاہ و سفید کا مالک بن گیا تھا اور بنوعباس کو مکمل طور پر بے دست و پا کر چکا تھا' پھر اسے بھی صفحۂ ہستی سے مٹا دیا گیا۔ اسی طرح بنوعباس کی خلافت کی ابتدا میں ابومسلم خراسانی کے لشکر اور تحریک کا ایک بہت بڑا حصہ تھا' مگر پھر اسے مجبور کر دیا گیا کہ وہ بنوعباس کے مقابلے میں اتر آئے۔ اس کشمکش میں عرب و عجم کے تعصبات پھر عود کر آئے اور ابومسلم خراسانی کے پیروکار فکرِ عجم کے استحکام کا باعث بنے۔ پھر یعقوب لیث صفاری نے مشرقی ایران میں بغاوت کر کے ایرانی قومیت کے نام پر اپنی علیحدہ حکومت قائم کر لی تھی۔ پھر مامون الرشید کا دور آیا تو اپنی ایرانی ماں کی تربیت کے باعث اس نے فکرِ عجم کو فروغ بخشا' مگر غلط فلسفیانہ موشگافیوں اور قرآن کے مخلوق یا کلامِ خدا کی بحث نے عباسی سلطنت کو خاصی زک پہنچائی۔ مامون الرشید نے حالات سے مجبور ہو کر آٹھویں اثنا عشری امام حضرت علی رضاؒ کو اپنا ولی عہد نامزد کیا' مگر بعد میں کچھ روایات کے مطابق شہید کروا دیا۔ پھر آل بویہ نے بائیسویں عباسی خلیفہ مستکفی کو قید کر کے بغداد پر قبضہ کر لیا تھا اور ایرانی قومیت کے جذبہ اور تشیع کے فروغ کے نام پر اپنی حکومت قائم کر لی تھی۔ اس تمام دور میں اہل عجم کی اکثریت سنی حنفی عقائد کی

حامل رہی' مگر اثنا عشری ائمہ اور اہل بیت سے محبت ہمیشہ قائم ودائم رہی۔ یہ وہ لوگ تھے جو سنی ہوتے ہوئے بھی تشیع کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ یہ رنگ کہیں ہلکا تھا کہیں گہرا' مگر اِعتدال کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔

مسلمانانِ عجم کو سب سے زیادہ نقصان منگولوں کے حملے سے پہنچا۔ فرید الدین عطارؒ جیسے مفکر شہید ہو گئے' کتابیں دریابُرد ہو گئیں' لوگ تہہ تیغ ہو گئے' اور زندہ بچ جانے والے قنوطیت کا شکار ہو کر مانوی طرز کی صوفیانہ روش پر چل نکلے۔ اُس دَور میں فقط جلال الدین رومیؒ نظر آتے ہیں جو سعیٔ پیہم اور عمل کی تلقین کرتے ہیں۔ اسی دَور میں محی الدین ابن عربی موجود ہیں جو وحدت الوجود کے نظریات کا پرچار کرتے ہوئے ''فصوص الحکم'' میں زوال پذیر نظریات کی انتہا کر دیتے ہیں کہ اسلام کی روح تک متاثر ہو جاتی ہے۔ بہت سے مفکرین' شعراء اور مؤرخین بھاگ کر برصغیر میں شمس الدین التمش کے ہاں' یا ناصر الدین قباچہ کے ہاں پناہ لیتے ہیں' جو دوسرے وطن میں جا کر اس قابل نہیں رہتے کہ فکری ارتقاء میں اہم رول ادا کر سکیں۔ کافی لوگ مارے جاتے ہیں۔ خانقاہوں میں موسیقی' قوالی اور سماع کا دَور دَورہ ہے۔ لوگ دھڑا دھڑ خانقاہوں کا رُخ کرتے ہیں۔ ایک نیا نظام وجود میں آتا ہے' مگر ذہن ہیں کہ رُکے رُکے سے ہیں۔

اسلامی تاریخ میں عثمانی ترکوں کا دور اہم سنگ میل ثابت ہوتا ہے۔ جنگی فتوحات انہیں یورپ کے مرکز تک لے جاتی ہیں۔ جزیرہ نمائے عرب اور شمالی افریقہ کے ساحلی علاقے ان کے زیرنگیں ہیں۔ فقہ حنفی ان کا سرکاری عقیدہ ہے۔ ایران میں آذربائیجان کا ایک ترک خاندان خود کو سید قرار دے کر تشیع کے تحفظ کے نام پر لوگوں سے بیعت لینا شروع کر دیتا ہے۔ آہستہ آہستہ اسی خاندان کا ایک تیرہ برس کا بچہ شاہ اسماعیل صفوی کے نام سے زمامِ اقتدار سنبھال لیتا ہے۔ ترک سلطان کی موجودگی میں اسے حکومت اور اقتدار کا حق حاصل نہیں ہے' کیونکہ وہ خلافت کا لقب اختیار کیے ہوئے ہے' حتیٰ کہ برصغیر کے جملہ حکمران' بادشاہ کے بجائے سلطانانِ ہند کہلواتے ہیں۔ صفوی حکمران اپنی بادشاہت اُس وقت تک قائم کرنے سے قاصر تھے جب تک ان کے پاس کوئی ٹھوس

مذہبی بنیاد نہ ہوتی۔ انہوں نے شیعہ عقائد کو بنیاد بنا کر ان عقائد کو سرکاری طور پر سخت گیر انداز میں رائج کیا اور کسی قسم کی رو رعایت سے کام نہیں لیا۔ اس زمانے میں ایران میں شیعہ علماء موجود نہیں تھے' اس لیے انہوں نے عرب ممالک سے شیعہ علماء کو بلا کر انہیں بڑی بڑی جاگیریں اور مراعات دیں۔ ان لوگوں نے شاہ سے زیادہ شاہ کی وفاداری میں صحابہ رضی اللہ عنہم پر سب و شتم اور طعن و تشنیع کے دروازے کھول دیے اور اعمال اور عقائد کو اس درجہ پر لے گئے کہ تاریخ میں پہلی بار تشیع ایک الگ تھلگ مذہب کی صورت میں نظر آنے لگا۔ ایران کی اکثریت جو سُنی حنفی عقائد پر عمل پیرا تھی' اسے مجبور کر دیا گیا کہ یا تو وہ شیعہ عقائد اپنا لیں یا مرکزِ ایران سے دور چلے جائیں۔ اس طرح سنی حنفی لوگ ایران کے مرکز یعنی تہران' اصفہان' تبریز' شیراز اور گیلان سے آہستہ آہستہ غائب ہو گئے اور دُور دراز کے علاقوں مثلاً بلوچستان' خوزستان' کردستان' ساحلی علاقوں' ترکمان علاقوں اور سیستان وغیرہ میں باقی رہ گئے۔ پڑھے لکھے ایرانی شعراء و مفکرین نے ہندوستان کا رُخ کیا جنہیں مغل دربار میں زبردست پذیرائی ملی۔ اس طرح فکرِ عجم کے مراکز دہلی' لاہور' دکن اور لکھنؤ وغیرہ میں منتقل ہو گئے۔ ملک الشعراء بہار کے بقول عہد جہانگیری میں ایران کا اصل دارالحکومت اصفہان نہیں تھا بلکہ وہ آگرہ منتقل ہو چکا تھا۔

اسماعیل صفوی نے ایران میں شیعہ عقائد کو فروغ دیا تو پھر وسطی ایشیا کی جانب توجہ دی۔ عبداللہ خان ازبک سمرقند و بخارا میں امام العصر کے لقب سے سنی حنفی عقائد کا محافظ بن گیا۔ انہی ایام میں فرغانہ کا حکمران شہزادہ ظہیرالدین بابر اپنی موروثی تیموری سلطنت کی بقاء کی جنگ لڑ رہا تھا' اسے صفویوں کی حمایت کی ضرورت محسوس ہوئی۔ صفویوں نے اسے معاہدے کی رو سے اس امر کا پابند بنایا کہ جو علاقے وہ فرغانہ کی حدود سے باہر نکل کر فتح کرے گا وہاں پر ائمہ اثنا عشری کے نام کا خطبہ پڑھا جائے گا اور انہی کے نام کے سکے جاری ہوں گے۔ بابر نے سمرقند فتح کیا جہاں اس کے آباء واَجداد کی حکومت قائم رہی تھی' مگر وہاں اس نے جب ائمہ اثنا عشری کے نام کا خطبہ پڑھا تو وسطی ایشیا کے لوگ اس کے اعلانیہ تشیع سے بددل ہو گئے اور اس کی زبردست مزاحمت پر اتر آئے۔ وہ

عبداللہ خان ازبک سے ہزیمت کھا کر کابل آن پہنچا۔ کابل و ہرات میں بھی اسے مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تو وہ ہندوستان میں آن وارد ہوا۔ دہلی پہنچ کر اس نے ایرانی تسلط کا جوا سر سے اتار کر ہندوستان کے پہلے مسلمان بادشاہ کا لقب اختیار کیا۔ اس سے پہلے ہندوستانی مسلمان حکمران سلاطین کہلاتے تھے اور مرکزی خلافت کے وفادار تھے۔ اب دنیائے اسلام میں تین حکمران تھے۔ ترک خلیفہ محافظ اسلام تھا اور سنی حنفی عقائد کا نگہبان تھا۔ صفوی سادات متشددانہ تشیع کے سرپرست تھے اور ہندوستان کا مغل بادشاہ کنفیوژن کا شکار تھا۔ مغلوں کے عقائد معتدل تھے۔ وہ نسبتاً سیکولر ذہن کے مالک تھے اور سیاسی مصلحتوں کے تحت اپنی مذہبی پالیسی کی تبدیلی کے لیے تیار تھے۔

ایران میں شاہی سرپرستی میں علماء کی کلیسائی انداز میں منظم درجہ بندی کی گئی۔ انہیں جاگیریں دے کر فیوڈل لارڈ بنا دیا گیا اور پھر شاہی گھرانے میں علماء کی بیاہ شادیاں بھی ہوئیں۔ اس طرح ایک کلیسائی طرز کی مذہبی حکومت قائم ہوئی جس میں بادشاہِ وقت امامِ زمان کا قائم مقام یا ڑسٹی کے درجے کا حامل تھا اور وہ یہ حلف اٹھاتا تھا کہ امامِ وقت کے ظاہر ہوتے ہی وہ تاج و تخت سے دستبردار ہو جائے گا۔ بادشاہِ وقت نے اپنی عوامی مقبولیت قائم رکھنے کے لیے ظاہریت کو فروغ دیا۔ تعزیے' مجالس' ماتم' گھوڑے اور علَم کی نمائش کو مذہب کا درجہ حاصل ہو گیا' جبکہ اسلام کے ارکان پر کم توجہ دی جانے لگی۔ وہ لٹے پٹے لوگ جو ایران سے برصغیر یا وسطی ایشیا پہنچے انہوں نے سنیوں پر ہونے والی سختیوں کا ذکر جب مقامی آبادیوں میں کیا تو شیعہ سنی خلیج گہری ہونے لگی اور فرقہ وارانہ منافرت پہلی بار سامنے آنے لگی۔ اسی طرح ترک حکمرانوں نے بھی ان باتوں کا سختی سے نوٹس لیا اور سلطان سلیم کے زمانے میں ایرانیوں کے حج کرنے پر بھی پابندی عائد کر دی گئی۔

برصغیر میں بابر کی وفات پر ہمایوں نے حکومت سنبھالی تو اسے شیر شاہ سوری کے ہاتھوں شکست کھا کر پھر ایران بھاگنا پڑا۔ اصفہان کے صفویوں سے فوجی امداد اسی صورت میں مل پائی جب اس نے ظاہری طور پر شیعیت اختیار کر لی اور کئی برس کی مسلسل

یقین دہانیوں کے بعد چودہ ہزار ایرانی فوجیوں اور علماء سمیت ہندوستان میں آن وارد ہوا۔ ان دنوں دکن کی چار مقامی ریاستوں نے پہلے ہی صفویوں سے وفاداری کا دم بھرنا شروع کیا ہوا تھا اور وہ شیعہ عقائد کی سرپرستی کر رہی تھیں۔ ہمایوں نے ہندوستان میں زمامِ حکومت تو سنبھال لی' مگر ایرانی فوجیوں کی کثیر تعداد لکھنؤ' دہلی' لاہور اور دیگر شہروں میں رہ گئی' جنھوں نے اپنی مقامی بستیاں آباد کرلیں اور فارسی اور تشیع کو اپنا شعار بنالیا۔ اور جہاں جہاں پر یہ لوگ قیام پذیر ہوئے وہاں پر شیعیت کے مراکز قائم ہو گئے۔ ہمایوں کے زمانے میں ان لوگوں کو کھلی آزادی دے دی گئی اور ان کے لیے ایران سے علماء کا آنا جانا لگا رہا۔ اسی زمانے میں کشمیر میں چک خاندان کی شیعہ حکومت قائم ہو چکی تھی جو مغلوں کی حدود سے باہر تھی۔ اس تمام کنفیوژن کا یہ نتیجہ نکلا کہ برصغیر کی مسلمان آبادی کی سنی اکثریت فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا مظاہرہ نہ کرسکی۔ ہندوؤں نے صلح کُل کا پیغام دینا شروع کردیا۔ صوفیاء کی شاعری وحدت الوجود کا پرچار کرنے لگی۔ اکبر نے اس حالت میں اپنا مذہب جاری کردیا اور نصف صدی تک برصغیر میں فکری تناؤ کا دور دورہ ہوگیا۔ شریعت کی بجائے طریقت پر زیادہ زور دیا جانے لگا اور خانقاہوں کی رونق میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اس دوران ایران سے شعراء کی آمدورفت جاری رہی۔ عرفی' شیرازی اور نیشاپوری جیسے لوگ یہاں آن وارد ہوئے۔ سید محمد جونپوری جیسے عالم اور صالح شخص نے مکہ مکرمہ جا کر اپنے مہدی ہونے کا اعلان کیا اور برصغیر میں مہدویت کی تحریک کا آغاز ہوا' مگر یہ لوگ جلد ہی زیرِعتاب آ گئے۔ ابوالفضل اور ابوالفیضی جیسے وسیع النظر اسکالر مہدویت کی گمراہی کا شکار ہوکر دین اسلام کا حلیہ بگاڑنے میں پیش پیش ہونے لگے اور اکبر کے دین الٰہی کی فکری بنیاد مہیا کرنے لگے۔ دین الٰہی میں زردشتی عقائد کا احیاء بھی فکرِ عجم کا مظہر تھا۔

اکبر کے عہد اختتام پر حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کی کاوشوں کے نتیجے میں اور نورالدین محمد جہانگیر کے تعاون کے باعث دین الٰہی کا اختتام ہوا۔ وحدت الوجود کے بالمقابل وحدت الشہود کا نظریہ پیش کیا گیا اور حضرت مجدد الف ثانیؒ نے صحیح

عقائد پر مبنی اسلام کی فکری بنیاد کو استحکام بخشا۔ آپ کے مکتوبات (خصوصاً الہ داد سرہندی کے نام) آپ کی ذہنی استعداد کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ جہانگیر اور شاہجہان کے سسرالی ایرانی عزیزوں کی سرپرستی میں تشیع کے فروغ کے مواقع بھی موجود رہے۔ شاہجہان کے عہد میں شہزادہ داراشکوہ قادری نے اکبر کے دین الٰہی کی طرز پر صلح کل کا انتہائی متصوفانہ انداز میں پرچار کرنا شروع کر دیا۔ علماء و مفکرین کو یہ خطرہ محسوس ہونے لگا کہ شاید اسلام کی بطور دین بقاء کا مستقبل مخدوش ہو جائے گا' مگر اورنگزیب عالمگیر کے عہد میں یہ خطرہ وقتی طور پر ختم ہو گیا اور فقہ حنفی کی از سر نو تدوین فتاوائے عالمگیریہ کی صورت میں ہوئی اور دین سے حشو و زوائد کے خاتمے کی جانب خصوصی توجہ مبذول کی گئی۔ کہیں کہیں شیعہ سنی کشمکش کے واقعات بھی ملتے رہے۔ سماع' موسیقی' لچر شاعری اور سیکولرزم کی سرکاری سطح پر حوصلہ شکنی کی جانے لگی اور اس طرح ایک بار صحیح علم دین کے فروغ کی مخلصانہ کوشش ہوئی۔

اس اصلاحی ماحول میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ سامنے آتے ہیں۔ آپ نے قرآن پاک کا عام فہم فارسی زبان میں ترجمہ کر کے عوام الناس کے لیے قرآن کو سمجھنا آسان کر دیا۔ پھر شیعہ سنی منافرت کے خاتمے کی بھرپور کوشش کی جس پر وہ علماء کی تنقید کا نشانہ بنے۔ آپ کے فرزند شاہ رفیع الدینؒ پر تو تشیع کا الزام بھی لگا دیا گیا۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا شمار عظیم ترین اسلامی مفکروں میں ہوتا ہے۔ ان کے پائے کے مفکر یا تو امام غزالیؒ ہیں یا حضرت علامہ اقبالؒ۔ آپ کا دور ہندوستان میں مغلوں کے زوال اور مرہٹوں کی یورش کا تھا۔ چند برس قبل ایرانی حکمران برصغیر کے مرکز دہلی کو تاخت و تاراج کر چکا تھا اور ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت منگولوں کے استیلاء کے بعد ایران سے ملتی جلتی تھی۔ فکر عجم کے منفی پہلو خانقاہی نظام میں عیاں تھے اور مسلمانوں کی مایوسی انہیں زوال پذیر تصوف کے دامن میں پناہ لینے پر اکسا رہی تھی۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے دین کی روح کو بیدار کرنے کے لیے رجوع الی القرآن کا درس دیا۔ ورنہ ہند کے علماء تو قرآن کے مطالب کو سمجھنے کو نہ صرف غیر ضروری سمجھتے تھے بلکہ عوام تک قرآن کے معانی کی اشاعت کفر کے ضمن میں لا رہے تھے۔ بقول اقبال: ؎

ہند میں حکمت دیں کوئی کہاں سے سیکھے
نہ کہیں لذتِ کردار نہ افکارِ عمیق
حلقۂ شوق میں وہ جرأتِ اندیشہ کہاں
آہ محکومی و تقلید و زوالِ تحقیق
خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق!
ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب
کہ سکھاتی نہیں مؤمن کو غلامی کے طریق

شاہ صاحب کی عظیم مساعی سے احمد شاہ ابدالی کے ہاتھوں مرہٹوں کی سرکوبی ہوئی اور برصغیر کے مرکز کے مسلمانوں نے سکھ کا سانس لیا۔ فرقہ وارانہ ہم آہنگی پیدا ہوئی' سنی اور شیعہ مسلمان باہم شیر و شکر ہونے لگے۔ علم دین اور قرآن کی تعلیم کی جانب توجہ مبذول ہوئی اور پھر دین کی خدمت کا بیڑہ آپ کے خاندان نے اٹھایا۔

آپ کے پوتے شاہ اسماعیل شہیدؒ نے حضرت سید احمد شہید بریلویؒ کی قیادت میں فکر و وعظ کو تحرک اور جہد و عمل (Dynamic Activity) سے روشناس کروایا۔ اُن دنوں پنجاب' سرحد اور کشمیر پر سکھ حکمرانوں نے مسلمانوں کا عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا اور ان کی زندگی موت سے بدتر تھی۔ آپ نے بنگال اور مشرقی ہندوستان سے مجاہدین جمع کر کے پہلے سفر حج کیا' پھر واپس لوٹتے ہی لانگ مارچ کرتے ہوئے سندھ' بلوچستان اور افغانستان سے ہوتے ہوئے صوبۂ سرحد پر حملہ آور ہوئے۔ جہاں سید احمد شہید بریلویؒ میں فکری پختگی اور تحمل و بردباری کا عنصر نمایاں تھا' وہاں شاہ اسماعیل شہیدؒ کے ہاں استقامت اور فکری شدت تھی۔ شاہ اسماعیل شہیدؒ نے خالصتاً قرآن و حدیث کی روشنی میں' فکرِ عجم سے پہلوتہی کرتے ہوئے' سادہ مذہبی طریقے اپنانے پر زور دیا تو وہاں عام لوگوں میں تذبذب کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ آپ اور آپ کے تربیت یافتہ مجاہدین نے حدیث کی روشنی میں رفع الیدین اور آمین بالجہر وغیرہ پر زور دیا تو مقامی لوگوں کے لیے

یہ طریق کار چونکہ بالکل اجنبی اور غیر مانوس تھا' لہٰذا ان میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ پھر تصوف' خانقاہ' سماع' پیر پرستی اور دیگر ظاہری اُمور جو اُن کے ہاں رچ بسے تھے اور وہ ان کو خالص اسلام سمجھ رہے تھے' انہیں بیک قلم مسترد کر دیا گیا اور ان پر زبردست تنقید کی گئی : ؎

صفت برق چمکتا ہے مرا فکر بلند
کہ بھٹکتے نہ پھریں ظلمت شب میں راہی!

یہ صورت حال مقامی پٹھانوں کے دلوں میں وسوسوں کا باعث بنی تو ان کا تمام تر اعتماد جہادی کوششوں سے بھی اٹھ گیا اور پھر سید بادشاہ کا قافلہ تنہا رہ گیا' جسے سکھوں نے بڑی آسانی سے بالاکوٹ کے مقام پر تہہ تیغ کر دیا۔ مجاہدین نے مقابلہ تو بہت کیا مگر وہ ہر طرف سے گھر چکے تھے اور اپنے ساتھی چھوڑ کر جا چکے تھے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ جہاں حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کے پیرو ماسوائے قرآن وحدیث کے کوئی دوسری بات سننے سے مکمل طور پر آزاد ہو گئے' وہاں حضرت سید احمد شہیدؒ کو قریباً ایک صدی تک امامِ غائب کا درجہ دے دیا گیا اور آپ کی شہادت سے قیامِ پاکستان تک مجاہدین کا یہی عقیدہ رہا کہ وہ زندہ ہیں اور ایک بار ضرور ظاہر ہوں گے' مگر قیامِ پاکستان کے بعد یہ عقیدہ ماند پڑ گیا۔ پھر یہ لوگ کسی نہ کسی طرح جہاد پر عمل پیرا رہے اور انگریزوں کے لیے سخت مشکلات پیدا کرتے رہے۔ انگریزوں نے انہیں شیخ محمد بن عبدالوہاب کی تحریک کی مماثلت سے ''وہابی'' کا نام دیا۔ یہ لوگ ''فکرِ عجم'' سے بہت دُور تھے۔ اپنے مقصد عمل اور عقائد میں مخلص تھے اور اسلام میں صرف اُن اَفعال وعقائد کے قائل تھے جن کا ثبوت آنحضور ﷺ کی احادیث میں ملتا تھا۔ یہ لوگ غیر مقلد تھے اور کسی امام کی فقہ پر عمل پیرا ہونے کو غیر ضروری سمجھتے تھے۔ یہ تحریک آزادیٔ افکار' اجتہاد اور خالص اسلام پر عمل پیرائی کی اعلیٰ ترین مثال تھی' مگر یہ لوگ کسی بھی طرح ان لوگوں کو برداشت نہیں کرتے تھے جو اُن کی نگاہ میں مذہب میں آمیزش کے قائل تھے۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے رومی' جامی اور دیگر شعراءِ عجم پر سخت تنقید کی۔ اس طرح کے طریق کار اپنانے کا ردعمل دیگر

مسلمان گروہوں کی جانب سے بہت شدید تھا' جسے بوجوہ انگریزوں نے خوب ہوا دی۔

انیسویں صدی کے آخری نصف میں دیوبند کی تحریک کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ لوگ بھی شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے نظریات کے حامی تھے اور سید احمد شہید بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک سے متاثر تھے۔ ان لوگوں نے نسبتاً اعتدال کا راستہ اختیار کیا۔ فقہ حنفی کی حدود میں رہتے ہوئے خرافات کے خلاف تحریک چلائی' خانقاہی نظام کی کوتاہیوں پر تنقید کی اور اس کی اصلاح کی کوشش کرتے ہوئے اسے بیک قلم مسترد نہیں کیا' علمائے دین کو تیار کیا' انگریزوں کے خلاف عوام کو تیار کیا' زیرزمین جنگ لڑی اور ریشمی رومال تحریک جیسے منصوبے بنائے اور پھر دار ورسن کی صعوبات سہیں۔ خلوص اور فکری پختگی کی یہاں بھی کمی نہیں تھی' مقصد کے ساتھ لگن' ایثار اور دیانت داری کی ان کے ہاں بہتات تھی۔ یہ لوگ بھی انگریزوں کے غلبہ کے خلاف صف آراء تھے۔ یہ لوگ انگریزی تعلیم' تہذیب اور نظام کے مخالف تھے۔

تیسرا گروہ ان لوگوں کا تھا جو سنی حنفی تھے مگر روایات کے امین تھے۔ وہ ہر اُس روایت کو اپنائے ہوئے تھے جو اُن تک برصغیر میں سینہ بہ سینہ اور عملی طور پر پہنچی تھی۔ یہ لوگ خانقاہی نظام کے حامی اور مؤید تھے' تصوف کے سلسلوں سے وابستہ تھے' سماع' موسیقی اور دیگر رسوم ورواج کے قائل تھے' فکر عجم کی چھاپ ان پر بہت گہری تھی' یہ لوگ اپنے عقائد میں مخلص تھے اور پوری دیانت داری سے قرآن وحدیث' فقہ اور روایات پر عمل پیرا تھے۔ خانقاہوں کا تو یہ حال تھا کہ بقول اقبال:

قُم باذن اللہ کہہ سکتے تھے جو رخصت ہوئے
خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن

یا ایک مقام پر یوں فرمایا:

یہ معاملے ہیں نازک جو تری رضا ہو تُو کر
کہ مجھے تو خوش نہ آیا یہ طریق خانقاہی!

ان کے علماء اور مفکرین کی ذہنی استعداد اور دین سے لگن کسی بھی طرح کسی سے کم

نہیں تھی، مگر عوام الناس کے ہاں کچھ تو جاہلانہ رسوم بھی نظر آتی تھیں جو کہیں کہیں پر قابل اعتراض ہو جاتی تھیں، تاہم ان کا تعلق نہ تو عقائد سے تھا اور نہ ہی علمائے کرام ان کو اچھا سمجھتے تھے۔ یہ لوگ یہ سب کچھ صدیوں سے دیکھتے اور کرتے آئے تھے اور یہ چیزیں ان میں رچ بس گئی تھیں۔ اس کا تعلق مذہب سے کم اور ذہنی حالت (psyche) سے زیادہ تھا، اس سے ملتی جلتی روایات ہندوؤں میں بھی تھیں اور یہ دین اور مذہب کی بجائے ایک قسم کا کلچر تھا۔ جہاں تک دین کا تعلق تھا یہ لوگ بھی کسی سے کم نہیں تھے۔

برصغیر کے شیعہ حضرات جو کہ نسبتاً الگ تھلگ آبادیوں میں مقیم تھے، شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے زمانے کے بعد دیگر مسلمانوں کے ساتھ شیر و شکر تھے۔ ان کی ظاہری رسوم یعنی تعزیہ، علم اور ذوالجناح کے جلوس بھی ان کی طرزِ زندگی کے عکاس ضرور تھے مگر یہ مذہب کا حصہ نہیں سمجھے جاتے تھے۔ یہ لوگ بھی کتاب اللہ اور سنتِ رسول ﷺ پر عمل پیرا تھے۔ تأویل کچھ بھی ہو دین کے ساتھ ان کا شغف اور لگاؤ بھی واضح تھا۔ اگرچہ صفوی ایران اور بعد میں قاچاری ایران کے علماء کی آمد و رفت کے باعث ان کے ہاں کبھی کبھی فکری شدت آ جاتی تھی، مگر معدودے چند واقعات کے علاوہ سنیوں کے کسی بھی عالم نے انہیں دائرۂ اسلام سے باہر نہیں سمجھا اور نہ ہی انہوں نے باقی مسلمانوں کے ساتھ الجھاؤ کا رویہ اختیار کیا۔ لیکن برصغیر کے شیعہ احباب کے ہاں کوئی تحرک آور زبردست قسم کی اصلاحی یا فکری تحریک سامنے نہیں آئی جس کے باعث قدامت پرستی کا غلبہ رہا، جبکہ اس دور کے ایران میں جہاں کئی اصلاحی تحاریک چلتی رہیں صفوی دور کے سخت گیر نظریات آہستہ آہستہ ماند پڑتے چلے گئے اور لوگ اعتدال کی طرف مائل ہوتے چلے گئے۔ تاہم انگریزوں کے برصغیر اور ایران کے مابین قائم کردہ آہنی پردہ (iron curtain) کے باعث وہاں کی اصلاحی تحاریک کا اثر برصغیر کے شیعہ احباب پر کم ہی پڑتا محسوس ہوا۔ ہر طرح کی قومی اور عملی جدوجہد میں شیعہ مسلمان اور سنی مسلمان ہمیں یک جان نظر آتے ہیں اور گزشتہ دو صدیوں کی تاریخ میں ایک دوسرے کے لیے احترام اور اخوت کے جذبات واضح طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔

اب ہم دوبارہ ایران چلتے ہیں' جہاں صفوی دَور سے بادشاہت کے تحفظ کے لیے واضح طور پر سنی ترکی اور سنی ہندوستان کے مقابلہ میں ایسی صورت سامنے آ رہی تھی جہاں کے عوام کے افعال' اعمال اور ظاہری رسوم و رواج میں سرکاری سرپرستی اور تشویق کے باعث واضح فرق نظر آ رہا تھا اور یہ فرق ہر چیز میں تھا۔ امامت کے تصور اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بابت نظریاتی اختلاف کے علاوہ کوئی بھی واضح فکری اور مذہبی فرق ہر چند وہاں کے شیعہ اور اردگرد کے ممالک کے سنی مسلمانوں میں نہیں تھا' مگر ظاہری طور پر ان کے رسوم و رواج دوسرے مسلمان فرقوں سے کافی حد تک مختلف تھے۔ صفوی بادشاہ اور بعد کے قاچاری بادشاہ امامِ وقت کے ٹرسٹیز (trusties) سمجھے جاتے تھے' اور شاہی نظام کے زبردست تعاون سے علماء کرام اور مشائخ انتہائی معزز اور محترم تھے کہ علماء نے بتدریج ایسا مربوط اور منظم نظام قائم کر دیا جو ایرانی معاشرے کا سب سے منظم نظام تھا اور اس کا رابطہ نچلی سطح تک عوام سے تھا اور بالائی سطح پر ان کی رشتہ داریاں شاہی خاندان سے تھیں۔ انیسویں صدی کے ناصر الدین قاچار بادشاہِ ایران کی بیٹی تہران کی جامع مسجد کے خطیب کے عقد میں تھی۔ یہ لوگ شاہی نظام کے سرپرست اور حامی تھے۔ ان کے نظام کی سوچ ایک ہی تھی اور شاہی استبداد کی تابع تھی۔ یہ لوگ رسوم و رواج اور فکرِ عجم کے منفی پہلوؤں کی آبیاری کرتے ہوئے ایک قوم کو متحد رکھے ہوئے تھے مگر فکری آزادی کا فقدان تھا' لیکن روشن فکر مذہبی اسکالر اس تمام سلسلے پر چیں بجبیں ضرور تھے اور بقول اقبال یہ کہہ رہے تھے: ؎

تیری طبیعت ہے اور' تیرا زمانہ ہے اور
تیرے موافق نہیں خانقہی سلسلہ!

کچھ اور لوگ بھی ان کی بات سمجھ رہے تھے' مگر وہ مصلحت سے کام لے رہے تھے: ؎

اس کی خودی ہے ابھی شام و سحر میں اسیر
گردشِ دوراں کا ہے جس کی زباں پر گلہ

شاہی نظام کسریٰ کے استبدادی نظام کا تسلسل تھا۔ وہ فکری کہنگی جسے اسلام نے ختم

کر کے حیاتِ نوبخشی تھی' ایران پر اسے دوبارہ مسلط کیا جا رہا تھا' مگر تھی وہ مذہب کے پردے میں بند۔ مذہب اور استبداد کا یہ امتزاج ناقابل برداشت ہوتا جا رہا تھا ؎

یا شرع مسلمانی' یا دیر کی دربانی
یا نعرۂ مستانہ' کعبہ ہو کہ بُت خانہ
میری میں' فقیری میں' شاہی میں' غلامی میں
کچھ کام نہیں بنتا بے جرأتِ رندانہ!

انیسویں صدی عیسوی کا آغاز ایران میں قاچاری عہد کا ابتدائی زمانہ تھا۔ لوگوں میں بیداری کی لہر دوڑ رہی تھی اور ایران روس کے ہاتھوں سخت ہزیمت سے دوچار تھا۔ اس صدی کے پہلے نصف میں ایران اپنے یورپی مسیحی مقبوضات جارجیا اور آرمینیا سے محروم ہو گیا اور پھر زارِ روس نے آذربائیجان کے ساٹھ فیصد سے زائد رقبہ پر قبضہ کر لیا۔ پھر ترکمانستان' ازبکستان اور تاجکستان بھی ایران کے ہاتھوں سے جاتے رہے۔ ۱۸۲۸ء کے شرمناک معاہدہ کے بعد فتح علی شاہ قاچار نے ان تمام خطوں سے اپنی دستبرداری کا اعلان کر دیا۔ اب عوام مایوسی کا شکار ہونے لگے اور ان کے ہاں سکونِ قلبی کا کوئی سامان نہ رہا۔ دربار سے وابستہ جاگیردار علماء انہیں شاہ سے وفاداری کے لیے مائل کرنے کی غرض سے ہر ممکنہ کوشش کرتے رہے۔ بالآخر انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ اس فساد اور تباہی کے عہد میں اب امامِ غائب کا ظہور ہونے والا ہے اور امامِ وقت مہدیٔ آخر زمان آ کر ہمارے تمام مسائل حل کر دیں گے۔ عوام ظن و تخمین کا شکار تھے' سوچیں غلط سمت پر رواں دواں تھیں اور بقول اقبال :؎

عقلِ بے مایہ امامت کی سزاوار نہیں ۔ راہبر ہو ظن و تخمیں تو زبوں کارِ حیات
فکر بے نور ترا' جذبِ عمل بے بنیاد ۔ سخت مشکل ہے کہ روشن ہو شبِ تارِ حیات

مگر ایک بات پر سب متفق تھے کہ

دنیا کو ہے اُس مہدیٔ برحق کی ضرورت ۔ ہو جس کی نگہ زلزلۂ عالمِ افکار!

اس نظریاتی بحران کا فائدہ اٹھانے والا شیراز کا نوجوان علی محمد باب تھا جس نے

مہدیٔ موعود کے ایلچی ہونے کا دعویٰ کرتے ہوئے یہ باور کرایا کہ امامِ زمان اسے ملتے رہتے ہیں اور وہ ان کا پیام لوگوں تک پہنچا رہا ہے۔ باب نے آزادیٔ افکار کا پرچار کیا اور لوگوں کو یہ درس دیا کہ وہ علماء اور شاہ کے مسلط کردہ نظام پر تنقید کریں اور ہر طرح کی تقلید سے آزاد ہو کر اس کی پیروی کریں‘ غرض وہ انہیں ہر بند سے آزاد کرنا چاہتا تھا‘ بقول اقبال:؎

ہر سینہ نشیمن نہیں جبریلِ امیں کا ہر فکر نہیں طائرِ فردوس کا صیاد
گو فکر خداداد سے روشن ہے زمانہ آزادیٔ افکار ہے ابلیس کی ایجاد

جہاں تک باب کا تعلق ہے وہ فکری آزادی کے علاوہ ہر قید مکان و زمان سے آزادی کا طالب تھا‘ اور بقول اقبال وہ تو قرآن کو بھی اعراب سے آزاد کرنا چاہتا تھا:؎

تھی خوب حضورِ علماء باب کی تقریر بیچارہ غلط پڑھتا تھا اعرابِ سمٰوات
اس کی غلطی پر علماء تھے متبسم بولا تمہیں معلوم نہیں میرے مقامات
اب میری امامت کے تصدق میں ہیں آزاد مجبوس تھے اعراب میں قرآن کے آیات

لوگ اس کے گرد جوق در جوق جمع ہونے لگے اور شاہی استبدادی نظام ایک عظیم خطرے سے دوچار ہو گیا۔ رہی سہی کسر اس کی ایک مرید خاتون نقطہ قزوینی (جسے طاہرہ قرۃ العین کا لقب دیا گیا) نے پوری کر دی۔ اس انتہائی پڑھی لکھی اور ذہین خاتون کا تعلق قزوین و اصفہان کے معزز مذہبی خاندان سے تھا۔ اس نے باب کی پیروی میں گھر کو خیر باد کہا اور اپنی شاعری اور تبلیغ کے ذریعے خواتینِ ایران کو آزادیٔ نسواں کا شیطانی درس دینا شروع کیا۔ حسن و جمال اور شعر و سخن کے علاوہ وعظ و خطبہ میں اس کی کوئی مثال نہیں تھی۔ اس خاتونِ عجم نے بغداد میں اپنی جلاوطنی اور پھر ایران میں آوارگی کے زمانے میں نوجوانانِ ایران کو تحرک اور ابلیسی آزادی کا درس دیا۔ باب کو تبریز میں گولیوں کی باڑ سے اڑا دیا گیا اور طاہرہ کو تہران میں اندھے کنویں میں پھینک کر ابدی نیند سلا دیا گیا‘ مگر یہ مسئلہ حل نہ ہو سکا۔ باب کے ایک مرید مرزا حسین نے بہاء اللہ کے لقب سے مہدیٔ آخر زمانی کا دعویٰ کر دیا اور اعلان کر دیا کہ اس کے پیروکار (جو پہلے بابی

کہلاتے تھے) اب بہائی مذہب کے ماننے والے ہیں' اور نعوذ باللہ آنحضورﷺ کی نبوت کا عہد ختم ہو چکا ہے اور قرآن منسوخ ہو چکا ہے (نقل کفر کفر نباشد) اور یہ کہ نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ اور ارکانِ اسلام اب منسوخ سمجھے جائیں گے۔ یہ شخص اپنے مریدوں سمیت جلاوطن ہو کر ترکی چلا گیا اور ادرنہ کے مقام پر واصل جہنم ہوا۔ اس کے بیٹے عبدالبہاء نے اپنے ساتھیوں کو ساتھ لیا اور فلسطین چلا گیا' جہاں پر جنرل ایلن بی کو فلسطین پر قبضہ میں مدد دی۔ ایران میں جابجا بہائی اور بابی موجود تھے جن کی بیخ کنی کے لیے علماء نے سخت مہم چلائی اور ان پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا۔ حال ہی میں انقلابِ ایران کے بعد یہ لوگ بڑی تعداد میں ایران سے نکل کر امریکہ اور مغربی ممالک میں روانہ ہو گئے اور بہت سے افراد نے عارضی طور پر کافی عرصہ پاکستان میں قیام کیے رکھا۔ یہ ماننا پڑے گا کہ ایرانی علماء اور عوام نے ان سے کوئی رو رعایت نہیں کی۔ ادبی حلقوں تک میں طاہرہ کا نام اور کلام ایک شجر ممنوعہ سمجھا جانے لگا۔

ہر چند کہ فکری بیداری کا ابتدائی مرحلہ غلط سمت کی جانب گامزن ہو کر اپنے منطقی انجام کو پہنچا' مگر فکری بیداری کی یہ لہر ختم نہیں ہوئی۔ انیسویں صدی کا دوسرا نصف انگریزوں اور روسیوں پر اپنے تسلط کے قیام کی جنگ تھی۔ ایک بفر سٹیٹ کے طور پر افغانستان کو وسعت دینے کے لیے انگریزوں نے ہرات اور خراسان کے اردگرد کے علاقے ایران سے افغانستان کو منتقل کروا دیے اور ایران نے جب ان علاقوں پر قبضے کی کوشش کی تو خلیج فارس میں برطانوی بحری بیڑے کی موجودگی میں انگریزوں کے الٹی میٹم کے نتیجہ میں ایران کو ہرات کا محاصرہ چھوڑ کر واپس آنا پڑا۔ ایران نے فرانس کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھایا مگر اسے اپنے مقصد میں چنداں کامیابی نہ ہو پائی۔ اقتصادی اعتبار سے ایران کو تباہ کرنے کے لیے انگریزوں نے تجارت پر اپنی اجارہ داری قائم کرنے کے لیے شرمناک شرائط پر معاہدے کیے۔ ان معاہدوں کے ردعمل کے طور پر ایرانی قصبے اسد آباد کے ایک روشن فکر جوان سید جمال الدین نے عوام کو شاہ سے بغاوت پر اُکسایا۔ عوام میں شعوری بیداری پیدا کرنے کے بعد سید جمال الدین نے مذہبی قیادت کی

جانب اُمید بھری نگاہوں سے دیکھا اور پھر کسی نہ کسی طرح علماء کی حمایت اور آیت اللہ العظمیٰ سید حسن شیرازی کے فتوے کے حصول کے بعد عوام میں بغاوت کی ایک خوفناک کیفیت پیدا کر دی۔ یہ بات ثابت ہو گئی کہ ایران میں کسی بھی سیاسی تحریک کی کامیابی کے لیے علماء کی حمایت بہت ضروری ہے۔ ہر چند کہ حضرت حسن شیرازی کے فتوے کے بارے میں بہت سی متضاد آراء ہیں کہ وہ جعلی تھا یا اصلی' مگر اس فتوے کا اثر شاہی محل کی خواتین تک ہوا۔

سید جمال الدین اسد آبادی جلاوطن ہوئے اور ایران سے نکال دیے گئے۔ وہ ہندوستان بھی آئے' جہاں وہ جمال الدین افغانی کے نام سے مشہور ہوئے۔ پھر وہ ترکی' مصر اور دیگر ممالک سے ہوتے ہوئے برطانیہ چلے گئے۔ سید جمال الدین اسد آبادی کے ایک مرید رضا کرمانی نے ناصر الدین شاہ قاچار (بادشاہ ایران) کو انیسویں صدی کے آخر میں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ پارلیمنٹ میں آزادیٔ اظہار اور انسانی حقوق کی جدوجہد چلی اور پھر ۱۹۰۶ء میں ایران کا آئین منظور ہوا جس کی رو سے شاہ کے اختیارات محدود کر دیے گئے' ملک کو اسلامی مملکت قرار دے دیا گیا اور عوام کو مذہب کے دائرۂ کار میں حقوق عطا ہو گئے۔ جمال الدین کی شخصیت' ان کے رفقاء اور دیگر انقلابی افراد نے اسلام کا درس دیا' وہ تشیع کی آڑ میں آگے نہیں آئے' بلکہ وہ ہمیں ہر لحاظ سے فرقہ واریت سے آزاد نظر آتے ہیں۔ یہ آئین اس حد تک اسلامی تھا کہ شاہ کے آخری ایام میں اور امام خمینی کی جلاوطنی کے دور کے سب سے اہم مذہبی رہنما آیت اللہ حاجی کاظم شریعت مدار اسی آئین کی بحالی کا مطالبہ کر رہے تھے۔

لیکن یہ آئین شہنشاہِ وقت اور استبدادی استعماری قوتوں کے لیے قابلِ قبول نہیں تھا۔ شاہی فوج اور عوام آپس میں دست و گریبان ہو گئے۔ محمد علی شاہ قاچار کو ایران سے جلاوطن کر دیا گیا' مگر وہ روسی توپخانے کی مدد سے کرنل لیا خوف کی ہمراہی میں تہران میں آن دھمکا اور پارلیمنٹ پر بمباری کروادی۔ ایک بار پھر شاہ کو نکال باہر کیا گیا اور اس کے نابالغ بیٹے احمد شاہ قاچار کو علامتی طور پر بادشاہ تسلیم کر لیا گیا' مگر طاقت عوام کے ہاتھ

آ گئی، لیکن شاہی نظام سے باہر مؤثر انفراسٹرکچر کی عدم موجودگی نے ہندوستان کے مغلیہ دور کے آخری ایام کی طوائف الملوکی اور بدامنی کی صورت پیدا کر دی۔ ایران کے جنوب اور مشرق میں انگریزوں کا تسلط قائم ہو گیا' ہر چند کہ انہوں نے باقاعدہ حکومت کا اعلان نہیں کیا' اور شمال میں روس نے اپنا اثر و رسوخ قائم کر لیا۔ انقلاب روس کے حالات کے باعث شمال میں ایران نے قدرے سکون کا سانس لیا۔ وہاں مرزا کوچک کی سربراہی میں گیلان اور مازندران کے صوبوں میں طالبان طرز کی سیدھی سادی اسلامی حکومت قائم ہو گئی۔ یہ لوگ انتہائی مخلص' دیندار اور بے لوث تھے۔ یہ لوگ جنگل میں اپنا دائرۂ کار وسیع کرتے چلے گئے۔ بالشویک روس نے انقلاب کے بعد انہیں اپنے ساتھ ملانا چاہا اور مرزا کوچک کی حکومت کو سوویت جمہوریہ کے طور پر یونین میں شامل کرنے کی دعوت دی' جو ٹھکرا دی گئی۔ سوویت یونین کے جنوبی مسلمان خطہ کے قریب ایک اسلامی حکومت کا قیام روس کے لیے کافی پریشانی کا باعث بنا اور روسیوں نے ان کے خلاف کارروائی شروع کر دی۔ جنوب میں انگریزوں نے کرنل رضا خان کی حکومت کو مضبوط بنایا اور اس کو مرزا کوچک کی سرکوبی کے لیے مدد فراہم کی۔ انگریزی فوج میں موجود مسلمان لوگ جن کا تعلق ان علاقوں سے تھا جو اب پاکستان میں شامل ہیں' برطانوی فوج سے بھاگ کر بڑی تعداد میں ان سادہ لوح مسلمانوں کے حسنِ اخلاق اور کردار سے متاثر ہو کر مرزا کوچک کے گروہ میں شامل ہو گئے' مگر مرزا کوچک کی حکومت کے خاتمے کے بعد یہ لوگ پکڑے گئے اور بغداد میں پھانسی پر لٹکا دیے گئے۔

کرنل رضا خان نے مصطفیٰ کمال پاشا کی طرز پر ایران میں بادشاہت کی بساط لپیٹ کر صدر جمہوریہ بننا چاہا' مگر علماءِ قُم کا خیال تھا کہ کہیں ترکی کی طرز پر یہ شخص ایک سیکولر حکومت قائم نہ کر دے' اس سے خائف ہو کر انہوں نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ خود ایران کا بادشاہ بن جائے۔ کیونکہ روایتی طور پر ایران کا بادشاہ مذہب کا محافظ خیال کیا جاتا تھا اور صفوی عہد کے بعد بادشاہ کی حیثیت امام غائب کے نمائندہ کی سی سمجھی جاتی تھی۔ ابھی تک علماء کے پاس وسیع و عریض جاگیریں اور سرکاری مراعات موجود تھیں'

اس لیے انہوں نے بادشاہ سے ہر طرح کا تعاون کیا۔ یہ شخص رضا شاہ کے نام پر ۱۹۲۵ء میں ایران کا بادشاہ بن گیا اور پھر آہستہ آہستہ اس نے ایران میں انارکی اور طوائف الملوکی کو ختم کر کے ایک مستحکم اور مضبوط مرکزی حکومت قائم کی۔ اس استحکام کی تعریف علامہ اقبال نے بھی فرمائی اور کہا :۔

پہلوی آں وارثِ تختِ قباد ناخنِ او عقدۂ ایراں کشاد
آں کہ بر تقدیرِ مشرق قادر است عزم و حزمِ پہلوی و نادر است

یعنی رضا شاہ پہلوی نے تخت قباد (ایران کا قبل از اسلام کے ساسانی دور کا بادشاہ جو نوشیروان کا باپ تھا) کے وارث کے طور پر ایران کی گتھی کو اپنے ناخن تدبیر سے سلجھا دیا' اور وہ لوگ جو مشرق کی تقدیر بدل سکتے ہیں وہ رضا شاہ اور افغانستان کے نادر شاہ ہیں۔

لیکن جلد ہی علامہ اقبال حقیقت کی تہہ تک پہنچ گئے اور انہوں نے رضا شاہ پہلوی کے اصل عزائم کو بھانپ لیا' جس نے بتدریج ایران میں مغربی نظام نافذ کرنا چاہا اور اس کے اسلامی تشخص کو مٹانے کا عزم کر لیا۔ اب اسلامی تشخص کو مٹانے کے لیے اس نے قدیم ایرانی تاریخ پر فخر و مباہات کو وسیلہ بنانا چاہا۔ علامہ اقبال نے فرمایا: ۔

مری نوا سے گریبانِ لالہ چاک ہوا
نسیمِ صبح چمن کی تلاش میں ہے ابھی!
نہ مصطفیٰ نہ رضا شاہ میں نمود اس کی
کہ روحِ شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی!
مری خودی بھی سزا کی ہے مستحق لیکن
زمانہ دار و رسن کی تلاش میں ہے ابھی!

علاوہ بریں ''جاوید نامہ'' میں تو آپ نے اس صورت حال کی انتہائی دلکش پیرائے میں وضاحت کر دی۔ جب آسمان پر آپ کی ملاقات نادر شاہ افشار سے ہوتی ہے اور وہ آپ سے ایران کی موجودہ صورت حال کے بارے میں پوچھتا ہے تو آپ ان الفاظ میں جواب دیتے ہیں :۔

بعد مدت چشم خود بر خود کشاد   لیکن اندر حلقۂ دامے فتاد
کشتۂ نازِ بتانِ شوخ و شنگ   خالقِ تہذیب و تقلیدِ فرنگ
کارِ آں وارفتۂ ملک و نسب   ذکرِ شاپور است و تحقیرِ عرب
روزگارِ اُو تہی از واردات   از قبورِ کہنہ می جوید حیات
با وطن پیوست و از خود درگذشت   دل بہ رستم داد و از حیدر گذشت
نقشِ باطل می پذیرد از فرنگ   سرگذشتِ خود بگیرد از فرنگ

یعنی ایک طویل زمانہ گزرنے کے بعد اس میں بیداری کی لہر اٹھی تھی لیکن وہ ایک اور دام میں الجھ کر رہ گیا ہے۔ وہ سرزمین جو ایک عظیم تہذیب و تمدن کا گہوارہ تھی' آج شوخ و خوبصورت چہروں کے سحر میں مبتلا ہو کر اہل مغرب کی تقلید کرنے لگی ہے۔ ایک بار پھر وہ وطنیت اور حسب و نسب پر فخر میں مبتلا ہو کر شاہ پور ساسانی (عربوں کے دشمن ایرانی بادشاہ) کا ذکر کر کے عربوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھ رہی ہے۔ وہ نئے دور کے تقاضوں سے بے خبر ہے اور قدیم زمانے کے کھنڈرات اور قبروں میں زندگی کو تلاش کر رہی ہے۔ وطنیت کے نشے میں مست ہو کر وہ اپنے (اسلامی) تشخص سے ہاتھ دھو رہی ہے (اور یوں لگتا ہے جیسے) رستم (وسہراب) کی داستانوں کے طلسم میں مبتلا ہو کر حضرت علی ؓ کا دامن چھوڑ رہی ہے۔ الغرض ہر قسم کے باطل نظریات وہ اہل مغرب کے ہاں سے درآمد کر رہی ہے اور اپنی تقدیر کے اوراق (سرگذشت) بھی اہل مغرب سے حاصل کر رہی ہے۔

اس سے زیادہ دلکش پیرائے میں اس دَور کی تصویر کھینچی ہی نہیں جا سکتی تھی۔ مایوسی کے اس دَور میں علامہ اقبال کو وہاں کے مستقبل کے جھروکوں سے اُمید کی ایک روشن کرن نظر آ رہی تھی۔ وہ تہران کے اہل مشرق کا جنیوا بننے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ وہ اس بے آب و گیاہ سرزمین کے پُرنم ہو کر زرخیز ہونے کا انتظار فرما رہے تھے اور تبریز سے کسی رومی کے ظہور کے منتظر تھے۔ آپ کو فکری' تہذیبی اور تاریخی ورثے کی حامل اس قوم سے نہ صرف مستقبل کی قیادت کی توقع تھی' بلکہ وہ خود کو اور وادیٔ سندھ کے مسلمانوں کو اسی عظیم تہذیب و تمدن کا جزو قرار دے رہے تھے اور ایران کے نوجوانوں

کو پیام دے رہے تھے کہ: ؎

حلقہ گردِ من زنداے پیکرانِ آب وگل　　آتشے در سینہ دارم از نیاگانِ شما!

(اے ایران کے نوجوانو! اے کچی مٹی اور پانی سے بنے ہوئے کچے مجسموں جیسے لوگو! آپ میرے اردگرد اس لیے جمع ہو جاؤ کہ میرے سینے میں آپ کے آباء واجداد کی لگائی ہوئی آگ جل رہی ہے جس کی تمازت سے تم پک کر مضبوط، مستحکم اور پختہ ہو جاؤ گے۔)

رضا شاہ پہلوی کا عہد جاری تھا کہ ایران دوسری جنگِ عظیم کے ہولناک اور مہیب سائے میں گھر کر رہ گیا۔ روس، امریکہ اور برطانیہ نے اس پر اس لیے قبضہ کرلیا کہ کہیں جرمنی کا آریائی استعمار اُس پر اُن سے پہلے قابض نہ ہو جائے۔ رضا شاہ کو اتحادی طاقتوں کی مخالفت کی پاداش میں جنوبی افریقہ کے شہر جوہانسبرگ میں جلاوطن کر دیا گیا اور اس کے اٹھارہ برس کے بیٹے محمد رضا شاہ کو حکومت کا علامتی سربراہ بنا کر ملک کی عنانِ اقتدار قابض قوتوں نے اپنے ہاتھوں میں لے لی۔ ایران میں اب پھر سے ہر سو مایوسی کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ یہ وہی دور تھا جب مسلمانانِ ہند ۱۹۴۰ء کی قراردادِ لاہور پاس کر کے اپنے ایک علیحدہ اسلامی تشخص کے لیے سرگرمِ عمل تھے۔ اس پورے خطے کے مسلمان مایوسی سے نکل کر تحرک اور سعی وعمل کے لیے تیار ہو چکے تھے۔ بیداری کی ایک لہر موجود تھی اور اس لہر کے پس منظر میں حضرت علامہ اقبال کے فکر کی گہری چھاپ تھی۔ ایران کے لیے بھی ایک ہی راستہ تھا، یا چناں کن یا چنیں والا معاملہ تھا۔ اب بحث وہیں پر جا پہنچی تھی جہاں اسلام کے ہاتھوں ایران کی فتح کے موقع پر تھی۔ یا اسے ساسانی (قبل اسلام کے) تشخص کی جانب واپس لوٹ جانا تھا یا اسلام کو دل وجان سے قبول کرنا تھا۔ عام لوگوں کے دل اب بھی اپنے مذہب اسلام کی محبت سے سرشار تھے، ہاں فکرِ عجم ان کے افکار وعقائد میں پوری طرح موجزن تھا، مگر فکرِ عجم مذہب اسلام کے بنیادی اصولوں سے متصادم نہیں بلکہ ان میں غوطہ زن تھا، تاہم اندازِ فکر اور عمل میں کچھ خامیاں بھی موجود تھیں جو قابل اصلاح تھیں اور ان کو دین کا جزو نہیں بلکہ کلچر اور ذہنی کیفیت (psyche) کا حصہ سمجھا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر ایران میں عیدین سے بھی زیادہ اہم تہوار نوروز کا تھا

جسے مذہبی حلقے بھی پورے طمطراق سے منایا کرتے۔ یہ دن جمشید بادشاہ (اساطیری عہد کے) کی فتوحات کے بعد وطن واپس لوٹنے کی خوشی میں منایا جاتا تھا۔ یہ دن برصغیر میں بھی اورنگ زیب عالمگیر کے عہد سے پہلے پوری شان وشوکت سے منایا جاتا تھا۔ اس طرح یہ عید وہاں کے لوگوں کی نفسیات میں پختہ ہو چکی ہے۔ افغانستان اور تاجکستان کا بھی یہی حال ہے۔ انقلاب کے بعد بھی ایران میں یہ جشن سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے اور رہے گا۔ اسی طرح وہاں کا فن پہلوانی ہے' پھولوں کے ساتھ لگاؤ ہے' باغ کی سیر ہے جسے گلگشت کا نام دیا جاتا ہے' شعروسخن ہے' گھروں میں قالین اور سماوار کا استعمال ہے۔ یہ تمام اجزاء وہاں کے فرہنگ (culture) کا حصہ ہیں اور جب تک دین کے بنیادی اصولوں سے متصادم نہیں ہیں ان کے وہاں پر رائج رہنے میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔

لیکن جب مغربی قوتوں کی سرپرستی میں ایران میں جاہلیت کی وطنیت پرستی اور ملّی حمیت کو دوبارہ زندہ کر کے تاریخ کے اس مرحلے پر لا کھڑا کر دیا گیا جہاں وہ اپنے زردشتی تشخص کو قائم رکھنے کے لیے صحابہ کے لشکر سے برسرپیکار تھے' تو صورت حال سنگین ہو گئی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا گویا یزدگرد کا زمانہ پھر سے واپس آ گیا ہو اور عہدِ اسلامی کے تمام مذہبی' فکری اور عملی ورثے اس سرزمین پر ایک بوجھ محسوس ہو رہے ہوں۔ مغربی استعمار کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایران میں خواتین کو اُن کی مرضی کے خلاف زبردستی بے پردہ کر دیا گیا' عریانی کو عام کر دیا گیا' مغربی تہذیب اپنانے کی ترغیب دی گئی' شراب عام ہوگئی' عیش وعشرت کے اسباب مہیا کر دیے گئے' عورت کو جنسی تسکین کا ذریعہ بنا لیا گیا' عشرت کدے کھل گئے' مخلوط تعلیم اور مخلوط محافل کی حوصلہ افزائی کی گئی' رقص و سرود عام ہو گئے۔ یہ سب کچھ ایران کی ذہنیت (psyche) کا عکاس نہیں تھا' یہ تو شیطانِ بزرگ کے وہ وسوسے تھے جو اَب آہستہ آہستہ عملی صورت اختیار کر چکے تھے۔

اس اہم موقع پر حضرت علامہ اقبال کے افکار واشعار ایران پہنچے تو انہوں نے اپنا طلسماتی اثر دکھانا شروع کر دیا۔ پھر اقبال کی پیروی میں بہار' سرمد' محمد حسین خطیبی اور احمد سروش نے لکھا اور پھر ڈاکٹر علی شریعتی کی قدآور شخصیت اُبھری۔ یہ تمام لوگ دانشور تو

تھے مگر روایتی علماء نہیں تھے۔ ڈاکٹر شریعتی ہر چند کہ عظیم مذہبی فلسفی تھے' مگر ان کا تعلق بھی علماء کے نظام (hierarchy) سے نہیں تھا۔ کچھ عرصہ تک تو علماء نے بھی شاہی نظام کو تحفظ فراہم کیا' مگر ۱۹۶۰ء کی دہائی میں صورت حال نا قابل برداشت ہوگئی اور آیت اللہ العظمیٰ روح اللہ خمینی نے استبداد سے ٹکرانے کا عزم کر لیا۔ اب ایک بار پھر روشن فکر مفکرین کی آزادی کی تحریک میں علماء کی حمایت کا عنصر نہ صرف شامل ہو گیا بلکہ قیادت علماء کو منتقل ہوگئی۔ ہر چند کہ حضرت آیت اللہ خمینی ایک روایتی عالم دین تھے اور ان کی تربیت بھی خالصتاً اسی نظام میں ہوئی تھی' مگر آپ نے شاہی استبداد کے مقابلہ' جلاوطنی اور غریب الدیاری کے عہد میں اگر کوئی بات کی تو اسلام کے احیاء اور ایران کو خالصتاً اسلامی تشخص دلانے کی ہی کی۔ ہر چند کہ ابتدائی زمانہ کے ان کے افکار اور تحریر کچھ بھی ہوں مگر اس تمام تر دَور میں آپ نے کوئی ایسی بات نہیں کی جس پر تشیع کا احتمال ہوتا ہو۔ آپ کی عدم موجودگی میں ایران میں حضرت آیت اللہ محمود طالقانی' آیتّ اللہ شریعت مدار اور دیگر علماء کی کاوشیں بھی قابل ستائش رہیں اور تمام تر امریکی حمایت اور مضبوط فوج اور انٹیلی جنس کی موجودگی شاہی نظام کو نہ بچا سکی اور ایک بار پھر ''هَلَكَ كِسْرىٰ فَلَا كِسْرىٰ بَعْدَهٗ'' کی نبوی پیشین گوئی حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی' شاہی استبدادی نظام کا خاتمہ ہو گیا اور ایران میں اسلامی انقلاب برپا ہو گیا' بقول اقبال: ؎

باز زندہ کن تو آن رسمے کہ از تاثیرِ وے   بوریائے رہ نشینے سرزند با تختِ کے

(پھر اس رسم کو زندہ کر دو جس کی تاثیر سے ایک درویش کا بوریا تخت کیان سے ٹکرا جائے۔)

ہم ان تفصیلات کو چھوڑتے ہوئے مزید آگے بڑھتے ہیں اور یہ بات ذہن نشین کرواتے ہیں کہ ایران میں جب کوئی تحریک کامیابی سے ہمکنار ہوئی تو اس کی قیادت مخلص علماء کے ہاتھوں میں رہی جن کا کردار کسی بھی شک وشبہ سے بالاتر تھا' مگر انڈونیشیا' مصر' ترکی اور برصغیر میں قیادت نسبتاً مغرب زدہ لوگوں کے ہاتھوں میں رہی۔ یہ دراصل عوام کا انتخاب تھا اور سنی اکثریت کے مسلمان ممالک کے عوام کی نفسیات میں کچھ نہ کچھ

شک وشبہ یا وسوسہ ضرور موجود تھا' جو انہیں علماء سے الگ تھلگ رکھے ہوئے تھا یا پھر اعتماد کا فقدان تھا۔ برصغیر میں اہم مذہبی تحریکوں کو عوام کی حمایت لازماً حاصل رہی ہے' مگر آزادی کے بعد اِن کا کردار کافی حد تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ اگر ہم برصغیر میں ایک اور پہلو کو بھی اجاگر کریں تو وہ سرسیدی طبقے کی روشن فکر تحریک کا ہے۔ یہ رام پور کے صدر الصدور (قاضی القضات) ہی تھے جن کا نام تھا سید احمد خان۔ آپ نے آئین اکبری (ابوالفضل علامی کی فارسی کتاب) کی تدوین فرمائی تھی۔ یہ کتاب فکر عجم کا ایک نادر نمونہ تھی جسے شاہ ایران (محمد رضا شاہ) کے زمانہ میں فرہنگستان کے ادارے میں ایک نمونے (gold standard) کے طور پر سامنے رکھتے ہوئے صحیح فارسی تحریر و فکر کے احیاء کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ سید احمد خان نے اس کا تدوین شدہ نسخہ مرزا اسداللہ خان غالب کے پاس بھجوادیا جو کہ ایک عظیم فارسی شاعر تھے اور ان کے اردو اور فارسی کلام میں فکرِ عجم کے منفی پہلوؤں کے علاوہ بہت کم مواد ملتا ہے۔ مرزا غالب نے سید احمد خان کو اس کا دیباچہ لکھ کر دیا تو یوں کہا: ؎

چشم بکشا اندریں دیر کہن　　گر ز آئیں می رود با ما سخن
شیوہ و اندازِ ایشاں را نگر　　صاحبانِ انگلستان را نگر
گشت آئینِ دگر تقویم پار　　پیش ایں آئیں کہ دارد روزگار

(یعنی اگر ہم سے آئین کی بات کرتے ہو تو اس پرانے جہان میں آنکھ کھول کر دیکھو۔ انگلستان کے لارڈز کو دیکھو اور ان کے شیوہ و انداز کی پیروی کرو۔ ان کے نظام کی صورت میں جو آئین دنیا کو ملا اس کے سامنے تمام آئین ماضی کے کیلنڈر بن چکے ہیں۔)

اور آگے چل کر یوں کہا: ''مردہ پروردن مبارک کار نیست'' یعنی مردوں کا پالنا اچھا کام نہیں ہے۔

پھر سید احمد خان مغربی آئین کو اپنا کر سرسید احمد خان بن گئے۔ آپ نے انگریزی سیکھنے اور اس کی پیروی کو برصغیر کے مسلمانوں کے لیے عام کرنا چاہا۔ ان کو حالی اور

ذکاء اللہ جیسے دردمندوں کی حمایت بھی حاصل ہوگئی اور ایک ایسی تحریک بھی چلی جو عملی اعتبار سے تو مؤثر تھی مگر اس کی فکری بنیاد بہت کمزور تھی اور ظاہری اور وقتی قومی مفادات کی طرف نظر تھی' لیکن اس تحریک نے مسلمانوں میں بیداری کی ایک لہر ضرور دوڑا دی۔ اس بیداری کی لہر کا یہ اثر ہوا کہ لوگ منطقی استدلال کی راہ پر چل نکلے اور اسلام میں موجود فکرِ عجم کے منفی پہلوؤں کے خلاف ایک بغاوت کی کیفیت بھی پیدا ہوگئی۔ دوسری جانب اس آزادی نے قرآن کے مطالب کو احادیث' اقوال اور مفسرین کی کاوشوں سے حاصل کردہ معانی و مطالب سے آزاد کر دیا اور کئی لوگ اس کی تاویل اپنے اپنے آزادانہ انداز میں کرنے لگے اور انہوں نے فکرِ عجم کے منفی اور ظاہری پہلو قرآنی مطالب پر اس قدر حاوی کر دیے کہ شاعرِ مشرق کو کہنا پڑا کہ: ؎

ہے کس کی یہ جرأت کہ مسلمان کو ٹوکے	حریتِ افکار کی نعمت ہے خدا داد
چاہے تو کرے کعبے کو آتش کدۂ پارس	چاہے تو کرے اس میں فرنگی صنم آباد
قرآن کو بازیچۂ تاویل بنا کر	چاہے تو خود اک تازہ شریعت کرے ایجاد!
ہے مملکتِ ہند میں اک طرفہ تماشا	اسلام ہے محبوس' مسلمان ہے آزاد!

اور ایک موقع پر تو یوں کہہ دیا کہ: ؎

احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسر	تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پاژند

اب حضرت علامہ اقبال نے اس فکری خلاء کو محسوس کرتے ہوئے اپنے ردِّ عمل کے طور پر ایک متحرک سوچ کے ذریعے مسلمانانِ ہند کو فکری ورثہ سے مالا مال کرتے ہوئے ان کے لیے ایک نئی جہت کا تعین کر دیا۔ آپ کے افکار کو عملی صورت عطا کرتے ہوئے مسلمانانِ ہند نے قائداعظم کی قیادت میں ایک الگ وطن بھی حاصل کر لیا' مگر قیامِ پاکستان کے بعد فکرِ اقبال کو پس پشت ڈالنا شروع کر دیا اور پھر باہمی اختلافات سامنے آنا بھی شروع ہوگئے' کبھی رنگ و زبان اور قبائل کے تعصب کی صورت میں اور کبھی فرقہ واریت کی صورت میں' جبکہ ان تمام تر فرقوں کی حقیقت ہم واضح کر چکے ہیں کہ یہ مختلف قسم کی اصلاحی تحریکیں تھیں اور شیعہ' سنی' اہل حدیث' سب کے سب کتاب اللہ

اور سنتِ رسولؐ پر متفق تھے اور رہیں گے۔فکرِ عجم کے اثرات نے ان میں اختلافات کی گنجائش ضرور رکھ دی تھی۔ اب فکرِ عجم کے ان منفی پہلوؤں سے پہلوتہی کرتے ہوئے اسلام کی اصل کی جانب لوٹنے کا وقت تھا جسے اقبال نے بڑے خوبصورت پیرائے میں یوں بیان کیا ہے :؎

مرا ساز اگرچہ ستم رسیدۂ زخمہ ہائے عجم رہا
وہ شہیدِ ذوقِ وفا ہوں میں کہ نوا مری عربی رہی

اگر ہم ان تنگ نظرانہ اختلافات سے پہلوتہی کرلیں' اگر افغانستان امن کا گہوارہ بن جائے' اگر تاجکستان میں صورتِ حال معمول پر آ جائے تو یہ وحدت عظیم قوم کی صورت میں ڈھل سکتی ہے جو ﴿وَّاٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِھِمْ﴾ کی مصداق ہے' جس کی وضاحت خود ہادیٔ برحق نے فرمائی تھی۔ یہ اس عظیم خراسان پر پھیلی ہوئی قوم ہے اور اس میں اسلام کی روح کا جلال و جمال جلوہ فگن ہے۔ ایران' پاکستان اور دیگر فارسی علاقے ایک عظیم ورثے کے حامل ہیں جس کی مثال حضرت سلمان فارسی ؓ تھے' جنہیں آنحضور ﷺ نے اہل بیت میں ایک فرد کے طور پر اپنالیا تھا۔ یہ لوگ ثریا سے بھی دین کی حقیقت لے آنے پر قادر ہیں۔ یہ لوگ غزالی' رازی' رومی اور اقبال کے فکری وارث ہیں۔ یہ لوگ نظام کو بدلنے کی استعداد رکھتے ہیں۔ یہ لوگ ''اَسْلِمْ تَسْلِمْ'' کے مصداق ہیں اور اسلام قبول کر کے سلامتی میں داخل ہو چکے ہیں۔ اور وہ لوگ جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کے پیغام کو ردّ کیا تھا وہ جملہ مجوسیوں کے گناہوں سمیت غارت ہو چکے ہیں۔ ان کی جنگی تزویرات کو حضور ﷺ نے اپنایا تھا' ان کے لباس کی تعریف کی تھی' ان کے افراد جب یمن اور بحرین سے حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے تو آپ ﷺ نے انہیں توقیر بخشی تھی۔ یہ وہ قوم ہے جس کے فرد سلمان فارسی ؓ کی بابت اقبال نے کہا تھا:؎

فارغ از اُمّ و اَب و اَعمام باش ہمچو سلماں زادۂ اسلام باش!

یعنی اپنے ماں' باپ اور چچاؤں کے فخر سے نکل کر سلمان فارسی ؓ کی طرح اسلام کے

فرزند بن جاؤ۔ یہ قوم خود کو اسلام کا وارث بنالے اور بقول اقبال: ؎

تو عرب ہو یا عجم ہو ترا لا الٰہ الاّ لغتِ غریب جب تک ترا دل نہ دے گواہی

اور دل کی گواہی بہت ہی اہم مگر مشکل کام ہے۔ بقول اقبال: ؎

فرد از وے صاحبِ جذبِ کلیم ملت از وے وارثِ ملکِ عظیم
رقصِ جاں آموختن کارے بود غیرِ حق را سوختن کارے بود

یعنی دل کے رقص کو اپنا کر غیر اللہ کے علاوہ تمام نقوش کو مٹانا بہت بڑا کام ہے جس سے ایک فرد تو کلیم اللہ کے جذب کا حامل بن جاتا ہے اور قوم ایک بہت بڑے ملک کی وارث بن جاتی ہے۔

یہ قوم فرہاد کی کوشش اور سعی و عمل کی وارث ہے۔ ؎

خرید سکتے ہیں دنیا میں عشرتِ پرویز خدا کی دین ہے سرمایۂ غمِ فرہاد

یہ ذوالقرنین کے ملک کی باسی قوم ہے اور اس پر خدا کے نبی آنحضور ﷺ (اُمّیوں کے علاوہ) مبعوث کیے گئے ہیں۔ یہی فکرِ عجم کا اثاثہ ہیں' تاکہ اس کو اپنا کر اور فکرِ عجم کے منفی پہلوؤں سے پہلوتہی کر کے احیائے دین کا فریضہ ادا کر سکیں' اور بقولِ اقبال: ؎

حرم کے پاس کوئی اعجمی ہے زمزمہ سنج کہ تار تار ہوئے جامہ ہائے احرامی
عجب نہیں کہ مسلماں کو پھر عطا کر دیں شکوہِ سنجر و فقرِ جنیدؒ و بسطامی

اگلے صفحات میں اس امر کی ایک عاجزانہ سی کوشش کی گئی ہے کہ فکرِ عجم کے اہم پہلوؤں کی نشاندہی کی جا سکے۔ حضرتِ علامہ اقبال نے اسی موضوع کو اپنے ڈاکٹریٹ کے لیے منتخب فرمایا تھا اور اسی پر راقم الحروف نے اپنی تمام تر بے بضاعتی کے باوجود خامہ فرسائی کی ہے۔ ممکن ہے کچھ خامیاں بھی ہوں اور کچھ اہم پہلو نظر سے چھپ بھی گئے ہوں۔ قارئین سے گزارش ہے کہ وہ علمی اور تاریخی خامیوں سے اعراض فرماتے ہوئے راقم الحروف کو اس سے آگاہ ضرور فرمائیں۔

عجم کی فکری اساس

سرزمینِ عجم اور اصحابِ ایران کے شعر و ادب کا شغف ناچیز کو تاریخِ علوم کی وادیٔ پرخار میں مائل بہ سفر کرتا رہا ہے۔ اقبالیات کے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے میں نے حضرت علامہ اقبال کے تفکرات کو ایک مخصوص زاویے میں دیکھنے کی کوشش کی ہے جس میں حضرت علامہ اقبال کی ذات کا پرتو واضح نظر آنے لگتا ہے۔ غزالیؒ' رازیؒ' رومیؒ' عطارؒ' سنائیؒ' غزنویؒ' نظیری نیشاپوریؒ' عرفی شیرازیؒ' ابوطالب کلیمؒ' صائب تبریزیؒ' مرزا غالبؒ اور گرامی جالندھریؒ کے اشعار و افکار کا عکس ہر چند حضرت علامہ اقبال کے کلام پر واضح ہے' مگر ہر لحاظ سے آپ کا اسلوب منفرد ہے اور آپ کا شعر برائے شعر نہیں بلکہ کچھ اور ہی ہے اور آپ نے خود فرمایا ہے: ؎

شعر را مقصود اگر آدم گری است
شاعری ہم وارثِ پیغمبری است

(شعر کا مقصد اگر انسانیت کی تعمیر ہے تو شاعری پیغمبری کی وراثت ہے۔)

میں نے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے ایماء پر اپنے خیالات کو قلمبند کرنے اور حضرت علامہ اقبال کے افکار کے وہ پہلو قارئین کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے جو فارسی علوم اور حالاتِ عجم سے طویل چشم پوشی کے نتیجہ میں قارئین کی اکثریت کی نگاہوں سے اوجھل ہو رہے تھے۔ میں نے چونکہ اقبالیات کے ضمن میں ڈاکٹر صاحب سے بہت کچھ سیکھا ہے اس لیے تعمیلِ ارشاد کرتے ہوئے مضامین کے ایک سلسلے کا آغاز کر رہا ہوں جو ممکن ہے غبارِ خاطر کو دُور کر سکے اور قارئین تک حقائق کو پہنچا سکے۔ خداوند تعالیٰ سے دعا ہے کہ ناچیز کو اس کی توفیق عطا کرے' ورنہ بقول عرفانی: ؎

در دلِ تنگم قیامت ہا بپاست
گفت من را طاقتِ گفتن کجاست

(میرے دل کی تنگ وادی میں قیامتیں برپا ہیں۔ جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ سب کچھ کہنے کی ہمت نہیں پا رہا۔)

جو کچھ کہنا چاہتا ہوں اس کا اظہار اس لیے مشکل ہے کہ شاید عوام الناس کے لیے ایسے خیالات سے سمجھوتہ کرنا آسان نہ ہو' کیونکہ ہمارے متداول نظریات ان سے کسی قدر ہم آہنگ نہیں ہیں۔ اور یہ بات ایسی ہے جو کہ ع

بدار تواں گفت بہ منبر نتواں گفت

(تختہ دار پر تو کہی جا سکتی ہے مگر منبر پر نہیں کہی جا سکتی)

اس تمہید کے بعد ہم اصل مقصد کی طرف آتے ہیں۔

ایران یا عجم سے کیا مراد ہے؟

ایران کا لفظ ''آریان'' سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں ''آریاؤں کا وطن''۔ پامیر کی بلند چوٹیوں اور ملحقہ وادیوں میں پھیلے ہوئے آریائی باشندے آج سے پانچ چھ ہزار برس پہلے شکار کھیلتے اور تھوڑے بہت گھریلو جانور پالتے ہوئے اپنی زندگی گزارتے تھے۔ جب اُن کی بڑھتی ہوئی آبادی پر یہ وادیاں اور پہاڑ تنگ ہونے لگے تو وہ جنوب کی سمت بڑھے اور آہستہ آہستہ موجودہ ایران کے صحراؤں' سطحِ مرتفع اور مرغزاروں میں سکونت پذیر ہونے لگے۔ پھر وہ پانیوں کی تلاش میں دجلہ وفرات کی وادیوں میں پھیل گئے۔ انہوں نے اس سرزمین میں اپنی سکونت اختیار کرتے ہوئے کاشتکاری اور دستکاری کو اپنایا اور آہستہ آہستہ دیہات' قصبات اور شہروں میں مقیم ہوتے چلے گئے۔ اس طرح معاشی استحکام پیدا ہوا اور نظم وضبط کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے دجلہ کے کنارے مدائن کی تہذیب کا آغاز ہوا۔ مرکزِ ایران میں سپاہان (یعنی افواج کا مرکز) آباد ہوا' جو صفاہان اور بعد میں اصفہان کے نام سے مشہور ہوا۔ شہر رے (جہاں اب ماڈرن تہران آباد ہے)' پاسارگاد یا تخت جمشید (جہاں سے کچھ فاصلے پر فارس کا

دارالحکومت شیراز آباد ہے)' طوس (جس کے پاس مشہد شہر ہے) اور تبریز کے مراکز وجود میں آئے۔تہذیب وتمدن کے اس گہوارے میں زرتشت نے اپنے مذہب کی تبلیغ شروع کی۔زرتشت (یا زروشت) کا زمانہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ کے قریب تر تھا۔جغرافیائی اعتبار سے بھی زردشت اور حضرت ابراہیمؑ کی پیدائش کے خطے ایک دوسرے سے چنداں دُور نہیں تھے۔دونوں کی تعلیمات توحید اور خدائے برتر پر ایمان پر مبنی تھیں۔حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی بابل کے شہر (جو فارس یا ایران کے مرکزی شہروں کے قریب ترین تھا) سے ہی ہجرت فرما کر' مصر سے ہوتے ہوئے سرزمینِ فلسطین میں آباد ہوئے تھے اور وہاں سے عربستان کے ریگزاروں سے گزرتے ہوئے مکہ میں خانہ کعبہ کو آباد کر کے واپس چلے گئے تھے۔بعد میں بھی آپؑ کے سفر مکہ کا کم از کم دو بار ثبوت ملتا ہے۔

زرتشت کے مذہب میں سچائی کی تعلیم دی گئی تھی۔ رفتارِ نیک' پندارِ نیک اور گفتارِ نیک (نیک چال چلن' اچھی سوچ اور اچھی بات) پر مذہب کی بنیاد رکھی گئی۔اس مذہب میں خدائے بزرگ و برتر یعنی اھورامزدا کا واضح تصور تھا۔نیکی کی قوتوں کے خالق و مالک (یعنی خدائے خیر) کا نام ''یزدان'' تھا اور اسے ''ایزد'' بھی کہا جاتا تھا۔بدی کی قوتوں کے سردار کو ''اہرمن'' یا ''ہریمن'' کہا جاتا تھا۔نیکی اور برائی کی قوتوں کو ہمیشہ برسرِ پیکار سمجھا جاتا تھا اور زرتشتیوں کے لیے حکم تھا کہ وہ یزدان کی پرستش کریں اور اہرمن کے لشکر (یعنی شیاطین) سے نفرت کریں اور ایسی طاغوتی قوتوں سے جنگ لڑیں۔ روشنی کو یزدان کی صفت سمجھا جاتا تھا اور تاریکی یا ظلمت کو برائی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ خدا یعنی یزدان کو نورِ مجسم اور برائی کو ظلمتِ مجسم تصور کیا جاتا تھا۔بُت پرستی کسی بھی صورت میں قدیم ایرانی مذہب میں مروّج و متداول نہیں تھی۔اس مذہب میں حیات بعد الممات' حشر' جنت اور دوزخ اور اعمال کے حساب حتیٰ کہ پل صراط کا واضح تصور موجود تھا۔

مذہبی کتاب ''اوستا'' کے نام سے موجود تھی' جو اس قدر ضخیم تھی کہ بارہ ہزار گائیوں کی کھالوں پر تحریر کی گئی تھی اور روایات کے مطابق سکندر اعظم نے ۳۲۹ ق م میں اصطخر

(تختِ جمشید) کے مقام پر اس کو جلایا تھا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ زرتشتی مذہب میں شروع شروع میں آتش پرستی یا مظاہر پرستی کا شائبہ تک نہیں تھا۔ آہستہ آہستہ اس میں تحریف کی گئی اور آگ اور سورج کو نور کا منبع اور سرچشمہ سمجھ کر اُن کا احترام کیا جانے لگا اور پھر آتشِ مقدس کی پرستش شروع کر دی گئی۔ اس طرح آتشِ مقدس کے محافظ ''مُغ'' کہلائے اور مغوں کے منظم سلسلوں نے مذہبی پروہتوں کا مقام سنبھال لیا۔ انہی مغوں کو مغس اور پھر مجس کہا گیا اور عربی زبان میں مجوس کی اصطلاح عام ہوئی۔ خدا کو نور قرآن میں بھی کہا گیا ہے: ﴿اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ﴾ (النور:۳۵)۔ اِسی طرح ہدایت کو نور کہا گیا ہے۔ شیاطین اور طاغوتی طاقتوں کے ذکر میں بھی مماثلت ملتی ہے اور پھر نیکی اور بدی کی مسلسل جنگ کو اقبال نے اِن الفاظ میں بیان کیا ہے: ؎

ستیزہ کار رہا ہے اَزل سے تا اِمروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

اور: ؎

موسیٰؑ و فرعون و شبیرؓ و یزید
از حیات ایں ہر دو می آید پدید

بعد میں طاغوتی طاقتوں کو خدائے بدی کا لشکر سمجھ لیا گیا اور اہرمن کو بھی بدی کے خدا کا درجہ دے دیا گیا۔ پھر یہ سمجھ لیا گیا کہ زلزلے اور آفات کا خالق خدائے بدی ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد آتش پرستی کے ساتھ ساتھ توحید کی بجائے ثنویت کا تصور مستحکم ہوتا گیا اور خدائے نیکی اور خدائے بدی (یعنی یزدان و اہرمن) کی خلاّقی اور قدرت پر یقین کیا جانے لگا اور پھر اِن دونوں قوتوں کا اِتصال ایک ذات یعنی ''اہورامزدا'' کی شکل میں کیا گیا۔ مرزا غالب نے اس امر کی نفی ان الفاظ میں کی : ؎

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بُو بھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا

مختصراً یہ کہ یہ مذہب اس علاقے میں خوب پھلا پھولا اور پھر ایرانی افواج کی عظیم

فتوحات کے ساتھ شاہی سرپرستی اور ترغیب سے مفتوح علاقوں کا مذہب بن گیا۔ حتیٰ کہ ٹیکسلا کے قریب جنڈیال کے مقام پر تین سو برس قبلِ مسیح کے زمانہ کے کھنڈرات میں آتش کدوں کے آثار دریافت ہوئے ہیں۔ اس مذہب کی دو عیدیں نوروز (بہار کے آغاز پر) اور مہرگان (سال کے آخر میں) بھی تمام مفتوحہ علاقوں میں رائج ہوئیں۔ اسی طرح ۲۱ دسمبر کی رات کو شب یلدا کہا گیا جب کہ سورج کی از سرِنو پیدائش ہوتی ہے۔ مدینہ منورہ میں نبی اکرم ﷺ کی آمد تک یہ عیدیں منائی جاتی رہیں۔ عیسائیت کی ایسٹر کا دن نوروز کے قریب تر ہے اور شب یلدا کرسمس کا ہی موقع ہے۔ یہی نوروز بیساکھی اور بسنت کی شکل میں کسی نہ کسی طرح رائج رہی ہے اور برصغیر میں عملاً اورنگ زیب عالمگیر کے زمانہ میں اسے ختم کر کے عید الفطر کے جشن کو تقدس بخشا گیا۔ اس سے قبل نوروز کو ہی ترجیح دی جاتی رہی ہے اور اس کا ثبوت شعروادب میں ہر جگہ ملتا ہے۔

اِمتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ یہ مذہب بھی تحریف کی زد میں آ گیا۔ کچھ کہا تو نہیں جا سکتا مگر قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ممکن ہے یہ مذہب الہامی مذہب ہی ہو' مگر تحریف کی وجہ سے اِس قدر بدل گیا ہو کہ اس کی صورت بگڑ گئی ہو۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے مروی ایک روایت کے مطابق ان لوگوں سے اہل کتاب کا سا سلوک کرنے کے لیے کہا گیا ہے ماسوائے اُن کا ذبیحہ کھانے کے اور اُن کی خواتین سے شادی کرنے کے۔

ایک مستحکم ومضبوط معیشت' ایک نسبتاً منظم مذہب اور ایک مہذب تمدن نے آہستہ آہستہ ایک بادشاہت کی صورت اختیار کر لی' مگر یہ بادشاہت کسی اُصول اور آئین پر ہی قائم تھی۔ اس میں بادشاہت کے تحفظ کے لیے شاہی خاندان کو تقدس کا درجہ دیا گیا اور شہنشاہ سے وفاداری کو اس ملک کے عوام کے رگ وریشے میں سمو دیا گیا اور پھر اس کے تحفظ کے لیے ایک فوج کی بنیاد رکھی گئی۔ پھر ایک مربوط ومنظم مواصلات کا نظام وجود میں آیا۔ شعروادب اور آئینِ جہانبانی وجود میں آئے۔ اس طرح وہ عظیم بادشاہت وجود میں آئی جس کی مثال پہلے زمانے میں کبھی نہیں ملتی۔ صدیوں تک بادشاہ کے لفظ سے مراد صرف ایران کا حکمران تھا اور یہ لقب کوئی اور شخص استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ ہخامنشی دور کی

تاریخ کسی حد تک وضاحت کے ساتھ ہم تک پہنچی ہے۔ اس عہد کا سب سے مشہور بادشاہ سائرس یا کوروشِ اعظم گزرا ہے۔ اس بادشاہ نے عدل و انصاف پر مبنی ایک نظام قائم کیا اور اپنی سلطنت کو مشرق و مغرب تک وسعت دی۔ اس بادشاہ کا ذکر انتہائی احترام کے ساتھ بائبل یعنی انجیل میں آیا ہے۔

یہ وہی زمانہ تھا جب یہودیوں کو فلسطین میں شکست دینے کے بعد بیت المقدس کو تباہ و برباد کرتے ہوئے بابل کے بادشاہ بخت نصر نے انہیں غلام بنا کر بابل میں مقید کر رکھا تھا۔ کوروشِ اعظم نے بابل کو زیرِ تصرف لاتے ہوئے یہودیوں کو ۵۳۶ ق م میں آزاد کر دیا تھا' اور پھر اپنے خرچ پر بیت المقدس اور اس کے تمام تر معبدوں کو از سرِ نو تعمیر کروایا تھا۔ اپنے زیرِ انتظام یہودی سلطنت کا احیاء کیا تھا اور پھر عرب کے بیشتر علاقوں پر قبضہ کرتے ہوئے بحیرۂ روم تک رسائی حاصل کر لی تھی' جہاں پر سورج کو اس نے سمندر میں ڈوبتے ہوئے دیکھا تھا۔ راستے میں اسے وحشی قوموں سے پالا بھی پڑا تھا۔ پرانی تصاویر میں کوروش کے سر پر جو آہنی خود نظر آتا ہے اس پر دو سینگ بنے ہوئے ہیں۔ عدل و انصاف اور سچائی کے اس پیکر کو تمام مؤرخین نے اچھے الفاظ میں یاد کیا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے سورۃ الکہف کی تفسیر لکھتے ہوئے خیال ظاہر کیا ہے کہ یہی ہے وہ ذوالقرنین (یعنی دو سینگوں والا) جس کی تعریف قرآن پاک میں کی گئی ہے' کیونکہ قرآن میں بیان کردہ صفات سے یہی بادشاہ متصف نظر آتا ہے اور اس کے نام سے یہود و نصاریٰ پوری طرح باخبر تھے۔

کوروش کے بعد اس سلطنت کے بڑے بڑے بادشاہوں میں داریوشِ اعظم یا دارا اوّل کا ذکر ملتا ہے' جس نے یورپ کی وادیوں میں سے گزرتے ہوئے اس وقت کی سب سے بڑی فوج کے ہمراہ یونان میں ایتھنز تک ۴۸۵ ق م میں فوج کشی کی تھی اور اس کی یلغار سے یورپ میں ارتعاش پیدا ہو گیا تھا۔ قصہ مختصر یہ کہ سکندرِ اعظم کی بڑھتی ہوئی افواج نے شیراز کے قریب نقش رستم کے مقام پر آخری ہخامنشی بادشاہ دارا سوم کو شکست سے دوچار کر کے اس سلطنت کا خاتمہ کر دیا تھا۔

اُس دور کی اہم خصوصیات درج ذیل ہیں:

(ا) ایک عظیم تہذیب وتمدن کا ظہور

(ب) مستحکم بادشاہت کا قیام

(ج) آئین جہانبانی وجہانداری کی تشکیل اور قانون سازی

(د) کوروشِ اعظم اور داریوش جیسے اہم تاریخی حکمران

(ہ) زرتشتی مذہب' مذہبی کتاب اور منظم مذہبی رہنمائی کا وسیع نظام

(و) بادشاہت میں وسعت کے باعث عرب وفلسطین اور یورپ سے آگاہی

(ز) مربوط جنگی نظام اور مسلح افواج کا قیام

(ح) زبان' ادب' شعر' فلسفہ اور فنونِ لطیفہ

(ط) بادشاہت کے مرکزی نقطہ کے طور پر شہنشاہ کی مقدس شخصیت کا تسلیم کیا جانا' خاندانی اور موروثی بادشاہت کا قیام' خاندان کی وفاداری اور نظامِ وراثت

(ی) اشرافیہ کا طبقہ وارانہ نظام اور مختلف پیشوں کا آغاز

(ک) زبان ونسل اور بادشاہت سے وفاداری کی بنیاد پر وطن کا تصور

مندرجہ بالا نکات اس لیے اہمیت کے حامل ہیں کہ آگے چل کر انہی کے اثرات کی روشنی میں ہمیں ایرانی مزاج کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ مثلاً ہمیں عظیم ایرانی تہذیب وتمدن کی برتری کی بنیاد پر عرب وعجم کی چپقلش ایران کے اسلام قبول کرنے کے بعد بھی کسی نہ کسی شکل میں اہلِ عجم کے احساسِ برتری میں نظر آتی ہے۔ مستحکم بادشاہت' شاہ کی ذات کا تقدس اور اس کے لیے وفاداری کا جذبہ بعد کے ہر ملوکانہ نظام میں نہ صرف نظر آتا ہے بلکہ ایران میں مرکزی اسلامی سلطنت سے باہر رہ کر اپنی آزادانہ بادشاہت کا نہ صرف جذبہ نظر آتا ہے بلکہ اس کی وسعت کی خواہش بھی موجزن دکھائی دیتی ہے۔ اسی طرح لسانی اور وطنی تصورات بھی نسبتاً مستحکم نظر آتے ہیں۔ زرتشتی نظریات' مجوسیت اور منظم مذہبی قیادت کے اثرات بھی بعد کے تمام ازمنہ میں دیکھے جاسکتے ہیں اور جنگی یا دفاعی تزویراتی نظام کا تصور ہمیشہ نظر آتا ہے۔ بعد میں ایک وقت آتا ہے جب ہادیٔ برحق

رسول اللہ ﷺ بھی جنگِ خندق سے قبل حضرت سلمان فارسی ؓ سے مدینہ منورہ کے دفاع کے لیے قدیم ایرانی تزویری نظام کی روشنی میں مشورہ طلب فرماتے ہیں۔

اسی طرح تفسیرِ قرآن کے لیے بھی ایران کی اس قدیم تاریخ کا مطالعہ اہمیت اختیار کر جاتا ہے، خصوصاً ذوالقرنین کے ذکر میں اور سورۃ الروم کو سمجھنے میں۔ ایک خاندان کے افراد سے موروثی وفاداری سلطنت سے نکل کر مذہبی حدود میں آ جاتی ہے اور بعد کے زمانوں میں اِمامت کے تصور کو سمجھنے میں اِس سے مدد ملتی ہے۔ اس طرح زبان وشعر وادب میں ایک خوبصورت عجمی رنگ قائم ودائم رہتا ہے۔ اور جب یہی ادب اسلامی صورت اختیار کر لیتا ہے تو پھر رومی وسعدی وعطار وسنائی واقبال کی شعری رفعت فلسفہ وفرہنگِ اسلام کو سمجھنے میں مددگار ہو جاتی ہے۔

ایران کو عجم اس لیے کہا جاتا ہے کہ عرب قبائل ہرچند کہ زیادہ تر متحرک اور خانہ بدوش تھے اور ان میں تہذیب وتمدن کا وہ رنگ دکھائی نہیں دیتا تھا جو ایران کی وادیوں میں نظر آتا تھا، مگر اُن میں کئی ایک شخصی خوبیاں رچی بسی تھیں۔ امتدادِ زمانہ سے دنیا کی ایک مربوط اور فصیح وبلیغ ترین زبان ان کے ہاں موجود تھی، جسے بعد کے فارسی شعراء نے بھی دبے لفظوں میں برتر ہی تسلیم کیا ہے۔ مولانا روم فرماتے ہیں ؎

فارسی گو گرچہ تازی خوشتر است   عشق را خود صد زبانِ دیگر است
بوی آں دلبر چوں پرّاں می شود   ایں، زبان ہا جملہ حیراں می شود

(فارسی میں بات کرو اگرچہ عربی اس سے زیادہ اچھی ہے۔ عشق کی امنگوں کے اظہار کے لیے سینکڑوں اور زبانیں بھی ہیں۔ جب خدا یا محبوبِ حقیقی کی خوشبو پھیل جاتی ہے تو یہ تمام زبانیں گنگ ہو کر رہ جاتی ہیں۔)

عرب کی زبان، قبائلی خصوصیات کا تحفظ، تحرک، مہمان نوازی، علم الرجال اور خاندانی عصبیت نے ہرچند ایک مربوط معاشرے کا قیام عملاً ناممکن بنا دیا تھا، مگر وہ ایک زبان بولتے ہوئے بھی ایک ڈھیلے ڈھالے وفاق (یا کنفیڈریشن) کی صورت میں زندگی گزار رہے تھے۔ آپس کا جدل وقتال بھی اُن کے ہاں عام تھا اور وہ کسی بھی خاص

سلطنت کا مستقل حصہ نہیں تھے' لیکن پھر بھی کبھی کبھار اہلِ ایران ان کے علاقوں میں یلغار کرتے ہوئے آن وارد ہوتے تھے اور ان پر اپنی سلطنت کا مروّجہ نظام اور آئین مسلط کرنے کی کوشش کرتے تھے' مگر آزاد منش عرب پھر بغاوت کر دیتے تھے۔ اس طرح کوئی بھی مستحکم سلطنت عرب میں نہ تو قائم ہو سکی اور نہ ہی ان کی کنفیڈریشن ایک فیڈریشن میں ڈھل سکی۔ ایرانی عربوں کو تازی کہتے تھے اور تازی کا لفظ تاختن یعنی لُوٹنے سے مشتق ہے' اس طرح عربوں کو لٹیرے سمجھا جاتا تھا۔ عرب بھی اہلِ ایران کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے اور یہ کشمکش جاری رہتی تھی۔ عرب جنہیں اپنی زبان اور شعر پر فخر تھا' وہ ایرانیوں کی زبان سمجھ نہ پانے کے باعث انہیں عجمی (گونگے) کہتے تھے۔ شبلی نعمانی کی ضخیم کتاب (جو پانچ جلدوں پر مشتمل ہے) بھی ''شعرالعجم'' کے نام سے موسوم ہے۔ یہ فارسی شعروادب کی ایک مبسوط تاریخ ہے۔ لسانی اختلاف کے باعث عربوں کی نظر میں یہ لوگ عجمی کہلائے اور انہوں نے عجم کے لفظ کو ایک حد تک اپنے لیے قبول کرنے میں عار محسوس نہیں کی۔ آخری حج کے موقع پر آنحضورﷺ نے خصوصاً عرب و عجم کے امتیازات کے خاتمے کا اعلان فرمایا تھا اور یہ برتری ختم کر دی تھی۔ احساسِ برتری اور احساسِ کمتری کا برملا اظہار اس خطبے کے بعد مسلمانوں میں ممنوع قرار پایا۔

ایران کے مرکزی علاقے یعنی شیراز و اصفہان کا خطہ کوہِ زیگروس کے ترائی کے علاقے اور ملحقہ سطح مرتفع ''فارس'' یا ''پارس'' (جسے پرشیا Persia بھی کہا جاتا ہے) اپنی ثقافت' زبان اور سیاسی اثر ورسوخ کے باعث سب سے اہم خطہ تھا اور اسی کی زبان یعنی فارسی (Persian) تمام ایرانی مقبوضات یا زیرِ اثر لوگوں میں مروّج تھی۔ یہ دراصل ہنداروپائی زبانوں کی ایک شاخ تھی جو قدیم پہلوی (آریائی زبان) سے وجود میں آئی تھی اور قدیم سنسکرت سے قریب تر تھی۔ اس کا اپنا قدیم رسم الخط بھی تھا اور سرکاری قوانین اور مذہبی تحریروں میں استعمال ہوتی تھی۔ ایران کے دوسرے صوبے خراسان' گیلان' آذر آبادگان (جس کا معرب آذربائیجان ہے اور یہ اصطلاح زیادہ متداول ہو چکی ہے)' خوزستان' سیستان' بلوچستان' تاجکستان اور مازندران تھے۔

خراسان کا خطہ افغان علاقوں ہرات وغزنی' بلخ و مزار شریف' بدخشاں' زنجیانگ کے ختاوختن اور مالا کنڈ ڈویژن کے علاوہ موجودہ ایران کے خراسان پر مشتمل تھا۔ یہ ایران کا مشرقی صوبہ تھا اور سورج کے طلوع ہونے کی سرزمین سمجھا جاتا تھا۔ اس علاقے سے مولانا روم' حکیم سنائی' فردوسی' طوسی' امام مسلم' جامی' سرخسی' ہجویری' عطار اور عمر خیام جیسی ہستیاں پیدا ہوئی تھیں۔ یہیں پر امام رازی اور غزالی بھی مدفون ہیں۔ یہی خطہ البیرونی اور امام ابوحامد غزالیؒ کا مولد بھی ہے۔ یہ خطہ فکری تحریکوں اور فلسفہ والٰہیات کا مرکز بھی رہا ہے۔ اس کے ایک علاقہ یعنی بامیان پر بدھ مذہب کے پرستار چھائے رہے ہیں۔ بعد میں عباسی خلافت کے خلاف قیام وبغاوت میں ابومسلم خراسانی کا نام آتا ہے۔ وہ بھی اسی خطے کا فرزند تھا۔ مامون الرشید عباسی کے ایماء پر اثنا عشری فرقہ کے آٹھویں امام حضرت امام علی رضاؒ بھی اسی علاقے میں آ گئے تھے اور آپ کے پیروکاروں کے خیال میں زہر خورانی کے باعث طوس کے قریب شہید ہوئے تھے۔ وہ جگہ اب مشہد کہلاتی ہے اور ایرانی خراسان کا مرکزی شہر ہے۔ خراسان کے وہ خطے جو افغانستان' تاجکستان اور چین میں شامل ہیں ان کے لوگوں کی بھی اپنی پہچان ہے۔ پاکستان میں ریاست سوات وہ آخری خطہ تھا جہاں ۱۹۶۸ء تک ریاست کے خاتمے تک فارسی سرکاری زبان کے طور پر تھی۔

فارس کی سرزمین کا بھی اپنا مزاج ہے۔ اس کا موسم' زمینی خدوخال' آب وہوا اور ماحول کا اپنا اثر ہے۔ تہذیب وتمدن کے گہوارے کی حیثیت سے اپنی نزاکت' خوش بیانی اور شعر وادب میں اس کا اپنا مقام ہے۔ جہاں ہمیں حافظ شیرازی جیسے غزل گو نظر آتے ہیں وہاں سعدی شیرازی جیسے معلمِ اخلاق و کردار بھی نظر آتے ہیں۔ جہاں اس کے ہزاروں سال قدیم کھنڈرات ہمیں پرسی پولیس (یا پاسارگاد) کے تختِ جمشید اور داریوش کے دخمہ یعنی نقشِ رستم کی صورت میں نظر آتے ہیں وہاں ہمیں صدیاں گزرنے کے باوجود تہذیب وتمدن خود بولتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ بقول عرفانی:۔

شعر و نغمہ می تراود ہر زماں
از فرازِ عرش بر شیرازیاں

(ہر لحہ عرش کی بلندیوں سے شعر اور نغمے شیراز کے لوگوں پہ بارش کے قطرات کی طرح ٹپکتے رہتے ہیں۔)

علاوہ بریں اس سرزمین کے لوگوں میں ہمیشہ سے اپنی سلطنت کی مسلسل وسعت کا جذبہ کارفرما رہا ہے اور اپنے قدیم تمدن پر فخر و مباہات کے علاوہ اپنی روایات سے وابستگی ان کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ صدیوں تک وسیع دنیا کے کاروبارِ حیات چلانے کے باعث انہیں انتظامی تجربہ حاصل رہا ہے' بلکہ اپنے زورِ بازو پر اعتماد نے انہیں حالات سے نبرد آزما رہنے کا گر سکھا دیا ہے۔ تحقیق و تفحص کا یہ عالم ہے کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ اگر میرا کوئی قول چاند کی بلندیوں پر بھی پہنچ جائے تو اہلِ فارس میں سے ایک شخص اسے وہاں سے بھی ڈھونڈ لائے گا۔ فارس کا خطہ زمانۂ قدیم میں دجلہ کے کناروں تک پھیلا ہوا تھا۔ حیرہ کے قدیم قصبے کے قریب کوفہ کی جو بستی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں افواج کے قیام کے لیے بنائی گئی تھی وہ بھی فارس کے آخری کونے میں تھی۔ یہاں پر حضرت علی رضی اللہ عنہ' حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ' حضرت حماد بن سلیمانؒ اور حضرت ابراہیم نخعیؒ کی کاوشوں سے ایک علمی اور فقہی فضا پیدا ہو چکی تھی۔ یہ جگہ بعد میں فقہ کی تدوین کا مرکز بن گئی۔ ایران کے آئین و قانون سے دلچسپی کا ذکر ہو چکا ہے اس لیے قانون سازی کے لیے یہ جگہ عرب و فارس کا سنگم بن گئی اور امام ابوحنیفہؒ جیسے عظیم ایرانی فرزند نے اسے نئی جہت عطا کی۔

سکندرِ اعظم کا حملہ اور ہخامنشی سلطنت کا انقراض

ہخامنشی دَور میں ایرانی بادشاہت عراق' شام' فلسطین' ایشیائے کوچک' عرب کے کچھ دیگر حصوں' قفقاز' وسطی ایشیا' موجودہ پاکستان' کشمیر اور شمالی ہندوستان تک پھیل چکی تھی۔ بھارت کے صوبہ گجرات پر ایرانی عملداری قائم ہو چکی تھی اور وہاں کے مقامی حکمران کو ہنرمن (ہنرمند) کہا جاتا تھا۔ بحیرۂ روم کے پانیوں سے لے کر بحیرۂ خزر یعنی کیسپین کی لہروں تک' خلیج فارس سے بحیرۂ احمر تک اور وادیٔ سندھ تک ایک وسیع ایرانی بادشاہت کے پھریرے اُڑ رہے تھے۔ اسی دوران مختلف اَدوار میں آریاؤں کے تازہ

لشکر پامیر کی چوٹیوں سے اتر کر درۂ خیبر کے راستے سرزمین پاک و ہند میں بھی داخل ہو رہے تھے اور اُن کا رُخ شمالی اور وسطی ہند کی جانب تھا۔ یہ لوگ رفتہ رفتہ مقامی آبادی کو پامال کرتے ہوئے یا جنوب اور مشرق کی سمت دھکیلتے ہوئے آباد ہوتے چلے گئے۔ آریائی باشندوں نے یہاں پر مقامی آبادی پر برتری کے اظہار کے لیے برہمنیت کا مقدس لبادہ اوڑھ لیا۔ وہ یہاں پر قدیم فارسی سے ملتی جلتی زبان سنسکرت' مظاہر پرستی' خاص قسم کے ساز اور نسلی تفوّق کی خصوصیات لائے تھے۔ اپنی نسل کو مقامی امتزاج سے بچانے کے لیے انہوں نے خود کو ازدواجی' سماجی' لسانی اور تمدنی اعتبار سے بالکل الگ تھلگ کیے رکھا۔

عظیم ایرانی سلطنت کی وسعت اس کے لیے بجائے خود ایک مسئلہ بن گئی۔ بحیرۂ روم اور ایتھنز میں ان کے بحری بیڑے اور یورپ میں منتشر لشکر باہمی رابطہ قائم رکھنے میں ناکام ہو گئے۔ اہلِ فارس کے لشکر ملک کے طول و عرض میں بکھر کر رہ گئے۔ مرکزیت کا استحکام کمزور ہوتا گیا۔ اسی دوران یونان کی ریاست مقدونیہ کا جواں سال حکمران سکندرِ اعظم اس سلطنت پر چڑھ دوڑا اور پھر آناً فاناً ۳۲۹ ق م سے ۳۲۷ ق م تک اس وسیع مملکت پر قابض ہو گیا۔ فارس کے مرکز میں داریوش سوم کی شکست عبرت کا وہ نشان تھی جسے ایرانی قوم فراموش کرنے کی کوشش میں صدیوں تک مگن رہی۔ بقول حافظ شیرازی :۔

ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم

از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس!

(ہم نے سکندر اور دارا کی کہانی نہیں پڑھی ہے۔ ہم سے محبت اور وفاداری کی حکایت کے علاوہ کچھ نہ پوچھئے!)

تھوڑے ہی عرصہ میں ایک ابھرتی ہوئی جواں سال یونانی قوت کے ہاتھوں ایک عظیم قوت کا سرنگوں ہو جانا ایک عظیم المیہ تھا جس سے مشرق اُس زمانے میں دوچار ہوا۔ سکندر اپنی واپسی پر بابل میں جوانی کے عالم میں عالمِ بالا کا راہی ہوا اور اس کے لشکری

مفتوحہ علاقوں پر اپنی اپنی حکومت قائم کر کے بیٹھ گئے اور مختلف صوبے یونانی حکمرانوں (سلوکیوں) میں بٹ کر رہ گئے' اور ایران کی مرکزیت کا نام ونشان مٹ گیا۔

ایک اہم نکتہ جو یہاں قابلِ ذکر ہے' وہ یہ ہے کہ یونانی عقائد' توہمات اور دیومالائی مذہب اس خطے میں بھی زیادہ عرصہ کے لیے رائج نہ ہوسکا۔ زرتشتی مذہب اس وجہ سے یہاں قائم ودائم رہا کہ مذہبی پروہتوں کا مربوط نظام جو پہلے سے موجود تھا' وہ قائم ودائم رہا۔ یہ نظام اس قدر منظم اور درجہ بدرجہ قائم تھا کہ عوام سے لے کر اعلیٰ مذہبی قیادت تک ہر ایک زنجیر کی طرح آپس میں منسلک تھا۔ ہر چند کہ مذہب اور حکومت کے ادارے جدا جدا ہو گئے تھے مگر عوام الناس نے اپنی مذہبی وفاداری قائم رکھی۔ اسی مذہبی نظام نے وطنیت اور قومیت کے ایرانی اثرات کو زائل نہیں ہونے دیا۔ ان کی زبان' ثقافت' تمدن اور معاشرتی حالات کافی حد تک یونانی اثرات سے محفوظ رہے۔

اس پس منظر میں غیر ملکی تسلط سے آزادی' مرکزیت کی آرزو اور اپنی بادشاہت کا از سرِ نو قیام نسل در نسل ایرانیوں کے دلوں میں موجزن رہا۔ غلامی کے اس دَور میں ایرانیت کا شعور کمزور ہونے کی بجائے اور مضبوط ہوتا چلا گیا۔ قدیم شاہی خاندان کے افراد زیرِ زمین تو چلے گئے مگر اُن سے وفاداریاں عوام کے دلوں سے محو نہ ہوسکیں۔ ایران کے اس طرح مٹ جانے کی طرف علامہ اقبال نے یوں اشارہ کیا ہے: ؎

آ دبایا مہرِ ایراں کو اجل کی شام نے
عظمتِ یونان و روما لوٹ لی ایام نے

لیکن جس طرح ایرانیت کا جذبہ زیرِ زمین زندہ رہا اس کی جانب اس طرح اشارہ فرمایا: ؎

تُو نہ مٹ جائے گا ایران کے مٹ جانے سے
نشۂ مے کو تعلق نہیں پیمانے سے

یہ وہی زمانہ تھا جب ہندوستان کا برہمن بدھ مذہب کے افکار سے فکری طور پر برسرِ پیکار تھا اور ایک وقت ایسا بھی آیا جب بدھ حکمرانوں کے اقتدار کے باعث بدھ مت کے اثرات اس قدر غالب آ چکے تھے کہ بظاہر ہندومت کا خاتمہ ہوا چاہتا تھا'

مگر برہمن کی کوششیں بارآور ثابت ہوئیں اور بدھ مذہب ہندوستان سے نکال باہر کیا گیا۔ اس مذہب کے آثار خراسان میں گہرے ہو گئے اور بلخ نو بہار کا بدھ مذہب کا معبد طلوعِ اسلام کے بعد تک قائم رہا۔ یہیں کے آتش کدے کے پروہت برامکہ کہلاتے تھے اور ان کے گہرے اثرات ہارون الرشید عباسی کے عہدِ حکومت میں مرتب ہوئے۔ بدھ مت کے افکار نے خراسان کے خطے میں ترکِ دنیا اور رہبانیت کو فروغ بخشا۔ یہی اثرات بعد میں مسلمانوں کے تصوف میں بھی پائے گئے۔ برامکہ کے اقتدار سے عباسی خلافت میں گہرے عجمی، غیر اسلامی عقائد اسلام میں در آئے۔ کچھ مخلص مسلمان دانشوروں کی کوششوں سے بالآخر برامکہ اپنے عبرت ناک انجام کو پہنچے۔ الغرض بدھ مت خراسان اور وسطی ایشیاء کے راستے چین اور تبت میں وارد ہوا، اور ہندوستان کی سرزمین کے گرداگرد چین، مشرق بعید اور ہندوستان کے جنوب میں سری لنکا تک جا پہنچا، مگر اپنے مولد و منشاء یعنی برصغیر سے یہ مذہب مکمل طور پر ختم ہو گیا۔ خراسان کے اثرات کے باعث وادیٔ سوات کے کھنڈرات میں آج بھی بدھ مت کے آثار دیکھے جا سکتے ہیں اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ پاک و ہند کے خطے سے بدھ مذہب تو مٹ گیا مگر مالاکنڈ ڈویژن کے علاقہ میں یہ مذہب کافی عرصہ قائم و دائم رہا۔

یہی وہ زمانہ تھا جب اہلِ ایران کے ہاتھوں دوبارہ قائم شدہ فلسطینی یہودی ریاست رومیوں کے تطاول کا شکار ہو چکی تھی۔ رومیوں نے بحیرۂ روم کے اردگرد کے تمام علاقوں پر اپنا اقتدار قائم کر لیا تھا اور ابراہیمی ادیان تحریف کا شکار ہو کر رومیوں کے دباؤ میں آ کر علماء بنی اسرائیل کی خود غرضی کی بھینٹ چڑھ چکے تھے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب سرزمین فلسطین سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ظہور ہوا۔ حضرت عیسیٰؑ بنی اسرائیل کو سچائی اور نیکی کی تلقین کرتے تھے۔ آپؑ بنی اسرائیل کی گم شدہ بھیڑوں کو گلے سے ملاتے رہے اور رومیوں کو خبردار کرتے رہے کہ ظلم و ستم اور شرک و بُت پرستی اُن کی تباہی کا باعث بننے والی ہے۔ ابتدائی طور پر بہت کم لوگ اُنؑ کی تبلیغ سے متأثر ہوئے اور آپؑ حق بات کہتے ہوئے مطعونِ زمانہ ٹھہرے اور حق کہنے کی پاداش میں ان کے لیے یہودیوں کی کوششوں

سے صلیب تیار کر لی گئی۔ اسی کشمکش میں آپ کا مشن پایۂ تکمیل تک پہنچ گیا اور عیسائیت کا خدائی پیغام ایک صدی کے لیے دب کر رہ گیا۔ اس دوران عیسائی راہبوں اور علماء نے دین مبین کے اصولوں کو سیکھنا شروع کر دیا اور غار و کوہ میں چھپ کر اپنی تربیت کا اہتمام کیا اور انہی غاروں اور تنگ وادیوں سے نکل کر یہ لوگ دنیا کے طول و عرض میں پھیل گئے اور عیسائیت کی تبلیغ کے مشن کے لیے خود کو وقف کر لیا۔ مولانا رومؒ نے فرمایا ہے :۔

مصلحت در دینِ عیسیٰؑ غار و کوہ
مصلحت در دینِ ما جنگ و شکوہ

(عیسوی دین کی مصلحت غاروں اور پہاڑوں کی خلوت گزینی تھی لیکن ہمارے دین اسلام کی مصلحت جنگیں لڑ کر شان و شوکت حاصل کرنا ہے۔)

قرائن سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں ایران کے صفحۂ ہستی سے نابود ہونے کے باعث دوسری تہذیبوں، مذاہب اور فلسفہ ہائے اخلاق کو پنپنے کا موقع مل گیا تھا اور انسانیت کی تعمیر و ترقی کے لیے اس زمانے میں جو فکری احتیاج تھی اس کی تکمیل ہو گئی۔ آنے والے ایام میں عیسائیت اور بدھ مت کے اثرات دنیا کی غالب آبادی پر مرتب ہوتے رہے۔

آمدم برسرِ مطلب! سکندرِ اعظم کی وفات کے سو برس بعد سے ایران کے علاقوں میں یونانیوں (سلوکی حکمرانوں) کے اثرات بتدریج کم ہوتے گئے اور آہستہ آہستہ ایک خانہ بدوش ایرانی قوم جس کا تعلق کیسپین سمندر کے کناروں پر آباد سیتھین قوم سے تھا، یہ لوگ روس اور چین کی سرحدوں کے قریب گھومتے پھرتے رہتے تھے۔ ماسا گیتے اُنہی کے ایک قبیلے کا نام تھا۔ یونانی ان لوگوں کو ساکا کہتے تھے۔ ہر چند کہ وہ ہخامنشی ایرانیوں کی نسل سے تھے مگر وہ اصلاً خانہ بدوش ہی تھے۔ یہ لوگ آہستہ آہستہ صوبہ فارسی (پرسو، پہلو) میں آباد ہو گئے اور یہ لوگ پہلوی کہلانے لگے۔ چین کے صوبہ سنکیانگ سے ترکی النسل قبائل (جنہیں اشکانی کہا جاتا ہے) بھی آن وارد ہوئے اور ایران پر ترکی اثرات مرتب ہونے لگے۔ اَسّی (۸۰) برس تک خانہ بدوش سیتھین قبائل سلوکیوں

(یونانیوں) سے آزادی حاصل کرنے میں کوشاں رہے۔ یہی پہلوی (پارتھین) دوسری صدی قبلِ مسیح میں متری دات اوّل کی قیادت میں فارس اور اس کے نواحی خطوں باختر (بلخ)، بابل، سوسا، میڈیا اور ساحلی علاقوں کو اکٹھا کر کے ایک سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ بعد میں اسی صدی میں متری دات دوم نے آرمینیا سے سیستان اور خراسان تک حکومت قائم کر لی اور برصغیر کے کچھ علاقے بھی ہتھیا لیے۔ ان لوگوں کے چین سے قریبی روابط استوار ہوئے اور شاہراہِ ریشم تعمیر ہوئی۔ تجارتی قافلے چین سے اسی شاہراہ پر یورپ آنے جانے لگے۔ ساڑھے چار سو برس تک یہ حکمران ایران پر غالب رہے مگر یہ جاہل، اُجڈ اور خانہ بدوش لوگ کوئی نمایاں کام سرانجام نہ دے سکے۔ لیکن اس دوران ایران کے اردگرد تہذیب وتمدن، مذہب وفلسفہ اور علم وادب کا ارتقاء ہوتا رہا۔ پھر آریائی تہذیب وتمدن کے نام لیوا منظم ہو کر اپنے اقتدار کی جدوجہد کرنے لگے تاکہ خانہ بدوش تورانیوں سے نجات حاصل کر سکیں اور ہخامنشی دَور کی عظمت بحال کر سکیں۔ بقول اقبال:

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اَسرارِ شہنشاہی

❁❁❁

ساسانی عہد اور ایران

خالص آریائی نسل کے بادشاہ اردشیر نے ۲۲۴ء میں اقتدار پر ایک بار آریائی ایرانیوں کا قبضہ مستحکم کرتے ہوئے اپنی بادشاہت کا اعلان کیا اور آہستہ آہستہ قوم پرست ایرانیوں کی مدد سے خلیج فارس سے بلخ (شمالی افغانستان) تک قابض ہو گیا۔ اس کی بڑھتی ہوئی قوت کے سامنے ساحل مکران اور بلوچستان کے دیگر علاقوں کے حکمرانوں نے بھی اس کی اطاعت قبول کرتے ہوئے باج و خراج ادا کرنا شروع کر دیا۔ ایران کا سیاسی اقتدار اور فکری مقام ایک بار پھر جوبن پر آ گیا' اس کی عظمت رفتہ بحال ہوئی' فوج منظم ہونے لگی اور قومیت اور مذہب زرتشت کا ہر جگہ غلبہ ہو گیا۔ جلد ہی اردشیر نے رومی سلطنت کے حلیف سرحدی ملک آرمینیا پر حملہ کر دیا اور پھر رومی سلطنت کے ایک صوبے یعنی عراق پر حملہ کر دیا۔ رومیوں کی جانب سے الیگزینڈر نے ۲۳۱ء میں مقابلہ کی ٹھانی مگر ایرانیوں کی یورش کے سامنے رومی نہ ٹھہر سکے۔ اگلے چار سو برس رومیوں اور ایرانیوں کے مابین اکثر جنگیں ہوتی رہیں۔

مرکز میں مستحکم دفتری نظم و نسق قائم ہوا' شہنشاہ رعایا سے الگ تھلگ رہتا تھا اور اس کے حضور باریابی حاصل کرنے والے لوگ خاص پروٹوکول کا خیال رکھتے تھے۔ جاگیرداری اور اشرافیہ کا نظام بحال ہوا' بھاری بھرکم ہتھیاروں سے لیس سوار شاہ کے ذاتی دستہ میں شامل کیے گئے اور ایک مرکزی رائل آرمی (شاہی فوج) قائم ہوئی جس کی اساس شاہ کی ذات اور تاج و تخت سے وفاداری پر تھی۔

شہنشاہ کی زیرِ سرپرستی ایک مربوط اور منظم مذہبی نظام (جو کلیسائی نظام سے مشابہ تھا) قائم ہوا' جو ریاست کی حمایت کرتا تھا۔ درحقیقت یہ کلیسائی طرز کا نظام جو سلوکیوں اور اشکانیوں کے عہد میں زیرِ زمین تھا' کھل کر سامنے آ گیا۔ ہخامنشی دور کا زرتشتی مذہب

نئے جوش وخروش اور ولولہ کے ساتھ سامنے آیا۔ اہورامزدا (یعنی خدائے برتر) کی پرستش کے ساتھ ساتھ کئی دیوی اور دیوتاؤں کی پرستش بھی شروع ہوگئی۔ روشنیوں کے مظاہر یعنی مہر (سورج) اور ناہید (زہرہ سیارہ) کی پرستش بھی شروع ہوگئی۔ مزدیسنا کا کلیسائی طرز کا نظام ایک سردارِ اعلیٰ کی قیادت میں قائم ہوا' جس کے ماتحت مختلف درجات کے مغ' دستور' ارد اور نوار تھے جو زرتشتی مذہب کی تشریح کرتے تھے۔ علاوہ بریں آتش کدوں کے مجاور اور متولی بھی مقرر تھے۔ اس تحریف شدہ دین میں آتشِ مقدس کو مرکزی اہمیت حاصل تھی۔ ہر فرقہ اور ہر شخص گھر میں مقدس آگ کے شعلے روشن رکھتا تھا۔ ریاست کے مختلف حصوں میں تین بڑے آتش کدے خاص اہمیت کے حامل تھے۔

زرتشت کی کتابِ مقدس ''اوستا'' جو امتدادِ زمانہ کا شکار ہو چکی تھی' اس کی ایک بار پھر سے تدوین کا بیڑا اٹھایا گیا۔ کتاب مقدس کے ''حفاظ'' کو جمع کیا گیا اور ایک بار پھر اسے حیطۂ تحریر میں لایا جانے لگا۔ اردشیر ساسانی کے عہد میں ہی اس کی تدوین کا کام شروع ہوا اور شاہ پور اوّل کے دَور میں جاری رہا۔ یہ کام شاہ پور دوم کے عہد میں پایۂ تکمیل تک پہنچا۔ اس کتاب کی اصلیت معلوم کرنے کے لیے مذہبی رہنماؤں نے ایک ستائیس برس کے نیک انسان اردی ویراف کا انتخاب کیا جسے مختلف خواب آور مشروبات پلا کر گہری نیند سلا دیا گیا اور وہ کوئی ہفتہ بھر کے بعد بیدار ہوا۔ اب اس نے دعویٰ کیا کہ وہ آسمانوں کے سفر پر چلا گیا تھا جہاں اس نے خداوند اہورامزدا سے ملاقات کی ہے اور فرشتوں اور آسمان کی بادشاہت کے جلال کا مشاہدہ کیا ہے۔ اس نے دعویٰ کیا کہ خداوند اہورامزدا نے اوستا کے نئے ترتیب شدہ نسخے کی حقانیت کی تصدیق کر دی ہے اس طرح اس کتابِ مقدس پر شاہی مہر لگا دی گئی۔ ''اردی ویراف نامہ'' کے نام سے پارسی ابھی تک اس آسمانی سفر کی سرگزشت پر مبنی کتاب کا مطالعہ بڑے ذوق وشوق سے کرتے ہیں۔ مسلمانوں کے ہاں ''معراج نامے'' اسی کتاب کی بازگشت ہیں۔

ابتدا میں دیگر مذاہب مثلاً یہودیت' عیسائیت اور بدھ مذہب کو سلطنت کے اطراف واکناف میں پھلنے پھولنے کا موقع بھی عطا کیا گیا۔ ایران کے مغربی مفتوحات

اور آرمینیا میں عیسائیت کو غلبہ نصیب ہوا اور خراسان میں بدھ مذہب کی اشاعت ہوئی۔

اسی عہد میں مانی کا ظہور ہوا۔ مانی نے رہبانیت کی تبلیغ کی۔ شادی بیاہ کی مخالفت اور تجردِ کامل کی حمایت کی۔ اس نے ترکِ دنیا کا درس دیا اور مختلف تصاویر و تماثیل کے ذریعے اپنے مذہب کی اشاعت کی۔ وہ اپنے زمانے کا سب سے بڑا فنکار آرٹسٹ تھا اور اس کی تصاویر کا مجموعہ ارژنگ یا ارتنگ کہلاتا تھا۔ غالب نے اپنی بابت کہا ہے: ؎

فارسی بیں تا بہ بینی کاندر اقلیم خیال
مانی و ارژنگم واین نسخہ ارتنگِ من است

(میرے فارسی کلام کو پڑھ کر تو معلوم ہوگا کہ تصوارت کی سرزمین کا میں ہی مانی ہوں اور میرا کلام مانی کا ارژنگ ہے۔)

سرزمینِ ایران سے نکل کر مانی نے کشمیر اور تبت کی غاروں کی راہ لی اور مختلف غاروں میں تصویر کشی کرتا رہا۔ کشمیر اور تبت کی غاروں میں ان کے آثار بھی ملتے ہیں۔ مانی اپنے زمانے میں درویشوں کا ایک گروہ قائم کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ یہ درویش ملک کے طول وعرض میں جوگیوں کے روپ میں پھرتے رہتے تھے اور لوگوں کو زہد و تجرد کی تلقین کرتے تھے۔ آہستہ آہستہ وہ زرتشتی کلیسا کے لیے ایک خطرہ بن کر سامنے آگئے۔ بہرام اوّل ساسانی کے عہدِ حکومت میں مانی کو گرفتار کرلیا گیا اور مُغوں کے سپرد کر دیا گیا جو اس کے ازلی دشمن تھے۔ انہوں نے بابل میں شہر کے دروازے پر ۲۷۵ء میں اس کی زندہ حالت میں کھال کھنچوا کر اسے ختم کر دیا۔

اسی طرح جب بازنطینی سلطنت نے عیسائیت اختیار کر لی تو ایرانیوں نے عیسائیوں کو رومیوں کے آلۂ کار قرار دے کر شاہ پور دوم کے عہدِ بادشاہت میں ظلم وستم کا نشانہ بنایا۔ ان پر عرصۂ حیات تنگ ہو گیا۔ عیسائیت کی تبلیغ ممنوع قرار پائی اور عیسائیوں کو قیصرِ روم کی رعایا سمجھ کر انہیں یا تو بزور زرتشتی بنالیا گیا یا جلاوطن کیا جانے لگا۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے' ایرانیوں نے ساسانی عہد میں مہر اور ناہید (سورج اور زہرہ) کی پرستش بھی شروع کردی تھی۔ یہ مذہب ایشیائے کوچک اور آرمینیا میں بھی

پھیل گیا تھا۔ کچھ عرصہ کے لیے رومی افواج وہاں مقیم رہیں اور ایرانی عقائد اپنا کر مہر پرستی اور ناہید پرستی اپنے ساتھ یورپ تک لے گئیں۔ ۳۱۷ء میں دریائے ڈینیوب کے کنارے ممتاز رومی سرداروں گلیرس اور لائی سینس نے مہر (سورج) کا ہیکل تعمیر کیا اور کہا کہ یہ دیوتا ہمارا محافظ ہے۔ علاوہ بریں تحریف شدہ زرتشتی عقائد یورپ میں بھی پہنچ گئے۔ یونانی فکر میں نیکی و بدی یزدان اور اہرمن کی دوئی (ثنویت) اور ان کے مابین ازلی کشمکش کے تذکرے شامل ہوگئے' اسی طرح ناہید مغرب میں افرودیت (Aphrodite) دیوی کی صورت میں قبول کر لی گئی۔

یہاں یہ امر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ناہید دیوی اور مہر دیوتا کی بابت عروج عقائد کا کسی حد تک ذکر کر لیا جائے۔

ناہید کی قدیم صورت ''اناہیتہ'' ہے' جس کے معنی ''بے عیب'' ہیں۔ یہ دیوی زرخیزی کی علامت سمجھی جاتی تھی اور کاشت کاری کی فراوانی اس سے منسوب کی جاتی تھی۔ کاشت کاری کے باعث جب دولت اور ثروت جمع ہوتی تھی تو عیش وعشرت اور نشاط وانبساط کی جانب میلان ہوتا تھا۔ اسی لیے بعد میں ناہید دیوی سے عشق ومحبت اور حسن وجمال کی خوبیاں وابستہ کر دی گئیں۔ اس کے عربی نام زہرہ سے بھی اسی قسم کے تصورات وابستہ ہیں۔ ہاروت و ماروت کے افسانے بھی اسی سے منسوب ہیں۔ انگریزی میں اس کی صورت وینس (Venus) ہے۔ ہوس پرستی اسی سے منسوب ہے۔ انگریزی کلمہ ''Venial'' ہوس کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ قدیم ایران میں اس دیوی کی پرستش بڑے زور وشور سے ہوتی تھی۔ بغداد کے قریب پہاڑ کی چوٹی پر اس دیوی کا مندر تھا۔ ''بغ'' سے مراد دیوتا ہے اور ''داذ'' کے معنی عطیہ کے ہیں۔ اس طرح ''بغ داذ'' کے معنی ہیں ''دیوتا کا عطیہ''۔ بغ اور نغ ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ سنسکرت میں بغ کا کلمہ بھگ کی صورت اختیار کر گیا اور بھگوان اور بھگتی اسی سے مشتق ہیں۔ ایران کا مشہور پہاڑ ''بے ستون'' جو فرہاد سے منسوب ہے' پہلے پہل ''بغستان'' کہلاتا تھا جس کے معنی تھے ''آستانۂ خدا''۔ رقص وسرود اور موسیقی بھی ناہید سے وابستہ

تھے۔ مومن نے کہا ہے: ؎

اس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو!

قصص القرآن میں صدرالدین بلاغی نے ''عزیٰ'' کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ قدیم زمانے میں اس بُت کی ہیکل کو حرمِ کعبہ کے برابر احترام دیا جاتا تھا۔ اسی بُت کو کلدانی لوگ بلتی اور عشتار کہہ کر پوجتے تھے۔ ارامی اسے ہتیرا کہتے تھے۔ فرماں روائے بابل کے زمانے میں یہ ستارۂ صبح (ناہید یا زہرہ) سے منسوب تھا۔

ساسانی سلطنت کے بانی اردشیر کا ذکر ہو چکا ہے۔ اس کا دادا ساسان اصطخر میں ناہید کے مندر کا پروہت یا متولی تھا۔ اس مندر کی سرداری اردشیر کو ورثے میں ملی تھی۔

چونکہ ان ایام میں ناہید دیوی کی پرستش عروج پر تھی اس لیے قوم پرستی یعنی ایرانیت کی تحریک کا مرکز یہی مندر تھا، جہاں پر پجاریوں نے تحریف شدہ زرتشتی مذہب کے پجاریوں میں اشکانیوں کے خلاف نفرت کے بیج بو کر ساسانی سلطنت کے قیام کی راہ ہموار کی۔

اب ہم مہر دیوتا کی جانب چلتے ہیں۔ ایران کے علاوہ اس کے مقبوضات عراق اور مصر میں بھی سورج کی چمک کے ساتھ زرخیزی کا تصور وابستہ تھا۔ اسے میترا، میئرہ، متھرہ اور مہر بھی کہا جاتا تھا۔ شروع میں متھرا یا مہر (سورج) اھورامزدا کی خوبیوں میں سے ایک تھا، بعد میں یہ تصور ایک مستقل دیوتا کی صورت اختیار کر گیا۔ آج بھی ایرانی تقویم (کیلنڈر) میں ایک مہینہ مہر ماہ کے نام سے منسوب ہے۔ اسی طرح مہر داد ایک ایسا نام ہے جو پاکستان کے دیہات تک میں پایا جاتا تھا اور لوگوں کو کم ہی معلوم ہوگا کہ یہ شرکیہ نام ہے۔ اسلامی انقلاب سے قبل ایران کے قومی نشان کے طور پر شیر کے ساتھ خورشید (مہر) کا نشان موجود تھا اور ایران کے پرچم پر بھی یہ نشان موجود تھا۔

اسی دوران روم میں عیسائیوں کے ایک فرقہ نے عقائد کے اختلافات کے باعث اپنے وطن سے نکل کر ایران کی راہ لی۔ اس عقیدہ کا بانی نسطوریس تھا اور اس کا کہنا تھا کہ

حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا کے بیٹے نہیں ہیں اور نہ حضرت مریم علیہا السلام خدا کی بیوی ہیں۔ نسطوریس اپنے ساتھیوں سمیت نوشیروان کے ابتدائی عہد میں ایران میں آ گیا اور اس کے پیروکاروں کو پوری عزت و احترام کے ساتھ خوزستان میں آباد کیا گیا۔ ان لوگوں نے جندی شاہ پور کے نام سے ایک یونیورسٹی ٹاؤن کی بنیاد رکھی' جہاں فلسفہ' طب اور تاریخ وادب کی تعلیم دی جاتی تھی۔ وہاں سے فارغ التحصیل لوگ دور دور تک پھیل گئے' حتیٰ کہ مشرکینِ مکہ میں بھی ایک ایسے شخص نضر بن حارث کا سراغ ملتا ہے جو اسلام کی تضحیک کیا کرتا تھا' اسے جنگ بدر کے موقع پر قید ہونے کے بعد قتل کرنے کا حکم صادر کیا گیا تھا۔ وہ قرآنی حکایات کو ایرانی اساطیر سے حقیر قرار دے کر قرآن کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔ الغرض جندی شاہ پور کی یونیورسٹی عباسی دور تک قائم رہی اور اس کے اکثر اساتذہ نے عیسائیت کو ترک نہیں کیا۔ جب عباسی دَور میں علوم وفنون کی قدردانی ہوئی تو یہ مقام مشرق ومغرب کے سنگم کی حیثیت اختیار کر گیا اور یہیں کے اساتذہ نے اہم کتب کا عربی ترجمہ کر کے علوم کے فروغ اور مسلمانوں کی علمی کاوش میں اہم رول ادا کیا۔ ان نسطوری عیسائیوں کے کلیسا خراسان وخوارزم تک میں موجود تھے۔

اِسی طرح کچھ نہ کچھ یہودی ایران میں ہر دَور میں موجود رہے ہیں اور یہودیوں سے ساسانیوں کے تعلقات میں ماسوائے چند مواقع کے گرمجوشی پائی جاتی رہی ہے۔ بازنطینی اور ساسانی جنگوں میں جب بھی یہودیوں کے خطے ایرانیوں کے قبضے میں آئے تو یہودی نسبتاً سکھ کا سانس لیتے رہے۔ جیسا کہ ہخامنشی دور کے ضمن میں بیان ہو چکا ہے۔ کوروشِ اعظم کے زمانہ میں یہودی بابل میں موجود تھے اور وہاں سے انہیں بیت المقدس کی دوبارہ تعمیر کے بعد وہاں آباد کیا گیا تھا' لیکن یہودیوں کی ایک بڑی تعداد بابل میں موجود رہی اور یہیں سے یہودی ایران میں داخل ہو کر مختلف مقامات پر پوری آزادی کے ساتھ آباد ہو گئے تھے۔ انہوں نے فارسی زبان اپنالی اور مختلف کاروانوں کے ہمراہ مشرقی نقاط کی جانب اپنے سفر اور قیام کی وجہ سے اپنے ہمراہ فارسی زبان کے اثرات لے گئے۔ فارسی میں یہودی تحریروں کے آثار افغانستان' چینی صوبہ زنجیانگ' ہندوستان

کے ساحل ملیبار اور وسطی ایشیا میں ملتے ہیں (مزید تفصیل کے لیے فرہنگ ایران مبین، جلد ۲۰، مطبوعہ تہران ۱۹۷۵ء میں موجود والٹر جے منکل کے مضمون ''فارسی یہودیوں کی ایرانی تہذیب وادب کے لیے خدمات'' کا مطالعہ ضروری ہے) ہر چند کہ علمی اور فکری اعتبار سے یہودی ایران میں الگ تھلگ رہے اور ایک محتاط اقلیت کے طور پر اپنے افکار کی اشاعت میں زیرِ زمین ہی رہے مگر پھر بھی زمانۂ بعد از اسلام میں مختلف ادوار میں ان کے اثرات واضح طور محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ اس کا ذکر بعد کے صفحات میں قدرے تفصیل کے ساتھ آئے گا۔

اب ہم ایک خالصتاً ایرانی مذہب مزدکیت کی جانب آتے ہیں۔ پانچویں صدی عیسوی کا یہ مذہب خالصتاً ایرانی الاصل تھا اور اشتراکیت کے نظام پر مبنی تھا۔ یہ وہ دور تھا جب ساسانی بادشاہت نے جاگیردارانہ اور طبقہ وارانہ نظام کی حوصلہ افزائی کر کے ملک کے باشندوں کو سماجی اور معاشی اعتبار سے طبقات میں تقسیم کر دیا تھا اور مختلف طبقات آپس میں برسرِ پیکار تھے اور کمزور و مستضعفین اپنے حقوق کے لیے خود آگاہی کے عمل سے گزر رہے تھے۔ پانچویں صدی میں قباد ساسانی کے دَور میں مزدک کو فروغ حاصل ہوا۔ اس نے شاہی گوداموں کو لوٹ لیا اور دولت میں اشتراک اور غرضیکہ ہر قسم کی اشیائے ضرورت میں اشتراک کے فلسفے کی ترویج کی۔ قباد ساسانی نے اس کا مذہب قبول کر لیا اور کچھ عرصہ کے لیے ایران اشتراکیت کے سائے میں چلا گیا۔ جلد ہی زرتشتی مذہب کے مبلغین نے اپنے آپ کو دوبارہ منظم کر لیا اور پھر شہزادہ منشر (جو بعد میں نوشیروان کے خطاب سے مشہور ہوا) کی مدد سے مزدک اور اس کے پیروکاروں کا مربوط فوجی ایکشن کے ذریعے صفایا کر دیا۔ اس کے کچھ پیروکار شام اور یونان بھاگ گئے اور کچھ عرصہ کے لیے شام اور یونان میں یہ مذہب زندہ رہا۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے، مانی کے مذہب کی بھی پہلے پہل سرکاری سطح پر سرپرستی کی گئی اور بعد میں اسے ختم کر دیا گیا تھا۔ مانی کے پیروکار کچھ عرصہ کے لیے ایران سے باہر اپنا مذہبی تشخص قائم رکھنے میں کامیاب رہے۔ ۲۷۷ء تک مانی کے عقائد

بازنطینی رومی سلطنت تک پہنچ گئے تھے' پھر یہ عقائد شمالی افریقہ پہنچے۔اس مذہب کے ایک راسخ العقیدہ مبلغ سینٹ آگسٹین (Saint Augustine) نے بہت شہرت پائی' قسطنطنیہ میں عیسائیت اور مانویت کے مابین مناظروں کا سلسلہ کافی عرصہ تک چلتا رہا۔ مانویت کی تعلیمات میں موجود رہبانیت بعد میں عیسائیت حتیٰ کے اسلامی تصوف میں بھی نظر آتی رہی ہے۔تاہم مزدکیت کو وہ فروغ حاصل نہ ہوسکا جو مانویت کے حصے میں آیا تھا۔ البتہ بعد کے اشتراکی نظریات میں اس کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔علامہ اقبال نے کارل مارکس کو روحِ مزدک کا بروز قرار دیتے ہوئے اشتراکیت کو مزدکیت کی ایک صورت قرار دیا ہے۔ارمغانِ حجاز میں آپ نے ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' میں ابلیس کے پانچویں مشیر کی زبانی اشتراکیت پر تبصرہ کرتے ہوئے کہلوایا ہے: ؎

وہ یہودی فتنہ گر' وہ روحِ مزدک کا بروز
ہر قبا ہونے کو ہے اس کے جنوں سے تارتار
زاغ دشتی ہورہا ہے ہمسرِ شاہین و چرخ
کتنی سرعت سے بدلتا ہے مزاجِ روزگار
فتنۂ فردا کی ہیبت کا یہ عالم ہے کہ آج
کانپتے ہیں کوہسار و مرغزار و جوئبار
میرے آقا! وہ جہاں زیروزبر ہونے کو ہے
جس جہاں کا ہے فقط تیری سیادت پر مدار

علامہ اقبال کی نگاہِ دوربین اس سے بہت آگے دیکھ رہی تھی اور وہ اس کا جواب ابلیس کی زبان سے یوں دلواتے ہیں: ؎

دستِ فطرت نے کیا ہے جن گریبانوں کو چاک
مزدکی منطق کی سوزن سے نہیں ہوتے رفو
کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد
یہ پریشاں روزگار' آشفتہ مغز' آشفتہ ہو

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس اُمت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو
خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ
کرتے ہیں اشکِ سحر گاہی سے جو ظالم وضو
جانتا ہے، جس پہ روشن باطنِ ایام ہے
مزدکیت فتنۂ فردا نہیں، اسلام ہے!

ساسانی عہد میں بازنطینی عیسائیوں سے خوفناک جنگوں کا ایک طویل سلسلہ بھی جاری رہا۔ قسطنطنیہ کے بازنطینی حکمران اپنی سرحدوں کے قریب ایرانی خطرے سے لاعلم نہیں تھے۔ ان کے عیسائیت کے سرپرست ہونے کے باعث ایران نے اپنی عیسائی آبادی کو رومیوں کا وفادار سمجھ کر ظلم وستم کا نشانہ بنایا تھا اور ان کو ملک سے نکال باہر کیا تھا۔ ۴۲۱ء میں عیسائی جب ایران سے بھاگ کر بازنطینی سلطنت میں پناہ گزین ہوئے تو ان کے تعاقب میں آنے والی ایرانی افواج کا مقابلہ رومی لشکروں سے ہوا اور یہ جنگ ہار جیت کے بغیر ختم ہوگئی۔ اور پھر ایک صدی تک یہ دونوں بڑی سلطنتیں اپنے اپنے علاقوں تک محدود ہوکر رہ گئیں۔ ایک صدی کے بعد ایرانیوں نے ۵۲۷ء میں پھر ایک بار رومیوں کو للکارا اور اُن کے مشرقی صوبوں پر قابض ہوگئے۔ ۵۳۲ء میں دارا کے مقام پر ایرانیوں کو پہلی مرتبہ بیلی ساریوس کے لشکر کے ہاتھوں ہزیمت اٹھانا پڑی۔ اس کے نتیجہ میں قیصر روم جسٹینین اور ایرانی شہنشاہ خسرو اوّل کے درمیان دوستی کا معاہدہ ہوا۔ یہ صلح زیادہ عرصہ تک نہ چل سکی۔ ۵۴۰ء میں ایرانی انطاکیہ (موجودہ شام کا شہر) پر چڑھ دوڑے اور شہر کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ شام وفلسطین اور بحیرۂ روم کے ایشیائی ساحل تک قبضہ کے بعد ایرانیوں نے اپنی شرائط پر صلح کر کے شمال کی جانب توجہ دی۔ شمال میں کوہِ قاف (قفقاز) کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم تھیں۔ یہ پہاڑی ریاستیں ہمیشہ سے آزادی کی متوالی رہی ہیں اور موجودہ چیچنیا اور داغستان کی طرح ان کی وادیوں میں کسی بھی حملہ آور کا نفوذ ایک مشکل امر رہا ہے۔ ایرانیوں نے ان کی جانب دوستی کا ہاتھ

بڑھایا اور انہیں زیرِ اثر لانے کی کوشش کرنے لگے۔ یہ امر بازنطینیوں کو گراں گزرا اور ایک بار پھر دونوں سلطنتوں میں ٹھن گئی۔ ۵۷۵ء میں ایرانیوں نے بازنطینیوں کو شکست سے دوچار کیا اور اگلے برس بازنطینی رومی غالب رہے۔ ۵۹۱ء میں صلح کا ایک اور معاہدہ مرتب ہوا۔

ایران پر طویل عرصہ حکومت کرنے کے بعد نوشیروان (۵۳۱ء۔۵۷۹ء) کا زمانہ ختم ہو چکا تھا اور کچھ عرصہ کی اندرونی کشمکش کے بعد خسرو پرویز (دوم) برسرِ اقتدار تھا۔ ۶۰۲ء میں اس نے موقع پاتے ہی رومیوں کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ ۶۱۱ء میں انطاکیہ اور ۶۱۲ء میں دمشق پر اور بعد ازاں بحیرۂ روم کے جزائر اور خاص طور پر قبرص پر قبضہ کے بعد ۶۱۴ء میں انہوں نے مصر پر قبضہ کر لیا۔ ادھر یمن پر ایرانی قبضہ کے بعد بحیرۂ احمر عبور کرنے کے بعد ایرانی سپاہ حبشہ تک بھی جا پہنچی۔ حبشہ پر عیسائی سلطنت قائم تھی۔ ایرانی جلد ہی وہاں سے واپس لوٹ آئے۔ ابرہہ، جس نے خانہ کعبہ کو تباہ کرنے کے لیے (اصحاب الفیل کا) ایک لشکر بھجوایا تھا، نے ایرانی افواج کو یمن سے نکال باہر کیا تھا اور یمن کے لوگ نوشیروان کے پاس فریاد لے کر پہنچے تھے کہ ان کے ملک پر افریقہ کے کوے قابض ہو گئے ہیں۔ ایک بار پھر ایران نے یمن پر قبضہ کر لیا تھا اور جس زمانہ میں آنحضور ﷺ نے یمن کے تجارتی سفر کیے اُن دنوں وہاں پر اہل ایران کی حکومت تھی۔ بعد میں خسرو پرویز کے زمانہ میں یمن پر بازان کو گورنر مقرر کیا گیا تھا۔ یہ وہی زمانہ تھا جب شام و عراق و یمن پر قبضہ کے بعد جزیرہ نمائے عرب پر ایرانی اپنا اقتدار محسوس کرتے تھے، مگر وہاں کے قبائل کو قریباً قریباً وہی خود مختاری حاصل تھی جس کا تصور ہمارے قبائلی علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ مشرکینِ مکہ خسرو پرویز اور ساسانی حکمرانوں سے ظاہری وفاداری اور ہمدردی کا اظہار ضرور کیا کرتے تھے۔ مدینہ منورہ جو ملک شام اور فلسطین سے قریب تر تھا اور نسبتاً متمدن علاقے کے اثرات اس شہر پر غالب تھے، اس پر ایرانی ساسانی اثرات کے نقوش نسبتاً زیادہ واضح تھے۔ یہودیوں کی مدینہ منورہ میں موجودگی بھی ایرانیوں سے قریبی روابط کی غماز تھی۔ ایرانی عیدیں نوروز اور مہرگان مدینہ

منورہ میں رسول اللہ ﷺ کی آمد سے پہلے پورے جوش وخروش سے منائی جاتی تھیں۔

مصر پر ایرانی قبضہ کے بعد اور بحیرۂ روم کے جزائر پر تسلط کے بعد رومی سلطنت کی کمر ٹوٹ کر رہ گئی تھی۔ مصر سے رسد ورسائل کا سلسلہ منقطع ہونے کے بعد رومی سخت پریشانی سے دوچار تھے۔ علاوہ بریں بیت المقدس پر قبضہ کے دوران لشکر میں موجود یہودیوں کے ایماء پر خسرو پرویز کی افواج نے عیسائی معبدوں کو زبردست نقصان پہنچایا تھا اور صلیب مقدس بھی اٹھا کر لے گئے تھے۔ اس مذہبی بے حرمتی نے عیسائی دنیا میں غم وغصہ کی لہر دوڑا دی تھی۔ پُراعتماد ایرانی ساسانی افواج اب ایشیائے کوچک کی جانب بڑھیں اور طنیہ کے بالکل سامنے ایشیائی ساحل پر سقوطری کے مقام پر قابض ہوگئیں اور یوں محسوس ہونے لگا کہ اب ایرانی افواج بازنطینی افواج کو روندتی ہوئی یورپ میں داخل ہو جائیں گی۔ ایرانیوں کی پے در پے فتوحات پر قرآن کی وحی کا نزول سورۃ الروم کی صورت میں ہوا' اس کا ذکر ہم بعد کے صفحات کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔

ان جنگوں کے عالمگیر اثرات مرتب ہوئے۔ جزیرہ نمائے عرب دونوں سلطنتوں میں ایک بفرزون کی حیثیت حاصل کر گیا۔ وہاں تجارت بدستور قائم رہی اور شام ویمن کے تجارتی راستوں کی اہمیت بڑھ گئی۔ یمن سے شام کا کاروانی راستہ جسے ''امام مبین'' کہا جاتا تھا' وہ بحر ہند کے سمندری راستوں اور بحیرۂ روم کے درمیان ایک پل کا کام دیتا تھا اور اس کاروانی راستہ پر اہل مکہ اور قریش کا مکمل اثر ورسوخ قائم تھا۔ مکہ مکرمہ اس راستہ میں ایک مرکزی مقدس مقام تھا۔ ہر چند کہ قبائل اپنی عصبیتوں کے باعث باہم برسرپیکار رہتے تھے مگر باہر کے قافلوں سے چنداں تعرض نہیں کرتے تھے۔ اسی طرح وہ خود بھی تجارتی سفروں میں خود کو زیادہ پُراعتماد محسوس کرتے تھے۔ شمال کی جانب شام کی سرحد پر جو ریاستیں بازنطینی سرحد پر موجود تھیں' مثلاً غسانی ریاستیں' ایرانی مصلحتاً ان سے تعرض نہیں کرتے تھے۔ ایران میں موجود نسطوری عیسائیوں کے بھی سرحد پار اپنے بھائی بندوں سے روابط موجود تھے۔ سرزمین ایران میں بھی عیسائیوں کی چند آبادیاں موجود تھیں جنہیں اب ایرانی زیادہ تنگ نہیں کرتے تھے۔ ان میں سے ایک ریاست نما آبادی

حیرہ کی بھی تھی (جہاں بعد میں کوفہ کا شہر آباد ہوا)۔ یمن پر ایرانی اقتدار کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ یمن ۵۷۰ء میں ایرانی سلطنت کا جزو بن چکا تھا' اس کے باوجود بحیرۂ احمر میں رومی جہاز رانی کرتے رہتے اور حبشہ کے عیسائیوں سے اپنے روابط قائم رکھے ہوئے تھے۔ اس طرح رومی اور ایرانی تجارت میں یمن اور حبشہ کو اہمیت حاصل تھی۔ اسی وجہ سے شام کی تجارتی شاہراہ جو مکہ اور مدینہ کے قریب سے گزرتی تھی' وہ ایک خاص اہمیت کی حامل تھی۔

ساسانی ایرانی افکار کا مرکز شہنشاہ کی ذات تھی۔ شہنشاہ کو دیوتا کا درجہ دیا جاتا تھا اور اس سے وفاداری' شاہی خون کی پاکیزگی' شاہ کی شخصیت کا سحر اور تقدس مسلّمہ امر تھا۔ ہر چند کہ عیسائیت نے اس نظریہ کی نفی کی تھی لیکن یہ تصور کسی نہ کسی طرح ایران سے بازنطینی سلطنت میں مروّج ہو گیا اور شاہ کو کلیسا کے سربراہ کا درجہ حاصل ہو گیا۔ مشرقی بادشاہت کے تصورات مغرب میں رائج ہو گئے۔ شاہی لباس اور تخت و تاج بھی رومی سلطنت میں ایرانی سلطنت سے ہی متعارف ہوئے۔ شہنشاہ اور شاہی خاندان کی عظمت کا تصور ایرانیت کے رگ و ریشے میں سمایا تھا اور زمانۂ ماقبل اسلام کا یہ مذہبی پہلو ایرانی ذہن پر طویل عرصہ تک اثر انداز رہا اور اس کے خاتمے کے لیے صدیاں بیت گئیں۔

اسی زمانہ میں سفارت و تجارت' کاروانوں کے سفر' جہاز رانی اور تہذیب و تمدن نے ترقی کی راہیں طے کیں۔ ایرانی بتدریج ترقی کی منازل طے کرتے چلے گئے۔ اُن میں اعتماد' ذہنی وسعت' قانون سازی کا فن' فلسفہ' نقش و نگار' فنِ تعمیر اور حربی فنون متعارف ہو گئے۔

قدیم ایرانی عمارات میں (ماقبل اسلام) محرابیں ہوتی تھیں اور ان پر گنبد تعمیر کیے جاتے تھے۔ ان گنبدوں کے اردگرد بند کمرے ہوتے تھے۔ دالان اور ڈیوڑھی کا تصور بھی تھا۔ اس طرح کی عمارات طیسفون اور دوسرے کھنڈرات میں ملی ہیں۔ یہی فنِ تعمیر بعد میں مساجد و مقابر اور خانقاہوں حتیٰ کہ قلعوں اور اسلامی دَور کے محلات میں دیکھا جانے لگا۔ لاہور کی مسجد وزیر خان اور تاج محل آگرہ تک میں یہی فنِ تعمیر نظر آتا ہے۔

اس پُرشکوہ ساسانی سلطنت میں فلسفے اور دیگر علوم نے بھی خوب ترقی کی۔ کئی فلسفیوں نے ایران آکر فلسفہ سیکھنے کی خواہش کا اظہار بھی کیا تھا۔ نوشیروان بذاتِ خود فلسفہ کا دلدادہ تھا۔ اس کے دربار میں حکماء کا اجتماع رہتا تھا۔ اس کا مشہور وزیر بزرگ مہر یا بزرجمہر (جسے برزویہ بھی کہا جاتا ہے) اپنے دور کا مشہور و معروف دانا تھا اور اب بھی سیاسی جغادروں کو اصطلاحاً بزرگ مہر یا بزرجمہر کہہ کر پکارا جاتا ہے۔

جب رومی بادشاہ گاڈین نے ۲۴۲ء میں ایران پر فوج کشی کی تو اس کے مشہور درباری فلسفی فلاطینوس نے اپنی یہ خواہش ظاہر کی کہ اسے بھی ساتھ لے جایا جائے تاکہ وہ ایران میں فلسفے کا مطالعہ کر سکے، لیکن یہ مہم ناکامی سے دوچار ہوگئی۔ اس واقعہ کے قریباً تین سو برس بعد خسرو اوّل (نوشیروان) نے پفس کے آرچ بشپ (اسقف) پال سے فلسفہ کا علم حاصل کیا۔ نوشیروان کی بابت لوگوں کا خیال تھا کہ ایران میں اس فلسفی بادشاہ کا ظہور ہو چکا ہے جس کا تصور افلاطون نے اپنی کتاب ''جمہوریت'' میں پیش کیا تھا۔ اسی زمانے میں قسطنطین (Constantine) نے ایتھنز کا فلسفے کا مدرسہ بند کر دیا تھا اور وہاں کے ساتوں عظیم فلسفی جنہیں کافر قرار دے دیا گیا تھا، وہاں سے نکل کر اس اُمید میں ایران آگئے تھے کہ وہاں انہیں اس شاہ موعود سے ملاقات کا شرف حاصل ہوگا۔ لیکن بادشاہ سے ملاقات کے بعد انہیں مایوسی ہوئی، کیونکہ اسے انہوں نے افلاطونی تصورات کے مطابق نہ پایا۔ یہ لوگ واپس روم لوٹ گئے۔ ایک بات ضرور ہے کہ نوشیروان علم و دانش کا شائق تھا اور اس نے ایران میں فلسفہ اور علوم کے فروغ میں بہت حصہ لیا تھا۔ جندی شاہ پور کی یونیورسٹی کا قیام اس کی علم دوستی کا بیّن ثبوت ہے۔ شیخ سعدی کے فلسفۂ اخلاق میں بار بار نوشیروان اور بزرجمہر کا ذکر ملتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ صدیوں تک اس دور کے حکیمانہ نقوش فارسی ادب پر موجود تھے۔

۶۲۸ء میں خسرو پرویز کی معزولی اور موت کے بعد ایران اندرونی فتنوں کا شکار ہو کر رہ گیا اور تین چار برس کے پُرآشوب دور کے بعد یزدگرد (سوم) برسرِاقتدار آگیا۔ (یہی سال رسول اللہ ﷺ کی رحلت کا سال ہے) اس نے ایران کو سنبھالنے کی کوشش کی

مگر ساسانی سلطنت کی کمزوریاں اس پر حاوی ہو رہی تھیں۔ اہلِ مذہب (زرتشتی) عوام الناس کی کمائی کا اسّی (۸۰) فیصد ظالمانہ ٹیکسوں کی صورت میں وصول کر کے آتش کدوں کے شعلوں میں جھونک رہے تھے۔ طبقہ وارانہ نظام میں منافرت جڑ پکڑ چکی تھی اور یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اندرونی کمزوریاں صدیوں پرانی عظیم سلطنت کو دیمک کی طرح چاٹ رہی تھیں۔ ۶۲۲ء (سالِ ہجرت نبویؐ) میں ہرقل کے ہاتھوں ایرانی شکست کے باعث سلطنت کے بحیرۂ روم کے ساحلی مقبوضات اور شام و فلسطین کا علاقہ ایرانیوں سے چھن چکا تھا۔ ۶۲۸ء سے لے کر ۶۳۲ء تک کی تاج و تخت کی کشمکش کے باعث شہنشاہ کی ذات کا طلسم و افسون ماند پڑ رہا تھا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ آنحضور ﷺ کی بددعا کے باعث یہ سلطنت شکست و ریخت سے دوچار ہو چکی تھی۔ علاوہ بریں رومیوں کے ہاتھوں ایرانیوں کی شکست کی قرآنی پیشین گوئی بھی پوری ہو چکی تھی۔ علامہ اقبال اس موقع پر فرماتے ہیں: ؎

پیریٔ ایراں زمانِ یزد جرد
چہرۂ او بے فروغ از خونِ سرد

(یزدگرد کے عہد میں ایران پر بڑھاپا طاری ہو چکا تھا۔ رگوں میں خون جم جانے کے باعث اس کے چہرے کی چمک ماند پڑ گئی تھی۔)

دین و آئین و نظامِ اُو کہن
شید و تارِ صبح و شامِ اُو کہن

(اس کا دین، دستور اور نظامِ حکومت سب فرسودہ ہو چکے تھے۔ اس کے دن رات کی تاریکیاں اور روشنیاں سب پرانے ہو چکے تھے۔)

موجِ مے در شیشۂ تاکش نبود
یک شرر در تودۂ خاکش نبود

(اس کے جام میں شرابِ معنوی کی ایک بھی لہر نہ تھی۔ یہ مٹی کا ایک تودہ بن چکا تھا جس کی گہرائیوں میں ایک چنگاری بھی باقی نہیں بچی تھی۔)

تا ز صحرائے رسیدش محشرے
آں کہ داد او را حیاتِ دیگرے

(اچانک صحرائے عرب سے اس پر قیامت نازل ہوئی اور اسی قیامت کے باعث اس کو ایک نئی زندگی مل گئی۔)

ایں چنیں حشر از عنایاتِ خدا است
پارس باقی! رومۃ الکبریٰ کجاست؟

(اس طرح کی قیامت بھی خداوند تعالیٰ کی نعمت ہوتی ہے۔ آج فارس قائم و دائم ہے مگر رومۃ الکبریٰ کے آثار بھی محو ہو چکے ہیں۔)

مرد صحرائی بایران جاں دمید
باز سوئے ریگزارِ خود رمید

(صحرا کے باسیوں نے ایران کو نئی زندگی عطا کی اور پھر وہ اپنے صحرا کی جانب واپس لوٹ گئے۔)

کہنہ را از لوحِ ما بسترد و رفت
برگ و سازِ عصرِ نو آورد و رفت

(تمام بوسیدہ اور پرانی تحریروں کو ہماری لوح سے مٹا کر چل دیے اور ہمیں نئے زمانے میں زندگی گزارنے کا سامان مہیا کر گئے۔)

آہ احسانِ عرب نشناختند
از تشِ افرنگیاں بگداختند

(بعد کے دور میں ایرانی انگریزوں اور امریکہ کے فریفتہ ہونے لگے اور عرب کے احسانات کو فراموش کر بیٹھے۔)

نوٹ : یہ علامہ اقبال کے زمانے کے ایران کی بابت کہا گیا جس کی ذہنی کیفیت اور قومیت کے جذبہ پر آپ نے افسوس کا اظہار فرمایا ہے۔

ساسانی عہد کی اہم خصوصیات اور اسلامی تہذیب پر اِن کے اثرات

عہدِ ساسانی میں ایران دنیا کی ایک طاقت ورترین سلطنت کی صورت میں اُبھرا۔ سلطنتِ فارس کی حدود پنجاب، کشمیر، شمالی ہند، بلوچستان، موجودہ افغانستان، مشرقِ وسطیٰ،

مشرقی چین، وسطی ایشیاء، قفقاز، جزیرہ نمائے عرب، ایشیائے کوچک، سواحل بحیرۂ روم، مصر، قبرص اور دیگر جزائر بحیرۂ روم تک پہنچ گئیں۔ تہذیب وتمدن کے اعتبار سے عظیم شہر مثلاً طوس، رے، صفاہان (سپاہان)، طیسفون، مدائن، نیشاپور اور شیراز وجود میں آئے۔ مشرق ومغرب کے مابین تجارت کو فروغ ہوا۔ مذہبی اعتبار سے دین زرتشت قدرے تحریف کے ساتھ زندہ رہا۔ رفتہ رفتہ اس میں آتش پرستی، مہر پرستی، ناہید پرستی اور مظاہر پرستی کے عناصر شامل ہوئے۔ مقبوضاتِ فارس میں عیسائیت کی ترویج، یہودیوں کی آبادکاری اور سفر، بدھ مت کے پیروکاروں کا شمال مشرقی خطوں میں فروغ، ہندی مقبوضات میں ہندومت کا احیاء، جین مذہب کی تشکیل، ایران میں مانوی مذہب کی ابتدا اور خاتمہ مزدکیت کا عروج وزوال اور چینی نظریات کی ایران میں آمد ایسے واقعات ہیں جنہوں نے اہلِ مشرق پر اپنے گہرے فکری نقوش چھوڑے ہیں۔ فلسفۂ اخلاق اور فلسفہ وافکار کی ایران میں جو بوقلمون صورت ابھری وہ ایشیاء کے وسیع حصہ پر بلکہ مشرقی یورپ پر صدیوں تک حاوی رہی ہے۔ بعض مؤرخین رقم طراز ہیں کہ ہرچند اسلام نے جنگی اعتبار سے سلطنتِ فارس کو شکست سے دوچار کر دیا تھا لیکن فکری اور تہذیبی اعتبار سے ایرانیت بہرحال ہر دور میں زندہ رہی ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ اسلام کی آمد نے اسے ایک نئی زندگی بخش دی۔ اسلام نے ایرانی تہذیب وتمدن، زبان وادب، قانون ودستور اور فلسفہ کے ان اجزاء کو جو اسلامی افکار اور روح سے متصادم نہیں تھے، یکسر ختم نہیں کیا، بلکہ انہیں اپنا رنگ دے کر ان کی ترویج کا سامان مہیا کیا۔ بقول اقبال: ؎

اندریں رہ جز نگہ مطلوب نیست
ایں کُلہ یا آں کُلہ مطلوب نیست

(علم وترقی کی راہ میں ماسوائے نظر کی پختگی اور گہرائی کے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ ٹوپی یا وہ ٹوپی پہننے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔)

اسلام نے حکمت ودانائی کو مؤمن کی میراث قرار دے کر جہاں سے ملے اسے پالینے کی تلقین کی ہے۔ علامہ اقبال نے اپنے اس شعر میں ایک مصرع میں قرآنی آیت اور دوسرے میں ایک حدیث کا مفہوم سمو کر کس خوبصورتی سے فرمایا ہے: ؎

گفت حکمت را خدا خیرِ کثیر
ہر کجا ایں خیر را بینی بگیر!

(خدا نے دانائی کو بے اندازہ خیر و خوبی قرار دیا ہے۔ جہاں سے یہ خیر و خوبی مل سکے اسے لے لیں۔)

بدقسمتی سے عجم کے وہ خیالات جو روحِ اسلامی کے منافی بھی تھے، وہ بھی کسی نہ کسی طرح زندہ رہ گئے اور کچھ ایسے ہی افکار و رسوم نے اسلام پر منفی اثرات بھی مرتب کیے۔ تصوف میں کچھ مانوی اور زرتشتی عقائد بھی شامل ہو گئے جنھوں نے کسی نہ کسی طرح حلقۂ صوفیاء میں بددلی، سکوت اور جمود کا عنصر شامل کر دیا۔ بقول اقبال: ؎

تاثیرِ غلامی سے خودی جس کی ہوئی نرم
اچھی نہیں اُس قوم کے حق میں عجمی لَے

اسی طرح ایک اور موقع پر فرماتے ہیں: ؎

ہے کس کی یہ جرأت کہ مسلمان کو ٹوکے
حریّتِ افکار کی نعمت ہے خداداد
چاہے تو کرے کعبے کو آتش کدۂ پارس
چاہے تو کرے اس میں فرنگی صنم آباد!

لیکن عرب و عجم کے امتزاج کے مثبت پہلو بھی سامنے آتے ہیں۔ بقول اقبال: ؎

بچھائی ہے جو کہیں عشق نے بساط اپنی
کیا ہے اس نے فقیروں کو وارثِ پرویز

آپ نے عربی جوش و جذبہ میں عجم کی خیال آفرینی اور تدبر کو جب دینِ مبین اسلام کے رنگ میں ڈوب کر ایک عظیم وحدت میں جذب ہوتے دیکھا تو آپ نے یورپ کی فکری و جذباتی محرومی پر دکھ کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: ؎

عرب کے سوز میں سازِ عجم ہے
حرم کا رازِ توحیدِ اُمم ہے

تہی وحدت سے ہے اندیشۂ غرب
کہ تہذیبِ فرنگی بے حرم ہے

اب ہم عجم کے ساسانی دور کے ان عناصر کا ذکر کریں گے جو بعد میں ہم پر اثر انداز ہوئے اور اس عمل کے مثبت اور منفی پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی کوشش کریں گے۔

ساسانی عہد کا زرتشتی مذہب

توحید اور ثنویت: ہر چند کہ زرتشتی مذہب کا آغاز اھورا مزدا کی پرستش سے ہوا تھا اور ایک عظیم ہستیٔ برتر کا تصور تھا جو خالقِ ارض و سماء ہے اور ایرانی ذہن کبھی بھی بُت پرستی کی جانب مائل نہیں ہو سکا، مگر بعد میں خدائے نیکی (یزدان) اور اہرمن (شیطان) کا تصور غالب آتا چلا گیا۔ نہ صرف ازل تا ابد نیکی اور بدی کی قوتوں کا مسلسل برسرِ پیکار رہنا ہمارے افکار میں در آیا بلکہ خداوند تعالیٰ کو یزدان اور ابلیس کو اَہرمن قرار دے کر اس نظریہ کو مشرف با سلام کر لیا گیا۔ حالانکہ اسلامی نقطۂ نظر سے ابلیس ایک راندۂ درگاہِ خداوندی ہے۔ وہ آگ سے تخلیق کیا گیا ہے اور خدا کی نافرمانی کے بعد مردود قرار پایا ہے۔ اس نے قیامت تک انسان کو گمراہ کرنے کی مہلت مانگی ہے، وہ کسی بھی طرح شر یا تباہی کا خالق نہیں ہے۔ خیر و شر کی صلاحیت انسان کے اپنے اندر ہے اور اسے خیر کا راستہ دکھانے کے لیے خداوند تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو نازل فرمایا ہے۔ ہمیں بعد از اسلام کے عجمی لٹریچر میں اَہرمن کی جاندار اور خوفناک شخصیت نظر آتی ہے جو خالص اسلامی نظریات سے کسی حد تک مختلف ہے۔ علامہ اقبال اپنی شاہکار کتاب ''جاوید نامہ'' میں جہاں ابلیس کو ''خواجۂ اہلِ فراق'' کہہ کر الگ سے زیرِ بحث لائے ہیں وہاں ''طاسینِ زرتشت'' کے عنوان سے اہرمن اور زرتشت کا مکالمہ خوبصورت پیرائے میں بیان کیا ہے۔ یہاں پر اہرمن کو اسی طاقت اور شان و تمکنت سے پیش کیا گیا ہے جو زرتشتی عقائد کے قریب تر ہے، لیکن اس مکالمہ سے جو مطلب اخذ فرمایا ہے وہ روحِ اسلامی کے قالب میں ڈھلا ہوا ہے۔ یہاں پر زرتشت کو بھی پیغمبروں کے نمائندے کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

اہرمن کہتا ہے:

از تو مخلوقاتِ من نالاں چو نَے
از تو مارا فرودیں مانندِ دَے
در جہاں خوار و زبونم کردہ ای
نقشِ خود رنگیں زخونم کردہ ای
زندہ حق از جلوہٗ سینائے تست
مرگِ من اندر ید بیضائے تست

(تیری وجہ سے میری مخلوقات بنسری کی طرح مسلسل رو رہی ہیں۔ تیری وجہ سے میری بہاریں سخت سردی کے باعث اجڑ چکی ہیں۔ اس جہاں میں تو نے مجھے ذلیل وخوار کر کے رکھ دیا ہے اور میرے خون سے اپنی زندگی پالی ہے۔ طورِ سینا پر تیرے جلوؤں نے حق کو زندہ کر دیا ہے اور میری موت تیرے یدِ بیضا میں چھپی ہوئی ہے۔)

پھر کہا ہے: ؎

تکیہ بر میثاقِ یزداں ابلہی است
بر مرادش راہ رفتن گمرہی است

(نعوذ باللہ! یزدان کے وعدوں پر تکیہ کر لینا بے وقوفی ہے اور اس کے بتائے ہوئے راستوں پر چلنے والوں نے کبھی منزل نہیں پائی۔)

پھر پیغمبروں یعنی حضرت شیث، حضرت ایوب اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام پر آنے والی سختیوں کا ذکر کیا ہے اور حضرت نوح علیہ السلام کی صدیوں کی مجبوریوں کی جانب اشارہ کر کے خلوت نشینی اور رہبانیت کا درس دیتے ہوئے کہا ہے: ؎

خیز و در کاشانۂ وحدت نشین!
ترکِ جلوت گیر و در خلوت نشین

(اٹھ اور وحدت کے مقام پر بیٹھ جا۔ تنہائی اختیار کر لے اور لوگوں کی مجلس سے اجتناب کر لے۔)

اس کا جواب زرتشت نے کچھ اس انداز سے دیا ہے: ؎

نور دریائے است ظلمت ساحلش
ہم چو من سیلے نزاد اندر دلش

اندرونم موجہاے بے قرار
سیل را جز غارتِ ساحل چہ کار؟
نقش بیرنگے کہ او را کس ندید
جز بخونِ اہرمن نتواں کشید!
خویشتن را وانمودن زندگی است
ضربِ خود را آزمودن زندگی است

(روشنی ایک سمندر ہے اور تاریکی اس کا ساحل۔ اس روشنیوں کے سمندر کے دل سے میرے جیسا کوئی طوفان جنم نہیں لے سکا۔ مجھ میں بے قرار لہریں جوش مار رہی ہیں اور طوفان کا ایک ہی کام ہے اور وہ یہ ہے کہ ساحل کو تباہ کر کے رکھ دے۔ وحدت یعنی رنگوں کے چکر سے باہر آنا اسی وقت ممکن ہے جب اہرمن کے خون سے امن کی شراب کشید کی جائے۔ اسی امتحان کا نام زندگی ہے اور اپنی ضرب کو آزمانے کا نام ہی زندگی ہے۔)

پھر یہ کہتے ہوئے کہ پیغمبروں پر آنے والی آزمائشیں ان کے لیے باعثِ رحمت ہیں اور خلوت انسان کی تربیت کے لیے ہر چند کہ ضروری ہے مگر اسے ہمیشہ کے لیے اختیار نہ کیا جائے، آخر میں کہا ہے: ؎

گرچہ اندر خلوت و جلوت خدا ست
خلوت آغازست و جلوت انتہاست
گفتہ ای پیغمبری دردِ سر است
عشق چوں کامل شود آدم گر است
راہِ حق با کارواں رفتن خوش است
ہمچو جاں اندر جہاں رفتن خوش است

(اگرچہ خلوت اور جلوت دونوں میں خدا ملتا ہے مگر خلوت سفر کی ابتدا ہے اور جلوت اس کی انتہا ہے۔ تو نے کہا ہے کہ پیغمبری دردِ سر ہے، لیکن جب عشق اپنی تکمیل کو پہنچتا ہے تو وہیں سے انسانیت کی تعمیر کا مشن شروع ہو جاتا ہے۔ حق کی

راہ پر قافلے کے ہمراہ چلنے کے اپنے مزے ہیں۔ کائنات میں روح کی طرح سفر
کرنے کے اپنے ہی مزے ہیں۔)

یزدان واہرمن کی کشمکش اور زرتشتی روح کی بے چینی ہمیں بعد از اسلام کے ادب و شعر میں ہر جگہ نظر آئے گی۔ یہ کشمکش اسی جذبہ کو جنم دیتی ہے جو جہد پیہم، سعی و عمل اور جستجو کے لیے انسانی طبیعت کو اکساتا ہے۔ تحرک، جدل اور بے سکونی انسان کو کوشش اور مقصدیت پر مائل کرتی ہے۔ بقول رومیؒ:

اندریں رہ می تراش و می خراش
تا دمِ آخر دمی فارغ مباش!

(اس راستے میں توڑ پھوڑ کرتے رہو اور آخری دم تک ایک لمحے بھر کے لیے بھی
فارغ مت بیٹھو۔)

آگ کا تصور: زرتشتی عقائد میں آگ کو خدا تو نہیں مانا گیا مگر اس کے تقدس کو تسلیم کیا گیا ہے، کیونکہ یہ عنصر گرمی و روشنی اور تحرک کا منبع سمجھا جاتا تھا۔ اس کو ساسانی دَور میں روشن رکھنا ضروری تصور کر لیا جاتا تھا اور ان کی تمام عبادت گاہیں آتش کدوں کا روپ دھار چکی تھیں۔ ہر مقام پر آگ کی انگیٹھیاں نصب کی جاتی تھیں اور ان میں صندل کی لکڑیاں، گھی، عود و لوبان اور حسبِ استطاعت دیگر سوختنی اشیاء ڈالی جاتی تھیں۔ یہ آگ مسلسل روشن رہتی۔ اسی وجہ سے ایرانیوں کو آتش پرست تصور کیا جانے لگا، حالانکہ وہ اھورامزدا (خدائے برتر) کے پرستار تھے۔

قرآن پاک میں آگ کا ذکر اکثر مقامات پر جہنم کی آگ کے سلسلے میں آیا ہے، یا پھر نارِ نمرود کے ضمن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصہ میں آیا ہے جسے تلمیح کے طور پر علامہ اقبال نے بڑے خوبصورت پیرائے میں بیان فرمایا ہے:

عذابِ دانشِ حاضر سے باخبر ہوں میں
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیلؑ

قرآن حکیم میں ایک مقام پر آگ کو روشنی کے منبع کی مثال کے طور پر پیش کیا

گیا ہے:

﴿مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِى اسْتَوْقَدَ نَارًا فَلَمَّآ اَضَآءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِىْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ﴾ (البقرۃ)

''ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے آگ جلائی' پھر جب اس آگ کی روشنی نے اردگرد کو روشن کر دیا تو خدا نے اس کا نور زائل کر دیا اور وہ اندھیروں میں رہ گئے اور کچھ دیکھنے سے قاصر ہو گئے۔''

تاہم روشنی اور نور کا ذکر قرآن پاک میں مختلف معانی میں آیا ہے۔

اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بابت سورۂ طٰہٰ میں اس آگ کا ذکر آتا ہے جو آپؑ نے کوہِ طور پر دیکھی تھی اور جو آپؑ کے لیے نشانِ منزل بن گئی تھی۔ فرمایا:

﴿وَهَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ۘ اِذْ رَاٰ نَارًا فَقَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْٓا اِنِّىْٓ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّىْٓ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِقَبَسٍ اَوْ اَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى﴾ (طٰہٰ)

''کیا تمہیں موسیٰ (علیہ السلام) کی داستان پہنچی ہے؟ جب اس نے آگ کو دیکھا تو اپنی بیوی سے کہا کہ یہاں ٹھہرو میں وہاں سے یا تو انگارے لے کر آتا ہوں یا پھر یہ آگ کی روشنی میرے لیے رہنمائی کا سبب بن جائے گی۔''

یہاں پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آگ کی روشنی سے رہنمائی کا تصور کیا اور بقول اقبال: ؎

گذر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغِ راہ ہے' منزل نہیں ہے!

آگ کا تصور ایرانی مفکرین کے ہاں ہمیشہ روشنی' گرمی' زندگی کی تمازت' چمک دمک' توانائی اور عظمت کے معانی میں استعمال ہوتا رہا ہے۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں: ؎

آتشِ عشق است کاندر نے فتاد
جوششِ عشق است کاندر مے فتاد

(عشق کی آگ بنسری میں آ پڑی تو اس کی لے میں ڈھل گئی اور عشق کا جوش تھا جو شراب میں آ پڑا۔)

آتش است ایں بانگِ نے و نیست باد
ہر کہ ایں آتش ندارد نیست باد

(یہ بنسری کی آواز آگ ہے ہوا نہیں ہے، جس ہوا میں یہ آگ نہیں ہے وہ بھی بیکار ہے۔)

یہاں پر تو بانسری کی لَے کو مولانا نے روح کے مفہوم میں بیان کیا ہے۔ وحدت الوجود کے ضمن میں بھی آگ کی مثال لاتے ہوئے فرماتے ہیں: ؎

زانکہ آہن محوِ رنگِ آتش است
زآتشی می لافد و آتش وش است

(چونکہ لوہا آگ کے شعلے میں پڑ کر آگ کا رنگ اختیار کر لیتا ہے اس لیے وہ آگ بن جانے پہ فخر کرتا ہے اور وہ آگ ہی دکھائی دیتا ہے۔)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جلوۂ طور کو ایرانی خیال آفرینی شمع اور پروانے کی مثال میں پیش کرنے لگی اور سلوک کی منازل کے تمام فاصلے سمٹا کر اس کو پروانے کے اضطراب اور شمع کے گرد طواف پر لے آئی۔ حافظ شیرازی نے کیا خوب کہا: ؎

آتش آن نیست کہ از شعلۂ آن خندد شمع
آتش آن است کہ بر خرمنِ پروانہ زدند

(آگ وہ نہیں ہے جس کے شعلے سے شمع مسکراتی ہے، بلکہ آگ تو وہ ہے جس سے پروانے کے کھلیان کو جلا دیا گیا ہے۔)

قدیم شعراء تو فی الحقیقت آتش کدے اور زرتشتی تصورات کو آگ کے ضمن میں پیش کرتے رہے ہیں۔ کچھ مثالیں درج ذیل ہیں۔ عسجدی نے کہا ہے: ع

''برخیز و بر افروز ھلہ قبلۂ زرتشت''

(اُٹھ اور جلدی سے زرتشت کے قبلہ یعنی آگ کو روشن کر دے۔)

افضل الدین بدیل خاقانی نے کہا ہے: ؎

اگر قیصر بیگالد رازِ زردشت
کنم تازہ رسومِ ژند و اوستا

بگویم کانچہ ژند است و چہ آتش
کزان پاژند و ژند آمد مسما
چہ اخگر ماند ازان آتش کہ وقتی
خلیل اللہ در آن افتادہ دروا

(اگر قیصر زردشت کے راز سمجھ لے تو میں ژند اور اوستا کی رسوم کو زندہ کر دوں' پھر میں بتاؤں کہ کتابِ ژند کیا ہے اور آگ کیا ہے اور ژند و پاژند کے کیا معانی ہیں' اس آگ میں اَنگارے کیا باقی رہ سکتے ہیں جس کے دامن میں خلیل اللہ کو ڈال دیا جائے؟)

کسی اور نے کہا ہے:

زردشت کہ آتش را بستاید در ژند
زانست کہ بامے بہ فروغ است همانند

(زردشت نے ژند میں آگ کی اس لیے تعریف کی ہے کہ وہ آب و تاب میں شراب کی طرح دکھائی دیتی ہے۔)

علامہ اقبال کے ہاں آگ اور زرتشت کا ذکر بھی ملتا ہے اور آپ یہ فرماتے ہوئے کہ میرا پیغام آنے والے وقتوں کے لوگوں کے لیے ہے اور میرے بعد میرے کلام کے رموز و معانی لوگوں پر منکشف ہوں گے' اس امر کا برملا اظہار کرتے ہیں:

انتظارِ صبحِ خیزاں می کشم
اے خوشا زرتشتیانِ آتشم

(میں صبح صبح بیدار ہونے والے لوگوں کا انتظار کر رہا ہوں۔ آفرین ہے میری آگ کے زرتشتیوں پر۔)

شہنشاہ کی شخصیت کا طلسم

اس میں ذرا سا بھی شک نہیں ہے کہ ایران میں بادشاہت کے قیام کے بعد شاہ کی ذات کو انسانی اور ملکوتی اوصاف کا مجموعہ قرار دے کر اسے خداوندِ خلاّق (اہورامزدا) کا مظہر اور پرتَو قرار دے دیا گیا۔ چونکہ اس کی ذات کا شاہی خاندان کے موروثی نظام کے

باعث تعین ہوتا تھا اس لیے شاہی خون کے تقدس کے نظریات بھی مسلمہ امر کے طور پر قبول کر لیے گئے۔ شاہ کا جلال اور دبدبہ اسی وجہ سے قائم رہ سکتا تھا کہ وہ عوام سے دور رہ کر دربارِ شاہی کی رونقوں میں جلوہ افروز ہو۔ اس کی ذات سے بادشاہت کا مرکز ہونے کے باعث کچھ ایسے تقاضے کیے جاتے تھے جنہیں بہر صورت پورا کیا جانا ضروری تھا۔ ان میں شاہ کا علم و شعور، اس کی دانش و تدبر اور جرأت و دلاوری لازمی نکلتے تھے۔ جنگ و جدال کے موقع پر شاہ کو عموماً خود میدان میں اترنا ہوتا تھا اور شاہ کی موجودگی ملتِ ایران کے اتحاد کی علامت اور مظہر تھی۔ عوام کی بادشاہ سے وفاداری اور جان نثاری کسی بھی شک و شبہ سے بالاتر تھی۔ مشہور بادشاہ خسایارشاہ جب یونان و مصر پر قبضہ کے بعد مصر میں کشتی پر سوار ہو کر وطن واپس آ رہا تھا تو وزن کی زیادتی کے باعث ایک موقع پر کشتی ڈگمگانے لگی۔ ملاح نے کہا کہ اگر کچھ لوگ سمندر میں چھلانگ لگا دیں تو شاہ کو بچایا جا سکتا ہے۔ روایات کے مطابق کشتی میں ڈیڑھ سو افراد سوار تھے۔ شاہ نے کہا کہ کون ہے جو اپنے بادشاہ کو بچانے کے لیے سمندر میں کود جائے؟ یہ سنتے ہی بلا حیل و حجت سب نے سمندر میں چھلانگیں لگا دیں۔

شروع شروع میں روم کے بادشاہ نے سادگی کا شعار اختیار کیا تھا اور عیسائیت قبول کرنے کے بعد بادشاہوں میں میانہ روی اور منکسر المزاجی کے جذبات پیدا ہو گئے تھے، لیکن ایرانی دربار میں رومی سفراء کی آمد و رفت سے ایرانی دربار کے پروٹوکول اور عظمت کی خبریں روم پہنچیں تو وہاں پر بھی ایرانی طریق کار اپنایا جانے لگا۔ دراصل یورپ و مشرق کے درباری آداب ایرانی بادشاہت سے متاثر ہوئے ہیں۔

اسلام کے فروغ کے بعد خاندانی تقدس اور خونی اصالت کا ایرانی نظریہ بالآخر اسلام میں بھی در آیا۔ امام زین العابدینؒ کی زبان سے ایرانی کتب میں روایت پائی جاتی ہے کہ میں سب سے نجیب انسان ہوں، ایک طرف میں نواسۂ رسول کا فرزند ہوں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا پوتا ہوں تو دوسری طرف میں ایران کے ساسانی شہنشاہ یزدگرد سوم کا نواسہ ہوں۔ اس طرح خاندانِ نبوت اور خاندانِ شہنشاہی کا امتزاج ہوں۔ یہ

اصالتِ نسب وخون ہمیں مذہبی نظریات میں بعد کے ادوار میں بھی جلوہ فگن ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔

اسی طرح جب اسلام میں بادشاہت کی طرف میلان ہوا تو خاندانِ بنی اُمیہ کے بادشاہوں نے اپنے حساب کتاب کے لیے ایرانی دیوانوں کو مقرر کیا اور ان کی مدد سے کامیابی سے اپنا مالیاتی نظام چلایا۔ عباسی سلطنت کے قیام میں تو ایرانیوں کی گہری دلچسپی اور تعاون شامل رہا ہے اور پھر مامون الرشید تو تھا ہی ایرانی ماں کے بطن سے۔ اس طرح عباسی حکومت کا دارالخلافہ بغداد بھی اسی خطہ میں شامل تھا جو طیسفون کے نام سے ایرانی بادشاہت کا کبھی مرکز رہا تھا۔ ہمیں بنو عباس کے اس شاہی نظام میں ہر لحاظ سے گہرے ایرانی اثرات ملتے ہیں۔ پھر ایک موقع یہ بھی آیا کہ مسلمانوں میں بطور اولوالامر شاہِ وقت کی اطاعت کرنا لازم قرار دے دی گئی اور شاہ کو ظلِ الٰہی کا درجہ حاصل ہوا۔ آج برصغیر میں بادشاہت کو ختم ہوئے مدت ہوگئی ہے مگر اب بھی علماء کے خطبوں میں سلطانِ وقت کی اطاعت اور اس کے حکم کو خدائی حکم کے ہم پلہ قرار دیے جانے کی تکرار محراب و منبر میں بدستور جاری وساری ہے۔

یہودیوں نے بھی ایرانی ہخامنشی بادشاہت کو قریب سے دیکھا اور پھر وہ ایرانی لشکر کے تعاون سے فلسطین میں دوبارہ داخل ہو کر ایک حکومت کے وارث قرار پائے جو ہخامنشی سلطنت کے زیرِ سایہ پنپتی رہی۔ انہوں نے خدائے ذوالجلال کی ہیبت وعظمت کا موازنہ بھی ایرانی بادشاہ سے کیا اور فرشتوں کو خدا کے درباریوں کی صورت میں پیش کیا۔ یہ صورتِ حال ہمیں دبے دبے لفظوں میں کچھ مفسرین کے ہاں بھی ملتی ہے۔

ایرانی میدانِ جنگ

مسلمانوں نے فنِ حرب وضرب میں بھی ایرانی تجربات سے خوب استفادہ کیا ہے۔ جنگِ خندق سے قبل آنحضورﷺ نے بذاتِ خود حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے تزویراتی امور میں مشورہ لیا اور خالصتاً ایرانی طریقہ سے دفاعی جنگ لڑی۔ اس کے بعد مسلمانوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں ایرانیوں سے طویل جنگ کے نتیجے میں بہت

کچھ سیکھا۔ پھر جب ایرانیوں نے اسلام قبول کیا تو اپنے بہت سے فنونِ حرب وضرب اور دیگر فنونِ دفاع و جنگ اسلام میں لے آئے۔ پھر وہ اسلام کے بازوئے شمشیرزن بن کر میدانِ عمل میں اترے۔ ہمیں برصغیر پر ابتدائی حملہ میں محمد بن قاسم کے ہمراہ ہزارہا ایرانی (صوبہ فارس سے تعلق رکھنے والے) سپاہیوں کی موجودگی کا پتا چلتا ہے۔ محمود غزنوی کے ہمراہ آنے والوں میں ایرانی فوجیوں کے علاوہ عنصری اور فرخی سیستانی جیسے عظیم فارسی شعراءِ ایران بھی میدانِ عمل میں ساتھ ساتھ ہوتے تھے جنہوں نے اپنے جنگی واقعات شعروں میں قلمبند کیے ہیں۔ ظہیر الدین بابر کو اکثر اوقات وسط ایشیا کے حملوں میں ایرانی سپاہ کی حمایت حاصل رہی ہے۔ اسی طرح ہمایوں کے ہمراہ ہندوستان کی دوبارہ تسخیر تو ایرانیوں کی وجہ سے ہی ممکن ہوئی تھی۔ اسی طرح برصغیر کے تمام مسلمان بادشاہوں اور سلطانوں (خصوصاً عہدِ مغلیہ) کے ہاں فوجی افسروں کی واضح اکثریت فارسی بولنے والے افراد پر مشتمل رہی ہے۔

علاوہ بریں ایرانیوں کا معمول رہا ہے کہ وہ طویل عرصہ تک جنگ لڑنے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتے ہیں اور اپنی قوم کے وقار کی بحالی کے لیے سالہا سال تک جنگ لڑ سکتے ہیں۔ ایک موقع پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایرانیوں سے جنگ کے موقع پر فرمایا تھا کہ اے کاش! ہمارے اور ملتِ ایران کے مابین آگ کے پہاڑ ہوتے' نہ وہ ہماری جانب بڑھتے اور نہ ہی ہمیں ان سے جنگ لڑنا پڑتی۔ یہ چیز ہم ان کی رومیوں سے ہونے والی خونریز جنگوں میں بھی دیکھتے ہیں اور یہی جذبہ اسلامی سپاہ کے حملے کے موقع پر نظر آتا ہے۔ اسی طرح زمانۂ جدید میں اس کا مظاہرہ ہم ایران اور عراق جنگ کی طوالت کی صورت میں دیکھتے ہیں۔ ان جنگوں میں ان کا جذبہ یہی ہوتا ہے کہ اپنے تمام وسائل یکجا کر کے خود کو ذلیل وخوار ہونے سے بچا سکیں۔ بقول فردوسی: ؎

همه سر به سر بهرِ کشتن دهیم
ازان به که ایران به دشمن دهیم

(ہم ایک ایک کر کے اپنے سر کٹا دیں یہ اس سے بہتر ہے کہ ہم ایران دشمن کے

سپرد کر دیں۔)

یہ شعر بھی فردوسی طوسی نے ہزار برس قبل ایران پر اسلامی سپاہ کی فتح کا بیان کرتے ہوئے کہا تھا۔

جذبہ حُبّ الوطنی اور قوم پرستی

حبِ وطن ایرانیوں کا شیوہ رہا ہے۔ انہیں اپنی تہذیب، زبان، تمدن، تاریخ اور سرزمین پر فخر رہا ہے۔ وہ غیر ملکی قبضہ سے نفرت کا اظہار کرتے رہے ہیں۔ ایران کی مملکت سکندرِ اعظم، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور چنگیز و ہلاکو خان کے ہاتھوں غیر ملکی قبضے میں گئی ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ سے ان کی ایک گونہ نفرت کی وجہ ایران کی سلطنت کا انقراض اور ایرانی فخر و مباہات کا خاتمہ تھا۔ حضرت عمر فاروقؓ کی فتح کے بعد یہ بات انتہائی اہم ہے کہ ایرانی قریب قریب بحیثیت قوم مسلمان ہو گئے تھے۔ ہر چند اسلام کے دین مبین، قرآن کے ابدی اصولوں اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر وہ ایمان لے آئے تھے لیکن اسلامی فاتحین سے جبلی نفرت ہمیں بعد کے ایرانی افکار میں ہر کہیں پر دبے دبے انداز میں ابھرتی ہوئی نظر آتی ہے۔

ہم علامہ اقبال کے ضمن میں ایرانی پروفیسر پورِ داؤد کا ایک بار پھر ذکر کریں گے۔ یہ وہی پروفیسر ہے جس کا تمام تر تحقیقی کام اور تخصص قبل از اسلام کے ساسانی ادب اور تاریخ سے ہے۔ اس نے ایک بار ہندوستان کے سفر (قبل از تقسیم ہند) کے موقع پر علامہ اقبال کی ذات کے بارے میں چند ایک قابلِ اعتراض جملے بھی کہے تھے۔ چونکہ استاد پورِ داؤد کی تمام تر تصانیف زرتشتی ایران کی تجلیل و تمجید کے بارے میں رہی ہیں، ہم یہاں پر اس کے اشعار کی رو سے ہرمزان (ایرانی جرنیل) اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے مکالمہ کے بارے میں قارئین کو متعارف کرواتے ہیں: ؎

چو شد واژگون تختِ ساسانیان
مداین بیغما شد از تازیان

(جب ساسانیوں کا تختہ الٹ گیا اور ایران کا دار الحکومت مدائن عربوں کے ہاتھ

مالِ غنیمت کی صورت میں لگا۔)

سپاہِ عمر تا بہ جیحوں رسید
بخون خفتہ شہزادگان را بدید

(عمر کی فوج دریائے جیحوں کے کنارے تک جا پہنچی اور اس فوج کے ہاتھوں شہزادے خون میں لت پت ہوکر دم توڑ گئے۔)

یلِ نامور ہرمزانِ دلیر
کشیدہ بہ زنجیر برسانِ شیر

(مشہور بہادر پہلوان ہرمزان کو شیر کی طرح جکڑ کر لے جایا گیا۔)

ببردندش سوی مدینہ دوان
بہ نزدِ عمر رہبرِ تازیان

(اس حالت میں اسے دوڑاتے ہوئے مدینہ میں عربوں کے سربراہ عمر کے پاس لے گئے۔)

نگہ کردش آن تازیٔ کینہ جُوی
پس آنکہ کشود آن لبِ گفتگوی

نعوذ باللہ نقل کفر کفر نباشد (اس کینہ جُو عرب نے اس پر غصے سے ایک نظر دوڑائی اور پھر گفتگو شروع کی۔)

ہر آنکس بہ اسلام جنگ آورد
سرش را خدا زیرِ سنگ آورد

(جو بھی اسلام کے خلاف برسرپیکار ہوتا ہے خدا اس کا سر پتھروں سے ڈھک دیتا ہے۔)

ہم مزید شعر بیان کیے بغیر مذکورہ بالا اشعار کے ذریعے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خلاف روایتی ایرانی عناد کے بارے میں معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ چیز دراصل ادب، شعر اور تاریخ میں جلوہ گر رہی ہے۔ شکست خوردہ حالت میں بھی ایرانی اپنی عزتِ نفس اور فخر کا جذبہ قائم رکھنے کی کوشش ضرور کرتے نظر آتے ہیں۔ ایرانی ہر اُس شخص کو اپنا

بدترین دشمن سمجھتے ہیں جواُن کے شعائر اور قومی روایات کی تحقیر کرتا ہو۔ وہ سکندرِ اعظم سے شکست خوردگی کے بعد بھی اپنے آپ کو تسلی دلانے کے لیے من گھڑت حکایات بیان کرنے سے نہیں چوکتے۔ سکندرِ اعظم کو وہ ایرانی بادشاہ داریوش سوم کا بیٹا ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور بیان کرتے ہیں کہ داریوش (یا دارا) نے سکندر کے باپ فیلپ مقدونی سے اس کی بیٹی کا رشتہ مانگا اور پھر وہ اسے بیاہ کر ایران لے آیا اور پھر کچھ عرصہ بعد واپس یونان بھیج دیا جہاں اس عورت نے داریوشِ سوم کے بیٹے کو جنم دیا جسے سکندر کا نام دیا گیا۔ اس کہانی کو فردوسی اس طرح بیان کرتا ہے:۔

دلِ بادشاہ سرد گشت از عروس

فرستاد بازش سرِ فیلپوس

(جب بادشاہ یعنی دارا کا دل اس دلہن سے اکتا گیا تو اسے واپس اس کے باپ فیلپ کے پاس بھجوادیا۔)

چو نُہ ماہ بگذشت از آن خوب چہر

یکی کودک آمد چو تابندہ مہر

(جب نو ماہ پورے ہوئے تو اس سورج جیسی خوبصورت خاتون نے ایک بچہ جنم دیا۔)

زبالا و رنگ و زبوی و برش

سکندر ہمی خواندی مادرش

(اس کے قد اور جسم میں خوبصورتی اور رنگ و بو کا سماں تھا جس کی وجہ سے ماں نے اسے سکندر کہا۔)

ہمی گفت قیصر بہر مہتری

کہ پیدا شد از نسلِ من قیصری

(شرم کو چھپانے کے لیے فیلپ نے سرداروں میں مشہور کر دیا کہ میرے ہاں ایک شہزادے نے جنم لیا ہے۔)

ہمی ننگش آمد کہ گفتی بہ کس
کہ دارا ز فرزندِ من کرد بس

(اسے وہ ماجرا سناتے ہوئے شرم آ رہی تھی جو اس کی بیٹی پر دارا کے ہاتھوں بیتا تھا۔)

اسی طرح کی من گھڑت داستانیں اور احساسات ایران کے ماضی پر فخر کرنے کا جواز مہیا کرتی تھیں اور ایرانی ایک موقع پر تو اس قدر قدیم ساسانی اور ہخامنشی عہد کی تواریخ کے دامن میں پناہ لینے لگے کہ ان کے ہاں اسلام کا جذبہ ماند پڑتا ہوا نظر آنے لگا۔ اس قومی جذبے کو اشتعال دلا کر محمد رضا شاہ پہلوی نے ایرانی قومیت کی اساس پر اپنی بادشاہت کو مستحکم کرنا چاہا تھا اور یہی وہ وقت تھا جب علامہ اقبال کو ایران کے حد سے بڑھے ہوئے جذبۂ قومیت اور عربوں سے نفرت پر دلی دکھ ہوا تھا۔ مثال کے طور پر ہم پھر یہاں پر پورِ داؤد کے شعر بیان کرتے ہیں:۔

فرو فیروزیٔ ملتِ ما پیداست ہنوز
کیشِ زرتشت ز آتش کدہ برجاست ہنوز
تختِ جمشید بلند اختر برپاست ہنوز
طاقِ کسریٰ بلب دجلہ ہویداست ہنوز
ماند آن ملک کزو ماند بجا نام و نشان

(ہماری قوم کی کامیابی کے نشان اور کر و فر اب بھی ظاہر ہیں۔ آتش کدوں کے نشانات کے باعث زرتشت کا دین اب بھی زندہ ہے۔ اپنی تمام تر شان و شوکت کے ہمراہ تختِ جمشید اب بھی قائم و دائم ہے اور دجلہ کے کنارے طاق کسریٰ کے اب بھی نشانات موجود ہیں۔ جس ملک کا نام و نشان باقی ہو وہ ملک قائم رہتا ہے۔)

یہ جذبہ اس حد تک بڑھا ہوا تھا کہ اس صدی کے آغاز میں ایک مشہور ایرانی عالمِ دین نے کہا تھا کہ ہم اپنے ملک میں گھس کر آنے والے ہر شخص کو پہلے قتل کریں گے پھر یہ دیکھیں گے وہ مختون ہے یا غیر مختون۔ پہلے ہم یہ دیکھنے کی کوشش نہیں کریں گے کہ

آیا وہ مسلمان ہے بھی یا نہیں۔ یہی قوم پرستی کا جذبہ تھا جس کے تناظر میں ہمیں ایران کی جدید تاریخ کا مطالعہ کرنا ہوگا اور اس قوم کے جذبات کو سمجھنا ہوگا۔

تاریخ میں جہاں شکست خوردگی اور ہزیمت کا ذکر آئے گا وہاں پر ایرانی حماسہ سرائی کے ذریعہ دردمندانہ اور آرزومندانہ رزمیہ شعر کہتے ہوئے قوم کو بیداری کے لیے اکسائیں گے۔ یہی بات نہ صرف ہمیں مرثیہ میں نظر آتی ہے بلکہ ایران کی قومی تحریکوں کے احیاء میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ جس طرح اساطیری عہد کے ایران میں ایک لوہار کاوہ نے ضحاک جیسے ظالم غیر ملکی حکمران کے استبداد کے خلاف اپنا علَم بلند کر کے قوم کو بیدار کیا تھا اسی طرح ساسان نے اپنے معبدِ ناہید سے نکل کر قوم میں نئی روح بیدار کی تھی۔ کسی شاعر نے انقلاب سے چند برس قبل کیا خوب کہا تھا: ؎

ایرانیان کہ تختِ کیان آرزو کنند
باید نخست کاوہ خود جستجو کنند

(اہلِ ایران جو تختِ کیان کی آرزو لے کر آہیں بھر رہے ہیں انہیں چاہیے کہ سب سے پہلے وہ اپنا کاوہ تلاش کریں۔)

اس سے مراد یہ ہے کہ وہ ایسے مردِ آزاد کی قیادت تسلیم کریں جو اُن کو جدوجہد کی مشکلات سے گزارتا ہوا منزلِ مقصود تک پہنچا دے۔

اس قومی جذبے نے نہ صرف ایران کی زبان اور روایات کو زندہ رکھا بلکہ ہر دَور میں ان کا قومی مزاج بھی بحال رہا۔ اسی مزاج کا اثر تھا کہ وقت آنے پر یہ قوم سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر ہر چیلنج کے مقابلے میں ڈٹنے کی اعلیٰ صلاحیت کا مظہر بن کر اُبھرتی رہی ہے۔ وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ قومی جذبات میں اسلام کا مذہبی جذبہ بھی شامل ہو گیا اور پھر قومیت کا اور مذہب کا امتزاج ایک خوبصورت رُخ اختیار کر گیا۔

ایرانی طرزِ فکر

ایران میں عظیم سلطنت کا ایک عرصہ تک وجود رہا ہے۔ اسی وجہ سے وہاں پر ایک منظم مالیاتی نظام، فوجی نظم و نسق اور قانون و آئین کا دَور دَورہ رہا ہے۔ اسلام قبول

کرنے کے بعد قانون سازی' اجتہاد اور فقہ کی تدوین و ترقی میں اُن کا یہ جذبہ بروئے کار آیا۔ نہ صرف امام ابو حنیفہؒ جیسے عظیم فقیہہ یہاں پر پیدا ہوئے بلکہ رازی اور غزالی جیسے مفکرین' شہاب الدین سہروردی جیسے خود شناس صوفی بزرگ اور مولانا روم اور سنائی و عطار جیسے پُر جوش روحانیت کے داعی بھی ایران ہی میں پیدا ہوتے رہے ہیں۔ سعدی و جامی اور حافظ کی شاعری ہو یا سعدی و رومی و عطار کا فلسفۂ اخلاق' غزالی کی کردار سازی ہو یا مذہبی مسائل کا استدراک' رازی کا استدلال اور منطق ہو یا امام مسلم کی تحقیق و تفحص' حضرت عبدالقادر گیلانی کی خداشناسی اور درویشی ہو یا سید علی ہمدانی کی تبلیغ' یہ تمام جہتیں انہی جذبات و تفکرات کی آئینہ دار نظر آتی ہیں۔

ابن سینا' نصیر الدین طوسی' عطا ملک جوینی اور ملا صدرا جیسے مفکرین کہاں نظر آتے ہیں! اسی طرح معین الدین چشتی اجمیری اور جلال الدین تبریزی (سلہٹی) کے درجہ کے صوفیاء اور مبلغینِ باعمل صرف اسی خاک سے جنم لے سکتے تھے۔ یہی ذہنی کشمکش ہمیں علامہ اقبال کے تفکرات میں جلوہ فگن نظر آتی ہے جہاں آپ فرماتے ہیں: ؎

اسی کشمکش میں گزریں مری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و سازِ رومی' کبھی پیچ و تابِ رازی

اور کبھی فرماتے ہیں: ؎

سنائی کے ادب سے مَیں نے غوّاصی نہ کی ورنہ
ابھی اس بحر میں باقی ہیں لاکھوں لولوئے لالا!

یہ تفکر' تعمق' استدلال' جذبہ اور جوش ہمیں کسی اور قوم کے ادباء و شعراء اور صوفیاء میں نظر نہیں آتا۔ حضرت علی ہجویریؒ کی تصوف کے موضوع پر لکھی گئی پہلی فارسی کتاب **کشف المحجوب** سے لے کر علامہ اقبال کی ارمغانِ حجاز تک کا نو سو برس پر محیط دور لاہور کے ایرانی اور عجمی فکر کا آئینہ دار ہے۔ کہیں ہمیں قرونِ اولیٰ کا مسعود سعد سلمان لاہوری نظر آتا ہے کبھی مغلیہ دور کا ملا شاہ بدخشی' کہیں حضرت میاں میر کی ذاتِ گرامی ہے اور کہیں لاہور کے قیام کے دوران صائب تبریزی کی غزلیات۔ راقم الحروف نے بہت پہلے لکھا تھا: ؎

بس معطر می کند ہر گوشۂ لاہور را
آن نسیمی کو بیاید از صفاہانِ شما

(لاہور کے ہر گوشے کو وہ بادِ نسیم جو تمہارے اصفہان سے چل کر آ رہی ہے، پوری طرح معطر کر رہی ہے)

انہی ایرانی الاصل مبلغین کا استدلال ہی تو تھا کہ اسلام کی اشاعت و تبلیغ کے نتیجہ میں ہمارے آباء واجداد نے کلمۂ حق پڑھ کر کفرستانِ ہند میں طرحِ حرم رکھ دی۔

ایرانی جشن

ایرانی بہار کی آمد اور شیطانی غلبہ سے آزادی کی یاد میں جشنِ نوروز مناتے چلے آ رہے ہیں اور اسے عید کا درجہ دیتے رہے ہیں۔ اسی طرح موسم سرما میں ان کی عید مہرگان ہے۔ یہ دونوں عیدیں رسول اللہ ﷺ کی ہجرت تک مدینہ منورہ میں بھی منائی جاتی تھیں۔ آپ ﷺ نے ان کو منسوخ فرما کر عید الفطر اور عید الاضحیٰ منانا شروع کیا۔ ہمارے ایرانی احباب ایک حدیث بیان فرماتے ہیں جس کے مطابق آنحضور ﷺ نے مدینہ منورہ میں عیدِ نوروز کا حلوہ بھی تناول فرمایا تھا اور خوشی کا اظہار کیا تھا۔ یہ عید ابھی تک ایران اور فارسی بولنے والے دیگر ممالک میں منائی جاتی ہے۔ محمود غزنوی کے دربار میں پڑھے گئے عیدِ نوروز کے قصائد ابھی تک موجود ہیں اور مغلیہ دَور میں اورنگ زیب عالمگیر کے عہد تک ہمیشہ عیدِ نوروز پورے جوش و جذبہ سے منائی جاتی رہی۔ جہانگیر نے تو اپنی توزک کے ابواب کو جب مختلف سالوں کے احوال پر تقسیم کیا تو ہر باب کو روزِ نوروز کا نام دیا۔ پہلے سال کو وہ روزِ اول نوروز اور دوسرے برس کو روزِ دوم نوروز سے یاد کرتا ہے۔ پاکستان کے دور دراز کے علاقوں میں کہیں کہیں ابھی تک نوروز کا میلہ منعقد ہوتا ہے۔ سکھوں کی بیساکھی بھی تو نوروز کی صورت ہی ہے۔ آج بھی نوروز کا تہوار ایران میں سرکاری طور پر منایا جاتا ہے اور منایا جاتا رہے گا۔ ہمارے ہاں عید کے پکوان اور اس موقع پر ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا اور کھانے پیش کرنا، یہ کسی حد تک نوروز کے جشن سے مماثلت رکھتے ہیں۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور سلطنتِ فارس

ایران کے مذاہب

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت کے موقع پر ایرانی جزیرہ نمائے عرب، شام اور یمن پر چھا چکے تھے۔ عیسائیوں کی حیرہ و نجران کی ریاستیں ایرانی خطے کی حدود میں ہی قائم تھیں۔ یہ ریاستیں زیادہ تر نسطوری عیسائیوں کی آبادی پر مشتمل تھیں، جنہیں رومیوں نے مسلکی اور فکری اختلاف کے باعث اپنی سلطنت سے نکال دیا تھا۔ یہ لوگ نہ تو حضرت مریم سلامٌ علیہا کو خدا کی بیوی مانتے تھے نہ ہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا۔ اس طرح نہ تو وہ روایتی تثلیث کے قائل تھے اور نہ ہی وہ ذاتِ حضرت مسیحؑ میں الوہی خصوصیات کی موجودگی پر یقین رکھتے تھے۔ یہ لوگ ایران میں پناہ گزین کی حیثیت سے داخل ہوئے اور پھر انہیں عزت و احترام دیا گیا۔ انہوں نے خوزستان (ایرانی صوبہ) میں جندی شاہ پور کا شہر آباد کیا اور وہاں پر ایک عظیم یونیورسٹی کی بنیاد رکھی جہاں پر طب کی تعلیم دی جاتی تھی۔ یہ یونیورسٹی عباسی عہد تک قائم رہی۔ سرزمینِ حجاز سے بھی کچھ لوگ وہاں تعلیم کے حصول کے لیے جاتے رہے۔ انہی نسطوری عیسائیوں کے گروہ در گروہ ایران میں راہبوں کا لباس پہن کر جگہ جگہ رکتے، تبلیغ کرتے اور آگے نکل جاتے۔ اسی طرح کے ایک گروہ کے ہمراہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے چل کر بیت المقدس کی جانب اپنے طویل سفر کا آغاز کیا تھا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معاصر ایرانی بادشاہ خسرو پرویز کی بیوی شیریں بھی ایک عیسائی خاتون تھی۔ یہ وہی خاتون ہے جس کا ذکر فرہاد و شیریں کی عشقیہ داستان کے ضمن میں آتا ہے۔ اس طرح ایران کے مغربی علاقوں میں عیسائیت کے گہرے اثرات موجود تھے اور پورے ملک فارس میں عیسائی راہبوں کے قافلوں کی نقل و حرکت کے باعث عیسائیت کافی حد تک ایران میں

متعارف ہو چکی تھی۔

یہودیوں کے اثرات بھی کسی نہ کسی حد تک ایران میں موجود تھے۔ ہخامنشی عہد میں آج سے قریباً ۲۵۵۰ برس قبل ایرانی بادشاہ کوروشِ اعظم (Cyrus the Great) نے ایک کامیاب یلغار کے بعد یہودیوں کو بابل کے کلدانی حکمران کی ستر سالہ قید سے نجات دلوائی تھی اور انہیں دوبارہ سرزمینِ فلسطین میں آباد کیا تھا۔ اس نے اپنے خرچ سے بیت المقدس اور ملحقہ بستیاں تعمیر کروائی تھیں۔ یہ واقعہ حضرت عزیرؑ کی طویل نیند کے زمانے کا تھا اور آپؑ نے اپنی بیداری کے بعد فلسطین کو جو شاد و آباد دیکھا تھا اس کا تعلق کوروشِ اعظم کی اس خطہ کی از سرِ نو تعمیر سے وابستہ تھا۔ عموماً یہودیوں کے ساتھ اہلِ فارس کے اچھے روابط رہے اور یہ لوگ تجارتی مقاصد کے لیے نہ صرف سلطنتِ فارس کا سفر کرتے رہے بلکہ سرزمینِ ہند اور چین تک کے سفر کرتے رہے۔ چین اور ہند کے جنوبی علاقوں میں یہودی تجارت کے جو آثار ملے ہیں ان کے مطابق یہ لوگ (یہودی تاجر) فارسی زبان میں اپنا حساب کتاب رکھتے تھے۔ یہودیوں کی ایک قلیل تعداد سلطنتِ فارس کے مرکز میں آباد تھی اور اب تک آباد چلی آ رہی ہے۔

ہندوستان سے جب بدھ مذہب کے پیروکاروں کو جلاوطن کیا گیا تھا تو یہ لوگ مشرقی ایران میں داخل ہو گئے تھے اور یہاں سے وسطی ایشیاء کے راستے چین میں داخل ہوئے تھے۔ سلطنتِ فارس کے شمال مشرقی (خراسانی) حصوں میں بدھ مذہب کے معابد اور بُت خانے موجود تھے۔ بلخ میں نوبہار کا معبد خاص اہمیت کا حامل تھا۔ خاندانِ برامکہ (جس نے عباسی دور میں عروج و زوال کا امتزاج دیکھا تھا) کے اسلاف اسی معبد کے مدار المہام یا پروہت تھے۔ اس طرح سلطنتِ فارس کے شمالی اور انتہائی مشرقی خطوں میں بدھ بھکشو اپنے کشکول لیے، گیروا لباس پہنے، اپنے ریش و ابرو اور سر منڈوائے ناقوس بجا رہے تھے۔

سلطنتِ فارس کی حدود میں ہندوستان کے شمال مغربی خطے بشمول پنجاب و کشمیر بھی شامل تھے اور اس طرح ہندو مذہب اور جین مذہب کے اثرات بھی اس سلطنت پر

موجود تھے۔ ایرانی کسی نہ کسی حد تک اس مذہب کی رسوم و روایات اور طرزِ زندگی سے واقف ضرور تھے۔

سلطنتِ فارس میں دو مذاہب مانوی اور مزدکیت بھی وجود میں آئے تھے اور آتے ہی ختم ہو گئے تھے، مگر ان کے اثرات عرصہ دراز تک لوگوں کے ذہنوں میں باقی رہ گئے تھے۔ مانوی مذہب کا بانی مانی (۲۱۵ء۔ ۲۷۵ء) تھا۔ وہ یونانی ادب، فلسفہ، موسیقی، مصوری، ہیئت اور طب کا ماہر تھا۔ اس کے ہاں زردشتی اور عیسائی عقائد کا امتزاج نظر آتا ہے۔ وہ مادہ اور روح کو ایک دوسرے کی ضد قرار دیتا ہے۔ وہ اس جہان کو نور اور تاریکی کی آمیزش قرار دیتا ہے۔ وہ روشنی کو اعلیٰ و ارفع قرار دیتا ہے اور تاریکی کو ادنیٰ۔ اس کا خیال تھا کہ روشنی اور تاریکی کو زبردستی آپس میں ملایا گیا ہے اور بالآخر انہیں الگ ہو کر ہی رہنا ہے۔ مادہ اندھا ہے اور عقل اور ارادے سے محروم بھی۔ اس میں اگر حرکت ہے تو وہ روح کے ملنے کی وجہ سے ہے۔ مادے نے بالآخر تاریکی کی طرف لوٹنا ہے اور روح کو مادے سے نجات حاصل کرنے کے لیے کوشش کرنا ضروری ہے۔ وہ تخلیقِ کائنات کو شر کی تخلیق قرار دیتا تھا اور ہستیِ مطلق یعنی خدا کو نورانی کائنات کا باپ قرار دیتا تھا۔ وہ جسم کو رُوح کا قید خانہ قرار دیتا تھا۔ وہ آواگون یعنی تناسخ کا قائل تھا۔ وہ شادی بیاہ اور بچے پیدا کرنے کو بھی گناہ قرار دیتا تھا اور تجرد کی تلقین کرتا تھا۔ وہ کھانا کھانے سے اجتناب کا درس دیتا تھا۔ اس کے پیروکار گوشت نہیں کھاتے تھے، صرف سبزی خور تھے اور دُنیوی مال و متاع سے پرہیز کرتے تھے۔ یہ لوگ خانہ بدوش تھے۔ وہ ایک دن کی خوراک اور ایک سال کے لیے کپڑوں سے بڑھ کر کوئی چیز اپنے پاس نہیں رکھتے تھے۔ اس کے پیروکاروں کا خیال تھا کہ ان کے دلوں پر چار مہریں (محبت، ایمان، خوف اور عقل نیک کی) لگی ہوئی تھیں۔ وہ سال میں پچاس دن کا روزہ رکھتے اور عبادات پر زور دیتے تھے۔ یہ لوگ حضرت مسیح علیہ السلام سے بھی عقیدت کا اظہار کرتے تھے۔ ساسانی بادشاہ شاہ پور نے ۲۷۵ء میں اس مذہب کے بانی مانی کو بابل میں سولی پر لٹکا دیا تھا۔ یہ مذہب ایران میں ختم ہو گیا، مگر اس کے پیروکار ایران سے

باہر شمالی افریقہ اور یورپ تک چلے گئے اور اس مذہب کے مظاہر کشمیر اور تبت تک کی غاروں میں اب بھی نظر آتے ہیں۔ ان کے عقائد کے اثرات بعد میں تصوف پر بھی مترتب ہوئے۔

اسی طرح ایک خالص ایرانی مذہب مزدکیت کا تھا۔ اس کا زمانہ تاریخی اعتبار سے اسلام سے قریب تر تھا اور اس مذہب کا بانی مزدک ۵۲۸ء یا ۵۲۹ء میں شہزادہ خسرو (خسرو نوشیروان) کے سپاہیوں کے ہاتھوں قتل ہو گیا تھا۔ ساسانی بادشاہ قباد نے مزدکی مذہب قبول کر لیا تھا اور یہ مذہب اشتراکیت کی ابتدائی صورت معلوم ہوتا ہے۔ وہ اسباب دُنیوی، مال و متاع اور حتیٰ کہ خواتین کی حد تک اشتراک کا قائل تھا۔ وہ گوشت خوری، شکار، جنگ و جدال اور خونریزی کا مخالف تھا۔ وہ دنیا کی تخلیق کو تین عناصر آگ، پانی اور مٹی کا امتزاج قرار دیتا تھا اور اس کا خیال تھا کہ اگر ان عناصر میں اعتدال رہے تو خیر وجود میں آتا ہے اور اگر اعتدال ختم ہو جائے تو شر۔ وہ ذہانت، حافظے، عقل اور توکل کو ذاتِ خداوندی کی خصوصیات قرار دیتا تھا۔ اس کے پیروکاروں نے شاہی گودام اور خوراک کے ذخائر لوٹ کر لوگوں میں تقسیم کر دیے تھے۔ وہ ایک ہی جیسا لباس پہنتے تھے۔ مزدکیت کے اثرات زمانۂ بعد میں قرامطہ اور اسماعیلی فدائین کے علاوہ کچھ صوفیانہ گروہوں میں بھی نظر آتے ہیں۔

سلطنتِ فارس کا سرکاری مذہب زردشتی یا مجوسی مذہب تھا۔ زردشت کے زمانے کے بارے میں اختلافات موجود ہیں۔ کچھ لوگ اسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا معاصر قرار دیتے ہیں اور کچھ اسے پانچ ہزار قبلِ مسیح کے دور سے وابستہ کرتے ہیں۔ کچھ روایات کے مطابق زردشت کا تعلق موجودہ آذربائیجان سے تھا۔ کچھ لوگ ایران کے شہر اراک اور کچھ افغانستان کے شمالی شہر بلخ کو اس کی جائے پیدائش قرار دیتے ہیں۔ وہ خالصتاً ایرانی النسل تھا اور اس کا ظہور اس زمانے میں ہوا تھا جب آریاؤں نے ایرانی علاقوں میں آبادکاری کے بعد گلہ بانی چھوڑ کر زراعت کا پیشہ اپنایا تھا۔ یہ زمانہ ۱۲۰۰ تا ۱۰۰۰ ق م کا معلوم ہوتا ہے۔ یہ مذہب خالصتاً توحید کے نظریہ پر قائم تھا مگر بعد میں اس

میں ثنویت (Dualism) کے عقائد کا غلبہ ہو گیا۔ علاوہ بریں آتش پرستی کا رجحان عبادات میں غالب آ گیا۔ پاکستان میں ٹیکسلا کے مقام پر قبل مسیح دَور کے آتش کدے کے آثار ملے ہیں۔

زردشت خدائے برتر کو اھورا مزدا کی تخلیق قرار دیتا تھا۔ بعد میں خیر کی قوتوں کے مظہر کو یزدان اور شر کی قوتوں کے مظہر کو اہرمن کا نام دے دیا گیا۔ وہ خیر کے پہلو کو دائمی، تعمیری، روشن، زندہ اور خوبیوں کا شاہکار قرار دیتا تھا اور شر کے پہلو کو عارضی، تخریبی، موت اور عذاب قرار دیتا تھا۔ وہ اھورا مزدا میں چھ صفات یعنی عقلِ کل، رُوحِ کل، مشیتِ ازلی، مادہ، لامحدودِ مکان اور لامحدودِ زمان کا قائل تھا۔ وہ انسان کو بھی وجودِ مطلق کی تمثیل قرار دیتا تھا۔ نور وظلمت کی اصطلاحات بعد میں اسلام میں بھی مروّج ہو گئی تھیں۔ اس مذہب میں انسانی طبقہ بندی تھی اور آتش مقدس میں تیل، عود، لوبان، صندل سب کچھ جلا دیا جاتا تھا اور لوگوں کی کمائی جابرانہ طور پر ضبط کر کے آتش کدوں کی نذر کر دی جاتی تھی۔ بادشاہ کو خدا کا مظہر قرار دیا جاتا تھا اور اس کا حکم اٹل تھا۔ بادشاہ کو خدائے خدائیگاں یا شہنشاہ کہا جاتا تھا اور اس کی وفاداری مذہبی طور پر لازم تھی۔ بعد کے زمانے میں آگ کو ہمیشہ روشن رکھا جاتا تھا اور اس کی پرستش کی جاتی تھی۔ کچھ لوگ مظاہرِ فطرت یعنی سورج، سمندر، جھیلوں اور درختوں کا احترام بھی کرتے تھے۔

آنحضورﷺ کی پیدائش

آنحضورﷺ کی ولادت باسعادت ۵۷۱ء میں ہوئی۔ یہ زمانہ خسرو نوشیروانؑ (۵۳۱ء۔۵۷۹ء) کا تھا۔ اس بادشاہ کی بابت مشہور تھا کہ وہ انتہائی عادل حکمران تھا، حالانکہ یہ وہی بادشاہ تھا جس نے کم از کم اٹھارہ ہزار مزدکیوں کو ان کے مذہب کے بانی سمیت قتل کر دیا تھا۔ اس نے شام کی مشہور ساحلی بستی انطاکیہ کو فتح کر کے وہاں پر مظالم کے پہاڑ توڑے تھے۔ تاہم اس نے اپنے طویل عہدِ حکومت میں اصلاحات کا آغاز کیا تھا اور زراعت و تجارت کو ترقی دی تھی۔ ایک روایت عموماً بیان کی جاتی ہے کہ آنحضورﷺ نے اس بات پر فخر کا اظہار کیا تھا کہ آپؐ نوشیروان جیسے عادل بادشاہ کے دور میں

پیدا ہوئے تھے۔ شیخ سعدیؒ نے گلستان میں اتا بک ابوبکر زنگی کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ مجھے آپ کی حکومت کے عہد میں زندگی گزارتے ہوئے اسی طرح فخر ہے جیسے آنحضور ﷺ کو عہدِ نوشیروان پر تھا۔ یہی بات ملا عبدالقادر بدایونیؒ نے شیر شاہ سوری کو کہی تھی۔ لیکن یہ روایت نہ تو حدیث کی کسی مستند کتاب میں ملتی ہے اور نہ ہی قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ آپؐ نے کسی مجوسی بادشاہ کے عہدِ حکومت پر فخر کا اظہار کیا ہو۔

رسول اللہ ﷺ کی پیدائش کے موقع پر دریائے دجلہ کے کنارے آباد شہر مدائن (جو مختلف بستیوں کا مجموعہ تھا) ایران کا دارالحکومت تھا اور تختِ شاہی پر نوشیروان متمکن تھا۔ آنحضور ﷺ کی پیدائش کی شب دریائے دجلہ میں سخت طغیانی آئی اور دریا کا پانی مدائن کی تمام بستیوں میں پھیل گیا۔ پھر شدید زلزلہ آیا اور شاہی محل یعنی ایوان کسریٰ کے چودہ کنگرے زمین پر آن گرے اور طاق کسریٰ میں دراڑیں پڑ گئیں۔ آتش کدۂ فارس کی صدیوں سے روشن آگ اچانک بجھ گئی۔ اسی رات فارس کے ایک عظیم مذہبی رہنما کو خواب میں دکھائی دیا کہ وحشی اونٹوں کا ایک بہت بڑا گلہ ہے جو عربی گھوڑوں کو کھینچ رہا ہے اور یہ جانور سلطنتِ فارس کی بستیوں میں پھیل رہے ہیں۔

ان واقعات کے اچانک ظہور میں آنے پر عمائدین سلطنت میں کھلبلی سی مچ گئی اور ان کی وضاحت پیش کرنا مشکل ہو گیا۔ اہلِ فارس مشکل مواقع پر اپنے باج گزار اہلِ حیرہ (جو مذہباً عیسائی تھے) سے رُجوع کیا کرتے تھے۔ خسرو نوشیروان نے ایک قاصد کے ذریعے حیرہ میں تعینات اپنے گورنر نعمان ابن منذر کو کہلا بھیجا کہ کسی عقل مند عالم کو ان واقعات کی توضیح کے لیے مدائن بھجوانے کا بندوبست کیا جائے۔ حسبِ فرمان ابن عمر انصانی کو دارالحکومت بھجوایا گیا۔ اس نے دربار شاہی میں اپنی معذوری کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وہ کوئی رائے دینے سے قاصر ہے۔ پھر وہ بادشاہ کی اجازت سے شام میں مقیم اپنے ماموں کے ہاں پہنچا جو اپنے وقت کا مشہور کاہن تھا۔ بزرگ کاہن بسترِ مرگ پر دراز تھا۔ اس نے بھانجے کی آمد کا مقصد معلوم کیا اور خواب کی

تفصیل سنتے ہی کہا کہ اب ساسانی سلطنت کے زوال کا وقت آن پہنچا ہے۔ مختصر عرصہ میں نوشیروان کے خاندان کے چودہ افراد حکومت کر چکیں گے تو ساسانی سلطنت اختتام پذیر ہو جائے گی۔

یہ امر بھی دلچسپی کا حامل ہے کہ آنحضور ﷺ کی پیدائش سے قبل اکثر لوگ آپؐ کی آمد کی بابت پیشین گوئیاں کرتے رہے تھے۔ مشہور ساسانی بادشاہ شاہ پور نے عرب علاقوں کو اپنے تصرف میں لاتے ہوئے اہل عرب پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑ دیے۔ پھر اہلِ عرب کے کندھوں میں سوراخ کروا کر ان میں رسیاں ڈال کر عربوں کو تذلیل کا نشانہ بنایا۔ شہنشاہِ فارس شاہ پور ذوالاکتاف سے پورے طمطراق سے فتح کے نشے میں مست گزر رہا تھا کہ ایک پُل پر ایک بوڑھی عرب عورت نے اسے روک کر کہا کہ عرب پر اس قدر ظلم نہ ڈھانا کہ تمہاری قوم کو اس کا حساب خوفناک اژدھے کی طرح نگل لے، ممکن ہے کہ عرب میں ایک بچہ پیدا ہو جو ایک دن اہلِ فارس کی سلطنت کو تہس نہس کر کے رکھ دے۔ کوئی تین سو برس بعد یہ پیشین گوئی پوری ہونے کا دن آ گیا۔

آنحضور ﷺ کا بچپن اور جوانی

آنحضور ﷺ کی پیدائش کے فوراً بعد یمن پر ایرانی حکومت مستحکم ہو چکی تھی۔ خسرو نوشیروان بڑھاپے کا شکار ہو چکا تھا اور اس کی سرزمین کو شمال مشرق سے ھن قبائل (ترکوں) کے پے در پے حملوں کا شکار ہونا پڑ رہا تھا۔ عرب کی سرزمین پر اس کی حکومت قائم تھی۔ مدینہ منورہ میں اہلِ فارس کی حکومت کے اثرات کسی حد تک نمایاں تھے۔ مکہ مکرمہ کی مثال آج کل کے پاکستانی قبائلی علاقوں کی تھی جہاں قانوناً شہنشاہِ فارس کی حکومت تھی مگر عملاً قبائل خود مختار تھے اور اپنے معاملات خود حل کرنے کے دعوے دار تھے۔ مکہ کی اہمیت شام و یمن کے مابین اہم تجارتی راستہ کے مرکز کی تھی۔ مشرکینِ مکہ شاہ فارس کی وفاداری کا دم بھرتے تھے اور اس کی فتوحات پر خوشی کا اظہار کیا کرتے تھے۔ رومی عیسائیوں سے ان کا معاندانہ رویہ بھی اپنی جگہ پر تھا۔ پھر روم و فارس کی کشمکش کا دائرہ بھی ان کے تجارتی روابط میں حائل ہوتا تھا۔ سرزمینِ شام و فلسطین جو روم و فارس کی

کشمکش کی آماجگاہ تھی، وہ بھی مکہ سے چنداں دور نہیں تھی۔

آنحضور ﷺ کے زمانے میں حجاز کے دانش مند جندی شاہ پور (ایران) میں تعلیم و تربیت کے حصول کے لیے جایا کرتے تھے اور مکہ کے تجارتی قافلوں کے سفر حیرہ، بصرہ، طیسفون اور دیگر ایرانی شہروں تک اکثر ہوا کرتے تھے۔ اس طرح اہلِ مکہ فارس کی جنگی، تمدنی اور تہذیبی سرگرمیوں سے باخبر ضرور تھے۔

آنحضور ﷺ کی ابتدائی زندگی میں ایران و روم کی مخاصمت زوروں پر تھی اور ان کے مابین ایک خونریز جنگ ۵۷۲ء سے ۵۷۹ء کے عرصہ تک جاری رہی تھی۔ ابتدا میں رومیوں کو سخت ہزیمت سے دوچار ہونا پڑا اور رومی شہنشاہ جستن کو اسی شکست کے نتیجہ میں تاج و تخت سے دستبردار ہونا پڑا اور اس کی جگہ طبریوس نے لی۔ طبریوس نے بھی مصالحت کا راستہ اپنانے میں عافیت سمجھی، مگر اس جنگ کا زمانہ نوشیروان کے بیٹے ہرمز چہارم کے ابتدائی عہد تک پھیلا رہا جو ۵۷۹ء سے لے کر ۵۹۰ء کے عرصہ تک محیط رہا اور یہ زمانہ بھی ترکوں اور رومیوں سے جنگ کی حالت میں گزرا۔

بعض روایات کے مطابق آنحضور ﷺ نے اپنے چچا ابوطالب کے ہمراہ بارہ برس کی عمر میں شام کا تجارتی سفر کیا اور آپؐ شام سے واپسی پر بصریٰ پہنچے اور راستے میں حیرہ کے علاقے میں (جہاں نسطوری عیسائیوں کی آبادی تھی) بحیرہ راہب سے ملاقات ہوئی جس نے آپؐ کی نبوت کی پیشین گوئی کرتے ہوئے جناب ابوطالب سے کہا کہ آپ اس بچے کو فوراً بحفاظت واپس لے چلیں۔ مؤرخین اور سیرت نگاروں نے (جن میں مولانا سلیمان ندوی بھی شامل ہیں) اس واقعہ کی تاریخی صحت پر کئی اعتراضات کیے ہیں اور اسے مشکوک قرار دیا ہے۔ اگر اسے سچ مان لیا جائے تو بھی شام سے مکہ کی جانب واپسی کے راستے بصرہ سے نہیں گزرتے تھے۔ تاہم یہ ممکن ہے کہ اگر تجارتی مال شام (رومی علاقہ) سے بصرہ (فارس کا علاقہ) لانا مقصود تھا اور پھر وہاں اس سامان کو فروخت کر کے مزید تجارتی مال مکہ کی جانب لانا تھا تو پھر کوئی نہ کوئی صورت پیدا ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ اگر یہ واقعہ صحیح مانا جائے تو یہ سفر اُن راستوں پر ہی ممکن تھا جہاں اہلِ فارس کا بول

بالا تھا' بلکہ وہاں پر اہلِ فارس کے اہم ترین سیاسی' تمدنی' ثقافتی اور جنگی مراکز واقع تھے۔ اس طرح ممکن ہے کہ آنحضور ﷺ اپنے بچپن میں سرزمین فارس میں داخل ہوئے ہوں جہاں کی زبان' بودوباش اور ثقافت آپؐ کے لیے بالکل اجنبی تھی۔ اس صورت میں آپؐ کے مشاہدات کیا تھے اور آپؐ کے ذاتی تجربات کیا تھے' ان کا ذکر ہمیں کہیں ملتا تو نہیں مگر آنحضورؐ کے اقوال و احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کی نظر میں فارس کی تہذیب و تمدن کا ایک واضح نقشہ ضرور موجود تھا اور آپؐ ان کی جنگی فتوحات سے باخبر تھے۔ تجارتی قافلوں کے ذریعے سفر کرنے والوں کی زبانی حالات و واقعات کی تمام تفاصیل بھی مکہ پہنچتی رہتی تھیں۔ مزید برآں جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی خود آنحضور ﷺ نے بھی تجارتی سفر شروع کر دیے تھے اور تمام تاجروں کو سفر کے آغاز سے پہلے اردگرد کے خطوں کے حالات خصوصاً تجارتی راستوں پر واقع شہروں کی بابت معلومات جمع کرنا ضروری تصور کیا جاتا تھا۔ نیز وہاں کے امن و امان' ممکنہ طور پر فراہم ہونے والے اور بکنے والے سامان اور دیگر ضروریاتِ زندگی کا علم ضروری تصور کیا جاتا تھا۔ اس لیے یہ ضروری تھا کہ آنحضور ﷺ اپنے پیشے کی ضرورت کے مطابق ان حالات و واقعات سے باخبر ہوں۔ پھر وہ فہم و فراست اور نگاہِ دوربین جو خدائے بزرگ و برتر نے آپؐ کو عطا کی تھی وہ اس امر کا تقاضا کرتی تھی کہ آپؐ جہاں سے بھی گزریں وہاں کے مشاہدات سے آپؐ نتائج اس انداز سے اخذ فرمائیں جو باقی لوگوں کے ذہن سے اوجھل ہوں۔ ہر چند کہ آپؐ نہ پڑھ سکتے تھے اور نہ ہی لکھ سکتے تھے مگر آپؐ کی نگاہِ دُوررَس بین الاقوامی تبدیلیوں کی گہرائیوں میں اُتر رہی تھی۔

روم و فارس کی کشمکش' آنحضور ﷺ کے زمانہ میں

رسول اللہ ﷺ کی عمر جب بتیس برس کی ہوئی تو روم کی سلطنت میں ایک اہم تبدیلی آئی۔ قیصرِ روم ماریس کے خلاف بغاوت ہوئی اور اس کے ایک فوجی سردار فوکاس نے اس کی نگاہوں کے سامنے اس کے پانچ بیٹوں کو تہہِ تیغ کیا اور پھر قیصرِ روم کو موت کے گھاٹ اتارا۔ پھر اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ باپ بیٹوں کے سر قسطنطنیہ کے چوراہوں پر عوام

کی عبرت کے لیے آویزاں کروادیے۔ پھر چند یوم بعد اس کی بیوی اور تین بیٹیوں کو بھی ابدی نیند سلا دیا گیا۔ بالآخر فوکاس خود قیصر روم بن بیٹھا۔ ماریس کا زمانہ کسی حد تک عدل وانصاف کا عہد تھا اور عیسائی مذہبی اصولوں کی پاسداری کی جاتی تھی۔

اب ہم فارس چلتے ہیں جہاں نوشیروان کے بیٹے ہرمز چہارم کا ذکر ہو رہا تھا۔ اس کے عہد میں رومیوں سے جنگ رک گئی تھی اور ۵۸۹ء کے بعد رومی اور ایرانی اپنے اپنے علاقوں میں دبک بیٹھے تھے۔ اس طرح آنحضور ﷺ کا عہدِ شباب نسبتاً بین الاقوامی امن کا عہد تھا اور تجارتی قافلے سکون واطمینان سے رواں دواں تھے۔ ہرمز کے مشہور سپہ سالار بہرام چوبین کے ذمہ ہُن قبائل (ترکوں) کی سرکوبی تھی۔ ترکوں سے فارغ ہوکر اسے روم کے حکمرانوں سے نبرد آزما ہونا پڑا، مگر اسے شکستِ فاش نصیب ہوئی۔ ہرمز کی جانب سے بازپُرس کے نتیجہ میں بہرام چوبین اور اس کی افواج نے شاہ (ہرمز) کے خلاف بغاوت کردی۔ ایرانی بادشاہ کے خلاف فوجی بغاوت اس عہد کا ایک حیرت انگیز واقعہ تھا، کیونکہ شاہ کو خدائی اوصاف سے متصف سمجھا جاتا تھا اور ایسے واقعات کا تصور بھی ناممکن تھا۔ ہرمز نے جب بغاوت کو فرو کرنا چاہا تو وہ اپنی مہم میں ناکام رہا اور اپنے ایک فوجی سردار اور رشتہ دار بیستام کے ہاتھوں ۵۹۰ء میں گرفتار ہوا اور قتل کردیا گیا۔

ایران کے مرکز مدائن میں خسرو پرویز نے حکومت سنبھالی اور بہرام چوبین کو صلح کا پیغام بھجوادیا۔ بہرام بغاوت کے نشے میں سرشار تھا اور اسے نئے ساسانی شہنشاہ (خسرو پرویز) سے بھلائی کی توقع ہرگز نہیں تھی۔ وہ مدائن کی طرف لپکا مگر خسرو پرویز بچ نکلنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس نے قیصرِ روم ماریس کے دربار میں پناہ لی۔ ماریس نے اسے اپنا منہ بولا بیٹا کہتے ہوئے اس کی پذیرائی کی اور اس کی مدد کا وعدہ کیا۔ خسرو پرویز نے آرمینیا اور شہر دارا کا علاقہ قیصرِ روم کے سپرد کیا اور رومی افواج کی مدد سے بہرام چوبین اور باغی افواج پر حملہ آور ہوا۔ بہرام ایران کا تخت وتاج چھوڑ کر بھاگ نکلا اور خاقانِ ترکستان کی پناہ میں چلا گیا۔ سلطنتِ فارس پر قابض ہونے کے بعد خسرو پرویز

نے ازسرِ نو امن و امان قائم کیا۔ اس دوران ماریس (قیصر روم) سے اس کے مثالی تعلقات قائم رہے اور امن وامان باقی رہا۔

قیصرِ ماریس کا قتل اور فوکاس کی تخت نشینی نے فارس و روم کے روابط کا خاتمہ کر دیا اور خسرو پرویز ماریس کا بدلہ لینے کے لیے روم کے مفتوحات پر چڑھ دوڑا۔ ۶۰۳ء سے ۶۲۷ء کا دور رومیوں اور فارسیوں کی جنگِ عظیم کا عہد ہے۔ ایرانی افواج رومیوں کو شکستِ فاش سے دوچار کرتی ہوئی شام میں حلب اور انطاکیہ تک قابض ہوگئیں اور ایشیائے کوچک (موجودہ ترکی) میں ایڈیسا (موجودہ اورفا) تک جا پہنچیں۔ فوکاس نے اپنی سلطنت کو بچانے کے لیے ہاتھ پیر مارے مگر اس کی ایک نہ چلی۔ رومی بازنطینی سلطنت کے عمائدین نے رومیوں کی جانب سے مقرر کردہ مصری گورنر کو مدد کے لیے پکارا۔ فوکاس کو معزول کر دیا گیا اور افریقی مقبوضات (رومی) کے گورنر کے بیٹے ہرقل کو قیصرِ روم نامزد کر دیا گیا۔ ہرقل نے قسطنطنیہ پہنچتے ہی فوکاس کو قتل کر دیا اور اُس کے خاندان کو تہہِ تیغ کروا دیا۔ یہ واقعہ ۶۱۰ء میں پیش آیا اور یہی وہ برس تھا جب آنحضور ﷺ نبوت کے مقام پر فائز ہوئے۔

اہلِ روم اور اہلِ فارس کی خونریز جنگ اب بھی قائم رہی اور یہ جنگ زردشتی اور عیسوی مذہب کے پیروکاروں کے مابین خونریز معرکے میں تبدیل ہوگئی۔ رومی عیسائی فوجیں عیسائی یورپ اور بیت المقدس کے تحفظ کے لیے سرگرمِ عمل تھیں اور اپنے پورے مذہبی جوش و جذبہ کو بروئے کار لا رہی تھیں۔ بعد میں صلیبی جنگوں کے مواقع پر بھی عیسائی یورپ کا یہی جذبہ کارفرما نظر آتا ہے، مگر بعد کے ادوار میں زردشتی فارس کی بجائے صلیبیوں کا مقابلہ اہلِ اسلام سے تھا۔ عیسائیوں کے اپنے فرقے نسطوری اور یعقوبی (جو اہلِ ایران کی پناہ میں آچکے تھے) بھی زردشتیوں (مجوسیوں) کے ہمدرد تھے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، فلسطین میں کسی زمانے میں ایرانیوں نے بھی (ہخامنشی عہد میں) یہودی سلطنت قائم کی تھی، اس لیے یہودی بھی اہلِ فارس کے حلیف سمجھے جاتے تھے۔ یہودیوں نے ایرانیوں کا نہ صرف ساتھ دیا بلکہ چھبیس ہزار یہودی فوجی اہلِ فارس کی

طرف سے اہلِ روم سے نبرد آزما تھے۔

جنگ جاری تھی۔ ۶۱۰ء میں ایرانی شام میں انطا کیہ کی بندرگاہ پر قابض ہوئے۔ اب بحیرۂ روم کی لہریں ان کے سامنے تھیں اور وہ زخمی شیر کی طرح یورپ پر غرّا رہے تھے۔ ۶۱۳ء میں وہ دمشق پر قابض ہوئے۔ ۶۱۴ء میں وہ بیت المقدس (ایلیاء) پر لپکے اور وہاں کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ نوے ہزار عیسائیوں کو قتل کیا گیا۔ اہم ترین عیسائی معبد کنیسۃ القیامۃ کو مسمار کروادیا گیا۔ شہر کے تمام گرجے زمین بوس ہوگئے اور اہم ترین عیسائی مذہبی رہنما زکریا بھی گرفتار کر لیے گئے۔ صلیب مقدس (جس کی بابت عیسائیوں کا عقیدہ تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس پر مصلوب کیے گئے تھے) اکھاڑ لی گئی اور اسے مدائن پہنچادیا گیا۔

بیت المقدس (ایلیاء) پر قابض خسرو پرویز نے ہرقل کو ایک خط میں مندرجہ ذیل کلمات سے مخاطب کیا: ''خدائے خدائیگاں (شاہوں کا شاہ یعنی شہنشاہ) خسرو پرویز جو تمام روئے زمین کا مالک ہے، وہ اپنے کمینہ اور ناسمجھ غلام ہرقل سے مخاطب ہے۔ تیرا کہنا ہے کہ تجھے اپنے پروردگار پر بھروسا ہے۔ کیا وجہ تھی کہ تیرا پروردگار میرے ہاتھوں سے یروشلم کو نہیں بچاپایا''۔ پھر ایک ہی برس بعد ایرانی افواج بحیرۂ روم کے جزائر دشت سینائی، مصر اور ایشیائے کوچک پر قابض ہوگئیں۔

یہ وہ زمانہ تھا جب مکہ میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد مسلمانوں پر جبر و ستم کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے اور مسلمان کلمۂ حق کہنے کی پاداش میں تختۂ مشق بنے ہوئے تھے۔ اسی زمانے میں سیدنا جعفر طیار رضی اللہ عنہ کے ہمراہ مسلمانوں کا ایک گروہ بحیرۂ احمر کو پار کر کے حبشہ کے حکمران نجاشی کے ہاں پناہ لینے پر مجبور ہوا تھا، جنہیں وہاں سے لانے کے لیے مشرکینِ مکہ کی سفارت ناکام لوٹ آئی تھی اور اہلِ مکہ کو عیسائی حکمران (نجاشی) کے مسلمانوں کی حمایت کرنے پر شدید غم و غصہ تھا۔ اہلِ مکہ چونکہ ایرانیوں کے طرف دار تھے اس لیے انہیں عیسائی رومی حکمرانوں کی شکستِ فاش کی دلی خوشی تھی۔ بعینہٖ مدینہ کے یہودی بھی ایرانیوں کے حلیف ہونے کے باعث اور بیت المقدس پر عیسائی اثرات ختم

ہونے کی وجہ سے خوشی کے شادیانے بجا رہے تھے۔

مشرکینِ مکہ آنحضورﷺ کے ساتھیوں کو زچ کرنے کا کوئی موقع بھی ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے۔ وہ مسلمانوں سے کہتے کہ وحی و رسالت کو ماننے والے عیسائی شکست سے دوچار ہیں اور اہلِ فارس جیت رہے ہیں۔ اس طرح آپ بھی اپنی خیر منا لیں، ہم آپ کو بھی تہس نہس کر کے رکھ دیں گے۔ اہلِ اسلام جب بھی ذہنی دباؤ کا شکار ہوتے تو نزولِ وحی کے ذریعے بارگاہِ خداوندی سے انہیں تائید و نصرت کے پیغام موصول ہو جایا کرتے تھے، چنانچہ اب یہ آیات نازل ہوئیں:

﴿الٓمّٓ ۝١ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۝٢ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ۝٣ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ ۬ؕ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ ؕ وَيَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝٤ بِنَصْرِ اللّٰهِ ؕ يَنْصُرُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۝٥ وَعْدَ اللّٰهِ ؕ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝٦﴾ (الروم)

”ا۔ل۔م۔ رومیوں کو قریبی خطے میں شکست سے دوچار ہونا پڑا ہے اور اپنی اس شکست سے تھوڑے عرصے کے بعد (تین سے نو سال میں) وہ دوبارہ غالب آ جائیں گے۔ اللہ ہی کا اختیار ماضی میں بھی تھا اور مستقبل میں بھی ہوگا۔ اور اس دن مسلمان خوشیاں منائیں گے۔ یہ سب کچھ اللہ کی مدد سے ممکن ہوگا۔ وہ جس کی چاہے مدد کرتا ہے۔ اور وہ زبردست بھی ہے مہربان بھی۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے، اللہ اپنے وعدے کو توڑا نہیں کرتا لیکن یہ اور بات ہے کہ بہت سے لوگوں کو (اس کی حکمت کا) علم نہیں ہے۔“

دراصل ان آیات میں نہ صرف رومیوں کی فتح کی پیشین گوئی تھی بلکہ مسلمانوں کی کامیابی کی بشارت بھی دی گئی تھی۔ ان آیات کے نزول کے آٹھ برس بعد تک بھی آثار ایسے ہی تھے کہ ایرانی فاتح نظر آ رہے تھے اور رومی بری طرح پس رہے تھے۔ اسی طرح آنحضورﷺ کے ساتھی بھی ابھی تک تکالیف و آلام برداشت کر رہے تھے۔

ایرانیوں نے بڑھتے ہوئے ۶۱۹ء میں پورے ملک مصر پر اپنا اقتدار قائم کر لیا تھا اور زردشتی افواج نے لیبیا میں طرابلس کے قریب پڑاؤ کر رکھا تھا۔ ایشیائے کوچک

میں یہ لوگ رومیوں کا تعاقب کرتے ہوئے آبنائے باسفورس تک پہنچے تھے۔ ۶۱۷ء میں انہوں نے قسطنطنیہ کے بالمقابل خلقدون (موجودہ قاضی کوئی) پر اپنے جھنڈے نصب کردیے تھے۔ ان حالات میں قیصرِ روم ہرقل نے انتہائی لجاجت سے خسرو پرویز سے گزارش کی تھی کہ وہ ہر قیمت پر صلح کے لیے تیار ہے مگر خسرو پرویز نے اس وقت تک امان نہ دینے کا اعلان کررکھا تھا جب تک وہ عیسائیت چھوڑ کر دینِ مزدیسنا (زردشتی مذہب) اختیار نہ کرلے۔ قیصر نے قرطاجنہ (موجودہ تیونس) میں منتقل ہونے کا فیصلہ بھی کرلیا تھا۔

مشرکینِ مکہ اب مسلمانوں کا مذاق اڑارہے تھے اور آیاتِ خداوندی کی تضحیک اور استہزاء میں مگن تھے۔ ان آیات کے نزول کے فوراً بعد اُبی بن خلف نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے شرط بدی کہ اگر تین برسوں میں رومی غالب آگئے تو میں آپ کو دس اونٹ دوں گا ورنہ آپ دس اونٹ مجھے دیں گے۔ چونکہ ''بِضع'' کا اطلاق عربی میں دس سے کم پر ہوتا ہے اس لیے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ یہ شرط دس برس کے لیے کردو اور دس کی بجائے سو اونٹ مقرر کردو۔ اس طرح یہ شرط نئے سرے سے طے ہوئی۔

اسی اثناء میں ۶۲۲ء میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کی جانب ہجرت فرمائی۔ اب حالات نے پلٹا کھایا۔ مسلمانوں کے غلبہ کا دور بھی آن پہنچا اور رومیوں نے بھی ایرانیوں کو نیچا دکھانا شروع کردیا۔ ہرقل نے پوپ سے عیسائیت کے تحفظ کے نام پر مالی اور اخلاقی امداد طلب کی۔ پوپ سرجیس (Sergius) نے گرجاؤں میں جمع شدہ نذرانوں کی رقوم قیصرِ روم کو سود پر قرضہ کے طور پر دیں اور عیسائیوں کو مذہب کے مقدس نام پر قیصرِ روم کی مدد کرنے کی تلقین کی۔ اب قیصر نے جنگی تیاری کرکے بحیرۂ اسود (Black Sea) کا راستہ لیا اور چپکے سے ایران کے ان خطوں پر حملہ کیا جہاں پر ایرانی جنگی گرفت فی الحال کمزور تھی۔ اس نے طرابزون کی جانب کوچ کیا اور اچانک ۶۲۳ء میں آرمینیا پر حملہ کردیا۔ اگلے برس ۶۲۴ء میں آذر آبادگان (آذربائیجان) میں داخل

ہوگیا اور وہاں پر زردشت کی جائے پیدائش ارمیاہ (Clorumia) کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ پھر اس نے اہم ترین زردشتی آتش کدہ تباہ و برباد کردیا۔ رومیوں کی اس اہم ترین فتح کا دس برس سے کم عرصہ میں ظہور ہوا اور اُبی بن خلف کے جانشین سو اونٹ لے کر حضور ﷺ کی خدمت میں مکہ میں حاضر ہوئے۔ آپ ﷺ نے انہیں صدقہ میں دے دیا۔ اسی موقع پر جنگ بدر کی فتح کا واقعہ پیش آیا اور اس میں بھی مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی۔

اب رومیوں نے نینویٰ کی جنگ (۶۲۶ء) میں ایرانی بادشاہت کو شدید ہزیمت سے دوچار کرنے کے بعد مکمل طور پر مفلوج کر کے رکھ دیا۔ پھر وہ ایرانی شہنشاہوں کی رہائش گاہ دستگرد پر پل پڑے اور پھر وہ ایران کے پائے تخت طیسفون کے سامنے آن کھڑے ہوئے۔

حالات و واقعات کا مدوجزر ﴿تِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ﴾ کی خوبصورت تصویر ہے۔ چند برس قبل ایرانی بیت المقدس میں کلیساؤں کو مسمار کررہے تھے تو اب زردشت کی جائے پیدائش منہدم ہو چکی تھی اور ایران کا مقدس ترین آتش کدہ خاموش ہو چکا تھا۔ کل تک ایرانی قسطنطنیہ کے دروازے پر دستک دے رہے تھے، قیصرِ روم بھاگ جانے کی فکر کررہا تھا، آج رومی طیسفون کے باہر کھڑے تھے۔ کل خسرو پرویز قیصرِ روم کو عیسائیت چھوڑ کر دین مزدیسنا اختیار کرنے کو کہہ رہا تھا، آج دینِ مزدیسنا کے پیروکار مجوسی ابتلاء میں ڈال دیے گئے تھے۔ کل تک مسلمانانِ مکہ جبر و استبداد کا شکار تھے تو آج مدینہ کی سلطنتِ خداداد اپنے استحکام کی جانب بڑھ رہی تھی۔ اسی دوران آنحضور ﷺ کا خط خسرو پرویز کو موصول ہوا (جس کا ذکر ہم بعد میں کریں گے) اور اس نے آنحضور ﷺ کے مکتوب کی اہانت کر کے آپؐ کی بد دعا لی تھی۔ آج وہی خسرو (عربی میں کسریٰ) مصیبت میں مبتلا تھا۔

عمائدین سلطنت نے ۶۲۸ء میں خسرو پرویز کو معزول کردیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے اٹھارہ (۱۸) بیٹے قتل کر دیے گئے اور چند روز بعد وہ خود مصائب و آلام کا

شکار ہو کر اس جہان سے کوچ کر گیا۔ یہی برس صلح حدیبیہ کا برس تھا جسے قرآن نے فتح عظیم قرار دیا ہے اور غالباً اس برس کسریٰ (خسرو پرویز) نے آنحضورﷺ کے خط کے ٹکڑے کیے تھے۔

اس کے بعد شہزادہ شیرویہ پسر خسرو پرویز قبادِ دوم کے نام سے ایران کا حکمران بنا۔ اس نے ۶۲۹ء میں قیصر روم سے صلح کی درخواست کی۔ وہ تمام رومی مقبوضات سے دست بردار ہو گیا۔ ۶۲۹ء میں وہ صلیب مقدس لے کر ذاتی طور پر بیت المقدس (ایلیاء) گیا اور اسے اپنی موجودگی میں اس کے اصلی مقام پر نصب کروایا۔ اسی برس آنحضورﷺ نے عمرۃ القضاء ادا کیا اور آپؐ ہجرت کے بعد پہلی مرتبہ مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے۔ قباد دوم نے اپنے تمام بھائیوں کو قتل کروا دیا اور بالآخر طاعون کے مرض میں مبتلا ہو کر مر گیا۔

اب آنحضورﷺ کی نگاہیں تیزی سے انحطاط پذیر ایرانی بادشاہت (فارس کی شہنشاہیت) پر تھیں جو داخلی کشت و خون کا شکار تھی۔ قبادِ دوم کے بعد اس کا بیٹا اردشیر سوم سات برس کی عمر میں بادشاہ بنا اور کچھ عرصہ بعد اپنے ہی سپاہیوں کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ پھر چند برسوں میں یکے بعد دیگرے ایرانی تخت پر بارہ بادشاہ متمکن ہوئے جن میں دو خواتین پوراندخت دختر خسرو پرویز اور آذرمیدخت دختر خسرو پرویز بھی شامل تھیں۔ پوراندخت کی تخت نشینی کی خبر جب آنحضورﷺ تک پہنچی تو آپؐ نے فرمایا کہ وہ قوم تباہ ہو گئی جس نے ایک عورت کی حکمرانی قبول کر لی۔ آنحضورﷺ کی وفات کے برس (۶۳۲ء میں) آخری ساسانی تاجدار یزدگرد سوم نے عنانِ حکومت سنبھالی۔ ہر چند کہ اس کے نسب کے بارے میں پوری طرح علم نہیں ہے مگر روایات کے مطابق اسے خسرو پرویز کا پوتا بیان کیا جاتا ہے۔

یزدگرد سوم کے زمانہ میں ہی مسلمانوں نے حضرت عمر فاروقؓ کے عہدِ خلافت میں اہلِ فارس سے فیصلہ کن جنگیں لڑیں تھی اور سلطنتِ فارس کا خاتمہ آنحضورﷺ کی وفات کے چھ سات برس بعد ہی ہو گیا تھا۔ اس طرح آپؐ کی یہ پیشین گوئی بھی حرف بہ

حرف صحیح ثابت ہوئی تھی کہ: ((هَلَكَ كِسْرىٰ فَلا كِسْرىٰ بَعْدَه)) یعنی ''کسریٰ (خسرو) مر گیا اور اب اس کے بعد کوئی کسریٰ نہیں ہو گا۔'' یہی بات یزدگرد سوم کے دربار میں اسلامی سفیر حضرت ربعی بن ناضر رضی اللہ عنہ نے کہی تھی کہ ہمارا مقصد جھوٹے خداؤں اور انسانوں کے جبر و استبداد سے لوگوں کو آزاد کروا کر انہیں خدا کی بادشاہت میں دینا ہے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خط خسرو پرویز کے نام

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح حدیبیہ کے بعد جب فراغت اور امن کا زمانہ دیکھا تو آپؐ نے دعوتِ اسلام کو جزیرہ نمائے عرب کی حدود سے پرے پھیلانے کا عزم فرمایا۔ آپؐ نے اس وقت کے اہم حکمرانوں کو خطوط کے ذریعے اسلام کا پیغام دیا۔ آپؐ نے فرمانروائے فارس خسرو پرویز، قیصرِ روم ہرقل، شاہِ حبشہ حضرت نجاشیؓ اور قبطِ اعظم مصر مقوقس کو خطوط تحریر فرمائے۔ ہر خط میں اسلام قبول کر کے امن و سلامتی کی راہ اپنانے کی تلقین فرمائی گئی تھی، مگر ہر حکمران کو اس کے دینی، سیاسی اور سماجی پس منظر میں مختلف انداز سے خطاب کیا گیا تھا۔ خسرو پرویز کے نام یہ خط لے کر مدینہ منورہ سے حضرت عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ روانہ ہوئے۔

یہ وہی ایام تھے جب مصر، بحیرۂ روم کے جزائر، ایشیائے کوچک، شام و فلسطین بشمول بیت المقدس رومیوں کے ہاتھ لگنے کے بعد شکست خوردگی کے عالم میں خسرو پرویز ایک زخمی پرندے کی طرح تلملا رہا تھا۔ اس کا کنٹرول عمائدینِ سلطنت پر بھی ڈھیلا پڑ رہا تھا اور اس کے اہل خاندان بھی اس سے نالاں اور بدظن نظر آ رہے تھے۔ وہ اب حجاز و یمن اور جزیرہ نمائے عرب پر اپنا نظم و نسق مستحکم کر کے اپنا دفاعی نظام مضبوط بنانے کا سوچ رہا تھا، مگر اس کے دل میں یہ کھٹکا ضرور تھا کہ کہیں اس کی سلطنت کے دُور افتادہ خطوں میں بغاوت کی لہر نہ اُبھرنے لگ جائے۔ ان تمام واقعات نے اسے جلد باز، سفاک، مضطرب اور زُود رنج بنا دیا تھا، وہ ہر لمحے پیچ و تاب کھاتا رہتا اور عظمتِ دیرینہ کی بحالی کی سوچ میں مگن رہتا۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ رعشہ کے مرض

(parkinsonisom) میں مبتلا تھا جس میں سخت ڈپریشن اور غصہ ظاہر ہوتا ہے اور بدن مسلسل کانپتا رہتا ہے۔

اسی دوران دربار میں اعلان ہوا کہ مدینہ سے ایک سفیر آیا ہے۔ مدینہ منورہ کو تو ابھی تک اس نے اپنی بادشاہت کی حدود میں سمجھ رکھا تھا اور سفیر تو غیر ممالک سے آیا کرتے تھے' اپنے ملک سے تو فریادی آ سکتے تھے' سفیر نہیں۔ بادشاہ کو تعجب سا ہوا۔ پھر خط کو داخلِ دفتر کیا گیا' اس کا پہلوی (قدیم فارسی) زبان میں ترجمہ کیا گیا اور سفیر کی موجودگی میں دربارِ فارس کے ایک کارندے نے اس خط کا ترجمہ پڑھ کر بادشاہ کو سنایا۔ خط کچھ یوں تھا:

((بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، مِنْ مُحَمَّدٍ رَسُوْلِ اللّٰهِ اِلٰى كِسْرٰى عَظِيْمِ فَارِسَ، سَلَامٌ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى وَآمَنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَشَهِدَ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَدْعُوْكَ بِدِعَايَةِ اللّٰهِ، فَاِنِّيْ اَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَى النَّاسِ كَافَّةً لِيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكَافِرِيْنَ، اَسْلِمْ تَسْلِمْ، فَاِنْ اَبَيْتَ فَعَلَيْكَ اِثْمُ الْمَجُوْسِ)) (فقه السيرة للالباني : ٣٥٨)

''اللہ کے نام سے جو نہایت رحم کرنے والا مہربان ہے۔ (یہ خط) اللہ کے پیغمبر محمد (ﷺ) کی جانب سے فارس کے فرمانروا خسرو (پرویز) کی جانب (لکھا گیا) ہے۔ امن و سلامتی ہو اُس کے لیے جس نے ہدایت کی راہ اپناتے ہوئے اللہ اور اُس کے پیغمبر پر ایمان لانے کی سعادت پائی' مزید برآں جس نے گواہی دی کہ اللہ کے سوا کوئی بھی پرستش کے لائق نہیں' وہ اکیلا ہے' اُس کا کوئی شریک نہیں اور یہ کہ محمد (ﷺ) اُس کے بندے اور رسول ہیں۔ میں تجھے اللہ کے پیغام کی طرف دعوت دے رہا ہوں۔ پس (یہ بات جان لو کہ) میں تمام لوگوں کی جانب خدا کے پیغمبر کی حیثیت سے مبعوث کیا گیا ہوں' تا کہ ہر انسان کو جس کی روح زندہ ہو (مشیتِ الٰہی سے باخبر کرتے ہوئے) خوف دلاؤں اور انکار کرنے والوں پر (اللہ کی) بات سچ ثابت ہو جائے۔ (تیرے لیے بہتر ہے کہ) اسلام

قبول کر لے' تو سلامتی پا جائے گا۔ اس کے بعد اگر تم نے (اس دعوت کو قبول کرنے سے) انکار کیا تو تمام زردشتوں (آتش پرستوں) کے گناہوں کی ذمہ داری تمہی پر آن پڑے گی۔''

یہ سنتے ہی دربارِ مدائن پر سناٹا چھا گیا اور غصے کے باعث شاہ کا پارہ چڑھنا شروع ہو گیا۔ اس نے اس خط کی یہ توجیہہ کی کہ سرزمینِ حجاز میں اس کی بادشاہت کے خلاف اعلانِ بغاوت کر دیا گیا ہے۔ چند برس قبل اس نے خدائے برتر کے نام لیوا عیسائیوں کے ہاتھوں شکستِ فاش کا سامنا کیا تھا۔ اب وہ اس نئے سچے اور ابدی پیغام کو سنتے ہی آگ بگولا ہو گیا اور وفورِ جذبات سے کانپنا شروع ہو گیا۔ پھر اس نے جھپٹ کر مترجم سے خط کی تحریر چھین کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ اصل تحریر بہر حال محفوظ رہی اور ابھی تک اپنی اصلی حالت میں موجود ہے۔ پھر سفیر سے کہا کہ اگر سفارتی آداب مانع نہ ہوتے تو میں تمہاری گردن اڑا دیتا۔

یہ چیز انتہائی اہم ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قیصرِ روم کے خط میں اسے اہلِ کتاب ہونے کے ناطے سے ایک خدا کی پرستش کے عقیدہ پر اشتراک کا حوالہ دیتے ہوئے نسبتاً نرم انداز سے مخاطب کیا تھا' اور قیصرِ روم نے بھی ایمان نہ لانے کے باوجود اس خط کا بے حد احترام کیا تھا' اور ممکن ہے کہ یہی وجہ ہو کہ کسی نہ کسی صورت میں قیصرِ روم کی سلطنت اگلے چھ سات سو برس تک قائم رہ گئی۔

خسرو پرویز نے کہا کہ میرے غلام کی یہ مجال کہ مجھے اس طرح مخاطب کرے کہ اپنا نام پہلے تحریر کرے اور میرا نام بعد میں۔ حضرت عبداللہ بن حذافہؓ جب مدینہ لوٹے تو آنحضور ﷺ کی خدمت میں تمام واقعات بیان فرمائے۔ آپؐ نے دربارِ فارس کی کیفیت اور اہلِ فارس کے واقعات پورے تجسس' توجہ اور انہماک سے سنے' پھر آپؐ نے فرمایا کہ اس کی بادشاہت بھی اسی طرح پرزے پرزے ہو کر بکھر جائے گی جس طرح اس نے میرے خط کے ساتھ کیا ہے۔ چند ہی برس کے بعد یہ پیشین گوئی حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی۔ مشہور شاعر نظامی گنجویؒ نے کیا خوب فرمایا:

نسب نامۂ دولتِ کیقباد

ورق بر ورق ہر سُو برد باد

(کیقباد کی بادشاہت کے حکمران خاندان کا شجرۂ نسب بکھر گیا اور اس کے ورق جدا جدا ہو کر ہوا میں اڑ گئے۔)

خسرو پرویز نے سفیر کے جانے کے بعد اپنے یمن میں تعینات گورنر کے نام شاہی فرمان تحریر کیا کہ فلاں فلاں شخص کو گرفتار کیا جائے اور پا بجولاں دربار مدائن میں بھجوایا جائے تا کہ قرار واقعی سزا دی جا سکے۔ شاہِ ایران کی اعصاب شکستگی اور بے چینی کا حال بھی شاید حضرت نظامی گنجویؒ کے پُر اثر فارسی اشعار سے بہتر آج تک کوئی بھی شخص بیان نہ کر پایا ہو! قارئین کی دلچسپی کے مدِ نظر انہیں یہاں تحریر کیا جاتا ہے۔

دراں دوراں کہ گیتی رامِ اُو بود

زمشرق تا بہ مغرب نامِ اُو بود

(جس زمانے میں دنیا خسرو پرویز کی مطیع و فرمانبردار تھی اور مشرق و مغرب میں اس کے نام کا سکہ جاری تھا۔)

رسولِؐ ما بہ حجت ہائے قاہر

نبوّت در جہاں می کرد ظاہر

(ہمارے رسول حضرت محمد ﷺ روشن دلیلوں کے ساتھ اس دنیا میں اپنی نبوت کا اعلان فرما رہے تھے۔)

گہی با سنگِ خارا راز می گفت

گہی ریگش حکایت باز می گفت

(کبھی آپ ﷺ کی مٹھی میں پتھر کی کنکریاں آپؐ کا کلمہ پڑھ رہی تھیں اور کبھی صحرا کی ریت آپؐ سے مخاطب تھی۔)

خلائق را ز دعوت جام در داد

بہ ہر کشور صلائے عام در داد

(آپ ﷺ نے مختلف اقوام کے افراد کو دعوتِ اسلام دیتے ہوئے اطمینان عطا

کیا اور ہر ملک کے لیے اپنا پیغام پہنچایا۔)

به قرطاس از عطا عطرے سرشتند
به نامِ هر یکی سطرے نوشتند

(آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ اپنی مہربانیوں اور نوازشات کی رو سے فرمایا آپؐ کے کاتبوں نے ان کی خوشبوؤں کو سمیٹا اور عطر میں تبدیل کرتے ہوئے مختلف لوگوں کے نام سطریں تحریر کیں۔)

چو از نامِ نجاشی باز پرداخت
ز بهر نامِ خسرو نامه ای ساخت

(نجاشیؒ کے نام خط تحریر کروانے کے بعد آپؐ نے خسرو پرویز کے نام خط تحریر کروایا۔)

چو قاصد عرضه کرد آں نامۂ نو
بجوشید از غضب اندامِ خسرو

(جب نامہ رسان نے وہ منفرد مراسلہ پیش کیا تو غصے سے خسرو پرویز کے تمام اعضاء کانپنے لگ گئے۔)

ز تیزی گشت هر موئے سنانی
ز گرمی هر رگش آتش فشانی

(جوشِ جذبات کے غلبے نے اس کے ہر بال کو بھالے کی صورت میں تبدیل کر دیا اور غصے کے باعث اس کی ہر رگ آتش فشاں ہوگئی۔)

سوادے دید روشن هیبت انگیز
نوشته از محمدؐ سوئے پرویز

(جو تحریر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے خسرو پرویز کے نام لکھی گئی تھی وہ واضح بھی تھی اور ہیبت انگیز بھی۔)

چو عنواں گاه عالم تاب را دید
تو گفتی سگ گزیده آب را دید

(جب اس نے خط کا عنوان پڑھا تو آنحضور ﷺ کے خطاب کے انداز سے اس کی وہی کیفیت ہوئی جو کتے کے کاٹنے کے باعث باولے ہونے والے شخص کی پانی پر نظر پڑتے ہوتی ہے۔)

غرورِ بادشاہی بردش از راہ
کہ گستاخی کہ یارد با چو من شاہ!

(بادشاہت کے غرور نے اسے بھٹکا دیا اور اس نے کہا کہ اے درباریو! دیکھو کہ میرے جیسے شہنشاہ کی شان میں یہ گستاخی کرنے کی جرأت کسے ہوئی ہے؟)

کرا زہرہ کہ با ایں احترام
نویسد نامِ خود بالائے نام

(یہ کس کی مجال ہے کہ میرے احترام اور رتبے کی پرواہ نہ کرتے ہوئے کوئی میرے نام کے اوپر اپنا نام تحریر کرے۔)

رُخ از گرمی چو آتش گاہ خود کرد
بخود اندیشۂ بد کرد، بد کرد

(غصے کے باعث اس کا چہرہ اپنے آتش کدے کے شعلوں کی صورت سرخ ہوگیا۔ اس نے برا سوچا تو برا کیا۔)

درید آں نامۂ گردن شکن را
نہ نامہ بلکہ نامِ خویشتن را

(اس نے غرور کو خاک میں ملانے والے خط کو چاک کر ڈالا۔ اس نے خط کے ٹکڑے نہیں کیے بلکہ اپنے نام کے ٹکڑے کر دیے۔)

فرستادہ چو دید آں خشم ناکی
بہ رجعت پائے خود را کرد خاکی

(نامہ رساں نے جب شاہ کو غصے کی حالت میں پایا تو چپکے سے واپسی کی راہ لی۔)

ازاں آتش کہ آں دودِ تہی داشت
چراغِ آگہاں را آگہی داشت

(اس خالی دھوئیں سے اٹھنے والی آگ کو علم وآگہی کے چراغ یعنی آنحضور ﷺ محسوس کرر ہے تھے۔)

ز گرمی آں چراغِ گردن افراز
دعا را داد چوں پروانہ پرواز

(غصے میں آکر بلند وروشن چراغ یعنی آنحضور ﷺ نے اپنی دعا کو پروانے کی طرح ہوا میں اڑایا۔)

عجم را زاں دعا کسریٰ در افتاد
کلاہ از تارکِ کسریٰ در افتاد

(فارس میں جب دعا کے اثرات پہنچے تو خسرو پرویز کا تختہ الٹ گیا اور خسرو کے سر کا تاج نیچے آگرا۔)

زہی شاہنشہی کز بیم و امید
قلم رانده بر افریدون و جمشید

(مبارک ہوں وہ شہنشاہ یعنی آنحضور ﷺ جن کی حالت امید وبیم میں ان کا حکم افریدون اور جمشید جیسے بادشاہوں پر چلتا ہو۔)

قصہ مختصر یہ کہ یمن کے گورنر باذان نے خسرو پرویز کے ان احکام کی تعمیل کرتے ہوئے بابویہ اور خورخسرو نامی دو پولیس آفیسر مدینہ منورہ روانہ کیے۔ دونوں مدینہ منورہ پہنچے اور آپ ﷺ کو ساتھ چلنے کو کہا' بصورتِ دیگر مدینہ منورہ پر فوج کشی کی دھمکی دی۔ آنحضورؐ نے فرمایا کہ تم لوگ پہلے یہ تو پتا کروالو کہ تمہارا بادشاہ زندہ بھی ہے یا نہیں۔ یہ لوگ خود تو مدینہ منورہ میں ٹھہرے اور حقیقتِ حال معلوم کرنے کے لیے کچھ افراد کو روانہ کیا۔ بالآخر انہیں یہ خبر ملی کہ خسرو پرویز قتل ہوگیا ہے اور اس کے جانشین نے اس کے جاری کردہ تمام فرامین منسوخ کردیے ہیں۔ یہ سنتے ہی دونوں ایرانی آفیسر بے نیل ومرام مجبوراً واپس یمن لوٹ گئے۔ مدینہ میں قیام کے دوران انہوں نے اہلِ اسلام کی بود وباش اور جذبے کا جو مشاہدہ کیا' ممکن ہے کہ آئندہ ایام میں ان پر اس کے گہرے

اثرات مرتب ہوئے ہوں۔

خسرو پرویز کی گستاخی کی سزا ساسانی دربار کو مل کر رہی اور چند ہی برس میں اہلِ فارس کی بادشاہت ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ایک نشانِ عبرت اور ایک قصۂ پارینہ بن گئی۔

مجوس اور اہلِ ایران سے آنحضور ﷺ کا مزید واسطہ

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے' روایات کے مطابق آنحضور ﷺ نے دس برس کی عمر میں حیرہ کا سفر فرمایا۔ یہ شہر اُس وقت ایران کی سلطنت کا اہم ساحلی شہر تھا۔ مزید برآں شام سے آتے ہوئے بصرہ تک کے راستے میں اس وقت کی سلطنتِ فارس کے تمام اہم سیاسی مراکز بشمول پائے تخت مدائن واقع تھے۔ علاوہ بریں اپنے جوانی کے زمانہ میں بھی آپؐ نے یمن اور بصرہ کے متعدد سفر کیے تھے۔ بحرین بھی ان دنوں ایران کا صوبہ تھا' آپؐ نے وہاں کا سفر بھی کیا تھا۔ ایک موقع پر بحرین کے لوگ جب مدینہ منورہ تشریف لائے اور آپؐ نے ان سے بحرین کے مختلف مقامات کے بارے میں بالتفصیل بحث کی تو وہ لوگ بہت حیران ہوئے۔ آپؐ نے فرمایا کہ میں کئی مرتبہ آپ کا ملک دیکھ چکا ہوں۔ ان واقعات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ آپؐ نے مرکز فارس اور مقبوضات کا متعدد بار سفر فرمایا تھا۔ آپؐ کو وہاں کے لوگوں کی تہذیب وتمدن' رفتار و معاشرت اور بود و باش کے بارے میں ذاتی اور شخصی اہم معلومات حاصل تھیں۔ آپ ﷺ جب بھی وہاں کا ذکر فرماتے تو اس کے پس منظر میں یہ مشاہدات' تجربات اور معلومات ہوتی تھیں۔ آپ ﷺ نے فتح فارس کی پیشین گوئی بھی فرمائی تھی جس کا ذکر بعد میں یزدگرد سوم کے دربار میں اسلامی سفراء نے کیا تھا۔ علامہ اقبال نے کیا خوب فرمایا تھا:

ماند شبہا چشم او محرومِ نوم
تا بہ تختِ خسروی خوابید قوم

(آنحضور ﷺ کی آنکھیں نیند سے ایک مدت تک محروم رہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آپؐ کی امت کو خسرو کے تخت پر سکون نصیب ہو گیا۔)

اس شعر میں شاعرِ مشرق کی مراد یہی ہے کہ آپؒ کی شدت سے خواہش رہی تھی کہ ملک فارس مسلمانوں کے زیرِ نگیں ہو جائے' اور یہ خطہ اسلام کا مرکز بن جائے اور اس میں بسنے والی اقوام (بشمول خراسان و بلوچستان و سرحد و پنجاب و سنکیانگ کے باسی) ایک نہ ایک دن اسلام کے بازوانِ شمشیر زن بن جائیں۔

عرب میں بھی کہیں کہیں ایرانی اثرات بہت گہرے تھے۔ ایک اہم قبیلہ بنوتمیم بھی زردشتی دین پر قائم تھا۔ یہ لوگ اہلِ مجوس تھے' ان کے ایرانی حکمرانوں سے گہرے روابط بھی رہے ہیں۔ مجوسیوں میں بیٹیوں اور بہنوں سے بھی شادی کو معیوب تصور نہیں کیا جاتا ہے۔ بنوتمیم کے رئیس زرارہ تمیمی نے اپنی بیٹی کو اپنے عقد میں لے رکھا تھا جسے باقی عرب لوگ بہت بری نظر سے دیکھتے تھے۔ اسی طرح اقرع بن حابس تمیمی بھی مجوسی تھا۔ اس امر کا مفصل ذکر ''معارف ابن قتیبہ'' میں ملتا ہے۔ یہ لوگ فارس و عرب کے مابین ایک پُل کی حیثیت رکھتے تھے۔ یہ لوگ کافی پڑھے لکھے اور سمجھ دار تھے۔ ان کے وفود کی دربارِ رسالتؐ میں آمد شروع ہوئی تو یہ لوگ شروع شروع میں مروّجہ زردشتی آداب کو ملحوظِ خاطر لاتے ہوئے پوری شان و شوکت سے مدینہ منورہ آئے۔ بنوتمیم کے تمام بڑے رؤساء مثلاً اقرع بن حابس' زبرقان' عمرو بن الاہتم اور نعیم بن یزید پر مشتمل ایک وفد آنحضورﷺ کے پاس آیا۔ یہ لوگ خود مباہات کا مظاہرہ کرتے ہوئے پہنچے۔ آپﷺ کے گھر کے باہر کھڑے ہو کر آپؐ سے یوں مخاطب ہوئے: اے محمد! باہر آو۔ آپؐ گھر سے نکلے تو کہا کہ ہم مفاخرہ کرنے آئے ہیں' جس سے مراد یہ تھی کہ وہ اپنے مذہب' تمدن اور قبیلے کی خصوصیات کے بارے میں تقریر کریں گے اور پھر اسلام کا پیغام جواب میں پیش کیا جائے گا' پھر تقریری اور مناظرانہ انداز میں بحث ہو گی۔ آنحضورﷺ نے اجازت دے دی۔ چنانچہ ایک مجلس منعقد ہوئی جس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی موجود تھے۔ ان کی جانب سے معروف زردشتی خطیب عطارد بن حاجب آگے بڑھا۔ اس شخص نے دربارِ خسرو نوشیروان سے بھی اپنی تقریری خوبیوں کی بدولت کم خواب کی خلعت حاصل کی ہوئی تھی۔ اس نے کہا ''یزدان کا شکر ہے کہ اس

نے ہمیں گراں بہا تاج وتخت اور خزانوں کا مالک بنایا ہے۔ ہم تمام اقوامِ مشرق میں سب سے معزز ہیں۔ ہمارے برابر کون ہوگا! ہمارے مقابلہ کا جسے دعویٰ ہو وہ اپنے اوصاف وخصائص گنائے''۔

آنحضور ﷺ کے حکم کے مطابق ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ اُٹھے اور یوں گویا ہوئے:
''تعریف کے لائق اللہ کی ذات ہے جو زمینوں اور آسمانوں کا خالق ہے۔ اس نے ہمیں اقتدار بخشا اور تمام انسانوں میں سے اس ہستی کا انتخاب کیا جو سب سے شریف النفس، عالی نسب، حق گو اور بلند اخلاق کے مالک ہیں۔ تمام جہانوں سے آپؐ کو منتخب فرما کر آپؐ پر کتاب نازل کی۔ آپؐ نے لوگوں کو اسلام کی دعوت دی۔ سب سے پہلے مہاجرین اور پھر ہم (انصار) نے اسلام قبول کیا۔ ہم لوگ انصارِ الٰہی اور وزرائے رسالت ہیں۔''

پھر شعری مقابلہ ہوا۔ بنوتمیم کے مشہور شاعر زبرقان ابن بدر نے قصیدہ پڑھا تو جواب میں حضرت حسان رضی اللہ عنہ بن ثابت نے نعت پڑھی۔ اقرع بن حابس نے پھر تقریر کی اور زرتشتی عقائد اور تعلیمات پر اظہارِ فخر کیا۔

اس عالمانہ اور شاعرانہ معرکہ آرائی اور استدلال کا نتیجہ یہ نکلا کہ آخر کار مجوسی عمائدین زچ ہو گئے اور انہوں نے صدقِ دل سے اسلام قبول کرلیا۔ اس کے اثرات مجوسی معاشرے پر بھی مرتب ہوئے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی ان لوگوں کے عقائد وافکار سے واقفیت حاصل ہوئی۔ ان نظریات وعقائد کا فائدہ چند سال بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اُس وقت ہوا جب ایران فتح ہوا اور وہاں کے لوگوں سے معاملات طے کرنے کے لیے تبلیغ واشاعتِ اسلام اور اسلامی حکومت کی وہاں تک وسعت کے مسائل پیش آئے۔

اپنی کتاب ''انوار القرآن'' میں جناب ڈاکٹر ملک غلام مرتضیٰ رقمطراز ہیں کہ جب ایرانیوں نے اسلام قبول کیا تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ان کے لیے نماز کا ترجمہ فارسی میں کردو۔ یہ اس لیے کہا گیا کہ وہ لوگ نماز کو پورے فہم کے ساتھ ادا کریں۔ اس دوران انہیں اتنی عربی آگئی کہ وہ نماز کو سمجھ کر ادا کرنے لگے۔

سرزمین عرب سے کئی لوگ جندی شاہ پور کے مقام پر واقع ایران کی میڈیکل یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے جایا کرتے تھے اور وہاں سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد وہ لوگ واپس اپنے وطن مالوف لوٹتے تو ان پر عجمیت کا رنگ غالب ہوتا اور اعلیٰ غیر ملکی ڈگری کے حصول کے باعث معاشرے میں انتہائی عزت و آبرو کے مستحق گردانے جاتے۔ یہ لوگ مجوسی نظریات اور عقائد سے باخبر ہوتے اور انہوں نے ایرانی اساطیری ادب کا مطالعہ بھی کیا ہوتا تھا۔ ان لوگوں میں رکھ رکھاؤ اور پروٹوکول کا مخصوص عجمی احساس بھی موجود ہوتا۔ ایک ایسے ہی طبیب حارث بن کلدہ بھی تھے۔ انہوں نے جندی شاہ پور میں تعلیم حاصل کی تھی اور کم از کم ایک مرتبہ دربارِ خسرو نوشیروان میں بازیابی حاصل کی تھی اور شاہ سے خطاب بھی کیا تھا۔ انہوں نے خسرو نوشیروان کو طبی مشوروں سے نوازا تھا۔ یہ بنو ثقیف قبیلہ سے وابستہ تھے اور طائف میں قیام پذیر تھے۔ آنحضور ﷺ نے ان کو حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے معالجے کے لیے مدعو بھی کیا تھا اور انہوں نے آنحضورؐ سے ملاقات کی تھی۔ یہ اسلام کے ابتدائی دور میں وفات پا گئے تھے اور ان کے اسلام قبول کرنے کی بابت ثابت نہیں ہو پایا۔

ایک اور شخص نضر بن حارث بن کلدہ تھا۔ وہ بھی جندی شاہ پور سے فارغ التحصیل تھا اور معروف طبیب اور دانش مند تصور کیا جاتا تھا۔ وہ قرآن پاک کی آیات کا تمسخر اڑاتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ ایرانیوں کی اساطیر خصوصاً رستم اور اسفندیار کی داستانیں مطالب و معانی اور تفریحی اعتبار سے قرآنی حکایات سے بہتر ہیں۔ مستشرقین خصوصاً آر جی آربری نے یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ کبھی کبھار وہ آنحضور ﷺ کی مجلس میں آکر (مکی زندگی میں) ایرانی قصے چھیڑ دیتا تو لوگ آنحضور ﷺ کو چھوڑ کر اس کی جانب متوجہ ہو جایا کرتے۔ بقول ڈاکٹر براؤن آنحضور ﷺ کو اس کے اس نازیبا رویے پر سخت غصہ تھا۔ وہ بالآخر اسیرانِ بدر کے گروہ میں بارگاہِ نبوت میں مدینہ منورہ لایا گیا تو آنحضورؐ نے اس کے قتل کا حکم صادر فرما دیا اور اسے آیات و حکایاتِ قرآن کے استہزاء کی سزا مل گئی۔ بقول علامہ محمد قزوینی وہ حارث بن علقمہ بن کلدہ کا بیٹا تھا۔

علاوہ بریں حجاز ونجد ویمن میں قبیلہ بنو تمیم کے علاوہ بھی مجوسیوں کا وجود ملتا تھا اور جب وہ آنحضورﷺ کے عہد میں اسلامی نظم وضبط کے تحفظ میں آئے تو مولانا سلیمان ندوی کے بقول ان پر جزیہ عائد کیا گیا۔ ان لوگوں سے بھی آنحضورﷺ کو معاملات پیش آئے۔

مدنی زندگی میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ بھی مدینہ منورہ میں بطور غلام تشریف لائے۔ اس سے قبل اسلام کی حقانیت کی بشارت کے باعث ان کے تجسس نے انہیں مدینہ کی راہوں پر عازمِ سفر کر دیا تھا، مگر اپنے ساتھ شریکِ سفر کرنے والے یہودیوں نے مدینہ پہنچتے ہی انہیں فروخت کر دیا۔ آپؓ کی نجابت، بصیرت، تقویٰ اور اسلام سے جذباتی وابستگی کی ایک الگ داستان ہے۔ آپؓ اگر اصحابِ صُفّہ کے سرخیل تھے تو جنگی حکمتِ عملی میں رسول اللہ ﷺ کے خصوصی مشیر۔ آپؓ بزرگ صحابہ میں قابلِ احترام تھے تو دوسری جانب آنحضورؐ نے آپؓ کو اپنے اہلِ بیت کا فرد قرار دیا تھا۔ آپ رضی اللہ عنہ کی قدر و منزلت کا تقاضا ہے کہ کسی اور مرحلے پر ایک مستقل تحریر کی صورت میں آپؓ کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کیا جائے۔ تاہم مختصراً یہ کہ جنگِ خندق کی حکمتِ عملی وضع کرتے وقت اور دیگر مواقع پر دیے گئے مشوروں سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ پہنچنے کے بعد آپؓ آنحضورﷺ کے انتہائی قریبی دوست اور صحابی تھے۔ آپؓ کی شخصیت عجمی مسلمانوں کی نجابت، شرافت اور طاعت کا ایک حسین ترین نمونہ تھی۔ آپؓ کی عظیم شخصیت کے اثرات بعد میں ایران میں تبلیغ اسلام اور انتظام و انصرام پر مرتب ہوئے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ایران کی سماجی اور ثقافتی زندگی کی بابت حضرت سلمانؓ بھی آنحضورؐ کو معلومات مہیا فرماتے رہے ہیں۔ ابتدا میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کو عربی زبان سمجھنے میں دشواری پیش آتی تھی۔ آپؐ نے انہیں فرمایا کہ تلاوت کثرت سے کرتے رہو، جب عربی زبان سیکھ جاؤ گے تو قرآن پاک کو سمجھ کر پڑھ لینا!

ایرانی مقبوضات میں اسلام کی اشاعت کا آغاز

آنحضورﷺ کی حیاتِ طیبہ کے آخری چار برسوں میں اسلام کی اشاعت بڑے

پیمانے پر ہوئی۔ یمن ان دنوں ایران (سلطنتِ فارس) کا اہم صوبہ تھا جو آنحضورؐ کی زندگی کے پہلے برس سے مسلسل ایرانیوں کے قبضے میں تھا۔ یہاں پر اُن کا ایک مستقل گورنر مقیم ہوتا تھا۔ مزید برآں ایرانی فوج اور عمائدین کی ایک معقول تعداد بھی وہاں موجود رہتی تھی۔ وہاں کے مقامی باشندے زیادہ تر یہودی اور عیسائی تھے مگر ''اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِھِمْ'' (لوگ اپنے بادشاہوں کے مذہب پر ہوتے ہیں) کے مصداق ساٹھ سالہ غلبہ کے باعث وہاں پر ایرانی اثرات معاشرے میں گہرے ہو چکے تھے اور وہاں پر آتش کدے بھی روشن تھے۔ ایرانی عمائدین کو وہاں انباء کہا جاتا تھا۔ آنحضور ﷺ نے ۱۰ھ میں وبر بن یحنسؓ کو ان کے پاس دعوتِ اسلام دے کر بھجوایا۔ وہ نعمان پسر بزرگ کی مہمان نوازی سے لطف اندوز ہوئے۔ وہیں سے دیگر ایرانی عمائدین فیروز دیلمی، مرکیود، وہب پسر منبہّ کے پاس دعوتِ اسلام کے مراسلے بھجوائے۔ یہ لوگ زردشتی عقائد کے باعث توحید کے نظریہ سے کسی حد تک آشنا تھے، لہٰذا یہ لوگ فوراً مسلمان ہو گئے۔ صنعاء میں سب سے پہلے حافظ قرآن حضرت مرکیود کے صاحبزادے عطا اور وہب بن منبہ تھے جو ایرانی نوجوان تھے۔ یہ ایرانی عمائدین جب اسلام کے دائرے میں آ گئے تو انہوں نے مرکز فارس یعنی مدائن سے اپنا ناطہ یکسر توڑ لیا اور آنحضور ﷺ کی اطاعت کا دم بھرنے لگے۔ گویا یہ ایرانی بادشاہت اور قومیت سے پہلی علیحدگی تھی جو عقیدے میں تبدیلی کے باعث ممکن ہوئی۔

نواحی صوبہ نجران ہر چند کہ عیسائی آبادی کا مسکن تھا مگر پھر بھی جغرافیائی اعتبار سے ایرانی حدود میں موجود ہونے کے باعث ایرانی اثرات سے پاک نہیں تھا۔ ان لوگوں تک بھی آپؐ کا پیغام پہنچا اور ۱۰ھ میں یہ لوگ حضرت خالد بن ولیدؓ کے ہاتھوں مسلمان ہو گئے۔

بحرین بھی ایرانی صوبہ تھا اور وہاں کی غالب اکثریت فارسی باشندوں پر مشتمل تھی۔ وہاں کے عرب قبیلہ عبدالقیس نے مدینہ کے تجارتی سفر میں آنحضورؐ سے متاثر ہو کر اسلام قبول کیا، پھر ان لوگوں نے وہاں پر مسجد تعمیر کی۔ مسجد نبوی کے بعد بحرین کی

مسجد وہ دوسرا مقام تھی جہاں پھر باقاعدہ طور پر جمعہ کا خطبہ پڑھا گیا۔ آنحضورؐ نے حضرت علاء حضرمیؓ کو دعوتِ اسلام دی۔ یہاں پر ان دنوں ایرانیوں کی جانب سے مقرر کردہ گورنر منذر پسر ساویٰ تھا۔ انہوں نے دعوت اسلام پر لبیک کہا اور بڑی تعداد میں ایرانیوں نے زردشتی دین چھوڑ کر اسلام قبول کرلیا۔ بحرین کے علاقہ ہجر میں ایران کی جانب سے سیبخت حکمران مقرر تھا' اسے آنحضورﷺ کا مراسلہ موصول ہوا تو اس نے اپنے ایرانی ہم وطنوں کے ہمراہ دعوتِ اسلام پر لبیک کہا اور یہ لوگ اسلام کے علمبردار بن گئے۔

آنحضورﷺ نے ایرانی عمائدین کو اہم سرکاری ذمہ داریوں سے بھی نوازا اور ان پر اپنے اعتماد کا اظہار فرمایا۔ حضرت باذانؓ بن سامان ایران کے شاہی خاندان (اہل ساسان) کے فرزند تھے اور مشہور شہنشاہ بہرام گور کی اولاد میں سے تھے۔ شاہی خاندان کے اسلام قبول کرنے والے وہ پہلے فرد تھے۔ آپؐ نے ان کی خاندانی نجابت اور فہم و فراست کے مدنظر انہیں یمن کا گورنر مقرر کیا۔ پھر ان کے صاحبزادے شہر بن باذانؓ کو اپنے باپ کے بعد یہ ذمہ داری تفویض فرمائی۔

ایرانی اشیاء کا استعمال

رسول اللہﷺ نے نوشیروانی قبا بھی زیب تن فرمائی جو مشہور ایرانی لباس تھا۔ اس پر جیب اور آستینوں کی جگہوں پر دیبا کی سنجاف تھی۔ پاجامہ ایرانی لباس تھا' آپؐ نے اپنے لیے منیٰ کے بازار سے خریدا تھا۔ ایک موقع پر آپؐ نے فرمایا کہ جب تم عجم فتح کرو گے تو وہاں تمہیں حمام ملیں گے' ان میں جانا تو چادر کے ساتھ جانا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ ایرانی حمام کے وجود سے باخبر تھے۔ اسی طرح آپؐ کی خدمت میں جو تحائف عمائدینِ ایران نے یمن اور بحرین سے روانہ فرمائے' وہ بھی آپؐ کے استعمال میں رہے۔

استخراج نتائج

اس مختصر مضمون سے چند نتائج اخذ کیے جاسکتے ہیں:

ا) آنحضورﷺ نے کسی بھی موقع پر عرب وعجم کا امتیاز ملحوظ خاطر نہیں رکھا۔

ب) ایرانی عمائدین نے دعوتِ اسلام کے فوراً بعد اسلام قبول کر لیا۔

ج) آنحضورﷺ نے ایرانی عمائدین کو بطور گورنر نامزد فرما کر ان کے فہم و فراست اور نجابت کا احترام فرمایا۔

د) آپؐ نے ایرانی فنونِ جنگ سے استفادہ فرمایا اور دیگر اہم معاملات میں بھی حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے مشاورت طلب فرمائی۔

ر) آپؐ نے ایرانی اشیاء کا استعمال بھی فرمایا۔

س) آپﷺ کو مراکزِ ایران کے چشم دید مشاہدات بھی حاصل تھے۔

ص) آپؐ نے اہلِ عجم کے اسلام قبول کرنے کی بشارت بھی فرمائی تھی اور آپؐ کی آرزو بھی یہی تھی۔

اہلِ ایران سے وابستہ توقعات

آنحضورﷺ نے فرمایا تھا کہ اگر میری حدیث چاند پر بھی پہنچ جائے تو اہلِ فارس میں سے ایک شخص اسے وہاں سے بھی لے آئے گا۔ یہ اور بات ہے کہ ماہرینِ علمِ حدیث نے اس کی سند کو مقطوع قرار دیا ہے۔

اسی طرح آنحضورﷺ نے بشارت فرمائی تھی کہ اسلام کے عہدِ ابتلاء میں خُراسان سے لشکرِ اسلام روانہ ہوگا۔ خراسان ایران کا شمال مشرقی صوبہ ہے اور یہ ہمیشہ زمانہ قدیم سے ایرانی سلطنت میں شامل رہا ہے۔ اس علاقہ میں فارسی بولی جاتی ہے اور اس میں افغانستان کے کچھ حصے، تاجکستان، واخان، چین کے صوبہ زنجیانگ کے کچھ حصے اور پاکستان میں مالاکنڈ ڈویژن کے کچھ حصے بھی شامل تھے۔ آپؐ نے فرمایا تھا کہ یہ لشکر ایلیاء (یعنی بیت المقدس) پہنچ جائے گا اور اس کا راستہ کوئی بھی روک نہیں سکے گا۔ اس طرح اہلِ خُراسان کا لشکر مہدیٔ موعود کا مددگار بن جائے گا۔ یہ لوگ کالے جھنڈے اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ بنواُمیہ کے انقراض کے وقت اور سلطنت بنوعباس کی تاسیس کے موقع پر ابومسلم خراسانی بھی اپنے لشکر کو سیاہ علم اٹھوائے ہوئے لایا تھا، مگر یہ لشکر یروشلم

تک پہنچ نہیں پایا تھا۔

اس طرح آنحضور ﷺ نے اہلِ فارس کے علم وفراست، جذبہ جہاد اور قربانی کی پیشین گوئی بھی فرمائی تھی۔ آنحضورؐ نے حجۃ الوداع کے موقع پر واشگاف الفاظ میں اعلان فرمایا:

((يَا اَيُّهَا النَّاسُ اَلَا اِنَّ رَبَّكُمْ وَاحِدٌ وَاِنَّ اَبَاكُمْ وَاحِدٌ اَلَا لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلٰى اَعْجَمِيٍّ وَلَا لِعَجَمِيٍّ عَلٰى عَرَبِيٍّ وَلَا لِاَحْمَرَ عَلٰى اَسْوَدَ وَلَا اَسْوَدَ عَلٰى اَحْمَرَ اِلَّا بِالتَّقْوٰى)) (مسند احمد)

''اے لوگو! درحقیقت تمہارا پروردگار ایک ہے، اور بے شک تمہارا باپ ایک ہے۔ کسی بھی صورت میں عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر، سُرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سُرخ پر کوئی فوقیت نہیں ہے، اگر کسی وجہ سے فضیلت ہے تو وہ فقط تقویٰ کی بنا پر ہے۔''

اس عظیم اعلان کی وجہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اسلام کی نظر میں سب لوگ برابر ہیں، مگر مختلف اقوامِ اسلام اپنی گوناگوں خصوصیات کے باعث اسلام کی خدمت کے مختلف فرائض سرانجام دینے کی اہلیت کی حامل ہیں۔ اس طرح مسلمانانِ عرب وعجم میں نفرت یا ناپسندیدگی کے جذبات کی بیخ کنی کی اشد ضرورت ہے۔ بقول اقبال: ع ''عرب کے سوز میں سازِ عجم ہے''

نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم
چمن زادیم و از یک شاخساریم
تمیزِ رنگ و بو بر ما حرام است
کہ ما پروردۂ یک نوبہاریم

(نہ ہم افغانی ہیں اور نہ ہی تاتار کے ترک۔ ہم گلستان اسلام کے برگ وبار ہیں اور ایک شاخ سے وابستہ ہیں۔ ہم پر رنگ ونسل کی تفریق حرام ہے، کیونکہ ہمیں ایک مشترک نوبہار نے پال پوس کر بڑا کیا ہے۔)

آنحضور ﷺ کے زمانے کا ایران اور پایۂ تختِ ایران

آنحضور ﷺ کے زمانے میں سلطنت فارس موجودہ ایران، افغانستان، تاجکستان،

زنجیا نگ، ازبکستان، ترکمانستان، کوہستان، قفقاز، چیچنیا، آذربائیجان، آرمینیا، جارجیا اور موجودہ پاکستان کے بیشتر خطوں کے علاوہ جزیرہ نمائے عرب بشمول یمن وحجاز، عراق اور کچھ عرصہ کے لیے بحیرۂ روم کے ساحلی علاقوں (شام وفلسطین ومصر) پر محیط تھی۔ اس طرح یہ ایشیا کی سب سے بڑی بادشاہت تھی اور کئی موقعوں پر مغرب کی بازنطینی رومی شہنشاہیت کی افواج کو اہل فارس نے بری طرح مات دی تھی۔ ان کی طویل عرصہ تک مسلسل جنگ لڑنے کی استعداد، فہم وفراست، ہیبت ودبدبہ، ملّی جذبہ، شہنشاہی نظام کی گرفت اور مذہبی کلیسائی نظام کا استحکام انہیں دنیائے معلوم میں ایک منفرد مقام عطا کرتا تھا۔ معاشی اور انسانی ذرائع اور ان کے ریزرو (reserve) انہیں کسی انتظامی اور دفاعی مشکل سے عہدہ برآ ہونے میں مددگار تھے۔ تاہم سلطنت کی وسعت، محلاتی سازشیں اور عمائدینِ سلطنت کی ریشہ دوانیاں بتدریج پنپ رہی تھیں۔

جیسے کہ عرض کیا جاچکا ہے، ان کا پائے تخت موجودہ بغداد سے بیس میل کے فاصلے پر تھا اور یہ دجلہ کے کناروں پر آباد بستیوں کا ایک شاندار مجموعہ تھا۔ ایک بستی سلوکیہ کے نام سے موسوم تھی اور اسے سکندرِ اعظم کے جانشینوں (سلوکیوں) نے آباد کیا تھا۔ ایک شہر طیسفون تھا جو اَب بھی عراق میں ایک گاؤں کی صورت میں موجود ہے۔ طیسفون کے تینوں اطراف پر ہلال کی صورت میں ایک فصیل تھی جس پر برج بنے ہوئے تھے۔ اس دیوار کے آثار اب بھی موجود ہیں۔ عربوں نے ان بستیوں کے مجموعے کو مدائن (مدینہ کی جمع) کہا۔ طیسفون کے گاؤں کے عین مرکز میں سیّدنا سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کا مدفن اب بھی موجود ہے، جہاں وہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی جانب سے انتظام وانصرام کے لیے تعینات فرمائے گئے تھے۔ بقول اقبال:

آں مسلماناں کہ میری کردہ اند
در شہنشاہی فقیری کردہ اند
در امارت فقر را افزودہ اند
مثلِ سلماں در مدائن بودہ اند

(وہ مسلمان جو حکومت کرنے کے لیے منتخب ہوئے'انہوں نے بادشاہت میں بھی فقر کے اسلوب اپنائے رکھے تھے۔ انہوں نے اولوالامر ہوتے ہوئے بھی امارت اور فقر کا امتزاج پیش کیا تھا اور اس کی سب سے نمایاں مثال مدائن میں حضرت سلمان فارسیؓ کی تھی۔)

مدائن کو خسرو نوشیروان نے اپنا دارالحکومت بنایا تھا' جسے ایوانِ مدائن' قصرِ مدائن اور طاقِ کسریٰ کے ناموں سے پکارا جاتا تھا۔ ایک عرب شاعر بختری کے بقول : ؎

وکان الایوان من عجب الصنعة

جوب فی جنب ارعن جس

مشمخر نعلو له شرفات

رفعت فی رؤوس رضوی و قدس

لیس یدری صنع انس لجّن

سکنوه ام صنع جنّ لاِنس

(اس کاخِ شاہی کی تعمیر دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ گویا اسے کسی پہاڑ کی بلند چوٹی سے تراشا گیا ہے۔ اس کی رفعت و بلندی سے محسوس ہوتا ہے کہ گویا اس کی دیواروں کے کنگرے کوہِ رضوی اور کوہِ قدس پر اٹھائے گئے ہیں۔ نجانے اسے انسانوں نے جنوں کی رہائش کے لیے تعمیر کیا ہے یا جنوں نے انسانوں کے لیے۔)

آج تک طیسفون کے گاؤں کے جنوب میں ایوان مدائن کے آثار موجود ہیں جو کبھی نادرِ روزگار تھے اور اب بھی کھنڈرات کی صورت میں موجود ہیں۔ ان میں سے ایک دنیا کی بلند ترین محراب بھی ہے۔ اس کے پہلوؤں میں چھ منزلہ عمارات کی دیواریں قائم ہیں جن کی چوٹی کا حصہ محراب کی چوٹی سے متصل ہے۔ یہی طاق کسریٰ خسرو نوشیروان کا محل تھا۔

خسرو پرویز (۵۹۰-۶۳۱ء) نے اس ایوان کی مرمت بھی کروائی تھی اور اس میں کئی ایک اضافے بھی کیے تھے۔ اس نے ہیروں اور جواہرات سے مزیّن ایک تہہ خانہ بھی تعمیر کروایا تھا۔ پھر فرش بہار نامی ابریشمی فرش (جو زمرد اور جواہرات سے مرصع

میں ڈالا تھا۔ یہ فرش بعد میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد میں مالِ غنیمت کے طور پر مدینہ منورہ لایا گیا تھا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مشورہ سے اسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے تقسیم کیا گیا تھا۔

مسلمانوں کی ایک سیلاب کی طرح بڑھتی ہوئی افواج نے اس ایوان کا گھیراؤ کیا اور ۱۶ مارچ ۶۳۷ء کو اس پر قبضہ کیا۔ محل میں داخل ہوتے ہی مشہور صحابی حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے وہاں باجماعت نمازِ شکرانہ ادا فرمائی اور سورۃ الدخان کی تلاوت فرمائی، جس میں آلِ فرعون کے محلات اور مال و متاع کا ذکر کرتے ہوئے خداوندِ قدوس نے اہلِ حق کو اس کی ملکیت عطا کرنے کا اعلان فرمایا ہے، جس پر نہ آسمان رویا نہ زمین نے ماتم کیا اور نہ ہی ان کو مہلت دی گئی۔ شیخ سعدی شیرازیؒ (متوفی ۱۲۹۱ء) نے کیا خوب فرمایا تھا:

چو صیتش در افواہِ دنیا فتاد
تزلزل در ایوانِ کسریٰ فتاد

(جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کی خبر لوگوں تک پہنچی تو ایوان کسریٰ میں زلزلہ آ گیا۔)

اہلی شیرازی (متوفی ۱۵۳۵ء) نے کہا تھا:

کسریٰ کہ چوں ہلال بود طاقِ کسریش
از طاقِ ابروی چو ہلالِ محمدؐ است

(خسرو نوشیروان یا خسرو پرویز جن کے لیے طاق کسریٰ کا محراب ایک ماہِ نو (ہلال) کا مظہر تھا، وہ آج آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ابرو کے محراب کا نشان بن چکا ہے۔)

بالآخر اُبھرتی ہوئی اسلامی عظمت کے سامنے یہ آثار بھی ماند پڑ گئے، اور ان میں بسنے والے تاریخ کے صفحات میں گم ہو کر رہ گئے۔ مشہور ایرانی شاعر افضل الدین خاقانی (۱۱۲۶ء تا ۱۱۹۸ء) حج کی غرض سے جب ان کھنڈرات میں سے گزرا تو اس نے کیا خوب کہا:

ہاں اے دلِ عبرت بیں از دیدہ نظر کن ہاں
ایوانِ مداین را آئینۂ عبرت داں
(اے عبرت آموز دل! اپنی آنکھیں کھول اور ایوان مدائن کو عبرت کا آئینہ سمجھ۔)

گفتی کہ کجا رفتند آں تاجورانِ انیک
زایشاں شکم خاکست آبستن جاویدان
(تو نے کہا ہے کہ وہ شہنشاہ کہاں چلے گئے؟ وہ مٹی کے پیٹ میں ہمیشہ کے لیے گم ہو کر اس کو حاملہ کر گئے۔)

اسلام کی عظمت، آنحضور ﷺ کی بعثت، تہذیبوں کا زوال، خدا کے ابدی پیغام کی حقانیت کی مُنہ بولتی تصویر کے روپ میں آج مرکزِ عراق میں ایوان کسریٰ واقعی عبرت کا مقام بن چکا ہے۔ ہمیں قرآن حکیم بار بار حکم دیتا ہے کہ ہم ماضی کے آثار میں گھوم پھر کر دیکھیں کہ ہم سے پہلی کتنی طاقتور قومیں خاک میں مٹ گئیں۔ ان اقوام میں سے جنہوں نے حق کی آواز پر لبیک کہا وہ آج بھی اپنے عظیم اسلامی تشخص کے ساتھ زندہ ہیں۔

فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ!!

اسلام کے بعد کا دور

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۠ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰي شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَاُولٰۗئِكَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَھُمُ الْبَيِّنٰتُ ۭ وَاُولٰۗئِكَ لَھُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝﴾ (آل عمران)

''اے ایمان دار لوگو! اللہ سے اسی طرح ڈرو جس طرح اس سے ڈرنے کا حق ہے اور تمہیں جب موت آئے تو صرف حالتِ اسلام ہی میں آئے۔ اور اللہ کی رسّی کو اجتماعی طور پر مضبوطی سے تھام لو اور فرقہ بندی میں پڑ کر بکھر نہ جانا' اور اپنے آپ پر (نازل ہونے والی) اللہ کی نعمت کو یاد کرو کہ جب تم آپس کی دشمنیوں میں مگن تھے تو اس نے تمہارے دلوں میں محبت کی لو روشن کر دی' پھر اس کی (اسی) نعمت کے باعث تم (آپس میں) بھائی بھائی ہو گئے (تم میں بھائی چارے یعنی مؤاخات کی عظیم صبح طلوع ہو گئی)۔ اور (ایک وقت تھا جب) تم آگ کی گہری کھائی کے دہانے پر پہنچ چکے تھے' پھر اُس نے تمہیں اس سے بچالیا۔ اسی طرح اللہ تمہارے لیے اپنی نشانیاں بیان کرتا ہے تا کہ تم ہدایت کی راہ اختیار کر سکو۔ اور تم میں سے ایک گروہ ایسا بھی ہونا چاہیے جو بھلائی (کے راستوں) کی طرف رہنمائی کرے اور برائی سے روکے۔ اور ایسے ہی لوگوں کے لیے کامیابی و کامرانی (کی نوید) ہے۔ اور تم اُن لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو فرقوں میں بٹ گئے اور واضح نشانیاں ظاہر ہونے کے بعد بھی باہم اختلافات کا شکار ہو گئے۔ اور

یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے بہت بڑا عذاب (آنے والا) ہے۔''

قرآن پاک کی ان آیات کی تلاوت اور ترجمہ کے بعد ناچیز یہ عرض کرنا چاہے گا کہ فروعی اختلافات کو اگر اصلِ اسلام پر حاوی کر دیا جائے تو حقیقت خرافات میں گم ہو جاتی ہے۔ ؎

اے کہ نشناسی خفی را از جلی ہشیار باش
اے گرفتارِ ابوبکرؓ و علیؓ ہشیار باش

(اے کہ تمہیں خفی اور جلی (یعنی اصل اور فروع) کی اہمیت کا احساس نہیں ہے! تو ہوش کے ناخن لے۔ اور اے وہ شخص جو ابوبکرؓ اور علیؓ میں الجھ کے رہ گیا ہے! ہوش میں آ جا!)

علامہ اقبال نے فرمایا ہے: ؎

بہ مصطفےٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ اُو نرسیدی تمام بولہبی ست

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ جاؤ کہ دین تمام کا تمام وہیں ہے۔ اگر آپ تک نہ پہنچ سکنے کے باعث اِدھر اُدھر اُلجھ کر رہ گئے تو پھر ابولہب کے عقائد میں الجھ کر رہ جاؤ گے۔)

یہاں پر ابولہب کے عقائد سے مراد رجعت پسندی، جمود، قدیم اور غلط روایات پر ضد کرنا، قبائلی اور نسلی تضادات میں الجھ کر رہ جانا اور حقیقت کے واضح طور پر روشن ہونے کے بعد ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرنا ہے۔ ایک بار پھر شاعر مشرقؒ کی زبانی عرض کرتا ہوں: ؎

ملتِ بیضا تن و جاں لا الٰہ ساز ما را پردہ گرداں لا الٰہ
لا الٰہ سرمایۂ اَسرارِ ما رشتہ اش شیرازۂ اَفکارِ ما
ملت از یک رنگیٔ دلہاستے روشن از یک جلوۂ سیناستے
قوم را اندیشہ ہا باید یکے در ضمیرش مدّعا باید یکے
ما مسلمانیم و اولادِ خلیلؑ از ''اَبِیکُمْ'' گیر اگر خواہی دلیل

مدّعاے ما' مآلِ ما یکے ست　　طرز و اندازِ خیالِ ما یکے ست
ما ز نعمت ہائے اُو اخواں شدیم　　یک زبان و یک دل و یک جاں شدیم

(ملتِ بیضا اگر جسم ہے تو اس کی روح لا الٰہ یعنی توحید کی قوت ہے۔ ہمارے ساز کی تاروں اور پردوں کو چلانے والی قوت بھی لا الٰہ ہے۔ ہمارے تمام اسرارِ نہاں یعنی خفیہ رازوں کی دولت لا الٰہ ہے اور یہی وہ رشتہ اور تعلق ہے جس نے ہماری سوچوں کو اکٹھا کر کے ایک وحدت میں سمو رکھا ہے۔ ہماری قوم کے اتحاد کا راز دلوں کے ایک ہی رنگ میں رنگے جانے میں ہے۔ ایک ہی جلوۂ طورِ سینا سے ہماری روشنی ہے۔ ہم مسلمان ہیں اور ''مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ''☆ کے مصداق ایک ہی سرچشمہ یعنی دین ابراہیمی سے ہماری دلیل ہے۔ ہمارا مقصد اور ہماری آرزوئیں ایک ہی ہیں۔ ہمارا طرزِ حیات' اندازِ فکر اور خیالات ایک ہی ہیں۔ ہم توحید کی نعمتوں کے باعث بھائی بنے ہیں (یہ متذکرہ بالا آیت (آل عمران:۱۰۳) کی طرف اشارہ ہے) اور اسی وجہ سے ہم ایک زبان' ایک دل اور ایک جان ہوئے ہیں۔)

ایک اور موقع پر آپ فرماتے ہیں: ؎

رومیاں را گرم بازاری نماند　　آں جہانگیری جہانداری نماند
شیشۂ ساسانیاں در خوں نشست　　رونقِ خمخانۂ یوناں شکست
مصر ہم در امتحاں ناکام ماند　　اُستخوانِ اُو تہ اہرام ماند
در جہاں بانگِ اذاں بودست و ہست　　ملتِ اسلامیاں بود ست و ہست
عشق از سوزِ دلِ ما زندہ است　　از شرارِ لا الٰہ تابندہ است

(رومی بادشاہت کا عروج ختم ہو گیا۔ ان کی باشاہت کے آئین و دساتیر اور فاتحانہ سرگرمیاں قصۂ پارینہ بن گئیں۔ ایران کی عظیم ساسانی شہنشاہت کی عظمت کے نقوش ان کے اپنے ہی خون کی ندیوں میں بہہ گئے۔ یونان کی تہذیب اور فلسفے کی بوقلمونیاں اور موشگافیاں مٹ گئیں۔ مصری بھی اپنی ہیبت اور جلال برقرار رکھنے میں ناکام ہو گئے اور فرعونوں کی ہڈیاں اَہرام کی گہرائیوں میں

☆ ''تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کی ملت''۔ (الحج:۷۸)

عبرت کا نشان بن گئیں۔ اگر کچھ باقی ہے تو اذان کی آواز ہے اور رہی ہے۔ مسلمانوں کی اُمت ابھی تک زندہ رہی ہے' اور ہے۔ عشق ہمارے دل کے سوز کے باعث زندہ ہے اور اس کی چمک دمک اور فروغ لا الٰہ کی چنگاریوں کے باعث ہے۔)

اسی طرح آپ فرماتے ہیں: ؎

وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود
ہوتی ہے بندۂ مؤمن کی اذاں سے پیدا

یہاں پر ہمارے مدِّ نظر علامہ اقبال کے فلسفہ اور فکر کو بیان کرنا نہیں' بلکہ آپ کے سامنے مسلمانوں کے ان گروہی اور فروعی اختلافات کی تصویر کھینچنا ہے' جو امتدادِ زمانہ کے باعث فروغ پاتے چلے گئے اور ہم مختلف گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔

مجھے ڈاکٹر اسرار احمد مدظلّہ العالی کے خیالات سے کاملاً اتفاق ہے کہ اسلام میں دو ہی فرقے ہیں' ایک سنی اور ایک شیعہ' باقی تمام مکاتب فکر ہیں۔ بدقسمتی سے کم علمی اور کبھی کبھی کم عقلی کے باعث ایک دوسرے پر کفر کے فتوے لگانا کچھ لوگوں کا شعار رہا ہے' مگر اجتماعی طور پر سنی اور شیعہ ایک دوسرے کو مسلمان سمجھتے ہیں اور سمجھتے رہیں گے۔ آج مجھے حکم ملا ہے کہ میں تشیع کی اصل صورت آپ کے سامنے پیش کروں۔

شیعیت کی ابتدا

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی اسلام کے لیے عظیم خدمات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہیں۔ بقول قابل قدر شیعہ علماء کے آپ رضی اللہ عنہ کعبہ میں پیدا ہوئے۔ آپؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں پرورش پائی اور بچپن میں ہی اسلام کی دولت سے مالا مال ہونے کے باعث سبقت حاصل کی۔ آپؓ کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مکّہ سے مدینہ ہجرت کے موقع پر اپنے بستر پر لٹا کر مدینہ کی راہ لی' اور اپنے کئی دنیاوی اُمور آپؓ کے سپرد کیے کہ وہ ان کو نمٹانے کے بعد مدینہ کی جانب سفر فرمائیں۔ پھر اپنی سب سے لاڈلی بیٹی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آپؓ کے نکاح میں دے دیا۔ معرکہ ہائے حق و باطل میں

حضرت علی رضی اللہ عنہ پیش پیش رہے اور خیبر کی فتح کا سہرا آپؓ کے سر رہا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھرانے سے محبت کرنے والوں کی نظر میں حضرت علی، حضرت حسن، حضرت حسین اور حضرت زینب رضی اللہ عنہم سے عقیدت ایک فطری امر ہے۔ ان تمام امور میں سنی اور شیعہ مسلمانوں میں کہیں بھی اختلاف نظر نہیں آتا۔ بلکہ حبِ اہل بیت کا اظہار درود شریف کی صورت میں ہر نماز میں ہوتا ہے، جس میں آلِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر درود اور برکات بھیجے جاتے ہیں۔ بعض سنّی زعماء (مثلاً حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ، علامہ وحید الزمان حیدر آبادی اور علامہ اقبال کسی حد تک) حبِ علیؓ اس حد تک بڑھ کر بیان فرماتے ہیں کہ ان اصحاب کا اظہارِ عقیدت جمہور سنی علماء سے کسی حد تک مختلف ہو جاتا ہے۔ حضرت علامہ اقبال نے اپنے وصیت نامہ میں ہر چند خود کو حنفی سنی قرار دیا ہے، مگر ساتھ ہی اہل بیت کی محبت کا اظہار بلند آہنگ سے فرمایا ہے اور کسی قسم کی لگی لپٹی نہیں رکھی۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا مشن مکمل کر لیا تو آپ بھی اس جہانِ فانی سے بتقاضائے بشریت رخصت ہو گئے۔ شیعہ احباب کے خیال میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ۱۰ھ میں حضرت سلمان فارسی، عمار بن یاسر، ابوذر غفاری اور دیگر اصحاب رضی اللہ عنہم کی موجودگی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنا جانشین نامزد فرمایا۔ اس دن کو عید غدیر کے طور پر منایا جاتا ہے۔ یہ دن عیدالاضحیٰ کے بعد ذوالحجہ کے مہینہ میں آتا ہے۔ مگر جمہور اہل سنت کے ہاں ایسی کوئی دلیل نہیں ملتی۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلافت کے امیدوار کے طور پر پیش کیا گیا، مگر ثقیفہ بنو ساعدہ میں اکثریت کی رائے کے مطابق حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ منتخب ہو گئے۔ پہلے چھ ماہ ہر چند کہ حضرت علیؓ نے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت سے اعراض فرمایا مگر حضرت فاطمۃ الزہراءؓ کی رحلت کے بعد حضرت علیؓ نے حضرت عمر فاروقؓ کی کوششوں سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت فرما لی۔ اس دوران بھی حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت اور سرکاری کنٹرول کو تسلیم کیا گیا۔ اسی دوران حضرت فاطمہؓ باغ فدک کے مسئلہ پر حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ہاں تشریف لے گئیں اور مسئلہ پیش کیا، مگر آپؓ نے جس انداز سے معاملے کی وضاحت فرمائی حضرت فاطمہؓ بغیر کسی مزید

استدلال اور دعویٰ کے واپس تشریف لے آئیں۔

ازاں بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اصحابِ ثلاثہ یعنی حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہم کے اَدوار میں کبھی بھی خلافت پر اپنے استحقاق کی بات نہیں چھیڑی۔ حضرت عمر فاروقؓ کے سفرِ فلسطین (فتح بیت المقدس) کے موقع پر آپؓ قائم مقام خلیفہ کے فرائض بھی سرانجام دیتے رہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے مطابق حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی شہادت پر سب سے زیادہ جو شخص مغموم تھے وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے اپنی شہادت کے موقع پر خلافت کے انتخاب کے لیے جس کمیٹی کا اعلان کیا اس میں حضرت علیؓ بھی شامل تھے۔ عملی اعتبار سے کوئی بھی ایسا موقع نظر نہیں آتا جہاں تاریخ کے اوراق میں حضرت علیؓ اصحابِ ثلاثہ کی حکومت یا اقتدار کے خلاف آواز بلند کرتے ہوئے نظر آئے ہوں۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت (۲۵ ذوالحجہ ۳۵ھ) کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ چہارم کے مقام پر فائز ہوئے۔ ہر چند کہ آپؓ کی خلافت کے دوران جنگِ جمل اور جنگِ صفین کی صورت میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں اختلافات اُبھرے، مگر اہل سنت کے تمام ذی شعور حلقے اجتماعی طور پر حضرت علیؓ کی فضیلت اور خلافت بطور خلیفہ چہارم کے استحقاق کے قائل ہیں۔ سیاسی مصلحت کے باعث آپؓ نے دارالخلافہ مدینہ منورہ سے کوفہ منتقل کرلیا اور پھر پانچ برس اور تین ماہ کی خلافت کے بعد خارجی عبدالرحمٰن بن ملجم کے ہاتھوں ۴۰ھ میں شہید ہو گئے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں بعض سیاسی امور پر اختلافات ضرور اُبھرتے رہے ہیں، مگر ہم لوگ ''خطائے بزرگاں گرفتن خطاست'' کے مصداق ان سے صرفِ نظر کرتے ہوئے ان تمام اصحابِ رسولؐ کی عظمت کے قائل ہیں جنہیں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار اور آپؐ کا ساتھ نصیب ہوا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عظمت کو سلام کہتے ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے اپنی مختصر مدت کی خلافت کے بعد حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے مصالحت کے بعد خلافت سے دستبرداری کا اعلان کر

دیا۔ پھر جب یزید بن معاویہ کی موروثی حکومت کے قیام کے بعد حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے بیعت سے انکار فرمایا تو اس قضیہ میں حضرت عبدالرحمٰن بن ابوبکر، حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم نے بھی بیعتِ یزید سے پہلو تہی فرمائی۔ گویا پہلے دونوں خلفاء کے صاحبزادوں کا موقف بھی حضرت حسینؓ (فرزندِ خلیفہ چہارم) سے مختلف نہیں تھا۔ تاہم اہل کوفہ کی درخواست پر حضرت حسینؓ نے جب بیعتِ خلافت کے لیے کوفہ کا رُخ کیا تو سانحۂ کربلا پیش آیا، جس میں حضرت حسینؓ اور آپؓ کے تمام مرد ساتھی (ماسوائے حضرت زین العابدینؒ کے) شہادت کے مقام پر سرفراز ہوئے۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں :

اللہ اللہ بائے بسم اللہ پدر
معنیٔ ذبح عظیم آمد پسر

(اللہ کی شان دیکھئے کہ باپ (حضرت علیؓ) بسم اللہ کی "ب" کی طرح عظیم تھے اور حضرت اسماعیلؑ کی طرح بیٹا (حضرت حسینؓ) ذبح عظیم (قرآن پاک کی آیت سے اقتباس ہے) کی صورت میں قربانی کا اعلیٰ نمونہ بن گیا۔"

۱۰ محرم ۶۱ ھ کا سانحہ کربلا دلوں پر گہرے نقوش چھوڑ گیا۔ شہادت کے کچھ ہی عرصہ بعد مختار ثقفی نے کوفہ پہنچ کر قاتلینِ آلِ بیت کو چن چن کر مارا اور مرے ہوئے لوگوں کی ہڈیاں بھی قبروں سے نکال لیں۔ یہ حامیانِ آلِ بیت کا پہلا انتقام تھا۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا نکاح آخری ساسانی فرمانروا یزدگرد سوم کی بیٹی شہزادی شہربانوؒ سے ہوا تھا۔ اس طرح شاہی خاندان سے تعلق کے باعث آپؓ ایرانی شاہ پرستوں کی نظر میں اور بھی گرامی قدر اور عزیز ٹھہرے۔

علویوں کی حکومتیں

ہشام بن عبدالملک اُموی (۱۰۱ تا ۱۰۵ھ) کے زمانہ میں حضرت زین العابدینؒ کو حامیانِ اہلِ بیت نے خلافت کے حصول کے لیے جدوجہد کرنے کو کہا مگر آپؒ نے دلچسپی ظاہر نہیں کی۔ پھر لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بیٹے محمد بن حنفیہ (جو غیر فاطمی تھے) کی جانب

راغب ہوئے اور آپ کی بیعتِ خلافت کر لی۔ آپ کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے ابو ہاشم کی بیعتِ خلافت کی اور عراق و خراسان میں دعوت کو فروغ دیا۔ ابو مسلم خراسانی بھی اس دعوت میں شریک ہو گیا' مگر جناب ابو ہاشم نے خلافت محمد بن علی بن عباس بن عبدالمطلب کو تفویض کر دی اور دعوائے خلافت علویوں سے عباسیوں میں منتقل ہو گیا۔ ابو مسلم خراسانی کی مدد سے اپنی حکومت مستحکم کرنے کے بعد منصور نے اِس کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے پیشِ نظر اِسے قتل کروا دیا۔ اس کی مقبولیت کا یہ عالَم تھا کہ اہلِ خراسان میں سے کچھ عقیدت مند اسے ذاتِ خداوندی کا مظہر قرار دیتے تھے۔

خلیفہ منصور عباسی (۱۳۶ھ تا ۱۵۸ھ) کے زمانہ میں ایک بار پھر اولادِ علیؓ کی مقبولیت میں اضافہ ہوا۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے پڑپوتے محمدؒ نے اپنی خلافت کا اعلان کر کے مدینہ کے عباسی گورنر کو قید کر لیا' اور چند ہی یوم میں تمام حجاز اور یمن میں محمدؒ کو خلیفہ تسلیم کر لیا گیا۔ اس موقع پر امام مالکؒ اور امام ابو حنیفہؒ نے بھی محمدؒ کی خلافت کی حمایت کی۔

زبردست جنگ کے بعد ۱۴۵ھ میں منصور کے لشکر نے علویوں کو شکست سے دوچار کیا اور بیشتر مشاہیر جنہوں نے علویوں کا ساتھ دیا تھا' موت کے گھاٹ اتار دیے گئے' ان کے گھر مسمار کروا دیے گئے اور مدینہ میں بنو حسنؒ اور بنو حسینؒ کی جائیدادیں ضبط کر لی گئیں۔ اہل مدینہ کی خصوصی رعایات ختم کر دی گئیں۔ مصر سے مدینہ آنے والی رسد روک لی گئی۔ حضرت جعفر صادقؒ نے جائیداد واپس مانگی تو انہیں قتل کی دھمکی دی گئی۔ امام ابو حنیفہؒ کو زندان میں ڈال دیا گیا اور امام مالکؒ کو کوڑے لگوائے گئے۔ حضرت امام جعفر صادقؒ ۱۴۸ھ میں مدینہ میں وفات پا گئے۔ آپؒ کے بیٹے حضرت موسیٰ کاظمؒ امام تسلیم کیے گئے۔ امام جعفر صادقؒ کے بڑے بیٹے اسماعیل کی بیعت کرنے والے اسماعیلی کہلوائے اور امام موسیٰؒ کے ماننے والے اثنا عشری کہلوائے' کیونکہ انہوں نے حضرت امام موسیٰ کاظمؒ اور بعد کے ائمہ کو ملا کر بارہ اماموں کی امامت کو تسلیم کیا۔

پھر عباسی خلیفہ موسیٰ الہادی (۱۶۹ھ تا ۱۷۰ھ) کے زمانہ میں مدینہ کے گورنر نے

حضرت حسنؓ کی اولاد پر سختی شروع کر دی۔ حضرت حسنؓ کے پڑپوتے حسینؓ کی سرکردگی میں انہوں نے مقابلہ کیا مگر ناکام رہے۔ اس خاندان کے متعدد افراد موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ حسینؓ کا چچیرا بھائی ادریس ماریطانیہ چلا گیا' جہاں بربروں کی مدد سے ادریسیہ خلافت کی بنیاد رکھی۔

خلیفہ ہارون الرشید عباسی کے دور (۱۷۰ھ۔۱۹۸ھ) میں بحیرۂ خزر (Caspian Sea) کے جنوبی ساحل پر موجود دیلم کے علاقہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خاندان کے فرد یحییٰ بن عبداللہ نے دیلمیوں کی مدد سے خلافت کا دعویٰ کیا۔ ان کی تأدیب کے لیے فضل کی قیادت میں پچاس ہزار کا لشکر بھیجا گیا' مگر جنگ کی بجائے مصالحت سے یحییٰ بن عبداللہ کو بغداد لایا گیا اور وہاں پر پُرتپاک خیر مقدم کیا گیا' مگر یحییٰ نے ایک بار پھر حصولِ خلافت کی کوشش شروع کر دی۔ وہ قید ہوئے اور حالت اسیری میں وفات پا گئے۔

خلیفہ مامون الرشید عباسی (۱۹۸ھ۔۲۱۸ھ) نے پہلی مرتبہ خاندان علیؓ کی نجابت کے احترام میں حضرت امام علی الرضاؒ کو (جو مامون سے بائیس برس بڑے تھے) ۲۰۲ھ میں ولی عہدِ سلطنت نامزد کیا اور آپؒ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے احکامات جاری کیے۔ ساتھ ہی یہ حکم بھی جاری کیا کہ اب عباسی اپنی روایتی سیاہ قبا پہننے کی بجائے اہل تشیع کی سبز رنگ کی پوشاک پہنیں گے۔ اس سے اہل تشیع تو مطمئن ہو گئے مگر عباسیوں میں بددلی پھیل گئی اور حالات خراب سے خراب تر ہوتے چلے گئے اور بالآخر امام علی رضاؒ کی شہادت پر منتج ہوئے۔ روایات کے مطابق آپ کو طوس کے مقام پر زہر دیا گیا تھا۔

بعد میں طبرستان (ایران کا شمالی صوبہ جو اَب مازندران کہلاتا ہے) میں ۲۵۰ھ میں علویوں نے اپنی حکومت قائم کر لی۔ حضرت امام حسنؓ کی اولاد میں سے حسین بن زید نے (جو داعی کبیر کہلواتا تھا) بنی عباسؓ' طاہریوں اور یعقوب لیث کو شکست دے کر طبرستان' دیلم' گرگان اور رے (موجودہ تہران) پر حکومت قائم کر لی۔ پھر اس کے بھائی محمد بن زید داعی نے ۲۷۰ھ سے ۲۷۷ھ تک حکومت کی اور اسماعیل سامانی کے ہاتھوں قتل ہوا۔

قریباً چوبیس برس بعد ۳۰۱ھ میں حضرت امام زین العابدینؒ کی اولاد میں سے ایک شخص حسن بن علی نے طبرستان پر قبضہ کر لیا اور ساداتِ حسنی میں سے حسن بن قاسم کو گیلان کی حکومت سونپ دی۔ پھر ان کی آپس میں چپقلش جاری رہی اور حسن نے ۳۰۴ھ میں وفات پائی۔

ائمہ اثنا عشری اور شیعیت (شیعیت کی رو سے)

اثنا عشری ائمہ میں بارہ کے بارہ اصحاب انتہائی متدیّن، نیک سیرت اور پرہیز گار تھے۔ حضرت علی، حضرت حسن، حضرت حسین رضی اللہ عنہم، حضرت زین العابدین، حضرت باقر، حضرت جعفر صادق، حضرت موسیٰ کاظم، حضرت علی رضا، حضرت علی نقی، حضرت علی تقی، حضرت حسن عسکری اور حضرت محمد بن حسن قاسم عسکری علیہم السلام کے مقام، تبحر علمی، زہد و ریاضت، ذاتی محاسن، پرہیز گاری، عالی نسبی اور فضیلت پر کسی کو کوئی کلام نہیں ہے۔ ہمارے اثناء عشری احباب ان دوازدہ اصحاب کو معصوم، مطہر اور مأمور من اللہ سمجھتے ہیں۔ ان کے عقیدہ کے مطابق نبوت جب اپنی انتہا کو پہنچتی ہے تو اختتام پذیر ہو جاتی ہے اور جب نبوت کا خاتمہ ہوتا ہے تو خدا کے انسان سے تعلق کے تسلسل کے لیے وہاں سے امامت کا آغاز ہوتا ہے۔ شیعہ احباب کی اکثریت نبوت اور رسالت کو اعلیٰ ترین مقام دیتی ہے، مگر ان کے ہاں نبوت کے بعد امامت کا ایک مسلّمہ مقام ہے۔ قریباً سوا دو سو برس تک امامت کا تسلسل جاری رہا اور پھر حضرت محمد بن حسن عسکریؒ غائب ہو گئے۔ مختلف روایات کے مطابق انہیں لوگوں نے بلادِ شام میں سر من رای کی غار میں جاتے ہوئے دیکھا۔ کوئی ڈیڑھ سو برس غیابتِ صغریٰ کا دور ہے جب آپؒ کبھی کبھار وہاں سے باہر آ کر لوگوں میں ظاہر ہوتے رہے اور پھر اس کے بعد امام غائب کبھی کسی کو نظر نہیں آ پائے اور یہ دور غیابتِ کبریٰ کا دور ہے۔ آپؒ قیامت سے قبل امام مہدیٔ موعود کی صورت میں دوبارہ ظاہر ہوں گے اور لوگوں کی قیادت فرمائیں گے۔ یہ تمام ائمہ ان کے ہاں معصوم و مطہر اور مأمور من اللہ ہونے کے باعث اولوالامر ہیں اور ان کی اطاعت و تقلید لازمی ہے۔ جب بھی کبھی مشکل کا دور آیا ہے تو اپنی مدد کے لیے لوگوں نے امامِ

غائب کو پکارا ہے اور امام غائب یا صاحب الزمان کو آواز دی ہے۔ ناچیز نے ۱۹۷۸ء میں شاہ کے آخری ایام میں ایران میں اکثر یہ اشتہار دیکھا ہے:

ای امامِ زمان کجا ہستید، دنیا منتظرِ شماست!

(اے امامِ وقت آپ کہاں ہیں؟ دنیا آپ کے لیے چشم براہ ہے)

اسی طرح عربی زبان میں ہمارے ہاں شیعہ احباب کے گھروں اور دکانوں میں ایسی تحریریں دیکھنے میں آتی ہیں۔

چونکہ اُن کے عقائد کی رو سے یہ اولوالامر ائمہ ہیں اور رسالت کے بعد ان کا تسلسل موجود ہے اس لیے جہاں رسالت کی انتہا اور امامت کی ابتدا (نقطۂ اتصال) ہے وہ مقام سب سے اہم ہے۔ اس لیے آنحضور ﷺ تمام انبیاء میں افضل ہیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ تمام ائمہ میں افضل۔ چونکہ امام کی موجودگی میں کسی شخص کو اپنی حکومت کرنے کا حق حاصل نہیں ہے، خواہ وہ خلافت ہو، ملوکیت ہو یا جمہوری حکومت، اس لیے جو شخص بھی ان کے ہوتے ہوئے حکومت خلافت کے مقام پر فائز ہوتا ہے وہ امامِ وقت کے خدا کی طرف سے عطا کردہ استحقاق کو مجروح کرتا ہے۔ زیدیوں کے ہاں (جو حضرت زید بن زین العابدین کے پیروکار ہیں) ہر چند کہ خلافت درحقیقت تو امام وقت (یعنی حضرت علیؓ) کا ہی حق تھا، مگر چونکہ حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کو خلافت مل گئی اور شیخین نے تمام فیصلے دینِ برحق کی رو سے کیے اس لیے وہ بھی قابلِ عزت و احترام ہیں اور ان کی حکومت عملاً اور اخلاقاً تسلیم شدہ ہے۔

اس کا حل یوں نکالا گیا کہ ایران میں صفوی اور قاچاری اَدوار (۹۰۶ھ۔۱۳۴۳ھ) میں بھی بادشاہانِ صفویہ اور قاچار یہ تسلیم کرتے تھے کہ حکومت صرف اور صرف امام غائب کا حق ہے، مگر صاحب الزمان کی عدم موجودگی میں وہ امانتاً حکومت سنبھال رہے ہیں، اور جب کبھی بھی امام غائب ظاہر ہو جائیں گے وہ اسی وقت تاج و تخت ان کو سونپ کر حکومت سے دستبردار ہو جائیں گے۔ اور ہر بادشاہ اپنی تاج پوشی کے موقع پر اس امر کا حلف اٹھانے کا پابند تھا۔

صرف اور صرف امامِ وقت ہی قرآن کی تأویل کر سکتے ہیں اور ان کو ہی فقہ کے امور پر رائے دینے کا حق ہے۔ ان کی عدم موجودگی میں شیعیت کے ہاں متداول مذہبی نظام کے اعلیٰ ترین منصب پر فائز حضرات یعنی آیت اللہ العظمیٰ کو نائب امام کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے، جو اپنے اجتہاد کی رو سے احکاماتِ شریعت کی تأویل کر سکتے ہیں۔ ایران میں فی الوقت سب سے اہم مذہبی رہنما کو ولایتِ فقیہہ کی مسند پر متمکن کیا جاتا ہے اور انہیں نائبِ امام کا درجہ دیا جاتا ہے اور امام کے نام پر وہ حکومتِ وقت کو ہدایات جاری کر سکتے ہیں اور رہنمائی فرماتے ہیں۔

ائمہ اثنا عشری اور اہل سنت عمائدین کا رویہ

اہل سنت وہ مسلمان ہیں جو سُنی کہلواتے ہیں اور وہ یا تو ائمہ اربعہ (امام مالک، امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہم) میں سے کسی کے مقلد ہیں یا غیر مقلد۔ یہ لوگ صحاحِ ستہ کی احادیث اور سنت کی روایات سے استناد حاصل کرتے ہیں۔ ان کے ہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی ذات معصوم نہیں ہے۔ اپنے اپنے فقہی مسائل میں تقلید کرتے وقت وہ روزمرہ اُمور اور دینی احکامات کی بابت اپنے اپنے امام کے اقوال کو ترجیح دیتے ہیں یا اپنی فقہ کے متأخر علماء سے استناد کرتے ہیں۔

اب مسئلہ یہ رہا کہ ابتدائی دَور میں ان کے ائمہ اہلِ بیت سے تعلقات کیسے رہے ہیں، تو جیسا کہ عرض کیا گیا ہے، غالی سنیوں (جو بہت قلیل تعداد میں ہیں) کو چھوڑ کر تمام سنی حضرات حضرت علی رضی اللہ عنہ اور آپؓ کے خاندان کی تہہ دل سے عزت کرتے ہیں۔ خود حضرت علیؓ نے اپنے زمانے میں اصحابِ ثلاثہ رضی اللہ عنہم کی خلافت میں ہر طرح سے تعاون فرمایا ہے۔ اسی طرح واقعہ کربلا کی بابت بھی سُنی حضرات کو حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے عقیدت، ہمدردی اور محبت نظر آتی ہے۔ وہ کبھی بھی آپؓ پر تنقید کرنا روا نہیں سمجھتے۔

حضرت امام محمد باقرؒ اور امام جعفر صادقؒ سے حضرت امام ابوحنیفہؒ کے خصوصی تعلقات کا پتا چلتا ہے اور روایات کے مطابق حضرت امام ابوحنیفہؒ نے حضرت جعفر صادقؒ سے کسبِ فیض بھی کیا ہے۔ پھر حضرت زید بن زین العابدینؒ سے آپ کے گہرے

مراسم رہے ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ نے حضرت زید کو خلافتِ علوی کی بحالی اور خلافتِ عباسی کے خاتمہ کے لیے کچھ رقم بھی عطا کی تھی، مگر جب عملاً مدد کے لیے کہا گیا تو آپ نے فرمایا کہ مجھے ڈر ہے کہ لوگ آپؒ کا ساتھ چھوڑ جائیں گے، اور ایسے ہی ہوا۔ امام زید بن زین العابدینؒ نے فقہ پر کتاب بھی لکھی ہے جس کا نام ''المجموع فی الفقه'' ہے۔ اس کتاب کے مندرجات پڑھ کر قاری کو معلوم ہوتا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے اپنی کتب کی تدوین میں اس کے مندرجات سے استفادہ بھی کیا ہے۔

اسی طرح حضرت امام حسنؓ کے پوتے محمد کی مدد کے لیے امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کی مساعی کا ذکر بھی ہو چکا ہے۔ جس عباسی خلیفہ مامون الرشید نے پہلے امام علی رضاؒ کو ولی عہد نامزد کیا، بعد میں (بنا بہ روایات) زہر دلوا کر شہید کر دیا، اسی مامون الرشید سے حضرت امام احمد بن حنبلؒ بھی نبرد آزما نظر آتے ہیں۔ عصر حاضر کے مشہور ایرانی مفکر ڈاکٹر علی شریعتی کی کتاب ''خطاب بہ دوستانِ آشنا'' کی رو سے شیعہ مذہب میں امامت کے جو اعلیٰ ترین خصائل پیش کیے جاتے ہیں ان پر امام احمد بن حنبلؒ کی ذاتِ گرامی پوری طرح پوری اترتی ہے۔

استحقاقِ خلافت کے دعویٰ میں حضرت علی اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کے علاوہ ائمہ دوازدہ میں سے کوئی شخصیت دلچسپی لیتی ہوئی نظر نہیں آتی ماسوائے حضرت امام علی رضاؒ کے، جنہیں بطور خود مامون الرشید نے ولی عہد نامزد کیا تھا۔ علاوہ بریں خاندانِ علیؓ سے دیگر اصحاب خلافت کے لیے کوشش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔

مزید برآں یہ بھی نظر نہیں آتا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ائمہ اثنا عشریہ کے عقائد و اعمال میں دیگر مسلمانوں کی نسبت کوئی زیادہ فرق ہو۔ حضرت علیؓ بھی ہمیں تاریخ کے جھروکوں میں سے مسجد نبویؐ میں اسی طرح سب سے مل کر نمازیں پڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں جیسے باقی اصحاب ثلاثہ رضی اللہ عنہم۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ عقائد و اعمال میں اُس وقت کے اہل سنت اور ائمہ اثنا عشریہ میں بہت حد تک ہم آہنگی تھی۔ ہمیں کوئی ایسا واقعہ نظر نہیں

آتا جہاں فریقین نے ابتدائی سوا دو سو برسوں میں (امام دوازدھم کے غائب ہونے سے قبل) کبھی بھی ایک دوسرے کی تکفیر کی ہو یا طعن و تشنیع کی ہو۔ ائمہ اثنا عشریہ کی راست بازی اور دیانت داری سُنیوں کے ہاں بھی ایک مسلمہ امر رہا ہے۔ ایران کے صفوی دَور کے آغاز تک پہلے آٹھ نو سو برس تک سنی اور شیعہ گروہوں میں کوئی واضح اختلاف نظر نہیں آتا۔

شیعہ اور سُنّی عقائد کی ہم آہنگی

دنیائے اسلام کے دونوں فرقے توحید پر یکساں ایمان رکھتے ہیں۔ غالی شیعہ حضرات کے ایک فرقہ علی اللّٰہی کا ذکر ملتا ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خدا کا بہروز سمجھتے ہیں، مگر یہ فرقہ انتہائی قلیل تعداد میں ہے اور جمہور شیعہ احباب کی نمائندگی نہیں کرتا۔ اسی طرح کے گروہ ترکی کے دور افتادہ علاقوں میں علویوں کی صورت میں لبنان اور شام میں دروزیوں اور کچھ دیگر شامی علاقوں میں پائے جاتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت اور رسالت پر مکمل ہم آہنگی موجود ہے، بلکہ شیعہ حضرات آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع اور سنت میں بعض امور میں زیادہ احتیاط برتتے نظر آتے ہیں۔ مثلاً ان کا خیال ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبویؐ میں نماز پڑھتے وقت مٹی پر سجدہ ریز ہوتے تھے، اب مسجدوں میں قالین اور مصلّے بچھ گئے ہیں، مگر جی یہی چاہتا ہے کہ پیشانی مٹی پر آئے۔ اس لیے دو ہی صورتیں رہ جاتی ہیں، یا تو وہ باہر سے مٹی لا کر سجدہ کی جگہ پر بکھیر دیں جس سے مسجد میں گندگی پھیلنے کا احتمال ہے۔ اس لیے وہ پاک مٹی کی ٹکیہ بنا کر پیشانی کے نیچے رکھ لیتے ہیں۔

حج یا عمرہ کے موقع پر وہ عام لباس میں ہوائی سفر کرتے ہیں اور پھر بس پر بیٹھ کر میقات پر روانہ ہو جاتے ہیں جہاں سے وہ احرام باندھ کر آتے ہیں۔ چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احرام باندھ کر اونٹنی پر سفر کیا تھا اس لیے آپؐ کے سر پر کسی چیز کا سایہ نہیں تھا۔ وہ بھی حالتِ احرام میں ایسی بسوں میں سوار ہوتے ہیں جن پر چھت نہیں ہوتی۔ یہ اس کے باوجود ہے کہ بعض اوقات سخت گرمی کے باعث یہ عمل بہت مشکل ہو جاتا ہے۔

قرآن پاک پر انہیں غیر متزلزل ایمان ہے اور قرآن پاک کی ان کے ہاں وہی ترتیب ہے جو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے فرمائی تھی۔ قرآن پاک میں تحریف کے بارے میں کوئی بھی ثبوت مُدّعین پیش نہیں کر پائے۔ شاہ کے زمانے میں عقوبت خانوں میں ایران کے نوجوان راتوں کو قرآن پاک کی انہی آیات کی تلاوت فرماتے تھے جو ہمارے ہاں مشکل کے مواقع پر متداول ہیں۔

نماز اور روزہ کی ظاہری صورت اور اوقات میں بھی دونوں فرقوں کی ادائیگی میں معمولی فرق ہے، مگر وہ بھی ایسے نہیں کہ ان ہر دو فرائض کی بابت ہمیں مشکوک کر سکیں۔ زکوٰۃ کا جہاں تک تعلق ہے وہ اس سے انکار نہیں کرتے اور نہ ہی سونے یا جائیدادِ غیر منقولہ پر زکوٰۃ کے منکر ہیں۔ رقوم اور بنک ڈیپازٹ کے بارے میں ان کے سنیوں سے فقہی اختلافات ضرور ہیں۔

حج کے مراسم میں شیعہ اور سنی حضرات میں کوئی بھی فرق نہیں ہے۔ ممکن ہے یہ اس لیے نہ ہو کہ آپؐ نے صرف ایک ہی حج کیا تھا اور آپؐ کو ایک لاکھ سے زائد حضرات نے دیکھا تھا اور مختلف لوگوں نے ایک جیسی روایات بیان کی ہوں گی۔ راقم الحروف کو ۱۹۹۲ء میں اپنے حج کے فریضہ کی ادائیگی کے موقع پر فارسی زبان میں ایک کتاب ملی، جو حکومتِ ایران نے حجاج کی رہنمائی کے لیے چھاپی تھی۔ اس میں کہا گیا ہے کہ آپ لوگوں پر لازم ہے کہ مقامی امام کی اقتداء میں نماز ادا کریں اور جمیع مسلمانوں سے کسی موقع پر جدا نہ ہوں۔ پھر یہ بھی منقول ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ مبارک کی جالیوں سے مت چمٹیں اور وہاں پر دھاگے وغیرہ نہ باندھیں اور نہ ہی کوئی اور ناپسندیدہ حرکت کریں۔ ایسی حرکات کا نہ تو شریعت میں جواز ہے اور نہ کوئی فائدہ، بلکہ مقامی لوگوں کی دل آزاری ہوتی ہے جو حج میں ممنوع ہے۔

علاوہ بریں نکاح کے احکام، دیوانی معاملات اور دیگر روزمرہ امور مثلاً حجابِ شرعی وغیرہ میں بھی کہیں پر اصولی اختلاف نہیں ہے۔

سنت کے علاوہ احادیث میں بھی ہم آہنگی ہے۔ کتاب ''خطباتِ بہاولپور'' میں

ڈاکٹر حمیداللہ کا خیال ہے کہ راویوں کا بے شک فرق ہے' مثلاً میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی روایت پر ایک چیز بیان کرتا ہوں وہی بات میرا شیعہ بھائی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت پر بیان کرتا ہے' تو یہ مفروضہ کہ شیعہ سنی کی حدیثوں کی کتب میں فرق ہے' غلط ہے۔ فرق صرف روایت میں ہے' حدیث کے مندرجات میں فرق نہیں۔ اب تک ایسی کوئی خاص چیز ملی بھی نہیں جس میں یہ کہا جائے کہ شیعہ کتابوں میں ''الف'' چیز کا حکم ہے اور سنی کتابوں میں اس کے بالکل برعکس ''الف'' کی ممانعت کا حکم دیا گیا ہے۔

افکار اور تصوف میں ہم آہنگی کا یہ عالم ہے کہ ہر دو کے ہاں غزالی' رومی' حافظ اور جامی رحمۃ اللہ علیہ قابل احترام ہیں اور مشہور شیعہ فلسفی نصیر الدین طوسی سے سنی حضرات نے بھی استناد کیا ہے۔ اسی طرح امام خمینی نے گورباچوف کو اپنے مشہور خط میں اسلام کی دعوت دیتے ہوئے مشہور سنی صوفی محی الدین ابن عربیؒ کی تحریروں کا حوالہ دیا ہے۔ متأخرین میں سے جمال الدین افغانیؒ اور علامہ اقبال کو جو شہرت و مرتبہ ایران میں حاصل ہے وہ بھی اس کا ثبوت ہے۔

یہ سب کچھ مشترک ہوتے ہوئے ہر دو فرقوں کے درمیان ذہنی ہم آہنگی کا امکان اتنا مشکل نظر نہیں آتا جتنا کہ لوگ سمجھ لیتے ہیں اور اپنے مفادات کے مدّنظر اختلافات کو ہوا دیتے ہوئے آپس میں لڑانے کی کوشش کرتے ہیں۔

شیعہ اور سُنّی اختلافات

ہر چند کہ یہ اختلافات فروعی اور معمولی قسم کے ہیں مگر بسا اوقات دونوں جانب سے غلو اور تنگ نظری کے باعث ایک دوسرے کے موقف کو سمجھنے میں بے خبری کے نتیجہ میں یہ سنگین صورت اختیار کر سکتے ہیں۔ اس لیے شیعہ عقائد و اعمال کا مختصر تعارف کروانا بھی ضروری ہے:

☆ توحید اور رسالت میں چنداں اختلاف نہیں ہے۔ تاہم خاندانِ نبوت کے افراد (ازواجِ مطہرات اور بیٹیوں رضی اللہ عنہن) کے بارے میں عموماً ترجیحی سلوک روا رکھا جاتا

ہے۔ اسی طرح تسلسلِ امامت کا تصور شیعہ عقائد میں اہم سمجھا جاتا ہے۔ اہل علم شیعہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ذکر اپنی تحریروں میں پورے احترام کے ساتھ کرتے ہیں۔ کم علم لوگ کبھی احتیاط کا دامن چھوڑ دیتے ہیں۔

☆ نماز میں قیام کے دوران ہاتھ کھول کر رکھے جاتے ہیں۔ فقہ مالکی میں بھی یہی طریقہ کار اپنایا جاتا ہے۔ تاہم رفع الیدین نماز میں ہر حرکت کے ساتھ کی جاتی ہے۔ ''التحیاتُ'' ان کے ہاں نماز میں شامل نہیں ہے۔ سلام کے لیے دائیں اور بائیں چہرے موڑنے کی بجائے تین بار رفع الیدین کیا جاتا ہے اور پھر داہنے ہاتھ کو دائیں اور بائیں حرکت دی جاتی ہے۔ جماعت میں ساتھ والے نمازیوں سے مصافحہ بھی کیا جاتا ہے۔ جمعہ کی نماز شہر میں ایک ہی جگہ ادا ہوتی ہے۔ عموماً وضو میں پاؤں نہیں دھوئے جاتے' بلکہ مسح کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے' کیونکہ ایران کی عمومی مساجد میں وضو کی جگہ اتنی بلند ہوتی ہے کہ پاؤں وہاں تک پہنچ نہیں پاتے۔ اذان میں کچھ جملوں کا اضافہ کیا گیا ہے۔ مثلاً ''اَشْهَدُ اَنَّ عَلِيًّا وَلِيُّ اللّٰهِ'' ''اَشْهَدُ اَنَّ عَلِيًّا حُجَّةُ اللّٰهِ'' اور ''حَيَّ عَلٰى خَيْرِ الْعَمَلِ''۔ ایران کے شیعہ حضرات کے برعکس برصغیر کے شیعہ احباب ''اَشْهَدُ اَنَّ عَلِيًّا وَصِيُّ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَخَلِيْفَتُهٗ بِلَا فَصْلٍ'' کا جملہ بھی شامل کرتے ہیں۔

☆ روزہ میں انتہائے سحر اور آغازِ افطار کا وقت بالترتیب قدرے جلدی اور دیر سے ہوتا ہے۔

☆ کرنسی نوٹ اور بینک ڈیپازٹ پر زکوٰۃ نہیں دی جاتی۔

☆ بیک وقت دی گئی تین طلاقوں کو ایک ہی تصور کیا جاتا ہے۔ طلاق بھی دو گواہوں کے سامنے پوری مجلس میں دینا ہوتی ہے۔

☆ مُتعہ (عارضی شادی) کو جائز سمجھا جاتا ہے اور اس میں کسی معذرت سے کام نہیں لیا جاتا۔ نائلہ حائری نے اس ضمن میں لکھی گئی اپنی کتاب میں چونکا دینے والے انکشافات کیے ہیں۔ انقلاب کے بعد جب وسیع پیمانے پر سزائے موت دی گئی تو

نوجوان باکرہ لڑکیوں کو سزائے موت دینے کے سلسلے میں ہچکچاہٹ کا اظہار ہوا۔ چنانچہ یہ پالیسی اپنائی گئی کہ پہلے مُتعہ کے ذریعہ انہیں چند گھنٹے کے لیے شادی شدہ قرار دے دیا جائے اور اس کے بعد انہیں سزائے موت دی جائے۔ اس موضوع پر اس موقع پر مزید روشنی ڈالنا قرین مصلحت نہیں ہے۔ آیت اللہ حاجی کاظم شریعت مداری کے بقول مُتعہ کے حکم کو خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے منسوخ کیا تھا جس کا انہیں اختیار نہیں تھا۔

☆ چونکہ شیعہ احباب کی اکثریت اصحابِ ثلاثہ (حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہم) کو امامِ وقت (حضرت علی رضی اللہ عنہ) کی موجودگی میں قیادت کا حق دار نہیں سمجھتی، اس لیے ان کی حکومت کی بابت کبھی کبھار ناگواری کا تأثر اُبھرتا ہے جو مختلف صورتیں اختیار کر لیتا ہے۔ بعینہٖ ازواجِ مطہرات میں سے حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما کی بابت بھی ایسا ہی خیال ظاہر کیا جاتا ہے۔ یہ تصوّرات زیادہ تر صفوی دَور کے بعد شیعہ عقائد میں شامل ہوئے ہیں۔ اس بارے میں کبھی کبھی غلو سے بھی کام لیا جاتا ہے جس سے صورت حال مکدّر ہو جاتی ہے۔ باغِ فدک کے مسئلہ کو بھی اچھال کر اصحابِ ثلاثہ پر اہلِ بیت کی حق تلفی کا الزام لگایا جاتا ہے۔ روشن فکر شیعہ حضرات بتدریج ایسے معاملات میں احتیاط سے کام لے رہے ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ آہستہ آہستہ بہتری کی صورت پیدا ہوتی چلی جائے گی۔

یہاں یہ یاد رہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں بھی مختلف معاملات کے بارے میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد کبھی کبھار زبردست اختلافات پیدا ہو جاتے تھے اور نوبت جنگِ جمل، جنگِ صفین، مسلح تصادم اور کشت وخون تک جا پہنچی تھی، مگر یہ مثال کہیں نہیں ملتی کہ ایک فریق دوسرے کی اعلانیہ تکفیر کرتا ہو۔ نہج البلاغۃ میں موجود ایک خطبہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ شامیوں کے ایمان میں کوئی شک نہیں ہے، فرق صرف یہ ہے کہ ان لوگوں نے میرے خلاف بغاوت کر دی ہے۔ اس

موضوع کوصرف اورصرف سیاسی اہمیت ہی حاصل رہی ہے۔

☆ ائمہ کرامؒ اور دیگر بزرگ ہستیوں کی قبور کو زیارت گاہ بنا دیا گیا' مگر بدعات اور خرافات اس قدر نظر نہیں آئیں جس قدر برصغیر میں قبورِ اولیاء پر معمول ہیں۔ سعودی عرب میں انہدامِ قبور پر بھی ناگواری کا اظہار کیا جاتا ہے اور جنّت البقیع کے ایسے نقشے اِن اصحاب کے پاس ہوتے ہیں جن سے اہل بیت کی بزرگ ہستیوں کی قبور کی نشاندہی ہوتی ہے۔ شاہ عباس صفوی کے عہدِ حکومت میں ایران میں آٹھویں امام حضرت علی رضاؒ کے مزار کو پوری تزئین و آرائش کے بعد مشہد کے مقام پر ایک اہم مذہبی مرکز کا درجہ دیا گیا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ صفوی عہد میں بادشاہوں کو ایک مرکزی مقدس مقام کی ضرورت تھی جس کے متولی بن کر وہ عوام کی نظروں میں روحانی درجہ حاصل کر سکیں۔ یہ بادشاہ دراصل سجادہ نشین حکمرانوں کا درجہ حاصل کر کے مطمئن تھے۔ اس کی چھوٹے پیمانے پر مثال ہمیں جنوبی پنجاب اور سندھ کے سجادہ نشین جاگیردار خاندانوں کی صورت میں ملتی ہے۔

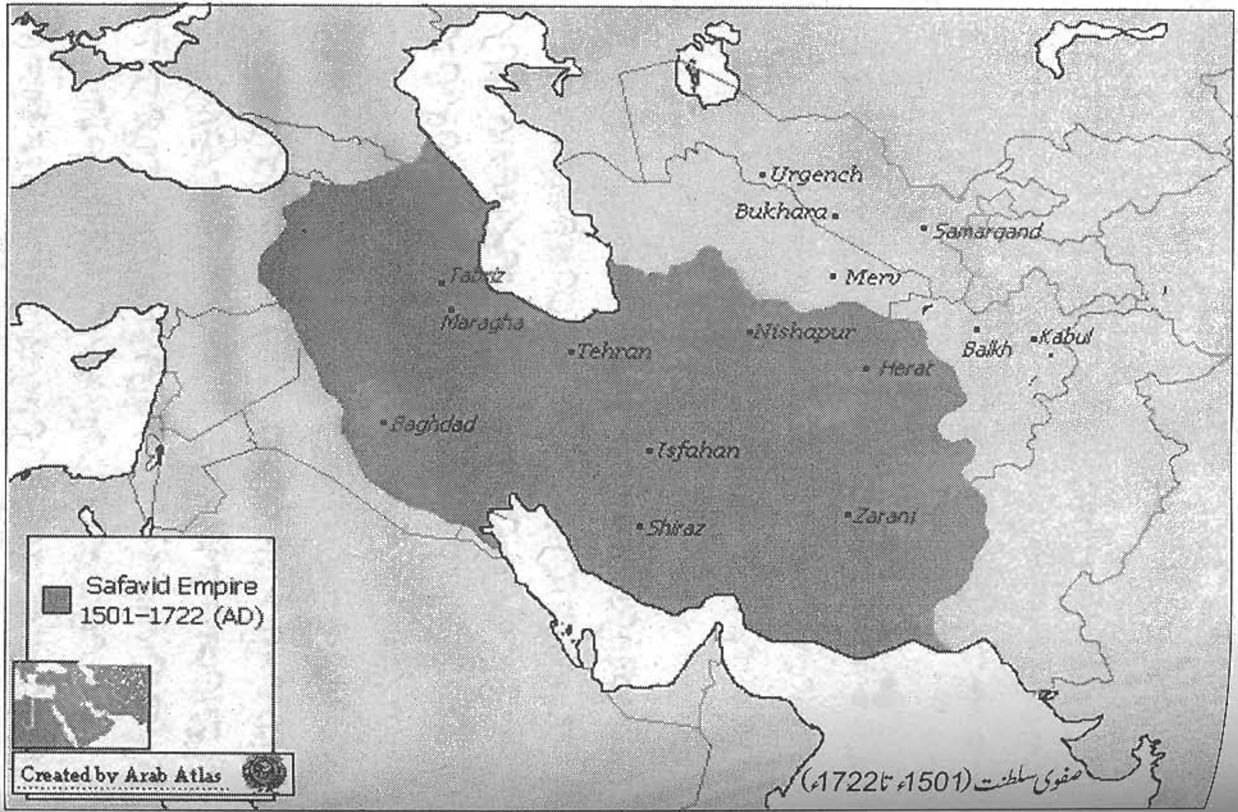

صفوی سلطنت (1501ء تا 1722ء)

صفوی دَور
اور ایران میں شیعیت کا فروغ

عصر حاضر کے معروف ایرانی مفکر ڈاکٹر علی شریعتی مرحوم نے اپنی تحریروں میں شیعیت کو دو اقسام میں بیان کیا ہے:

(۱) شیعیت علوی: یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی پیروی میں ہے۔ اس میں حق گوئی و بے باکی ' ملت و سلطنت اور ظلم کا مقابلہ مردانہ وار کرنا ہے۔ اس کا بنیادی عنصر اعلائے کلمۃ الحق ہے۔

(۲) شیعیت صفوی: یہ صفوی دَور کی ظالمانہ طور پر رائج کی گئی شیعیت ہے۔ اس کا مقصد آمرانہ شاہی نظام کو تحفظ عطا کرنے کے لیے دربار اور شاہ کی ذات کو مذہبی تقدس کا لبادہ اوڑھانا ہے۔

صفوی دور تک ایران اور فارسی گو علاقوں میں عموماً حنفی ' سُنّی عقائد کا غلبہ رہا ہے۔ حکومت وقت اور عوام کی واضح اکثریت بھی اسی مذہب پر کاربند رہی ہے۔ تاہم ایک بڑی تعداد میں مختلف آبادیوں میں شیعہ حضرات ہر دور میں وہاں پر موجود رہے ہیں۔ لیکن ان دونوں گروہوں میں کوئی بڑا اختلاف سامنے نہیں آیا اور وہ باہم شیر وشکر ہی رہے ہیں۔ اس سے پہلے آل بویہ نے ۳۲۰ھ میں شمالی ایران (مازندران) سے شروع کر کے ایک اہم حکومت قائم کر لی تھی اور بائیسویں عباسی حکمران المستکفی کو قتل کر کے عباسی حکمرانوں پر کنٹرول حاصل کر لیا تھا۔ انہوں نے بھی تشیع کے فروغ کی کوشش کی تھی ' مگر جلد ہی آلِ سامان کے ہاتھوں ان کی حکومت ختم ہوگئی تھی۔

محمود غزنوی کے دربار سے وابستہ اور شاہنامہ کے مصنف ابوالقاسم فردوسی جیسے عظیم قومی شاعر کی بابت کہا جاتا ہے کہ وہ شیعہ تھا۔ علاوہ بریں عظیم فارسی شعراء اور فضلاء

مثلاً مولانا روم' امام غزالی' امام رازی' عمر خیام' حضرت سید عبدالقادر گیلانی' صحاح ستہ کے جملہ ائمہ' ابو علی ابن سینا' حکیم ابو سعید ابوالخیر' شیخ سعدی شیرازی' شیخ فریدالدین عطار' حافظ شیرازی اور مولانا نورالدین عبدالرحمٰن جامی رحمۃ اللہ علیہ چند ایسے نام ہیں جو علم و عرفان اور شعر و ادب کے میدان میں بے مثال لوگ گزرے ہیں۔ یہ تمام لوگ حنفی العقیدہ سنی عقائد کے حامل تھے (ماسوائے صحاح ستہ کے چند ائمہ اور امام غزالیؒ کے' جو سنی تو ضرور تھے مگر حنفی مسلک کے مقلد نہیں تھے)۔ اسی طرح برصغیر میں اسلام کی تبلیغ اور اشاعت کے لیے جو بزرگ ایران و خراسان سے تشریف لے آئے وہ بھی حنفی سنی تھے۔ ان میں سے حضرت سید علی ہمدانیؒ (مبلغ کشمیر)' حضرت علی ہجویریؒ (مبلغ پنجاب)' حضرت جلال الدین تبریزیؒ (مبلغ بنگال) اور حضرت معین الدین چشتی اجمیریؒ جن کی پیدائش ایرانی علاقہ سیستان کے شہر منجر میں ہوئی تھی' سبھی لوگ سنی العقیدہ حنفی تھے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر اچانک یہ کیسے ہوا کہ کچھ ہی عرصہ میں ایران کے مرکز میں سنی حنفی عقائد کا خاتمہ ہو گیا اور ملک کے طول و عرض میں شیعیت فروغ پا گئی؟ اس کے لیے صفوی خاندان کی سیاسی' سماجی اور فکری تاریخ اور حالات و واقعات کی بابت ایک اجمالی خاکہ پیش کیا جاتا ہے۔

ہر چند کہ صفویوں کا اپنا یہی دعویٰ تھا کہ وہ لوگ حضرت امام موسیٰ کاظمؒ کی اولاد سے ہیں' لیکن علمِ تاریخ کے محققین نے ان کے اِس دعویٰ کی صحت سے واضح طور پر انکار کیا ہے۔ اس خاندان کے جدامجد صفی الدین اردبیلی تھے' جو ایران کے صوبہ گیلان کے شہر اردبیل میں ۶۵۰ھ (بمطابق ۱۲۵۲ء) میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے مشہور صوفی بزرگ شیخ زاہد گیلانی کے ہاتھ پر بیعت کی اور اپنی ذاتی خوبیوں کے باعث بالآخر اپنے مرشد کے داماد بنے۔ اپنے مرشد کی وفات پر مسند ارشاد پر فائز ہوئے۔ آپ کی طلسماتی شخصیت کے زیر اثر آپ کے مریدوں کا حلقہ آہستہ آہستہ ایشیائے کوچک تک وسیع ہو گیا۔ آپ ۷۳۵ھ (بمطابق ۱۳۳۵ء) میں فوت ہوئے۔ آپ کے مریدوں میں سے عظیم فلسفی مصنف رشیدالدین فضل اللہ جیسے دانشور اور ان کا بیٹا خواجہ غیاث الدین محمد

شامل تھے۔ رشید الدین فضل اللہ کو منگولوں کے دربار میں وزارت عظمیٰ کا منصب حاصل رہا ہے۔ جناب صفی الدین اردبیلی کی وفات کے بعد ان کا بیٹا صدر الدین اپنے باپ کی گدی پر بیٹھا اور ۷۹۴ھ (بمطابق ۱۳۹۱ء) تک بڑے زہد و تقویٰ سے زندگی گزاری۔ مشہور شاعر قاسم الانوار آپ کا مرید تھا۔ آپ کی ہر دلعزیز شخصیت کا شہرہ سن کر امیر تیمور بھی آپ کی خدمت میں پوری نیاز مندی کے ساتھ پہنچا' اور آپ ہی کی درخواست پر اس نے دیار بکر کے ترک قیدیوں کو رہا کر دیا جو زندگی کی اُمید سے محروم ہو چکے تھے۔ ان لوگوں نے تیمور کی قید سے رہائی پا کر آپ کے احسانات کے باعث آپ کی بیعت کر لی اور گیلان میں آباد ہو گئے۔ چند ہی نسلوں میں وہاں کے موافق حالات اور وسائل کے باعث ان کی آبادی میں خاطر خواہ اضافہ ہو گیا۔ ان لوگوں کی اولاد نے صفوی سلطنت کے قیام میں بے حد تعاون کیا۔ یہ ترک آبادی صفوی خاندان کی عقیدت میں ہر طرح کی جان نثاری کے لیے ہمیشہ مصروفِ عمل رہی۔ ان کے برعکس مقامی ایرانی آبادی نے صفوی اثرات کو شروع شروع میں قبول کرنے میں تأمل سے کام لیا اور تشیع کے فروغ میں وہ جوش نہیں دکھایا جس کا اظہار اس ترک آبادی نے کیا تھا۔

صدر الدین کی وفات کے بعد خواجہ علی نے مسند ارشاد سنبھالی۔ پھر ۸۳۰ھ (بمطابق ۱۴۲۶ء) میں آپ کے بیٹے شیخ ابراہیم اس مرتبہ تک پہنچے اور ان کی وفات پر سلطان جنید گدی نشین ہوئے۔ سلطان جنید کا حلقۂ اثر جب بہت وسیع ہوا تو آذربائیجان کے حاکم جہاں شاہ قراقویونلو نے اپنے اقتدار کے لیے خطرہ محسوس کرتے ہوئے انہیں اردبیل سے جلاوطن کر دیا۔ آپ وہاں سے ترکی کے علاقہ دیار بکر چلے گئے' جہاں کے حاکم اوزون حسن آق قویونلو نے آپ کا پُر جوش خیر مقدم کیا اور عقیدتاً آپ سے ارادت کے اظہار کے طور پر اپنی بہن خدیجہ آپ کے عقد میں دے دی۔ آپ شروانشاہ کے خلاف جنگ لڑتے ہوئے مارے گئے۔ آپ کے بعد آپ کا بیٹا اوزون حسن کا مقرب بن گیا اور سلطان پر آہستہ آہستہ اتنا اثر و رسوخ قائم کر لیا کہ سلطان نے اپنی بیٹی عالم شاہ بیگم (جو یونانی عورت مارتھا کے بطن سے تھی) ان کے عقد میں دے دی۔ اس طرح صفوی

خاندان کی رگوں میں شاہی خون شامل ہوتا گیا۔ شاہی خاندانوں سے اپنے تعلقات کے باعث ان صوفی بزرگوں نے روحانیت کے ساتھ ساتھ سیاست کے انداز بھی اختیار کر لیے اور سلطنت کے حصول کی تمنا آہستہ آہستہ ان کے دلوں میں جاگزیں ہوگئی۔

شیخ حیدر کے دو بیٹے ابراہیم مرزا اور شاہ اسماعیل تھے۔ شیخ حیدر نے حکم دیا کہ ان کے مرید ایرانی اور ترکی کلاہ کی بجائے سر پر بارہ کونوں والی سرخ ٹوپی دوازدہ ائمہ کی عقیدت کی نشانی کے طور پر اوڑھیں گے۔ اس وجہ سے یہ لوگ قزلباش (سرخ ٹوپی والے) مشہور ہوئے۔ شیخ حیدر بھی اپنے باپ کی طرح شروانشاہ کے خلاف جنگ کرتے ہوئے ۸۹۳ھ (۱۴۸۷ء) میں مارے گئے۔

شاہ اسماعیل صفوی ۸۹۲ھ (۱۴۸۶ء) میں پیدا ہوا۔ جب وہ جوانی کی عمر کو پہنچا تو سلسلہ صفویہ کے تمام مریدوں نے اجتماعی طور پر اس کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ اس نے اپنے مریدوں کو اپنی مقناطیسی شخصیت کی کشش کے حصار میں قید کر کے اپنی غیر متزلزل اطاعت اور سرفروشی کی تربیت دی اور انہیں کسی بھی مہم کے لیے پوری طرح مسلح کر لیا۔ یہ پُر جوش لوگ ہر وقت اپنے مرشد کے حکم پر جان دینے کو تیار رہتے تھے۔ اس نے سات ترک قبائل استاجلو، شاملو، روملو وارساق، ذوالقدر، قاچار اور افشار کو اپنا مرید بنا لیا۔ پھر صوفیائے قراباغ نے بھی اس کی اطاعت قبول کر لی۔ اس نے شروانشاہ سے اپنے باپ کے قتل کا انتقام لیا اور اسے شکست فاش دینے اور قتل کرنے کے بعد آذربائیجان کا علاقہ الوند بیگ آق قویونلو سے چھین لیا۔ اپنے سیاسی عزائم کی تکمیل کے لیے اس نے تبریز میں ۹۰۷ھ (۱۵۰۱ء) میں اپنی بادشاہت کا اعلان کیا۔

جلد ہی شاہ اسماعیل صفوی نے دیار بکر فتح کر لیا۔ باکو (آذربائیجان کا مرکزی مقام) فتح کرنے کے بعد اس نے شوشتر، فارس، کاشان اور استرآباد پر اپنا تسلط قائم کرنے کے بعد ۹۱۴ھ (۱۵۰۸ء) میں بالآخر بغداد کو اپنی مملکت میں شامل کر لیا۔

شاہ اسماعیل صفوی نے حکومت سنبھالتے ہی اثنا عشری شیعہ مذہب کو ایران اور اپنے دیگر مفتوحہ علاقوں کا سرکاری مذہب قرار دے دیا۔ اہلِ درد علمائے اہل تشیع نے اسے کئی بار

پوری نیک نیتی سے سمجھانے کی کوشش کی کہ ان حالات میں جبکہ بلادِ ایران کے عوام کی اکثریت سنی العقیدہ ہے' یہ اقدام فی الحال خطرناک ثابت ہوسکتا ہے' مگر شاہ اسماعیل نے یہ کہہ کر انہیں خاموش کرا دیا کہ اسے نصرتِ خداوندی اور ائمہ دوازدہ کی ارواح کی تائید حاصل ہے اس لیے ان عوامل سے خوف زدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے' اس نے زور دے کر کہا کہ اگر کوئی شخص میرے خلاف آواز بلند کرے گا تو میں اسے شمشیر بے نیام سے کچل کر رکھ دوں گا اور اسے اور اس کے خاندان کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔

شاہ اسماعیل صفوی کے زمانہ میں عظیم صحابہ خصوصاً حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کے خلاف تبرّیٰ کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ اس سلسلے میں دو قسم کی تاریخی روایات ملتی ہیں' جن کی تصدیق کرنا بہر طور مشکل ہے۔ ممکن ہے ان میں کچھ مبالغہ آرائی کا عنصر شامل ہو۔

- ایران کے عام لوگوں کو قطار کی صورت میں کھڑا کر کے انہیں خنجر تھما دیے جاتے تھے اور انہیں حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما (شیخین) پر آوازِ بلند (نعوذ باللہ) سبّ و شتم کرنے کو کہا جاتا تھا۔ جو انکار کرتا تھا اسے حکم دیا جاتا تھا کہ اپنا ہی خنجر اپنے سینے میں اتار لے۔ ہزاروں لوگوں کی غیرتِ ایمانی یہ گوارا نہ کر سکی کہ وہ نازیبا الفاظ اپنی زبان سے نکال سکیں' نتیجتاً انہوں نے اپنے ہاتھوں مرنے کو ترجیح دی۔
- سرکاری سرپرستی میں گروہ در گروہ لوگ گلیوں اور بازاروں میں نکلتے اور شیخین کے خلاف دریدہ دہنی کرتے اور لوگوں کو اپنے ساتھ شریک ہونے کا حکم دیتے' بصورتِ انکار انہیں قتل کر دیتے۔

آہستہ آہستہ سنی آبادی پر ان جانکاہ مظالم کا یہ نتیجہ نکلا کہ ایران کے مرکزی علاقوں سے اہل سنت والجماعت کے پیروکاروں کا قریباً قریباً صفایا ہوتا چلا گیا۔ سنی لوگ فارسی بولنے والے خطوں کے دور دراز کے علاقوں اور غیر فارسی گو علاقوں (کردستان' خوزستان' بلوچستان' سیستان' ترکمانستان اور سواحل) میں چلے گئے اور بے شمار لوگ

خاموشی سے روپوش ہو گئے' جن کی اولاد اپنے آبائی عقائد سے پہلوتہی کرتے ہوئے شیعہ عقائد کی حامل بن گئی۔

شاہ اسماعیل نے یہ سخت متعصّبانہ رویہ اپنے بعد میں فتح ہونے والے علاقوں کے لوگوں پر بھی قائم رکھا۔ وسطی ایشیا کے فارسی گو اور ازبک علاقوں پر یہ خوف طاری ہو گیا کہ اگر شاہ اسماعیل کا راستہ پوری شدت سے نہ روکا گیا تو وہ بڑھ کر ایک خوفناک طوفان کی صورت اختیار کر لے گا۔ شاہی سرپرستی میں زبردستی سے عوام میں شیعیت کی اشاعت اور فروغ کی جو مساعی کی جا رہی تھیں اس کی خبر بھی ان علاقوں کے لوگوں تک پہنچ چکی تھی اور لوگوں نے متحد ہو کر صفویوں کے خلاف مزاحمت کی ٹھان لی تھی۔ ان ایام میں ماوراء النہر کے علاقوں میں مغل شہزادہ ظہیر الدین بابر اپنی بقا کی جنگ لڑ رہا تھا۔ اپنے خاندان کی ریشہ دوانیوں سے فارغ ہو کر وہ وسط ایشیا تک پہنچ چکا تھا۔ اب بابر اور شیبانی خان ازبک آپس میں برسرِ پیکار تھے۔ شیبانی خان ازبک نے سنیوں کے حساس مذہبی جذبات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے امام العصر کا لقب اختیار کر کے شیعہ سلطنت کی توسیع کے خلاف رزم آرا ہونے کا عہد کیا۔ ان دنوں وہ بابر کو کئی مقامات پر شکستِ فاش دے چکا تھا اور اس کی بہن کو بھی اٹھا کر لے گیا تھا۔ صفویوں کا خوف وسطی ایشیا کے عوام کو شیبانی خان کے جھنڈے تلے لے آیا۔

شیبانی خان دراصل چنگیز خان کی اولاد سے تھا اور لوٹ مار اور قتل عام اس کی سرشت میں تھا۔ اس نے سمرقند' بخارا' تاشقند اور فرغانہ کے علاقوں پر تسلط حاصل کرنے کے بعد ایرانی علاقوں کی جانب رُخ موڑ لیا اور ۹۱۱ھ میں خراسان پر چڑھائی کر دی اور پھر ۹۱۵ھ میں شاہ اسماعیل کی قلمرو میں کرمان کے علاقہ پر یلغار کر دی۔ شاہ اسماعیل نے جب اس کے غاصبانہ قبضہ پر احتجاج کیا تو جواباً اس نے شاہ اسماعیل کی تحقیر کے لیے کشکول اور ڈنڈا بھجوایا تا کہ اس کو فقیری کا طعنہ دے سکے۔ جواباً شاہ اسماعیل نے بھی اسے تکلا اور سوت کی گچھی بھجوائی' جس کا مطلب یہ تھا کہ تم عورتوں کی طرح پیچ حربوں پر اتر آئے ہو۔ بالآخر ۹۱۶ھ (۱۵۱۰ء) میں شاہ اسماعیل نے خراسان پر جوابی حملہ کر دیا۔

مرو کے مقام پر اس کا مقابلہ ازبک لشکر سے ہوا۔ وہاں پر سترہ ہزار ایرانیوں نے اٹھائیس ہزار ازبکوں کو سخت جنگ کے بعد شکست فاش دی۔ بالآخر شیبانی خان گرفتار ہوا اور قتل کروا دیا گیا۔ اس کی کھوپڑی پر سونے کی پتری چڑھا کر شاہ اسماعیل نے اسے پیالے میں تبدیل کر دیا۔ بعد میں بلخ سے ہرات تک کے تمام علاقوں پر شاہ اسماعیل نے تسلط حاصل کیا۔ بابر کی بہن کو عزت و احترام کے ساتھ شاہ اسماعیل نے ظہیر الدین بابر کے پاس بھجوا دیا۔ شیبانی خان کے خاتمے کے بعد بابر کو پاؤں پھیلانے کی فرصت مل گئی اور وہ کھوئی ہوئی تیموری سلطنت کے حصول کے لیے معرکہ آراء ہو گیا۔

اب ایران کے صفویوں اور ظہیر الدین بابر کے درمیان ایک معاہدہ طے پایا جس کی رو سے بابر نے صفویوں کی شاہی بالادستی اور شیعہ مذہب کا اقتدار مجبوراً اور مصلحتاً وقتی طور پر تسلیم کر لیا۔ اس معاہدہ کی رو سے یہ طے پایا کہ وہ علاقے جن پر کبھی بابر کے والد عمر شیخ مرزا کی حکومت قائم تھی وہاں پر تو بابر کے اپنے نام کا سکّہ ہی چلے گا، مگر ایرانیوں کی مدد سے فتح ہونے والے دیگر علاقوں پر شیعوں کے ائمہ دوازدہ کے ناموں سے سکے ڈھلنا قرار پائیں گے۔ بابر نے اس معاہدہ کی رو سے ماوراء النہر پر حملہ کر کے ازبکوں سے بیشتر علاقے چھین لیے اور وہ اپنے آباء و اجداد کے دار الحکومت سمرقند میں فاتحانہ طور پر داخل ہو گیا جہاں سے اسے شیبانی خان نے ایک ذلت آمیز شکست کے نتیجہ میں نکال باہر کیا تھا۔ ان علاقوں میں جب ائمہ دوازدہ کے ناموں سے سکّے جاری ہوئے اور تشیع کی دیگر علامات کی سرکاری سرپرستی شروع کی گئی تو وہاں کے متدیّن سنّی عوام نے بابر کے خلاف سخت نفرت کا اظہار کیا اور اس خطے کے عوام میں اجتماعی طور پر ایک مایوسی اور بددلی کی کیفیت پھیل گئی۔ اس کا پورا فائدہ ازبکوں نے اٹھایا۔ چنانچہ شیبانی خان کے جانشین عبداللہ نے ۹۱۸ھ (۱۵۱۲ء) میں سنی عوام کی مدد سے بابر کو خوفناک شکست سے دوچار کیا اور سمرقند سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نکال باہر کیا۔ بابر آخری بار پھر ایرانیوں کے تعاون سے سمرقند کو واپس لینے کے لیے آگے بڑھا اور بخارا کے شمال میں گجروان کے مقام پر ازبکوں سے برسرِ پیکار ہوا، مگر شکست فاش سے دوچار ہونے کے بعد ہمیشہ کے

لیے وسط ایشیا سے دست کش ہو گیا۔ اب اس نے بدخشاں اور کابل وغزنی پر قبضہ کر کے ہندوستان کی وسیع سرزمین پر حکومت کا خواب دیکھنا شروع کیا۔ پانی پت کی لڑائی میں سلطان ابراہیم لودھی کی قیادت میں ہندوستان کی متحدہ طاقت کو شکست دینے کے بعد آگرہ اور دہلی پر قبضہ جمانے کے ساتھ ہی بابر نے مغلیہ سلطنت کی بنیاد رکھ دی۔ اب وہ ہندوستان کا پہلا مسلمان مطلق العنان بادشاہ بن گیا جو مکمل طور پر خود مختار تھا۔ تاہم مغلوں اور صفویوں کا دفاعی اتحاد بعد میں بھی قائم رہا، جس کا ذکر ہم ہمایوں کی جلاوطنی کے ضمن میں کریں گے۔

اب ہم ترکی چلتے ہیں جہاں کا عثمانی حکمران سلطان سلیم بھی صفویوں کے سخت متعصبانہ رویہ اور بڑھتی ہوئی فوجی اور سیاسی طاقت سے خوفزدہ تھا۔ ۹۲۰ھ (۱۵۱۴ء) میں چالداران کے مقام پر ترکوں کی یلغار کے باعث صفویوں کو اپنے دفاع کے لیے سلطان سلیم سے زبردست مقابلہ کرنا پڑا۔ ایرانی مؤرخین کے بقول سلطان سلیم نے صفویوں کو اشتعال دلانے کے لیے اپنے زیرِ انتظام علاقوں میں چالیس ہزار شیعوں کو قتل کروادیا تھا اور بعد میں سلطان سلیم ایران کی جانب چڑھ دوڑا تھا۔ عثمانیوں کی فوج کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار تھی اور ان کے پاس جدید قسم کی توپیں اور بندوقیں تھیں جن کی تکنیک انہوں نے یورپ سے حاصل کی تھی۔ صفویوں کی فوج ساٹھ ہزار نفوس پر مشتمل تھی۔ شاہ اسماعیل کی افواج کو شکست کا سامنا کرنا پڑا اور عثمانی ترک پیش قدمی کرتے ہوئے ایران کے تاریخی شہر تبریز میں داخل ہو گئے۔ شاہ اسماعیل نے ہمدان میں پناہ لے لی اور اپنی منتشر فوجوں کو یکجا کر کے دو ہفتے کے عرصہ میں تیاری مکمل کر کے، جوابی حملہ کر کے ترکوں سے تبریز واپس لے لیا، مگر دیار بکر اور کردستان کے علاقے مستقل طور پر سلطنتِ عثمانی کا حصہ بن گئے۔ شاہ اسماعیل نے یورپ کے دُور دراز کے ممالک (جو سلطنتِ عثمانی کے دشمن تھے) سے اپنے روابط بڑھائے، توپ وتفنگ کی جدید ٹیکنالوجی حاصل کی اور توپ ڈھالنے کا فن خود بھی سیکھا اور اپنے حلیف بابر کو بھی منتقل کیا۔ ۹۳۰ھ (۱۵۲۴ء) میں شاہ اسماعیل پچیس برس حکومت کرنے کے بعد اڑتیس (۳۸) سال کی عمر

میں وفات پا گیا۔ لودھی افواج کو پانی پت کے میدان میں بابر کی توپوں نے ہی شکست سے دوچار کیا تھا جن کا ہندوستانی فوج کے پاس کوئی توڑ نہیں تھا۔

شاہ اسماعیل کی وفات کے موقع پر اس کا بیٹا طہماسپ گیارہ برس کی عمر میں بادشاہ بنا اور ۹۸۴ھ (۱۵۷۶ء) تک نصف صدی سے زائد عرصہ تک تخت شاہی پر متمکن رہا۔ اس کے عہد میں شمال مشرق کی جانب سے شیبانی خان کا بیٹا عبداللہ ازبک خراسان کے علاقوں طوس، مشہد اور ہرات میں تاخت و تاراج کرتا رہا۔ بغداد میں بھی بغاوت ہوگئی اور ظہور قبیلے کے سردار نے موقع پاتے ہی وہاں پر اپنی ایک خودمختار حکومت قائم کر لی۔ اس دوران عثمانی ترک (سلطان سلیمان کے زمانے میں) بھی صفویوں کے خلاف مسلسل برسرپیکار رہے اور بالآخر آذربائیجان اور بغداد پر قابض ہو گئے۔ شاہ طہماسپ اُن دنوں خراسان میں تھا۔ واپس لوٹنے کے بعد اس نے زبردست لڑائی کے بعد عثمانی ترکوں سے یہ علاقے دوبارہ حاصل کر لیے۔ ترکوں کی روایت کے مطابق شاہ طہماسپ کے اپنے بھائی بھی اس سے الجھتے رہے اور ملک میں مسلسل خانہ جنگی کی کیفیت جاری رہی۔ اس کا اپنا بھائی القاص بھاگ کر عثمانی دربار میں پناہ گزین ہو گیا اور عثمانی سلطان کے بیٹے بایزید نے بھی اپنے باپ کے خلاف ناکام بغاوت کے بعد صفوی دارالحکومت اصفہان میں پناہ لے لی۔ مجبوراً ترکوں (عثمانیوں) اور صفویوں میں صلح ہو گئی۔ ۹۶۲ھ (۱۵۵۴ء) میں صلح کا معاہدہ طے پایا جس کے تحت ایرانیوں کو ایک طویل عرصہ کے بعد حج پر جانے کی اجازت ملی۔ یہاں یہ امر ملحوظِ خاطر رہے کہ حجاز مقدس پر قابض ترک عثمانیوں نے ان دنوں ایرانیوں پر شیعہ ہونے کے باعث حج کے سفر پر پابندی عائد کر رکھی تھی۔ علاوہ بریں ایران اور عثمانی سلطنت کے سرحدی مناقشات بھی ختم ہو گئے۔

اسی زمانے میں ہندوستان کے مغل تاجدار نصیرالدین ہمایوں کو شیر شاہ سوری کے ہاتھوں شکست سے دوچار ہونا پڑا اور وہ اپنے اہل خاندان کے ہمراہ بھاگ کر ایران آ گیا۔ ہمایوں کے اصفہان میں قیام کے دوران کئی بار صفویوں کے مزاج میں تبدیلی آئی۔ کبھی کوئی شوشہ چھوڑتا کہ بابر نے شاہ اسماعیل سے کسی موقع پر بدعہدی کی تھی۔ کبھی

ہمایوں کے بھائی کامران مرزا کا کابل سے خط آ جاتا کہ نااہل ہمایوں کی بجائے اس کی مدد کی جائے۔ صفوی خواتین کے مغل خواتین سے ان ایام میں خوشگوار مراسم اُستوار ہو گئے تھے۔ صفوی خواتین نے ہمایوں کا ساتھ دیا اور ہمایوں کے ساتھ ہندوستان کی تسخیر کے لیے ۹۵۱ھ (۱۵۴۴ء) میں ایک ایرانی لشکر بھیجنے کا فیصلہ ہوا۔ مجبوراً ہمایوں نے شاہ ایران کی تمام شرائط تسلیم کر لیں جن میں شیعہ عقائد کی ترویج و اشاعت کے علاوہ شیعہ مذہب قبول کرنا بھی شامل تھا۔ یہ وہی صورت حال تھی جو ہمایوں کے باپ بابر کو ماوراء النہر کی تسخیر کے موقع پر درپیش تھی۔ ایرانی فوج کے ہمراہ شیعہ مبلغین بھی ہندوستان کی جانب روانہ ہوئے۔ ایرانی فوج کی مدد سے ہمایوں نے کھوئی ہوئی سلطنت حاصل کر لی اور ایرانی لشکر ہندوستان کے مختلف شہروں مثلاً لکھنؤ، دہلی، لاہور اور پشاور وغیرہ میں منتشر ہو کر مقیم ہو گیا اور یہاں پر اہلِ تشیع کے کئی اہم مراکز قائم ہو گئے۔ ان لوگوں کا تعلق ایران سے بدستور قائم رہا اور مذہبی مبلغین ان کی مذہبی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے اسی طرح ایران سے آتے رہے جیسے آج کل ہمارے ہاں سے علماء برطانیہ وغیرہ میں مقیم پاکستانی طبقات کی مذہبی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے لیے جاتے رہتے ہیں۔

اُن دنوں سواحلِ ایران پر موجود پرتگیزی تجارتی مراکز کے ذریعہ پرتگال سے ایران کے تعلقات قائم ہوئے اور سلطنتِ برطانیہ کا سفیر ملکہ الزبتھ اوّل کی طرف تحائف اور دوستی کا پیغام لے کر آیا۔

شاہ طہماسپ کے بعد اس کے بیٹوں میں ایک بار پھر آپس میں ٹھن گئی اور جنگ برادر کشی کے بعد شاہ اسماعیل (۹۸۴ھ۔۹۸۵ھ بمطابق ۱۵۷۶ء۔۱۵۷۷ء) برسرِ اقتدار آیا۔ اس نے اپنے اہل خاندان کا خوب صفایا کروایا۔ ایرانی مؤرخین نے اسے عیاش، بدکار اور سنی العقیدہ قرار دیا ہے۔ صفویوں میں سے سنی شہزادے کا وجود حیرت انگیز امر دکھائی دیتا ہے، مگر یوں محسوس ہوتا ہے کہ سنی سے مراد یہاں بے دین لیا گیا ہے، کیونکہ اس زمانے میں یہ لفظ ایران میں عام طور پر نفرت کی علامت بن گیا تھا۔ اس کی وفات یا قتل کے بعد سلطان محمد خدابندہ (۹۸۵ھ۔۹۹۶ھ بمطابق ۱۵۷۷ء۔۱۵۸۷ء)

برسراقتدار آیا۔ یہ بادشاہ نابینا تھا۔اس کے زمانہ میں عثمانی ترک ایک بار پھر آذربائیجان (بشمول تبریز) پر قابض ہو گئے۔اسی طرح ماوراء النہر کے ازبکوں کو بھی ایران میں تاخت و تاراج کا موقع فراہم ہو گیا۔ یہ زمانہ ایران کی پریشان حالی کا زمانہ تھا۔ عمائدین' علماء اور شعراء نے ان ایام میں ہندوستان کی راہ لی اور وہاں کے مغل دربار میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہو گئے۔اس طرح ایران کا تہذیبی' ثقافتی اور لسانی مرکز آگرہ (ہندوستان) میں منتقل ہو گیا۔

اب شاہ محمد خدابندہ کے دوسرے بیٹے عباس صفوی (۹۹۶ھ۔۱۰۳۸ھ بمطابق ۱۵۸۷ء۔۱۶۲۹ء) کی باری تھی۔اس بادشاہ نے ۴۳ برس ایران پر مسلسل حکومت کی اور عباس اعظم کہلوایا۔اس کا ابتدائی عہد بدامنی کا زمانہ تھا۔عثمانیوں کی یلغار اور پے در پے حملوں سے تنگ آ کر اس نے تبریز' شروان' گرجستان (جارجیا) اور لرستان کے مقبوضات عثمانیوں کے سپرد کر دیے۔خود وہ عبیداللہ کے بیٹے عبدالمومن خان ازبک سے مقابلہ کرنے خراسان کی جانب جا رہا تھا کہ تہران میں بیمار ہو کر بستر پر لگ گیا۔اس دوران متعصب سنی ازبک حملہ آوروں نے مشہد پر قبضہ کر لیا۔ازبکوں نے اہل شہر کو تہہ تیغ کیا اور امام علی رضاؑ کے مقبرے کے خزانے کو لوٹا اور اسے تاخت و تاراج کیا' وہاں کی نفیس اشیاء اٹھالیں اور کتاب خانہ کو نذر آتش کر دیا۔مشہد کی تباہی کے بعد ازبکوں نے نیشاپور' دامغان' اسفرائن' طوس اور طبس کے تاریخی شہروں کو بھی بری طرح لوٹ کر تباہ و برباد کر دیا۔ اسی دوران عبدالمومن ازبک کا والد عبیداللہ ازبک وفات پا گیا اور عبدالمومن بھی اپنے پیروکاروں ہی کے ہاتھوں (جو اس کے باپ کو امام العصر مانتے تھے) مارا گیا۔اتنے میں شاہ عباس بھی صحت یاب ہو گیا اور ۱۰۰۶ھ (۱۵۹۷ء) میں اس نے ہرات میں ازبکوں کو جالیا اور انہیں ایک عبرت ناک شکست سے اس طرح دوچار کیا کہ وہ وسط ایشیا تک محدود ہو گئے اور پھر ایک طویل عرصہ تک بلادِ خراسان و ایران کا رُخ نہ کر سکے۔پھر شاہ عباس نے یزد' کرمان' گیلان اور لرستان پر دوبارہ اپنی حکومت مستحکم کی اور باغیوں کا قلع قمع کیا۔

بعدازاں اس نے پرتگالیوں کو کچھ ساحلی علاقے دینے کے بعد ان کی مدد سے بحرین اور بلوچستان کو مطیع کیا۔ ۱۰۱۷ھ (۱۶۰۸ء) میں عثمانیوں کو شکست دے کر اپنے چھینے ہوئے علاقے ترکوں سے واپس لے لیے۔ اس کے زمانے میں ایران کے ولندیزیوں (ڈچ)، فرانسیسیوں اور سپین کے یورپی ممالک سے تجارتی روابط اُستوار ہوئے۔ قندھار کا شہر مغلوں اور شاہ عباس کے درمیان مسلسل مسئلہ نزاع بنا رہا، اسی مسئلہ پر ہندوستان کے مغل حکمران نورالدین محمد جہانگیر کی شاہ عباس سے قندھار کے مقام پر تاریخی ملاقات بھی ہوئی۔ اس کے زمانہ میں ملک کا دارالحکومت قزوین سے اصفہان منتقل ہوا۔ اور اس نے وہاں پر اعلیٰ ترین عمارات مثلاً مسجد شاہ، چہل ستون، علی قاپو اور میدانِ سپاہ کی تعمیر کروائی۔ ان عمارات کی تعمیر نے اصفہان کو دنیا کے عظیم ترین دارالحکومت مراکز کی صف میں شامل کر دیا اور اصفہان نصفِ جہان کہلانے لگا۔ یہ عمارات آج بھی وہاں پر سیاحوں کی دلچسپی کا مرکز ہیں۔

شاہ اسماعیل کے بعد شیعیت کی ترویج میں اس بادشاہ کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ اس نے مختلف قبائل سے رابطہ استوار کر کے مشہد کو مذہبی مرکزیت دلوانے کی مہم چلائی اور وہاں پر حضرت امام علی رضاؒ کے مدفن کی موجودگی کے باعث اسے مقدس مقام کا درجہ دلوانے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ گاہے بگاہے اصفہان سے آٹھ سو میل کا طویل سفر طے کر کے مشہد میں حاضری دیتا اور سال میں دو ہفتے روضہ امام رضاؒ پر اپنے ہاتھوں سے جھاڑو دیتا تھا۔ کئی مرتبہ وہ پا پیادہ بھی زیارت کے لیے مشہد آیا تھا۔ کئی بار اس نے روضہ کی ہزاروں شمعیں اپنے ہاتھوں سے قطع کیں۔ اس نے اپنا گراں بہا خزانہ اور اپنی کمان (جس پر اس کا نام کندہ ہے) روضہ میں رکھوا دی۔ علاوہ بریں وہ زیارت کے لیے نجف بھی جاتا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مزار کو اپنے ہاتھوں سے صاف کرتا تھا۔ وہ زندگی بھر ایران کے لوگوں میں شیعہ عقائد کی ترویج اور عقیدت میں اضافہ کے لیے کوشاں رہا۔ اس نے مذہبی علماء کے باہمی اختلافات کو بطورِ احسن ختم کروایا۔ مذہبی علماء اور مجتہدین کی درجہ بندی کروائی اور سرکاری طور پر اُن کے مربوط کلیسائی نظام کو تسلیم کیا۔ مختلف مزاروں

کی دیکھ بھال کے لیے اوقاف قائم کیے۔ اس کے زمانہ تک سنی رعایا بری طرح سہم چکی تھی اور ایران میں شیعیت پورے زوروں پر تھی۔ علماء کی کمی کو پورا کرنے کے لیے شیعہ علماء کو خصوصی طور پر عرب ممالک سے بلوایا گیا تھا اور انہیں زبردست مراعات دی گئیں تھیں۔ یہ علماء عوام میں شاہ پرستی کی تلقین کرتے تھے۔ کلیم صدیقی نے اپنی کتاب ''انقلابِ ایران'' میں الگار کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہ شیعہ علماء شاہ (اور دیگر صفوی علماء) کو تعظیمی سجدہ بھی کرتے تھے۔ چونکہ اس سے پہلے ایران میں شیعہ علماء کے مدارس اور مکاتب موجود نہیں تھے اس لیے یہ انتظام بھی ضروری سمجھا گیا تھا۔ یہی غیر ملکی علماء صفوی دربار کے تقدس کو برقرار رکھنے میں ہر دم کوشاں رہے۔ اِس طرح بادشاہت اور دین کو یکجا کر کے بادشاہ کو مذہب کا سرپرست قرار دے دیا گیا۔

شاہ عباس کے بعد شاہ صفی (۱۰۳۸ھ۔۱۰۵۲ھ بمطابق ۱۶۲۹ء۔۱۶۴۲ء) کا دَور ہے۔ اس ناتجربہ کار بادشاہ نے اپنے ہی محسنوں کو قتل کروایا، ازبکوں کے ہاتھوں ہزیمت اٹھائی اور عثمانی سلطان مراد چہارم کے لشکر سے شکست کھا کر کُردستان اور ہمدان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ البتہ بغداد کو ترکوں سے بچانے میں کامیاب ہو گیا۔

اس کا بیٹا شاہ عباس دوم (۱۰۵۲ھ۔۱۰۷۷ھ بمطابق ۱۶۴۲ء۔۱۶۶۷ء) دس برس ہی کی عمر میں حکومت پر فائز ہوا۔ اس کی کم سنی میں امرائے سلطنت (جن میں بڑی تعداد مذہبی رہنماؤں اور علماء کی تھی) نے ملک میں مذہبی پابندیاں مزید سخت کر دی تھیں اور میخانے بند کروا دیے تھے۔ بادشاہ چونکہ خود بہت زیادہ شراب نوشی کرتا تھا اس لیے اس نے ہوش سنبھالتے ہی یہ پابندیاں نرم کر دیں۔ اس نے تمام مذاہب کے پیروکاروں سے یکساں نرمی کا سلوک کیا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ ایمان ایک امر باطن ہے اور باطن کا حال صرف خدا جانتا ہے۔ میں تو صرف عالَم ظاہر کا بادشاہ ہوں۔ اس نے مغل بادشاہ شاہجہان کے باغی حاکم بلخ کو مدد دی اور پہلی مرتبہ روسیوں سے جنگ لڑی۔

پھر اس کا بیٹا شاہ سلیمان ۱۰۷۷ھ (۱۶۶۷ء) میں برسر اقتدار آیا اور ۱۱۰۵ھ (۱۶۹۴ء) تک حکومت کی۔ یہ ضعیف العقل، ظالم اور سنگ دل انسان تھا۔ اپنے

مصاحبوں تک کے کان، ناک کٹوا دینا یا آنکھ نکلوا دینا اس کا عام معمول تھا۔ یہ خواجہ سراؤں کے اثر میں آ گیا تھا اور عیش وعشرت میں مستغرق رہتا تھا۔ جب ہالینڈ والوں (ولندیزیوں) نے خلیج فارس میں کشم کی بندرگاہ پر قبضہ کیا تو اسے کچھ اثر نہ ہوا۔ ازبک خراسان کو لوٹتے رہے تو اس کی بلا سے۔ تاہم اس نے پوری طرح سے شیعہ عقائد کی شدّت سے پاسداری کی، امام رضاؒ کے مقبرے کے گنبد کو زلزلے سے نقصان پہنچا تو اس کی شاندار مرمت کروائی اور ۱۰۸۶ھ (۱۶۷۶ء) میں وہاں پر ایک کتبہ نصب کیا۔ مشہد سے باہر مصلّٰی (مقامِ نماز) اس کی یادگار ہے جس کی محراب پر نیلی سطح پر سفید رنگ میں آیاتِ قرآنی درج ہیں۔ اس کی وفات کے بعد ایران میں صفوی سلطنت زوال پذیر ہوگئی۔ خانہ جنگیوں، ترکوں، ازبکوں اور یورپی طاقتوں کے حملوں کی تفصیل یہاں مطلوب نہیں ہے۔ ایک وقت آیا کہ افغانوں نے محمود کی قیادت میں اصفہان، شیراز اور یزد میں لُوٹ مار مچا دی۔ اپنے مرکز سے کٹ کر افغان زیادہ عرصہ فارس کے مراکز میں اپنی حکومت قائم نہ رکھ سکے۔ خراسان خودمختار ہوگیا اور عثمانی تُرک ایران کے مغربی اور شمال مغربی علاقوں پر قابض ہوگئے۔

ان دنوں خراسان کے ایک شہر ابیورد میں ایک معمولی خاندان کا بچہ نادرشاہ (جس کا تعلق قرقلو قبیلہ سے تھا) افشاریوں کی مدد سے طاقت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ بچپن میں ریوڑ چراتا اور گدھے اور اونٹ پر ایندھن لاد کر بھی بازار میں بیچا کرتا تھا۔ ایک بار ازبک چھاپہ مار اس کو اور اس کی بیوہ ماں کو اٹھا کر لے گئے تھے اور انہیں خوارزم میں بیچ دیا تھا۔ چار سال انہوں نے غلامی کی زندگی بسر کی اور ایک دن نادر بھاگ کر خراسان آن پہنچا۔ یہاں ابیورد کے حاکم باباعلی بیگ احمد لو افشار کے دربار میں ملازمت اختیار کرلی۔ باباعلی نے اس کی خوبیوں سے متاثر ہو کر اسے اپنا داماد بنالیا اور اس کی وفات پر وہ ابیورد کا حکمران بن گیا۔ پھر محمود سیستانی نے اسے جب اختیار واقتدار سے محروم کیا تو اس نے رہزنی شروع کردی اور کاروان لُوٹتے لُوٹتے تین ہزار کا لشکر بنا لیا۔ پھر اس نے جبراً اہلِ خراسان سے محصول وصول کرنا شروع کیا اور قلعہ کلات پر بزور

قبضہ کر لیا جو اس کے نام کی مناسبت سے کلات نادری کہلایا۔ پھر نیشاپور پر قبضہ کرنے کے بعد صفوی بادشاہ کے نام پر خراسان پر حکومت شروع کر دی اور ان کی دوبارہ تزئین و آرائش کروائی۔ نادر شاہ افغانوں کو پے در پے شکست دینے کے بعد ایک بار پھر ۱۱۴۱ھ (۱۷۲۹ء) میں صفوی اقتدار بحال کرنے میں کامیاب ہو گیا اور اصفہان میں داخل ہو کر طہماسپ صفوی کو یہ شہر سونپ دیا۔ شاہ طہماسپ صفوی شہر کی تاریخی عمارات کی شکستہ حالت دیکھ کر بہت پریشان ہوا اور ان کی دوبارہ تزئین و آرائش کروائی۔ نادر شاہ نے افغانوں کو ملک بدر کر کے عثمانی ترکوں کو آذربائیجان اور ہمدان سے نکال باہر کیا۔ بالآخر اس نے شاہ طہماسپ کو اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اپنا اسیر کر لیا اور خراسان میں جلاوطن کر دیا۔ ۱۱۴۵ھ (۱۷۳۲ء) میں اس نے شاہ طہماسپ کے بیٹے عباس سوم کو بادشاہت عطا کر کے امورِ انتظامی (بطور ریجنٹ) اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ پھر ترکوں سے معرکہ آراء ہونے کے بعد بحیرہ خزر (Caspian Sea) کے علاقوں سے روسیوں کو باہر نکالا اور دربند اور باکو پر اپنا قبضہ مستحکم کر لیا۔ ۱۱۴۸ھ (۱۷۳۵ء) تک وہ ایران کے تمام علاقوں سے عثمانیوں' روسیوں اور افغانیوں کو نکال چکا تھا' اب اس نے باقاعدہ طور پر اپنی بادشاہت کا اعلان کیا۔ یہ اعلان اس نے ایرانی عمائدین' قاضیوں اور بزرگوں کی موجودگی میں' ان کے مطالبہ پر کیا اور صفوی سلطنت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دی گئی۔ تاج پوشی کے موقع پر اس نے حاضرین سے جو مطالبات منوائے' وہ درجِ ذیل ہیں:

۱) ایران کا ایک سرکاری مذہب اہل سنت والجماعت بھی ہو گا اور حنفی فقہ سرکاری طور پر تسلیم کی جائے گی۔ اہل ایران اہل سنت والجماعت کے بارے میں اپنی رائے تبدیل کر دیں گے اور سنیوں کی چاروں قسم کی فقہ (حنفی' مالکی' شافعی اور حنبلی) کے ساتھ ساتھ پانچویں فقہ بھی بطور فقہ جعفری تسلیم کر لی جائے گی۔

۲) خانہ کعبہ میں مختلف سنی فقہ کے پیروکار چار مختلف ارکان پر نماز ادا کرتے ہیں۔ ایرانی کسی بھی ایک رکن میں ان کے ساتھ شامل ہو کر نماز پڑھیں گے۔ شیعہ حضرات فقہ

جعفری کے مطابق باقی مسلمانوں سے مل کر نماز ادا کریں گے۔

۳) ایرانیوں کی طرف سے ہر برس ایک امیر الحجاج متعین ہو گا جو دولتِ عثمانی کے کارندوں سے اسی طرح معاملات طے کرے گا جیسے شام اور مصر کے امرائے حجاج معاملات طے کرتے ہیں۔

۴) غلاموں کی خرید وفروخت پر پابندی عائد کر دی جائے گی اور جنگی قیدی آزاد کر دیے جائیں گے۔

۵) سلطنت عثمانی اور ایران کے وکلاء (سفراء) ایک دوسرے کے دارالحکومت میں قیام پذیر رہیں گے اور معاملات باہمی مشاورت سے طے کریں گے۔

ان مطالبات کے ماننے پر نادر شاہ ایران کا مطلق العنان بادشاہ بن گیا۔ یہ مشترکہ اعلامیہ دراصل اس امر کا نتیجہ تھا کہ ایرانی عوام اور عمائدین مذہبی عناد اور تعصب سے تنگ آ چکے تھے اور وہ خود بھی باقی مسلمان اُمت کے ساتھ مل جل کر رہنا چاہتے تھے۔ ہر چند کہ اس مذہبی تبدیلی کو بہت سے لوگوں نے دلی طور پر نہ مانا مگر یہ تبدیلی سرکاری سطح پر ضرور نظر آئی۔ نادر شاہ نے اہل تشیع اور اہل تسنن کے بین بین حضرت امام جعفر صادق کے نام پر مذہبِ جعفریہ کی ترویج کرنا چاہی اور ایران کو اُمت کے دھارے میں شامل کرنا چاہا مگر بعد کے حالات سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس میں وہ خاطر خواہ حد تک کامیاب نہیں ہو سکا۔

صفوی دَور میں مذہبی سختی اور عدم رواداری کے باعث لوگ بات کہتے ہوئے ڈرتے تھے اور فارسی شعر وادب اسی وجہ سے انحطاط پذیر ہو گیا تھا۔ مشہور شعراء سلطنت ایران کو چھوڑ کر ہندوستان چلے گئے جہاں کے مغل تاجدار فارسی شعر وادب کے دلدادہ تھے اور شعراء وفضلاء کے مربی ومحسن تھے۔ اس امر کی طرف ایران کے بیسویں صدی کے پہلے حصے کے مشہور شاعر ملک الشعراء بہار نے بڑے نازک انداز میں اشارہ کیا ہے۔ آپ کی مشہور نظم ''خطاب بہ ہند'' کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

چون کسی را صنعتی غالب بود می شتابد هر کجا طالب بود

(اگر کسی کو کسی ہنر یا صنعت پر قدرت حاصل ہو تو وہ وہیں کا رُخ کرے گا جہاں اس کے چاہنے والے موجود ہوں گے۔)

از ہمایوں گیر تا شاہِ جہاں　　شاعران را بود ہند آرامِ جان

(ہمایوں سے لے کر شاہ جہاں تک ہندوستان ہی شعراء کے لیے سکون اور روحانی اطمینان کا مقام تھا۔)

ہند بازارِ خریدِ ذوق بود　　ہند یکسر عشق و شور و شوق بود

(جس منڈی میں شعری ذوق کا سودا ہو سکتا تھا وہ ہند ہی تھا' اور یہی ملک عشق' شور اور شوق کی آماجگاہ تھا۔)

صنعت و ذوقِ ہنر ترکیب یافت　　کاروانہا جانبِ دہلی شتافت

(صنعت اور ذوقِ ہنر آپس میں مل گئے اور قافلے کے قافلے دہلی کی جانب چل دیے۔)

بس رواں شد کارواں در کارواں　　تنگہاے دل پُر از کالاے جان

(قافلوں کے پیچھے قافلے لگاتار اسی سرزمین کا رُخ کرتے رہے۔ ان کا ساز و سامان ان کے دلوں کے بقچوں میں بند تھا اور یہ سامانِ سفر دراصل ان کی جان یا روح کی متاع تھی۔)

رشکِ غزنیں گشت بزم اکبری　　نغمہ خوان ہر سو ہزاراں عنصری

(اکبر کی محفل پر غزنی کے ماضی کو رشک آنے لگا اور عنصری جیسے ہزاروں شعراء وہاں پر نغمہ خواں ہو گئے۔)

بزمِ نورالدین گلستانی دگر　　درگہ نورِ جہاں جانی دگر

(نورالدین محمد جہانگیر کی محفل بھی ایک عجیب گلستان کا منظر پیش کر رہی تھی' نور جہاں بیگم کے دربار کا اپنا ہی ایک وجود تھا۔)

دوسری جانب شعراء اور فضلاء کے عازم ہندوستان ہونے کے باعث ایران کی شعر و سخن کی محفلیں اجڑ چکی تھیں۔ عربی نژاد شیعہ علماء اور ان کے شاگردوں کے اقتدار کا دور دورہ تھا۔ شعراء اگر تھے تو انہیں ائمہ دوازدہ کی منقبت اور مرثیہ گوئی پر مجبور کر دیا گیا

تھا' کیونکہ شاہانِ وقت اپنے قصائد کی بجائے ائمہ کی تعریف سننا زیادہ پسند کرتے تھے۔ اسی طرح شیعہ عقائد کی تصانیف کے سلسلے میں علماء کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ ایسے علماء میں سے شیخ بہائی بھی شامل ہیں جو شام کے شہر بعلبک سے تعلق رکھتے تھے اور صفوی دَور میں شیخ الاسلام کے عہدے پر فائز ہوئے تھے۔ انہوں نے جامع عباسی' تشریح الافلاک اور کشکول بہائی جیسی تصانیف چھوڑی ہیں۔ اسی طرح ہمیں ملا صدرا (صدرالدین شیرازی) کا نام ملتا ہے جنہوں نے ۱۰۵۰ھ میں وفات پائی۔ انہوں نے دین و فلسفہ کے موضوعات پر کتب تحریر کیں۔ اسفار اربعہ' شواہد الربوبیہ' شرح اصول کافی' کتاب الہدایہ' شرح حکمت الاشراق' کتاب الواردات القلبیہ اور کسر الاصنام الجاھلیہ وغیرہ ان کی تصانیف ہیں۔ علامہ اقبال کے پی ایچ ڈی کے مقالہ میں بھی آپ کے فلسفیانہ افکار کا تفصیل سے ذکر ملتا ہے۔ اسی طرح ملا باقر مجلسی (متوفی ۱۱۱۱ھ) کا ذکر ملتا ہے جنہوں نے عربی میں بحار الانوار اور فارسی میں مشکوٰۃ الانوار' عین الحیات' حلیۃ المتقین' حیات القلوب' تحفۃ الزائرین' جلال العیون وغیرہ لکھی ہیں۔ علاوہ بریں خشک فلسفے اور علم الکلام پر بھی اُن دنوں کی کچھ کتابیں ملتی ہیں۔

صفوی بادشاہ اگرچہ خود ایک صوفی بزرگ کی اولاد میں سے تھے لیکن وہ خود صوفیاء کی زبردست مخالفت کرتے تھے۔ اس کی اہم وجہ یہ تھی کہ عموماً صوفیاء کرام سنی مسلک سے وابستہ تھے۔ صوفیوں کا اثر مریدوں اور عوام پر بہت تھا۔ ان سے یہ خطرہ درپیش تھا کہ کہیں وہ سرکاری مذہب کے خلاف کوئی تحریک نہ چلا دیں۔ اس لیے انہوں نے مسلک تصوف سے عوام کی توجہ ہٹانا چاہی۔ صوفی شعراء اور نثر نگاروں کا ایران میں کوئی پرسانِ حال نہ رہا۔ غزل' مثنوی اور رباعی (جو صوفیانہ موضوعات کے بیان کا ذریعہ تھیں) ماضی کے دھندلکوں میں کھو کے رہ گئیں۔ ''تاریخ ادبیات ایران'' کے مؤلف جناب رضا زادہ شفق کے بقول شاہ طہماسپ اور شاہ عباس کا بالخصوص اور دیگر شاہانِ صفویہ کا بالعموم حکم تھا کہ قصیدے صرف ائمہ کے کہے جائیں' کسی صورت میں امراء اور رؤساء کی مدح خوانی

نہ کی جائے۔اسی لیے تمام صفوی عہد میں مولانا جامی کے علاوہ کوئی اور بڑا نام تاریخِ شعر وادب میں نہیں ملتا۔صوفیائے کرام ہندوستان چلے گئے اور وہاں پر اسلام کی تبلیغ میں اہم کردارادا کیا۔

صفوی دَور میں شیعہ مذہب میں دیگر روایات کا اضافہ تصورات کا ارتقاء

امامت کا تصور

ازمنۂ قدیم میں ایران میں شہنشاہ کی ذات دینی (religious)' تسلط اور دنیاوی(temporal) اقتدار کا سرچشمہ تھی اور مذہبی اعتبار سے وہ بھی خدا کی عکس سمجھی جاتی تھی۔تمام مذہبی رہنما اس کی وفاداری کا دم بھرتے تھے۔امام حسین رضی اللہ عنہ کی شخصیت میں بھی اہل ایران کو (یزدگرد سوم ساسانی شہنشاہ کی بیٹی حضرت شہربانوؒ کے عقد کے باعث) خاندان نبوت اور ایرانی شہنشاہیت کا امتزاج نظر آنے لگا۔دینی اور نسلی وتمدنی فخر ومباہات یہاں سمٹتے ہوئے نظر آتے ہیں۔''میراث ایران'' کے مؤلف آر جی آربری کے بقول مذاہب قدیم کا تتبع کرتے ہوئے فردِ واحد کو صاحب اختیار واقتدار قرار دے دیا گیا' یعنی ایک بشر میں صفاتِ خداوندی کا پرتو دیکھا گیا۔ان کے ہاں امام کی ذات رومن کیتھولک عیسائیوں کے پوپ کی بجائے نسطوریوں کے مسیح کے ہم پلہ نظر آتی ہے۔آپ نے فلسفۂ اسلام کے مؤلف ایم ہارٹن سے استناد کرتے ہوئے لکھا ہے کہ پوپ کے مقابلہ میں امام کو شخصاً معصوم قرار دیا جاتا ہے اور عقائد کے اعتبار سے اس کا صاحب الشرع ہونا اور لغزش سے پاک ہونا مسلّم ہے۔امام کو معصوم سمجھا جاتا ہے اور مأمور من اللہ تصور کیا جاتا ہے۔

عیسوی عقائد سے استنباط

جس طرح عیسائیوں کے ہاں مسلّم ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قربانی نے دنیا بھر

کے گناہگاروں کے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا ہے' اسی طرح واقعہ کربلا سے قربانی اور انسانوں کے گناہوں کے کفارے کا تصور ملتا ہے۔ نوراللہ شوستری (متوفی ۱۶۱۰ء) کی کتاب ''مجالس المؤمنین'' میں سے پہلی مجلس کے الفاظ اگر احتیاط سے ملاحظہ ہوں تو ان کے مطابق یہ دنیا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا مہر قرار دی گئی ہے۔

اسی طرح جب کعبہ میں فتح مکہ کے موقع پر بُت شکنی کے وقت رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنے کندھوں پر اٹھا لیا' کیونکہ شوستری کے بقول وہ جملہ عیوب سے پاک تھے' وہ بقول آربری مسلک عیسویت میں اس واقعے کی یاد دلاتا ہے جب حضرت مریم علیہا السلام نے بحکم الٰہی بدون تصرف غیر حاملہ ہو کر اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اپنی گود میں لے لیا۔

اگرچہ اس قسم کے فلسفیانہ دلائل و براہین پر تمام شیعہ حضرات کا یکساں اتفاق نہیں ہے' مگر مختلف آراء اور عقائدِ عہد صفویہ کی اگر تدوین کی جائے تو ان پر آربری کے بقول یوحنا کی انجیل کے آخری الفاظ کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ ان تمام افکار و عقائد کے باوجود امام غائب کے تصور کے زیر سایہ صفوی بادشاہوں کا اقتدار ایک مسلّمہ امر رہا اور ہر چند کہ انہوں نے ائمہ کی شخصیات کے سامنے اپنا امیج عاجزانہ انداز میں پیش کیا مگر اقتدارِ شخصی (Autocracy) اور آمرانہ طریق حکومت (Dictatorship) اپنے عروج پر رہی۔ چونکہ مذہبی علماء زیادہ تر باہر سے منگوائے گئے تھے اور مراعاتِ شاہانہ سے لطف اندوز ہو رہے تھے اس لیے بادشاہت کے لیے خطرہ نہ بن سکے۔ انہی کی وفاداری نے شاہ کو امام کے مقام پر لا کھڑا کیا اور امام وقت کی غیابت (غیر حاضری) میں شاہ کو وہ اختیارات تفویض کر دیے گئے جو امامت کا خاصہ تھے۔

واقعۂ کربلا اور مرثیہ گوئی

ایران قدیم میں حماسہ گوئی (رزمیہ شاعری) کی رسم بہت اہمیت کی حامل رہی ہے۔ اگر ابوالقاسم فردوسی طوسی (متوفی ۱۰۲۰ء) کے شاہنامہ کا مطالعہ کیا جائے' یا ساسانی عہد کے خدائی نامہ (جس کا ترجمہ ابن المقفع متوفی ۷۵۷ھ کی بدولت فارسی میں ہوا) کا

مطالعہ کیا جائے تو یہ اسالیب سخن واضح طور پر اُبھرتے ہیں۔ ایران کی رزمیہ شاعری دراصل ڈرامہ نہیں، بلکہ کھوئے ہوئے اقتدار کی آرزومندی اور حصولِ عروج کی خواہش پر مشتمل ہے۔ فردوسی کا شاہنامہ تو ایرانی مشاہیر مثلاً سہراب اور زال کے مرثیوں یا سلطنت ہخامنشی اور ساسانی کے خاتمے پر لکھے گئے مرثیوں پر مشتمل ہے، جہاں ایران کی عظمت کے زوال اور اغیار کے عروج مثلاً سکندرِاعظم مقدونی اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ایرانی بادشاہت پر حملوں کا رونا رویا گیا ہے اور آرزو کی گئی ہے کہ پھر کسی نہ کسی طرح یہ عظمت واپس آ سکے۔ اسی طرح افضل الدین بدیل خاقانی (جو ایک درویش منش سنی مسلمان تھا) نے حج کے سفر کے موقع پر قدیم ایرانی دارالحکومت مدائن کے کھنڈرات پر کھڑے ہو کر شاہانِ ساسانی کا جو مرثیہ لکھا ہے وہ بھی ایک قسم کا عظمت رفتہ پر افسوس کا خوبصورت اشعار میں اظہار ہے۔ اسی طرح شیخ سعدیؒ نے انقراضِ بغداد اور عباسی خلافت کے خوفناک خاتمہ پر افسوس کا اظہار کیا۔ حافظ شیرازی کے ہاں بھی ایسی شاعری کے نمونے ملتے ہیں۔ نظامی گنجوی نے بھی یہ رسم زندہ رکھی ہے، اور ہخامنشی دور کے خاتمہ اور سکندر کے ہاتھوں داریوش کی موت کے موقع پر اس کا یہ شعر اپنی نظیر نہیں رکھتا۔

نسب نامۂ دولتِ کے قباد
برگ بر برگ ہر سو برد باد

(کیقباد کی حکومت کے شجرۂ نسب کی کتاب کے ورق ایک ایک کر کے ہوا اُڑا کر لے گئی۔)

صفوی دور میں یہی حماسہ گوئی ہمیں واقعہ کربلا اور دیگر ائمہ کی شہادت اور مظلومیت کے ادوار کا جذباتی نقشہ کھینچتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس حماسہ گوئی کو یہاں پر مرثیہ کا نام دیا جاتا ہے۔ ہر چند کہ سانحہ کربلا تین یوم پر مشتمل تھا مگر اس کی بابت جو اوراق شعر و نثر سے بھرے گئے ہیں وہ صدیوں پر محیط دکھائی دیتے ہیں۔ ان میں واقعہ نگاری، خیال آفرینی اور اثرانگیزی اپنے عروج پر ہیں۔ یہی مرثیے عاشورہ اور دیگر مجالس کے موقع پر پڑھے

جاتے رہے ہیں اور انہی کے زیر اثر ماتم کا سماں بندھتا ہے۔ اس میں ڈرامے کا عنصر نہیں ہے بلکہ شہادت کے واقعات کو گہرائی اور باریکیوں سے بیان کرتے ہوئے خاندانِ نبوتؐ پر نازل ہونے والے مظالم کا ذکر کرتے ہوئے امام وقت کی حکومت کے قیام اور احیاء اسلام کی آرزو کا رنگ جھلکتا ہے۔ آخری ادوار میں یہی مرثیے حماسہ گوئی کی جگہ لے لیتے ہیں۔ ان میں پوشیدہ آرزوؤں کا نکتۂ کمال ہمیں ایک مذہبی حکومت کے قیام کی خواہش کی صورت میں نظر آتا ہے۔

تعزیہ اور علامات

زمانۂ قبل مسیح کے بحیرۂ روم کے مشرقی ساحل (کے شامی علاقوں) میں تعزیہ کا وجود ملتا ہے جس میں مرنے والے شخص کی باقیات اور ذاتی استعمال کی اشیاء کی نمائش کی جاتی تھی، اور ان کے گرداگرد ماتم کیا جاتا تھا۔ پھر ان کو سمندر کی لہروں کے سپرد کر دیا جاتا تھا۔ اسی طرح کی رسم کو حضرت امام حسینؓ کی شہادت کے ضمن میں اپنا لیا گیا۔ صفوی دَور میں تعزیہ کا فن عروج پر پہنچا اور ائمہ کے روضوں کے ماڈل بنا بنا کر نمائش کے لیے مذہبی عمارات سے عاشورہ اور دیگر مواقع پر باہر لائے جانے لگے۔ اسی طرح واقعاتِ کربلا کی علامات مثلاً گھوڑا (ذوالجناح)، علَم، پنجہ، تلوار اور دیگر علامات بطور نمائش ماتم کے مواقع پر امام بارگاہوں سے باہر لائی جانے لگیں تاکہ لوگوں کے مذہبی جذبات کو جِلا ملے اور حالات و واقعات کی تصویر اُن کے سامنے چلتی پھرتی نظر آئے۔ ان کا مقصد یہی تھا کہ اہم تاریخی مذہبی واقعات کا سماں بندھے اور جذبات پر ان کا گہرا اثر ہو۔ تاریخ کے مطالعہ سے صفوی دَور سے پہلے ہماری نظر سے یہ چیزیں نہیں گزریں۔ یہیں سے یہ نشانات صفوی حکومت کی جنگی فتوحات اور عسکری مہمات کے لیے اہمیت اختیار کر گئے تھے۔ یہ نشانات لوک ورثہ کی صورت میں قائم رہے اور ان کی تعمیر و تزئین کو خاص اہمیت دی جانے لگی۔ اس طرح باطنی اور قلبی معاملات کی جگہ ظاہری علامات نے لے لی۔ نمود و نمائش پر زور دیا جانے لگا اور قلبی واردات کی جگہ رسوم و رواج نے لے لی۔

فلسفہ اور علم الکلام

اسلام سے قبل یہودیت کی تاریخ میں فقہ یعنی روزمرہ امور کے بارے میں مختلف مباحث ملتے ہیں۔ عیسائیت میں علم الکلام پر زور دیا گیا ہے۔ اسلام میں اہل سنت و الجماعت کے ہاں فقہ پر زیادہ زور ہے اور اکثر مذہبی تحریریں روزمرہ اور قانونی امور کی بابت ہیں۔ چونکہ اکثر مسلمان حکمرانوں کا تعلق سنی مسالک سے رہا ہے اس لیے ان کے علماء فقہ اور شرعی قوانین کی تدوین میں منہمک نظر آتے ہیں' تا کہ امور سلطنت اور عوام کے روزمرہ معاملات و مسائل کا مذہبی حل پیش کیا جا سکے۔ شیعہ احباب کے ہاں چونکہ اپنا نقطۂ نظر شدّ و مد سے پیش کرنا اہم تھا اس لیے وہ علم الکلام کی دقیق موشگافیوں میں پڑے رہے۔ انہوں نے فلسفیانہ تحریکوں میں سے معتزلہ' اشعریہ' جبریہ اور قدریہ کے بہت سے افکار اپنا لیے تھے۔ اسی طرح ادیان ماضی کے تصورات بھی اسلام کی حقانیت کی شرح میں پیش کرتے رہے ہیں۔ صوفیاء کرام نے قلبی واردات اور روحانی معاملات کی وضاحت اس دلچسپ پیرائے میں پیش کی ہے کہ عوام اور خواص یکساں لطف اندوز ہو سکیں۔

سنیوں کے ہاں غزالیؒ اور رازیؒ ایسے لوگ ملتے ہیں جو فلسفیانہ مسائل میں اُلجھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ غزالیؒ نے تو آخری زندگی میں ''تہافۃ الفلاسفۃ'' لکھ کر فلسفیوں پر تنقید کی ہے اور دیگر صوفیاء اور سنی شعراء نے ایقان اور وجدان پر زور دیا ہے۔ رازیؒ کے استدلال پر رومیؒ کا یہ کہنا ہے: ؎

گر بہ استدلال کارِ دین بدی فخر رازی راز دارِ دین بدی
پائے استدلالیان چوبین بود پائے چوبین سخت بے تمکین بود

(اگر دلائل دینے سے دین کی وضاحت کی جا سکتی ہو تو فخر الدین رازیؒ دین کے سب سے بڑے راز دان ہوتے۔ دلائل اور منطق کا سہارا لینے والے لوگوں کے پاؤں لکڑی کے ہوتے ہیں' جو بہت بودے اور بیکار ہوتے ہیں۔)

اسی طرح ابوعلی ابن سینا نے فلسفہ کا سہارا لیا ہے' مگر حضرت علامہ اقبالؒ نے رومی کے وجدان اور ایقان کو اس پر ترجیح دی ہے۔ علامہ فرماتے ہیں: ؎

بو علی اندر غبارِ ناقہ گم　　دستِ رومی پردۂ محمل گرفت
ایں فروتر رفت و تا گوہر رسید　　آں بگرد ابے چو خس منزل گرفت
حق اگر سوزے ندارد حکمت است　　شعر می گردد چو سوز از دل گرفت

(بوعلی سینا اونٹنی کے پاؤں کے گرد وغبار میں کھو گیا ہے، جبکہ رومی نے محمل کا پردہ اٹھا کر محبوب کا چہرہ دیکھ لیا ہے۔ رومیؒ نے آگے بڑھ کر گوہر تک رسائی حاصل کر لی ہے، مگر ابن سینا سمندر کی موجوں میں ہی خس و خاشاک کی طرح الجھ کر رہ گیا ہے۔ حق میں اگر سوز (ایمان کا نور) نہ ہو تو اسے دانائی کہتے ہیں، لیکن اگر دل کی گہرائیوں سے اس میں سوز شامل ہو جائے تو وہ شعر بن جاتا ہے۔)

اس کے برعکس ہمارے شیعہ احباب نے فلسفہ اور علم الکلام میں زبردست رسائی حاصل کی ہے۔ صفوی دور میں ملا صدرا اپنی مثال آپ ہیں۔ شیعہ فلسفی اُس وقت سنی مفکرین کی مدد کو آتے ہوئے نظر آتے ہیں جب وہ فلسفے میں الجھ کر رہ جاتے ہیں اور غیر مسلم اور گمراہ مفکرین کے اعتراضات کا جواب نہیں دے پاتے۔ اگر شیعہ مفکرین کے افکار کا مطالعہ کریں تو یوں لگتا ہے جیسے وہ پورے اعتماد کے ساتھ بات کرتے کرتے مسکراتے ہوئے آگے بڑھ رہے ہوں، ساتھ ساتھ شک کا اظہار بھی کر رہے ہوں اور مختلف مثبت اور منفی پہلوؤں کی بابت پورے اعتماد اور دلجمعی سے پُر اثر دلائل بھی دے رہے ہوں۔ پھر ہولے ہولے اپنی خوشگوار حیرت کا اظہار کرتے کرتے ایک دل پذیر انداز میں، بے پناہ طنز کے ساتھ اور نزاکتِ خیال کا اسلوب اپنائے ہوئے اپنا نقطۂ نظر واضح کرتے چلے جاتے ہیں۔

اس طرح کے منطقی استدلال کے نتیجے میں اسلامی عقائد میں بنی نوع انسان کے نجات پانے کا عملی اور فکری اعتبار سے متوازن تصور پایا جانے لگا اور بندہ و ربّ کے باہمی ربط کا پس منظر بھی معقول نظر آنے لگا۔ اس سے پہلے فقط اسی بات پر زور دیا جاتا رہا ہے کہ خدا وحدتِ محض ہے اور قرآن خدا کا کلام ہے۔ قرآن کے کلام الٰہی یا مخلوق الٰہی کے جھگڑے نے ایک عرصہ تک متکلمین کو لا حاصل بحث میں الجھائے رکھا تھا۔ اب توحید

کے ساتھ ساتھ رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی کو مرکز بنا کر اور خاندانِ نبوت کی قربانیوں اور شخصی عظمتوں کے بیان کے ساتھ ساتھ قربانی' شفاعت اور ائمہ کرام کی معصومیت کے اصول بیان کیے جانے لگے تھے۔ اگر شیعہ مصنفین کے علم الکلام کا مطالعہ کیا جائے' مثلاً نور اللہ شوستری کی مجالس المؤمنین (جو عوام الناس کے لیے تحریر کی گئی ہے) یا ملا صدرا کی تصانیف کا مطالعہ کیا جائے تو بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ فراخ دلی کے ساتھ اور پورے استدلال سے اپنا موقف پیش کر رہے ہیں اور اس مسلک میں تعصب کا شائبہ تک موجود نہیں ہے جبکہ عملی طور پر اس کے بالکل برعکس ثابت ہو رہا ہے۔

شیعیت کے بنیادی افکار سے ہوس اقتدار کے پجاریوں نے اکثر ناجائز فائدہ بھی اٹھایا ہے اور کبھی کبھی اپنے خوفناک مقاصد کے حصول کے لیے ان تصورات کی آڑ لی گئی ہے' حالانکہ ابتدائی عہد کے شیعہ افکار انتہائی سادہ اور مخلصانہ رہے ہیں۔ شیعیت کے سیاسی روپ میں دینی دلالتیں بھی شامل رہی ہیں۔ اس طرح شیعہ مذہبی رہنما سیاسی طور پر مستحکم پوزیشن کے حامل رہے ہیں۔

تعصب

اسی دور میں سنیوں کے خلاف تعصب کو ہوا دی گئی اور ان کے مسلمہ اکابرین کے لیے اہانت آمیز رویہ اختیار کیا گیا' حالانکہ اس سے پہلے سنی اور شیعہ اکابرین میں ذہنی ہم آہنگی پائی جاتی رہی ہے اور طعن و تشنیع سے اجتناب کیا جاتا رہا ہے۔ اپنی تازہ ہٹ دھرمی کے نتیجے میں یہ لوگ مسلمانوں کی اکثریت سے اس عہد میں کٹ کر رہ گئے تھے اور ان کے لیے حج پر جانا بھی ناممکن ہو گیا تھا۔ جلال الدین اکبر کے ابتدائی زمانہ میں جب اس کے مذہبی مشیر مخدوم الملک لاہوری سے پوچھا گیا کہ آپ اپنی دولت کے باوجود حج پر کیوں نہیں چلے جاتے تو ان کا جواب تھا (حالانکہ یہ عذرِ لنگ تھا) کہ حجاز کے سفر کے دو راستے ہیں' ایک سمندر کا ہے جس پر فرنگی (پرتگیزی) قابض ہیں اور ان کی اجازت کے بغیر یہ سفر ناممکن ہے اور دوسرا خشکی کا ہے جو ایران سے گزرتا ہے جہاں پر

روافض قابض ہیں۔ میرا ضمیر اجازت نہیں دیتا کہ ایسے مقدس سفر کے لیے ان لوگوں سے اجازت نامہ لے کر وہاں سے گزروں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ برصغیر کے سنی مسلمانوں میں ان دنوں ایرانی صفویوں کے عقائد اور اعمال سے بیزاری کا اظہار ہوتا تھا (ملاحظہ کیجیے شیخ اکرام کی ''رودِ کوثر'')۔ اسی وجہ سے نادر شاہ افشار نے حکومت سنبھالتے وقت یہ خطرہ بھانپ لیا تھا کہ اپنے سخت اور متعصّبانہ رویہ کے باعث ایران اپنے اردگرد کے مسلمان ممالک سے کٹ چکا ہے۔ ماوراء النہر کے ازبک اور عثمانی ترک ایران پر حملوں کے موقع پر ان کے سخت گیر عقائد کے باعث اکثر و بیشتر برافروختہ ہو کر اپنی افواج کو ایران کے خلاف لڑائی پر اُکساتے رہے ہیں۔

یہ امر باعث حیرت ہے کہ ان دنوں ہندوستان کی مغل سلطنت میں مذہبی رواداری اپنے پورے عروج پر تھی اور اکبر کے علاوہ تمام دیگر بادشاہ سنی العقیدہ تھے، لیکن کبھی بھی وہاں پر سرکاری سطح پر کسی کو نفرت پھیلانے کا یا اُس پر عمل کرنے کا موقع پیش نہیں آیا۔ یہی وجہ تھی کہ روشن فکر اور معتدل مزاج ایرانیوں کے لیے برصغیر کی سرزمین ایک مثالی پناہ گاہ بن چکی تھی۔ اورنگ زیب عالمگیر کو اپنے ایک اہم شیعہ اعلیٰ عہدیدار کے خلاف جب کچھ لوگوں کے دلوں میں موجود تعصب کی اطلاع ملی تو اس نے اس امر پر سختی سے نوٹس لیا تھا اور مذہبی تعصب کے خلاف وارننگ دی تھی۔

صفوی شیعیت

ڈاکٹر علی شریعتی مرحوم نے اسی وجہ سے صفوی شیعیت کو علوی شیعیت سے الگ بیان کیا ہے، کیونکہ صفوی شیعیت مخصوص غیر ایرانی ترک حکمرانوں (جو خود کو زبردستی سید کہلوانے پر مصر تھے) کی سیاسی مصلحت کے تحت اپنی بادشاہت کے استحکام اور جواز کے لیے شیعہ عقائد کے استحصال کا نام تھا، جس میں ظاہریت، علامات، مذہبی منافرت اور تعصب کو خاص مقام دیا جاتا تھا۔ جہاں شاہ کو تعظیمی سجدہ روا تھا اور جہاں غیر ایرانی علماء کے ذریعہ عوام الناس کے عقائد تبدیل کیے جاتے تھے، جہاں ہر طرح کے ظلم و ستم کو روا

رکھ کر مخصوص نظریات کی اشاعت کی جاتی تھی۔ اس کے برعکس شیعانِ علیؓ ذاتی اعتبار سے کسی بھی طرح سنی مسلمانوں سے الگ تھلگ نہیں تھے۔ ان کے عقائد و اعمال کا اشتراک انہیں سنی مسلمانوں کے ساتھ مل کر ایک عظیم مسلمان قوم کی صورت عطا کرتا تھا اور وہ باہم شیر وشکر ہو کر رہتے تھے۔ ہر دو فرقوں کے اکابرین اور علماء وفضلاء دونوں فرقوں کے عوام میں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ صفوی شیعیت کے زیراثر مسلمانوں سے عمل کا جوہر چھن گیا تھا اور فرد کی شخصی آزادی ختم ہو گئی تھی۔ شاہ کی ذات اور ایک متحدہ ایرانی قومیت کا تصور اہمیت اختیار کر گیا تھا۔ یہ صورت حال ماقبل اسلام کے زردشتی نظام سے چنداں مختلف نہیں تھی۔

صفوی شیعہ عقائد اور شاہی استبدادی سیاست کا امتزاج چند صدیوں تک ایران پر اثرانداز رہا۔ جنوبی ہند کی وہ ریاستیں جو ابتدائی مغلیہ عہد میں صفوی بادشاہ کی باج گزار تھیں، مثلاً گولکنڈہ، احمد نگر اور بیجاپور، وہاں بھی صفوی استبدادی اثرات غالب رہے۔ یہاں پر شاہ ایران کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا رہا تھا تاوقتیکہ اورنگ زیب عالمگیر کی افواج نے ان کی حیثیت ختم کر دی تھی۔ اسی طرح نصیرالدین ہمایوں کی مدد کے لیے آنے والی ایرانی افواج کی اولاد اور بعد میں آنے والے ایرانی زعماء وافراد نے صفوی عقائد پر عملدرآمد جاری رکھا۔ برصغیر میں ہرچند کہ اثناعشری شیعہ عقائد دیگر اسلامی عقائد کے مقابلہ میں بہت بعد میں آئے لیکن ان کے اثرات شدت سے محسوس کیے جانے لگے۔ آخری مغل دور میں یہ اختلافات کھل کر سامنے آ گئے۔ شیعہ اور سنی مسلمانوں کو قریب لانے کے لیے شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے عظیم کردار ادا کیا۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے بقول (ملاحظہ کیجیے ''برصغیر کی ملت اسلامیہ'') آپؒ کے صاحبزادے شاہ رفیع الدینؒ (جنہیں سب سے پہلے قرآن پاک کا اردو ترجمہ کرنے کا شرف حاصل ہوا) پر تو باقاعدہ تشیع کا الزام لگایا گیا۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے خاندان کی کوششوں کے نتیجہ میں شیعہ سنی جذبات کی تلخی کی شدت میں واضح کمی آئی اور شیعہ احباب بھی دیگر مسلمانوں میں گھل مل گئے۔ لیکن بعد کے ادوار میں یہ تلخیاں کبھی کبھی اُبھر

کر سامنے آتی رہیں۔ چونکہ مسلمانوں کو انگریزوں اور سکھوں کے ادوار میں ہندو اکثریت اور سکھ قوم کے مقابلے میں بقا کا مسئلہ بھی درپیش تھا اس لیے باہمی اختلافات قیامِ پاکستان تک دبے رہے اور اکثر و بیشتر ہمارے بزرگوں نے افہام و تفہیم اور رواداری سے کام لیا۔ کبھی بھی سنی اکابرین نے شیعہ مسلمانوں پر کفر کا فتویٰ نہیں لگایا۔ بحیثیت مجموعی شیعہ احباب کو مسلمانوں کا حصہ سمجھا جاتا رہا۔

ایران میں صفوی اور قاچاری دور کے انقراض کے بعد آہستہ آہستہ صفوی شیعیت کے اثرات ماند پڑتے چلے گئے (جس کا اجمالی جائزہ اگلے صفحات میں پیش کیا جائے گا) اور مختلف نوع کی فکری تحریکوں کے نتیجے میں اسلام کی اصل روح بیدار ہونے لگی۔ جمال الدین افغانیؒ، علامہ اقبالؒ، ڈاکٹر علی شریعتی اور ملک الشعراء بہار جیسی شخصیات کو فروغ حاصل ہوا جنہیں نہ سنی کہا جا سکتا ہے اور نہ ہی شیعہ۔ انہی شخصیات کے افکار نے اسلامی انقلاب کی راہ ہموار کی۔

اس کے مقابلہ میں برصغیر کے شیعہ احباب نے انگریزی عہد میں ایران و ہند کے مابین روابط کے انقطاع کے باعث ان تحاریک کا اثر قبول نہیں کیا اور وہ فکری خلاء میں معلق رہے۔ جب قیام پاکستان کے بعد ایران سے ثقافتی روابط قائم ہوئے تو برصغیر اور ایران کے شیعہ احباب ایک دوسرے سے مل کر حیران ہونے لگے کہ روابط کے انقطاع اور مرورِ ایام کے باعث وہ خاصی حد تک ایک دوسرے کو سمجھنے سے قاصر نظر آنے لگے۔

❀❀❀

ایران کا عہدِ قاچاریہ

فکری اور سیاسی تبدیلیوں کا دَور

نادر شاہ کے بعد ایران ایک بار پھر خانہ جنگی اور طوائف الملوکی کا شکار ہو کر رہ گیا۔ بالآخر ۱۲۱۰ھ (۱۷۹۶ء) میں قاچاریوں نے ایک مرکزی حکومت قائم کرنے میں کامیابی حاصل کر لی۔ یہ لوگ قفقازی ترک تھے اور سالور قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ شاہ اسماعیل صفوی کے باپ کے مرید تھے اور انہوں نے حصول حکومت کی جدوجہد میں صفویوں کی مدد کی تھی۔ اسی قبیلے کے ایک شخص فتح علی خان کو شاہ طہماسپ دوم نے اپنا نائب السلطنت بنا لیا تھا' جو نادر شاہ کے ہاتھوں قتل ہوا' کیونکہ نادر کا خیال تھا کہ شاہ طہماسپ فتح علی کے زیر اثر ہے۔ فتح علی خان کے دو بیٹے تھے' محمد حسین خان اور محمد حسن خان۔ محمد حسن خان نے نادر شاہ سے ڈر کر مشرقی ترکوں کے ہاں پناہ لے لی تھی۔ ان دنوں مازندران (طبرستان) کا حاکم نادر شاہ کا بھتیجا عادل شاہ تھا (جو بعد میں اس کا جانشین بنا)۔ عادل شاہ نے محمد حسن خان کے دونوں بیٹوں کو اپنے ہاں بلوا لیا۔ محمد خان کو اس نے قوت مردانگی سے محروم کروا دیا جس پر وہ ''آغا'' کے لقب سے مشہور ہوا' کیونکہ شاہی حرم کے خواجہ سرا کو آغا کہا جاتا تھا۔ اسی آغا محمد خان نے قاچاری حکومت کی بنیاد رکھی۔

آغا محمد خان قاچار

آغا محمد خان نے خاندان زند کے دارالحکومت کرمان پر یلغار کر کے وہاں پر مقامی آبادی کا بڑے پیمانے پر قتل عام کرنے کے بعد انسانی سروں کا مینار تعمیر کیا۔ پھر اس نے اصفہان' کردستان' عراقِ عجم اور آذربائیجان کو فتح کر لیا۔ بعد میں اس نے تحریص و تدبیر کے حربوں سے کام لیتے ہوئے افشار قبیلے کے سردار علی خان افشار والی آذربائیجان کو اپنے ہاں بلوایا اور اس کی آنکھوں میں سلائیاں پھروا دیں۔ پھر اپنے بھائیوں کو قتل کرنے

یا ملک سے بھگانے میں کامیاب ہونے کے بعد جارجیا (گرجستان) پر ہلہ بول دیا۔ جارجیا ان دنوں ایران کا صوبہ تھا' جس کے حکمران ہراکلیوس دوازدہم نے ایران کی داخلی کمزوری کا فائدہ اٹھا کر رازداری اور خاموشی سے زار روس سے دوستی کا معاہدہ کر لیا تھا۔ محمد خان نے ۱۲۰۹ھ (۱۷۹۵ھ) میں ساٹھ ہزار کی فوج کے ساتھ تفلیس (تبلیسی) پر حملہ کر دیا' اور شہر میں داخل ہو کر اہل شہر کو قتل کروا دیا' کلیساؤں کو نیست و نابود کیا اور پادریوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ سولہ ہزار افراد کو قیدی بنایا۔ پھر گنجہ کی جانب پیش قدمی کی اور اس پر بھی قبضہ کر لیا۔

اب اس نے شاہ اسماعیل صفوی کے مزار سے لائی ہوئی تلوار زیب کمر کی اور تاج شاہی سر پر رکھا۔ خود کو صفویوں کا سیاسی جانشین اور شیعہ مذہب کا حامی اور سرپرست قرار دیا' اور اعلان کیا کہ امام غائب کے ظاہر ہوتے ہی وہ حکومت ان کے سپرد کر دے گا' کیونکہ یہ بادشاہت اس کے پاس امام دوازدہم کی ایک مقدس امانت ہے۔ جلد ہی اس نے خراسان پر قبضہ کر کے نادر شاہ کے خاندان کے آخری فرد شاہ رُخ کو گرفتار کر لیا۔ اس وقت شاہ رخ کی عمر ساٹھ برس تھی۔ اس کے سر پر پگھلا ہوا سیسہ ڈالا اور اورنگ زیب کا مشہور ہیرا چھین کر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ آخر کار یہ ظالم بادشاہ خود اپنے ہی محافظوں کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔

فتح علی شاہ

آغا محمد خان قاچار کا بھتیجا فتح علی شاہ قاچار ۱۲۱۱ھ (۱۷۹۷ء) میں بادشاہ بنا۔ اس کا زمانہ بغاوتوں اور شورشوں کا تھا۔ اس کے زمانے میں روسیوں نے ایران سے جارجیا چھین لیا۔ اس نے انگریزی سفیر کپتان میلکم کے توسط سے ۱۸۰۰ء میں سلطنت برطانیہ سے ایک معاہدہ کیا' جس کے تحت افغانوں پر دباؤ' فرانسیسیوں سے تجارتی مراعات کی واپسی اور انگریزوں کے لیے ایران کی بندرگاہوں کا آزادانہ استعمال شامل تھا۔ اس کے ساتھ ہی انگریزوں کو ایران میں برآمدات کی آزادانہ اجازت دے دی گئی تھی۔ اس دوران نپولین نے بھی برطانوی ہند کے اقتدارِ اعلیٰ کو چیلنج کرنے کے لیے ایرانیوں سے

تعلقات بڑھانے کی کوشش کی جس کا مثبت جواب نہ ملا۔ ۱۸۰۳ء میں روس نے ایران سے طویل جنگ چھیڑ دی جو دس برس تک جاری رہی۔ ۱۸۰۵ء میں نپولین بھی روس سے نبرد آزما ہو گیا۔ بالآخر ۱۸۰۷ء میں فتح علی قاچار نے نپولین سے اس کی روس سے دشمنی کے مدِ نظر ایک اہم دفاعی معاہدہ کر لیا' جس میں انگریزوں کے خلاف ممکنہ مہم جوئی کے دوران ہندوستان پر حملہ کے موقع پر تعاون کا وعدہ بھی شامل تھا۔

اب فرانس کے ساتھ دفاعی معاہدے کے ردِ عمل کے نتیجے میں انگریز بھی ایران میں متحرک ہو گئے اور انہوں نے ۱۸۰۸ء میں سر بار فورڈ جونز کو ایران بھجوایا۔ اس دوران فتح علی شاہ بھی نپولین کے رویہ سے مایوس ہونے لگا تھا۔ حکومت برطانیہ نے ایران سے ایک لاکھ بیس ہزار پاؤنڈ سالانہ کی امداد کا وعدہ کیا۔ بعد ازاں ۱۸۱۱ء میں سر گور واسلے تہران میں برطانیہ کا سفیر مقرر ہوا۔

ایران اور روس کی طویل جنگ بالکل آخری معرکہ پر ۱۲۲۸ھ (۱۸۱۲ء) میں ختم ہوئی اور اس کے نتیجے میں ایران کے بہت سے علاقوں پر روس قابض ہو گیا۔ پھر قراباغ کے ضلع گلستان میں روس کے ساتھ بدنام زمانہ ''معاہدہ گلستان'' پر دستخط ہوئے' جس کے تحت ایران دربند' باکو' شروان' شوش' قراباغ اور طائش سے دستبردار ہو گیا۔ اسی طرح گرجستان (جارجیا)' داغستان' منگریلیا' ایمرشیا اور ابخازیہ کے علاقے روس کو تفویض ہو گئے اور ایران کا ان خطوں پر کوئی حق باقی نہ رہا۔ جب تمام متنازعہ علاقے روس کو مل گئے تو مسئلہ خود بخود ختم ہو گیا' مگر اس شرمناک شکست کے باعث ایران میں ہر طرف مایوسی کا دَور دَورہ شروع ہو گیا۔ داخلی شورشوں اور عوام کے اُکسانے پر فتح علی پھر روس پر حملہ آور ہوا تا کہ مسلمانان قفقاز کی مدد کر سکے' لیکن روسی بڑھتے ہوئے تبریز پر قابض ہو گئے۔ ۱۲۴۴ھ (۱۸۲۸ء) میں روس سے مصالحت کے لیے ''ترکمن چائی'' کا معاہدہ ہوا' جس کے تحت ایروان' نخجوان اور نواحی سرسبز و شاداب علاقے روسیوں کو مل گئے اور ایران اہم خطوں سے محروم ہو گیا۔

فتح علی قاچار کی چار سو بیگمات اور دو سو ساٹھ بچے تھے اور وہ رعایا کے ساتھ غلاموں

جیسا سلوک روا رکھتا تھا۔ ہر طرف بے چینی اور پریشانی کا دور دورہ تھا اور ملک شکست و ریخت سے دوچار ہو رہا تھا۔ اسی بے چینی نے بعد میں قومی اصلاحی تحاریک کو جنم دیا جو ناصرالدین کے زمانے میں پروان چڑھیں۔

اسی زمانہ میں شیخ محمد بن عبدالوہاب نے نجد سے امام ابن تیمیہؒ کی تعلیمات کی روشنی میں اپنی سخت گیر اصلاحی تحریک کا آغاز کیا۔ شیخ نے اپنی تعلیم ایران کے اہم ثقافتی اور تاریخی مرکز اصفہان اور بصرہ سے مکمل کی تھی۔ وہ نجد کے صدر مقام درعیہ کے قبائلی سردار ابن سعود اور اس کے بیٹے عبدالعزیز کی مدد سے ۱۲۱۶ھ (۱۸۰۱ء) میں کربلا پر حملہ آور ہو گیا اور وہاں پر اس کے لشکر نے بڑی بے دردی سے پانچ ہزار مرد و زن کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ایرانی مؤرخوں کے مطابق انہوں نے امام حسینؓ کے روضہ کی ضریح توڑ دی اور مزار کی نفیس اشیاء' گراں بہا جواہرات' سونے اور چاندی کی قندیلیں اور سونے کی اینٹیں لوٹ لیں۔ فتح علی شاہ قاچار نے والئ بغداد سلیمان پاشا کو تلقین کی کہ وہ شیخ کے خلاف ضروری اقدامات کرے۔ تھوڑی مدت کے بعد سلیمان پاشا فوت ہو گیا اور مزید کارروائی ممکن نہ رہی تو عبدالعزیز کے اثر و نفوذ میں اضافہ ہو گیا اور ۱۲۲۶ھ (۱۸۱۱ء) تک نجد کے آس پاس کے اہم علاقے اس کے تسلط میں آ گئے۔ اب اس نے مسقط پر فوج کشی کا ارادہ کیا۔ سلطانِ مسقط نے وہابیوں کے خلاف ایرانیوں سے مدد مانگی۔ ایرانی لشکر وہاں پہنچا' پھر وہاں سے چل کر درعیہ (نجد) کی طرف کوچ کیا' جہاں محمد علی پاشا والئ مصر کے ساتھ مل کر عبدالعزیز اور محمد بن عبدالوہاب کے مشترکہ لشکر کا مقابلہ کر کے انہیں شکست فاش سے دوچار کیا۔ محمد علی پاشا عثمانی اقتدار کے تحفظ کے لیے شیخ کی سرکوبی کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ فوجی شکست کے بعد اس تحریک کے اثرات باقی رہے اور اس کا نتیجہ ایک صدی کے بعد سعودی عرب کے قیام کی صورت میں نکلا۔

محمد شاہ قاچار

فتح علی شاہ کے بعد اس کا پوتا محمد شاہ پسر عباس مرزا ۱۲۵۰ھ (۱۸۳۴ء) میں ایران کا بادشاہ بنا۔ اسے حصول حکومت میں انگریزوں اور روسیوں کی حمایت حاصل تھی۔ اس

نے مشہور ماہر سیاست اور مشہور نثر نگار قائم مقام وزیر اعظم کو مروا دیا۔ حکومت کے حصول کے بعد اس نے انگریزوں سے بے اعتنائی برتی اور ۱۸۳۸ء میں انگریزوں نے ایران میں اپنا سفارت خانہ بند کر دیا۔ ایرانیوں نے افغانستان سے ہرات کا تاریخی شہر واپس لینے کے لیے اس کا ناکام محاصرہ کیا اور پھر انگریزوں کے خلیج فارس میں بڑھتے ہوئے دباؤ کے تحت وہاں سے محاصرہ اٹھا لیا۔ پھر خراسان میں بغاوت ہوئی۔ محمد شاہ کے زمانے کے کچھ واقعات بہت اہم ہیں جو بعد میں ایران میں فکری انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوئے۔ اس کے وزیر اعظم حاج مرزا آقاسی کی سخت گیری اور ظالمانہ مالیاتی نظام کے سبب عوام میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی۔ شخصی آزادیوں کے حصول کے لیے محبّ وطن اور آزادی کے متوالے ملوکیت کے خلاف آواز اٹھانے لگے۔ اس نے اس تحریک کو کچلنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی اور آزادی کے متوالوں کو چن چن کر مروایا۔ اس طرح انہیں انقلاب کی راہ دکھلائی۔ اسی تحریک کا تسلسل ڈیڑھ صدی کے بعد بادشاہ کے خاتمے کا باعث بنا۔

محمد شاہ قاچار نے ۱۲۶۴ھ (۱۸۴۸ء) تک حکومت کی۔ اس کے عہد میں اسماعیلیوں کی سرکوبی کی بھی کوشش کی گئی۔ اسماعیلی امام کی ایران میں موجودگی اور اثر و رسوخ بادشاہت کے لیے خطرے کا باعث بن رہا تھا۔ اسماعیلیوں کے امام خلیل اللہ کے صاحبزادے آغا خان محلاتی نے حاجی مرزا آقاسی (وزیر اعظم) کے معاندانہ رویے کے پیش نظر علم بغاوت بلند کیا اور کرمان کے دو ہزار سال پرانے قلعہ بام کو فتح کر لیا۔ جلد ہی حاکم کرمان فیروز مرزا نے فوج کشی کی اور اسماعیلیوں سے یہ قلعہ واپس لے لیا۔ بالآخر آغا خان مایوسی کے عالم میں ۱۲۵۵ھ (۱۸۳۹ء) میں ایران کو خیر باد کہہ کر ہندوستان میں بمبئی کے شہر میں قیام پذیر ہو گئے۔ پرنس کریم آغا خان انہی کی اولاد سے ہیں۔

اسی دوران ۱۲۶۰ھ (۱۸۴۴ء) میں حاکمِ بغداد نجیب پاشا (جو عثمانیوں کا نمائندہ تھا) نے کربلا میں اہل تشیع کا قتل عام شروع کر دیا۔ اس واقعہ پر حکومت ایران نے عثمانیوں سے سخت احتجاج کیا۔ انگریز اور روسی مصالحت کے لیے آگے بڑھے اور بالآخر

ایک معاہدہ طے پایا جس کے تحت عثمانیوں نے مجمرہ شہر (موجودہ بوشہر) اور بندرگاہ، جزیرۃ الخضر اور شط العرب کے مشرقی ساحل کو واگزار کر کے ایران کے حوالے کر دیا اور حکومت ایران کردستان میں سلیمانیہ کے علاقوں سے دستبردار ہو گئی۔ ایران کو خلیج فارس کے راستے جہاز رانی میں کامل آزادی نصیب ہوئی، ایران کے بلجیم، سپین اور برطانیہ سے تجارتی معاہدے طے پائے اور یورپی ممالک سے دوستانہ تعلقات استوار ہوئے۔

اسی دوران شیراز کے باشندے علی محمد باب نے ایک نیا مذہب پیش کیا اور دعویٰ کیا کہ وہ امام وقت کا نمائندہ اور مبشر ہے۔ اس کی چرب زبانی سے متاثر ہو کر مایوس ایرانی باشندوں نے اس کی طرف توجہ دی۔ اس طرح اس کے حلقۂ اثر میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس کے پیروکار بابی کہلائے جس میں طاہرہ قرۃ العین اور بہاء اللہ (بہائی مذہب کے بانی) قابل ذکر ہیں۔

ناصر الدین شاہ قاچار

اس نے ۱۲۶۴ھ (۱۸۴۸ء) سے ۱۳۱۴ھ (۱۸۹۶ء) تک پورے طمطراق سے نصف صدی تک ایران پر حکومت کی۔ اس کے عہد میں ایران میں تیزی سے سیاسی اور سماجی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اس نے محلاتی سازشوں اور داخلی یورشوں کا قلع قمع کر کے حکومت کو مستحکم کیا۔ مرزا تقی امیر نظام جیسے وزیر باتدبیر نے اس زمانہ میں اصلاحات کا نفاذ کیا اور مرکزی طاقت میں اضافہ کر کے امراء اور مجتہدین کی طاقت کو کم کیا، لیکن حاسدین کی کوششوں سے یہ وزیر قید ہوا اور ۱۲۶۸ھ (۱۸۵۱ء) میں قتل کروا دیا گیا۔

اسی دوران خوارزم (جو ایران کا حصہ تھا) کے حکمران نے خودمختاری کا اعلان کر دیا اور محمد امین خان، شاہِ خوارزم مرو پر لشکر کشی کرنے کے بعد سرخس پر حملہ آور ہوا۔ بالآخر قید ہوا اور ۱۲۷۱ھ (۱۸۵۴ء) میں قتل کروا دیا گیا۔ اسی دوران روسیوں نے ایران پر ایک بار پھر ہلہ بول دیا۔ روسی فوجوں نے ایرانیوں کو شکست سے دوچار کر کے خوقند اور بخارا کو فتح کرنے کے بعد بحیرۂ یورال تک چڑھائی کر دی اور پھر خوارزم پر قابض ہو گئے۔ ایرانی

جب تاریخی شہر ہرات کی جانب بڑھے تو انگریزوں نے ایک بار پھر ایرانی سواحل خصوصاً خرم شہر کی بندرگاہ پر حملہ کر دیا اور پھر ایک معاہدہ کے تحت ۱۲۷۳ھ (۱۸۵۷ء) میں آخر کار انگریزوں کے دباؤ کے تحت ایران ہمیشہ کے لیے ہرات پر اپنے دعویٰ سے دستبردار ہو گیا۔ اسی دوران بلوچستان کی مستقل حد بندی ہوئی اور ایران اور برطانوی ہند میں ۱۸۶۴ء میں یہ علاقہ تقسیم کر دیا گیا۔ اسی طرح سیستان کا علاقہ بھی ایران اور افغانستان میں تقسیم ہو گیا۔ پھر ایران اور ترکیہ کی حد بندی بھی مکمل ہوئی۔ اس کے عہد میں ٹیلی گراف کا مربوط نظام قائم ہوا۔ پھر ایک انگریز رائٹر کو ۱۸۷۲ء میں ریل چلانے' کان کنی اور بینک کا ٹھیکہ دیا گیا' مگر امراء کی مخالفت کے باعث یہ ٹھیکہ منسوخ کرنا پڑا۔ بحیرہ کارون میں انگریزوں کو جہاز رانی کا ٹھیکہ ملا' مٹی کے تیل کی وسیع پیمانے پر دریافت ہوئی' اہواز سے اصفہان تک پختہ سڑک تعمیر کی گئی۔ امپیریل بینک آف پرشیا اور روسی بینک قائم ہوئے۔

اب ہم قاچاری عہد میں علماء کرام کی سرگرمیوں اور اصلاحی تحریکوں کا جائزہ لیں گے' جن کے نتیجہ میں ایران میں بیداری کی لہر اٹھی اور ایران ازمنۂ تاریک سے نکل کر شعور اور بیداری کے دور میں داخل ہو گیا۔ مشہور یورپی نومسلم علامہ محمد اسد نے قاچاری دور کے عہد میں ایران کا اٹھارہ ماہ کا دَورہ کیا۔ موصوف ایرانی قوم کی تین ہزار سالہ عقل و دانش اور تہذیبی ورثے سے متأثر ہوئے اور ان کے قبولِ اسلام میں ایران کا سفر بہت زیادہ اہمیت کا حامل تھا۔

بابی مذہب اور بہائی عقائد

اس مذہب کا بانی علی محمد باب تھا۔ ۱۸۲۰ء میں شیراز میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ عطار تھا مگر اس نے علی محمد کو کربلا میں مذہبی تعلیم کے حصول کے لیے بھجوایا۔ ۲۴ برس کی عمر میں اس نے ایرانی عوام میں پیدا ہونے والی بے چینی اور بے اطمینانی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے باب (یعنی امام غائب کا دروازہ) ہونے کا اعلان کیا۔ اسی برس اس نے حج کیا اور پھر واپسی پر بوشہر میں عوام کے سامنے اپنا خود ساختہ مذہب پیش کیا۔ وہاں سے کچھ ابتدائی کامیابی حاصل کر کے وہ اپنے شہر شیراز واپس لوٹ آیا۔ پھر وہاں کے لوگوں کی سخت

مخالفت کے باعث اصفہان آ گیا۔حکومتِ وقت نے اسے قید کر کے شمالی علاقے کے شہر ماکو میں نظر بند کر دیا۔آخر کار علماء کے فتوے کی رو سے تبریز میں ۱۸۵۰ء میں مروادیا گیا۔

باب کے عقائد کی رو سے خدا ایک ہے اور باب خدا کا آئینہ ہے۔اس نے اسلامی شریعت کی تنسیخ کا اعلان کرتے ہوئے اپنی شریعت کے آغاز کا اعلان کیا اور کہا کہ میرے پیروکاروں کو اب مسلمان نہ کہا جائے۔دن میں ایک نماز اور سال میں انیس روزے قرار دیے۔آزادیٔ نسواں کو نئے مذہب کا اہم رکن قرار دیا اور شخصی آزادی کا تصور پیش کیا۔جبر واستبداد سے پسے ہوئے عوام جو کہ امام کے ظہور کے منتظر تھے‘اس سے متأثر ہونے لگے اور اس کی تحریک دور دور تک پھیلنے لگ گئی۔۱۸۵۰ء میں اس کے حامیوں نے یزد شہر پر قابض ہونا چاہا مگر ناکام رہے‘ پھر کرمان کا رخ کیا‘ پھر وزیراعظم امیر نظام کو قتل کرنے کا ارادہ کیا جس کا راز افشاء ہو گیا اور کئی بابی تختہ دار کی زینت بنے۔قزوین کے نواحی قصبہ زنجان کے ملاّ نے بابی مذہب اختیار کر لیا۔بابی آہستہ آہستہ دہشت گردی کی زیرزمین سرگرمیوں میں ملوث ہونے لگے۔۱۸۵۲ء میں ایک بابی نے بادشاہ ناصرالدین پر بندوق سے حملہ کیا مگر نشانہ چوک گیا اور ممکنہ قاتل دھر لیا گیا۔پھر بابیوں کی پکڑ دھکڑ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

اس تحریک میں ایک مشہور شاعرہ طاہرہ قرۃ العین کا کردار طلسماتی حد تک اہم ہے۔اس کا نام نقطہ زرین تاج تھا اور اسے باب نے طاہرہ کا لقب دیا۔یہ شاعرہ حسن و جمال‘ علم و فہم‘ دانش و تدبر اور شعر و سخن کا پیکر تھی۔طاہرہ قزوین کے مشہور عالم دین حاجی ملا صالح کی بیٹی تھی۔وہ اپنے چچا ملا محمد (جو اصفہان کے مشہور عالم دین تھے) کے بیٹے سے بیاہی گئی تھی۔ملا محمد مجتہد تھا۔طاہرہ نے حدیث‘ تفسیر‘ اصولِ فقہ کے علاوہ فلسفہ اور الٰہیات کی تعلیم پائی تھی۔طاہرہ معاشرے پر روا رکھی جانے والی بے جا پابندیوں کے خلاف اُٹھ کھڑی ہوئی اور آزادیٔ نسواں کا تصور پیش کیا۔سب سے پہلے اپنے گھرانے کے افراد سے اُلجھی اور خفیہ طور پر باب کو خط لکھ کر اپنے باغیانہ افکار کا اظہار کیا۔باب کے خط میں اپنے سوالات کا جواب پا کر وہ اس کی پیروکار بن گئی۔اپنے سسرال سے ناطہ

توڑ کر وہ کربلا چلی گئی۔ کچھ عرصہ بغداد میں بھی مقیم رہی اور وہاں پر علماء سے مناظرے کیے۔ وہاں کے عثمانی ترک گورنر نے اسے زبردستی واپس ایران بھجوادیا اور واپسی پر اپنے میکے میں ٹھہر گئی۔ جمعہ کے خطبہ کے موقع پر اس کا چچا مجتہد ملا محمد اپنی تقریر کے دوران ایک بابی کے ہاتھوں قتل ہو گیا جس کی محرک خود طاہرہ تھی۔ پھر جب اہل شہر نے اس خاتون کے خلاف شور و غوغا بلند کیا تو وہ چپکے سے تہران آ گئی۔ یہاں سے طاہرہ بغداد چلی گئی اور پھر تہران آئی۔ وہاں سے سرکردہ بابیوں کی کانفرنس میں بیدشت کے مقام پر شریک ہوئی۔ وہاں پر اس نے اپنا حجاب اتارا اور مشہور تقریر کی۔ اس کے بعد وہ گرفتار ہوئی۔ بادشاہ کے چھوڑنے کے باوجود وہ ۱۲۶۴ھ (اگست ۱۸۵۲ء) میں علماء کے ایک فتوے کی رو سے قتل کروا کے تہران میں ایک اندھے کنویں میں پھنکوادی گئی۔

اس کی زندگی کے حالات مشہور بابی مؤلفہ مارتھا روٹ (جو امریکی خاتون تھی) نے ''طاہرہ'' نامی انگریزی کتاب میں قلمبند کیے ہیں۔ یہ خاتون انیسویں صدی کے آخر میں قزوین آئی تھی اور وہاں سے طاہرہ کے احوال زندگی اور غزلیات جمع کر کے ہندوستان آئی جہاں اس کی ملاقات بلبل ہند سروجنی نائیڈو سے ہوئی اور سروجنی نائیڈو نے اس سے علامہ اقبال کے لیے طاہرہ کی کچھ فارسی غزلیات نقل کیں۔ علامہ اقبال نے ان غزلیات کے مطالعے کے بعد ''جاوید نامہ'' میں اس کا ذکر اُن بے چین روحوں میں کیا ہے جو جنت تک تو نہ پہنچ پائیں مگر حیات جاوید پا گئیں۔ اور اس کی غزل نقل کی جس کا مطلع درج ذیل ہے:

گر بتو افتدم نظر چہرہ بہ چہرہ روبرو

شرح دہم غم ترا نکتہ بہ نکتہ مو بہ مو

باب کی وفات کے بعد مرزا یحییٰ صبح ازل اس کا جانشین بنا جس کے بڑے بھائی مرزا حسین نے بہاء اللہ کے لقب سے بہائی مذہب کا آغاز کیا اور خود امام زمانہ ہونے کا دعویٰ کیا۔ یہ لوگ حکومت ایران کی سختیوں کے باعث بغداد اور کردستان ہوتے ہوئے استنبول چلے گئے اور وہاں سے نوپل کے مقام پر گوشہ نشین ہو گئے۔ یہیں پر بہاء اللہ سے

ملاقات کرنے کے لیے مشہور انگریز خاور شناس (orientalist) محقق ڈاکٹر جی ای براؤن آیا اور بہاء اللہ سے اپنی تاریخی ملاقات کا حال لکھا۔ بہاء اللہ کے بیٹے عبد البہاء نے وہاں سے ارضِ فلسطین کا رُخ کیا اور انگریزوں کے وہاں پر قابض ہونے کی راہ ہموار کی۔ (ناچیز کے سلسلہ ہائے مضامین میں' جو صراط مستقیم برمنگھم کے ۱۹۸۶ء اور ۱۹۸۷ء کے شماروں میں قسط وار چھپے ہیں' بابی اور بہائی مذہب پر سیر حاصل مواد موجود ہے۔)

قاچاری عہد اور شیعہ علماء

قاچاری عہد میں دینی علماء کو گراں قدر جاگیریں عطا ہوئیں اور یہ لوگ بھی شاہی نوازشات کے نتیجہ میں ایران کے جاگیردارانہ طبقہ میں شامل ہو گئے۔ پھر ان کی سرکاری سرپرستی میں درجہ بندی ہوئی۔ طالب علم ''طلاب'' کہلائے۔ فارغ التحصیل ہونے والے علماء کچھ عرصہ کے بعد ''ثقۃ الاسلام'' کہلائے اور سینئر علماء ''حجت الاسلام'' کے لقب سے ملقب ہوئے۔ ان سے بلند پایہ لوگ ''آیت اللہ مجتہد'' کہلوائے اور پھر قُم کے مذہبی حلقے سے ایک عہد میں دس ''آیت اللہ العظمٰی'' منتخب ہوتے تھے' جو مرجع تقلید کہلانے لگے۔ اس طرح عوام سے لے کر آیت اللہ العظمٰی تک ایک منظّم اور مربوط مذہبی نظام کا ادارہ قائم ہو گیا' جس کا تنظیمی نظم وضبط عیسائیت کے کلیسائی نظام کی طرح بے نظیر معلوم ہوتا ہے۔ ایران کے وہ علاقے جو شیعہ آبادی پر مشتمل تھے اور روس کے قبضہ میں چلے گئے تھے (مثلاً آذربائیجان) وہاں بھی یہ نظام ابھی تک رائج ہے۔ اسی طرح عراق عرب جو بعد کے اَدوار میں سلطنت عثمانی کا حصہ بن گیا' وہاں کے شیعہ حلقہ میں بھی یہی نظام باقی رہ گیا۔

فتح علی شاہ قاچار کے دور میں علماء کا اقتدار اور اثر ورسوخ بڑھتا چلا گیا۔ امیر نظام کے بعد مرزا آقا خاں وزیر مقرر ہوا تو اس نے علماء و مجتہدین سے انتہائی قریبی تعلقات استوار کر لیے۔ اسی دوران بادشاہ ناصر الدین بار بار یورپ کے سفر پر آتا جاتا رہا اور وہاں سے واپس آ کر اپنے ملک میں اصلاحات نافذ کرنے کے درپے ہوا۔ اس نے اپنے دَوروں کے اخراجات سے ملک کو مالی طور پر سخت زیرِ بارِ قرض کر دیا۔ یورپ کے

دوروں کے باعث علماء بھی شاہ سے بددل ہونے لگے۔ حسین خان وزیراعظم کے خلاف بھی ایرانی علماء اٹھ کھڑے ہوئے اور اس پر الزام عائد کیا گیا کہ وہ کافروں کا تمدن ملک میں رائج کرنا چاہتا ہے، کیونکہ وہ شاہ کے غیر ملکی دوروں کا انتظام کرتا ہے۔ بالآخر حسین خان کو وزارت سے علیحدہ کر کے اسے آذربائیجان کی حکومت سونپ دی گئی۔

اس دوران عوام میں بیداری کی لہر دوڑی تو علماء نے پینترا بدلتے ہوئے بہائیت کی سرکوبی کے نام پر عوام کا ساتھ دینے کی بجائے شاہ کا ساتھ دیا اور جس کسی شخص کو کیفر کردار تک پہنچانا مقصود ہوتا اسے بہائی کہہ کر قابل گردن زدنی قرار دے دیا جاتا۔ تہران کے خطیب (امام جمعہ) کا نکاح بادشاہ کی ایک بیٹی سے ہوا تھا۔ ایک مشہور عالم دین مرزا آقا خان کرمانی جنہیں جلاوطنی کی زندگی گزارنا پڑی، وہ لکھتے ہیں کہ اس دور کے ملاّ کے لیے کسی بھی بے گناہ شخص کا خون بہانا ایک معمولی سی بات تھی۔ کوڑے مارنا، سنگسار کروانا اور گردن اڑا دینا قانونی قرار دے دیے گئے تھے۔ اسی طرح ایک منحرف عالم دین شیخ زنجانی کے بقول ملاّ لوگ بہائی اور کافر کی اصطلاحات وسیع پیمانے پر استعمال کرتے تھے اور ایسے بے سروپا الزامات لگا کر وہ تاجروں، دکان داروں اور کسانوں کو ختم کروا کر ان کی دولت پر قابض ہو جاتے تھے۔ اس طرح دینی مدرسوں کے طلبہ اور علماء کا کردار پولیس کے سپاہیوں سے بھی بدتر ہو چکا تھا۔ ۱۸۸۴ء میں جب آزادیٔ رائے اور آزاد پریس کا ملک میں مطالبہ ہوا تو حاج ملا علی نے تہران سے وزیراعظم کو ایک خط میں خبردار کیا کہ آزادیٔ رائے صرف ظاہری طور پر ہی خوبصورت دکھائی دیتی ہے، مگر درحقیقت اس کی اپنی قباحتیں ہیں، یہ بالآخر شاہ، مذہبی علماء اور عمائدین سلطنت کی کردار کشی کے لیے استعمال ہوگی، یہ بات بادشاہت کے مفادات کے منافی ہے کہ ہر کسی کو اپنی مرضی کی بات کہنے کا حق دے دیا جائے۔ (بحوالہ ہما ناطق، روحانیت و آزادی ہائے دیموکراتیک، ۶ مارچ ۱۹۸۲ء) یہ علماء کے مکمل اور مسلسل تعاون کا نتیجہ تھا کہ ایران میں ۱۹۲۴ء تک قاچاری عہد قائم رہ سکا۔

بقول ڈاکٹر علی شریعتی کے یہ تمام استبدادی اور ظالمانہ حربے صفوی شیعیت کی

باقیات کی نشانیاں تھیں جو حکومتوں نے اپنے تحفظ کے لیے ایک جالے کی طرح عوام کے اردگرد سیاہ شیعیت کی صورت میں بُن رکھا تھا۔ اپنے انتہائی آغاز کے دور سے صفوی شیعیت نے شیعہ مذہب کے سب سے اہم اصول یعنی رواداری کے برعکس سنی عوام پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ آپ کے بقول اصلی شیعیت جو حضرت علیؑ کی میراث ہے وہ آزادی اور انقلاب کا راستہ دکھاتی ہے اور صفوی ظلم و استبداد کے باوجود اس کا وجود برقرار رہا ہے۔

ہر چند کہ علماء کو عمومی طور پر عوام میں ایک اہم مقام حاصل رہا مگر آہستہ آہستہ بیدار ذہنوں نے اور متبادل راستے بھی اپنانا شروع کر دیے۔ پھر ایک موقع آیا جب وہ روایتی علماء کی اندھی پیروی سے ہٹ کر ایک روشن فکر مفکر سید جمال الدین افغانی رحمۃ اللہ علیہ (جنہیں ایران میں جمال الدین اسد آبادی کہا جاتا ہے) کی قیادت میں متحرک ہو گئے اور اسی طرح اسلامی افکار کی وضاحت کے لیے آنے والے وقتوں میں انہوں نے علامہ اقبال (جنہیں وہ مولانا محمد اقبال لاہوری کہتے ہیں) اور ڈاکٹر علی شریعتی کا اثر قبول کیا۔

سُنّی علماء کے بارے میں سید جمال الدین رحمۃ اللہ علیہ کا خیال تھا کہ وہ معاشی اور سیاسی طور پر آزاد نہیں ہیں اور معاشی اعتبار سے اولوالامر (یعنی حکومت وقت) کے محتاج ہیں، اس لیے وہ سنی دنیا میں علماء سے ملنے کی بجائے اپنا پیغام پہنچانے کے لیے براہ راست عوام کے پاس جاتے — مگر شیعہ دنیا میں انہیں معلوم تھا کہ علماء کسی حد تک خودمختار ہیں اور وہ براہ راست عوامی فنڈ یا دیگر ذرائع سے کسب معاش کرتے ہیں، اس لیے براہِ راست ان سے رابطہ کیا جائے۔ شیعہ دنیا کے باضمیر علماء نے وقت آنے پر ان کا ساتھ بھی دیا اور ان کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے بے مثال قربانیاں دیں۔

سید جمال الدین افغانیؒ

سید جمال الدین اسد آبادی انتہائی صاحب بصیرت اور بیدار مغز انسان تھے۔ آپ دنیائے اسلام کا دورہ کرتے ہوئے ترکی چلے گئے جہاں آپ نے فرسودہ اور قدیم روایات سے ہٹ کر قرآن پاک کی بیباک انداز میں تشریح کرنا شروع کر دی، مگر اسی

روشن فکری کی پاداش میں ۱۸۷۳ء میں شیخ الاسلام فہمی کے حکم سے ملک بدر کر دیے گئے۔ اس سے قبل آپ نے حال ہی میں معرض وجود میں آنے والی استنبول یونیورسٹی میں مذہب اور سائنس کے عنوان سے لیکچر دیے تھے۔ شیخ الاسلام نے ان خطبوں کو خلافِ اسلام وپیغمبر اسلام قرار دیتے ہوئے آپ کی ملک بدری کا مطالبہ کیا تھا۔ آپ وہاں سے مجبوراً لندن چلے گئے اور پھر جامعۃ الازھر کے شیخ محمد عبدہ کے ہمراہ ۱۸۸۳ء میں پیرس میں مقیم ہو گئے، جہاں سے "عُرْوَۃُ الوُثقٰی" کے نام سے ایک مجلّے کا آغاز کیا جو اپنی انقلابی تحریروں کے باعث بیشتر اسلامی ممالک میں ممنوع قرار دے دیا گیا تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب سنی دنیا میں خلیفہ (سلطان عثمانی) کو اُولوالامر کا درجہ دے کر اس کی اطاعت کو لازمی قرار دیا جاتا تھا، مگر سید جمال الدین نے کہا کہ اسلام افراد کو سیاست وحکومت میں مطیع نہیں بلکہ شریک بناتا ہے۔ آپ کے نزدیک سیاست اور مذہب کا امتزاج وقت کا تقاضا تھا۔ آپ نے اسلام کو ایک ایسی طاقت قرار دیا جو اندرونی جبر واستبداد اور بیرونی سامراجیت سے تحفظ فراہم کرتی ہے۔ آپ کے بقول اسلام ایک جدید سائنسی مذہب ہے جو تحرک، سعی وعمل، وفاداری اور عزم وہمت سے عبارت ہے۔ یہ تعمیر وترقی کا مذہب ہے اور بددیانتی کا قلع قمع کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ خدا ان کی حالت نہیں بدلتا جو خود بدلنا نہ چاہتے ہوں۔ آپ کی تعلیم یہ تھی کہ اسلام سب مسلمانوں کے لیے ہے اور وہ اپنے اپنے حالات کے مطابق اس پر عمل پیرا ہوں۔

پہلی بار آپ ترکی میں ایرانی فرماں روا ناصرالدین قاچار سے ملے۔ شاہ نے آپ کو ایران آنے کی دعوت دی، لیکن جونہی اسے آپ کے انقلابی جذبات کا احساس ہوا تو اس نے ۱۸۸۶ء میں آپ کی ملک بدری کا حکم دے دیا۔ پھر میونخ میں آپ سے شاہ کی ملاقات ہوئی اور یہ جانتے ہوئے کہ یہ شخص بیرون ملک زیادہ خطرناک ہے، ۱۸۸۹ء میں شاہ انہیں اپنے ہمراہ ایران لے آیا۔ تہران پہنچتے ہی آپ کے عقیدت مند تیزی سے آپ کے گرد جمع ہونے لگے۔ بادشاہ نے بھی آپ کو اپنے قرب کے مواقع فراہم کیے اور کئی اہم سیاسی امور میں آپ سے مشورے لینے لگا۔

شاہ نے مارچ ۱۸۹۰ء میں تمباکو کا ٹھیکہ ایک انگریز کمپنی کو پندرہ ہزار پاؤنڈ اسٹرلنگ سالانہ کے عوض دے دیا۔ اس طرح تمباکو کے نرخ خود انگریز مقرر کر سکتے تھے اور عوام سے اونے پونے داموں تمباکو لے کر اسے کھلے بازار میں مہنگے داموں فروخت کر سکتے تھے۔ سید جمال الدین نے اس معاہدے کے خلاف رائے عامہ بیدار کی اور مختلف مقامات پر عوامی جلسوں میں تقریریں کر کے عوام کو اس کے خلاف اکسایا۔ اگرچہ یہ اجارہ داری کا معاہدہ عوام کی نگاہوں سے خفیہ رکھا گیا تھا، مگر ایک بڑی تعداد میں عوام اس کاروبار سے وابستہ تھے۔ یہ معاہدہ چھوٹے تاجروں کے مفادات پر ایک کاری ضرب تھا، علاوہ بریں معاہدے کی رو سے انگریزوں کو ہر مقام پر اپنے کارندے لانے اور بغیر تلاشی دیے اپنی حفاظت کی غرض سے ہر قسم کا اسلحہ لانے کی آزادی بھی دے دی گئی تھی۔ پھر عوام کے روزمرہ استعمال کی چیز یعنی تمباکو کو استعمال سے قبل کافروں نے ہاتھ لگانا تھا جو ایرانی عوام کے لیے ناقابل قبول تھا۔

اس موقع پر سید جمال الدین کا خیال تھا کہ علماء کی اکثریت فکری اور عملی جمود کا شکار تھی اور وہ قرآن پاک کے مفاہیم کی وسعتوں کو سمجھنے سے بالکل قاصر تھی۔ تاہم کچھ صاحب بصیرت علماء بھی موجود تھے۔ ایسے علماء، روشن فکر اہل دانش اور عوام کی مدد سے سید جمال الدین نے ایک انقلابی تحریک کو منظّم کرنا شروع کیا۔ آپ کا مطمح نظر صرف یہ تھا کہ ایک فردِ واحد جو آمرِ مطلق بنا بیٹھا تھا اور خود کو شاہ کہلاتا تھا، اسلامی افکار کی رو سے اس نے عوام الناس کے حکومت کرنے اور شخصی آزادیوں کے حقوق پر ڈاکہ ڈال رکھا تھا۔ سید جمال الدین کا یہ واضح موقف تھا کہ ایران کے غریب عوام غربت و افلاس اور جبر و استبداد کا شکار تھے اور شاہ نے اپنی ذاتی اغراض کی تکمیل کے لیے ایران اور اس کا جملہ مالیاتی نظام بیرونی سامراجی قوتوں کے ہاتھوں گروی رکھ دیا تھا۔ ایران میں پہلی بار آپ ہی نے شہنشاہیت کے خاتمے کا نعرہ (مرگ بر شاہ) لگایا۔

آپ کی مقبولیت کے خوف سے تہران میں موجود برطانوی مشن کے دباؤ پر بادشاہ نے آپؒ کو بالآخر تہران چھوڑنے کا حکم دیا تو آپ تہران کے نواح میں شاہ عبدالعظیمؒ

کے مزار پر چلے گئے جہاں کی پرامن فضا میں پوری دلجمعی اور آزادی سے آپ اپنی عملی تحریک جاری رکھ سکتے تھے۔ آپ کی تحریک کی مقبولیت کے باعث عوام نے جوق در جوق شاہ عبدالعظیم کے مزار پر جانا شروع کردیا اور سید جمال الدینؒ کی تقاریر کے باعث عوام کا غیظ وغضب بڑھتا گیا۔ شاہ نے اس مقام کے تمام تر تقدس کو پامال کرتے ہوئے آپ کو اپنی فوج کے سپاہیوں کے ذریعے مزار کی حدود سے گھسیٹ کر باہر نکالا اور ایران چھوڑنے کا حکم دیا۔ آپ ۱۸۹۱ء میں لندن پہنچے اور اگلے دو برس وہیں پر مقیم رہے۔ لندن میں آپ نے اپنی تحریک جاری رکھی اور اپنے پمفلٹ اور کتابچے وہاں سے مسلسل ایران بھجواتے رہے۔ آپ کے پیروکاروں نے شاہ کے خلاف اپنی مزاحمت جاری رکھی۔ خود جمال الدین افغانی بھی حکومت کے کارندوں کو خطوط لکھ کر صورتحال واضح کرتے رہے۔ شاہ کو تحریر شدہ ایک خط کا اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''تم روزِ قیامت رسول اللہ ﷺ کو کس طرح چہرہ دکھا سکو گے جن کے امتیوں پر تم نے مصائب کے پہاڑ توڑ رکھے ہیں، چند پاؤنڈوں کی خاطر تم نے غریب عوام کو اُن کی محنت شاقہ کے ثمر سے محروم کر رکھا ہے جس سے وہ اپنا پیٹ بھر سکتے تھے۔ تم نے ان کے نوالے چھین کر کفار اور منکرین پیغمبرؐ کی جیبیں بھر دی ہیں۔''

آپ کے ایک حامی مرزا علی رضا کو جب تہران میں گرفتار کیا گیا تو حکومت کی جانب سے ایک خط برطانوی دفتر خارجہ کو لکھا گیا جس کے مطابق مرزا علی رضا کی خفیہ تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سید جمال الدین کا پیروکار ہے اور وہ ہندوستانی عوام کی انگریزوں کے ہاتھوں غلامی کی ذلت سے متاثر ہے۔ اس کے بعد اس خط میں اس بات کا اظہار کیا گیا تھا کہ ان تمام واقعات کے پیچھے دو عوامل کارفرما ہیں۔ ایک تو جدید تعلیم یافتہ لوگ ہیں اور دوسرے روایتی ملاّ۔ پہلا طبقہ شاہ کے ظلم وستم اور مالیاتی بددیانتی کو عوام کے سامنے بڑھا چڑھا کر بیان کر رہا ہے جبکہ دوسرا طبقہ (علماء) یہ کہہ رہا ہے کہ مؤمنوں کو کفار کے پنجۂ استبداد میں دیا جا رہا ہے۔ علماء کے بقول بینک، کانیں، تمباکو اور سڑکیں انگریزوں کو بیچی جا رہی ہیں جو بالآخر عوام کا غلہ اور پھر ان کی خواتین بھی چھین کر لے جائیں گے۔

عوامی بغاوت اور تمباکو کا مسئلہ: آیت اللہ شیرازی کا فتویٰ

اب عوام بپھرے ہوئے شیروں کی طرح باہر نکل آئے۔ سب سے پہلے شیراز کے لوگوں نے (جو سب سے زیادہ تمباکو پیدا کرنے والے صوبہ فارس کا دارالحکومت تھا) شہر کے دروازے پر قبضہ کر کے برطانوی کمپنی کے کارندوں کو شہر میں داخل ہونے سے روک دیا۔ پھر اصفہان کے تمباکو کے اہم تاجروں نے برسرِ عام اپنے تمباکو کے ذخائر کو جلا دیا۔ تہران کے لوگوں کو جب یہ معلوم ہوا کہ مشہور عالم جناب مرزا حسن آشیانی کو جلاوطنی کا حکم ملا ہے تو شہر میں قیامت برپا ہوگئی۔ ایران کی تاریخ میں پہلی بار حکومت کے خلاف خواتین بھی مظاہروں میں شامل ہوگئیں۔ مظاہرین مسجد شاہ کی جانب بڑھے تو وہاں کے خطیب نے منبر پر کھڑے ہو کر عوام کو پرامن رہنے اور منتشر ہونے کی اپیل کی۔ عوام نے امام کو منبر سے نیچے کھینچ کر مارا پیٹا اور نعرے لگاتے ہوئے سڑکوں پر نکل آئے۔ خواتین مظاہرین نے دو شاہی کارندوں کو مار مار کر نڈھال کر دیا' ایک شخص نے شاہی خاندان کے فرد یعنی ریجنٹ کو چھرا گھونپ دیا۔ سرکاری عمارات اور ریجنٹ کے گھر کو نشانہ بنا کر عوام شاہی تنصیبات پر ٹوٹ پڑے' وہاں سے ان پر شاہی پولیس نے فائرنگ کر دی۔ یوں لگتا تھا کہ تمباکو تو ایک بہانہ تھا' گویا عوام عرصۂ دراز سے اس دن کے منتظر تھے جب وہ شاہ کے خلاف اپنے غیظ و غضب کا اظہار کر سکتے۔

یہ خبر جب سید جمال الدین کو پہنچی تو آپ نے اس وقت کے واحد مرجع تقلید آیت اللہ حسن شیرازی کو ایک خط لکھا' جو اُن دنوں عراق کے ایک چھوٹے سے قصبے سامرہ میں مقیم تھے۔ اس خط کے مندرجات سے ایک اقتباس کچھ یوں ہے:

> ''آج کا ایران آپ جیسے عظیم مذہبی رہنما کی تائید اور رہبری کا منتظر ہے۔ اس ملک کا بادشاہ غدار ہے۔ اس کا وزیر اعظم امین السلطان غاصب' بے دین اور ظالم ہے اور وہ حضور ﷺ کی شان میں گستاخی کا مرتکب ہوتا ہے۔ مذہبی علماء کے احکام کی صریحاً خلاف ورزی کرتا ہے' شراب پیتا ہے' سیدوں کو برا کہتا ہے' کفار کا دوست اور مسلمانوں کا دشمن ہے' غیر ملکی کفار کے فاسد ارادوں میں برابر کا

شریک ہے' ایک غیر ملکی کمپنی کو اس نے تمباکو کا ٹھیکہ دے رکھا ہے اور شاہ کہتا ہے کہ یہ ایک محدود وقت یعنی صرف پچاس برس کے لیے ہے۔ غیر ملکی بینک کے قیام کا اختیار بھی غیروں کو دے دیا گیا ہے۔ ادھر انگریز ایران کا سودا کر رہے ہیں ادھر روس اب خراسان کو چھیننے کی سوچ رہا ہے۔ شاہ نے اپنی اغراض اور ہوس کاری کے لیے قرضے لے رکھے ہیں' ملک کے صوبے نیلام ہو چکے ہیں۔ آپ مشاہیر اسلام کے سربراہ ہیں' اگر آپ نے رہنمائی نہ کی تو یہ ملک اغیار کے ہاتھوں بک جائے گا۔ یہاں کے سب علماء آپ کے فیصلے کے منتظر ہیں۔''

بالآخر آیت اللہ شیرازی کی طرف سے فتویٰ جاری ہو گیا۔ اس فتوے کی رُو سے تمباکو کا استعمال اور انگریزوں سے تمباکو کا کاروبار خدا' رسول اور امامِ وقت سے جنگ کرنے کے مترادف تھا۔ اس فتوے کے جاری ہوتے ہی شاہی انتظامیہ مفلوج ہو کر رہ گئی۔ لوگوں نے اپنے حقے توڑ دیے۔ اس فتوے کا یہ اثر ہوا کہ جب بادشاہ نے حقہ طلب کیا تو اس کی بیگمات اور نوکروں نے اس موقف کی بنا پر شاہ کو حقہ پیش کرنے سے انکار کر دیا کہ ایسا کرنا مرجع تقلید کے فتوے کی خلاف ورزی ہو گا۔ تمباکو کے بارے میں تمام امور معطل ہو گئے۔ (اسی تحریک کی کامیابی کے بعد گاندھی نے ترکِ موالات کا سوچا تھا)۔ لوگوں نے ایک اور فتویٰ بھی شائع کر دیا کہ اگر ۴۸ گھنٹے میں یہ معاہدہ منسوخ نہ ہوا تو پھر جہاد شروع ہو جائے گا۔ عوام بلووں پر اتر آئے اور مسلح تصادم کی نوبت آ گئی۔ شاہ کو یہ معاہدہ بالآخر منسوخ کرنا پڑا اور انگریزوں کو ہرجانے کی بھاری رقم ادا کرنا پڑی۔

حال ہی میں تحقیقات کی رو سے یہ معلوم ہوا ہے کہ یہ فتویٰ جعلی تھا اور تہران کے تمباکو کے تاجروں نے خود ہی فتویٰ لکھ کر شائع کر دیا تھا۔ ڈاکٹر ہما ناطق جنہوں نے سید جمال الدینؒ پر ڈاکٹریٹ کی ہے اور ڈاکٹر شریعتی کے قریبی ساتھی اور تہران یونیورسٹی میں تاریخ کے استاد تھے' لکھتے ہیں کہ بہت سے علماء جن میں شیخ حسن کربلائی بھی شامل تھے اور جنہوں نے اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا' وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ یہ فتویٰ ایران کے تمباکو کے مایوس اور پریشان حال تاجروں نے خود ہی گھڑ لیا تھا۔ اس فتویٰ کی مقبولیت کا عالم یہ تھا کہ خود آیت اللہ العظمیٰ بھی اس کی تردید نہ کر سکے اور خاموش رہے۔

ہر چند کچھ علماء اس تحریک میں شامل ہوئے لیکن اکثر علماء نے اس سے لاتعلقی جاری رکھی۔ عوام کے شبینہ خطوط ان دنوں اکثر اوقات لوگوں میں تقسیم ہوتے رہتے تھے۔ ایک ایسے خط میں یہ لکھا ہے کہ ''آپ لوگ اس لیے ملاّ بنے پھرتے ہیں کہ آپ کو عوام نے چندے دے دے کر اس مقام پر پہنچایا ہے اور انہی کے خرچ پر آپ لوگوں نے تعلیم حاصل کی ہے۔ مزدور' کسان اور تاجروں کے خون پسینے کی کمائی اس لیے آپ پر صرف نہیں ہوئی کہ آپ خاموش تماشائی بن جائیں۔ آپ لوگ عوام کا کیوں ساتھ نہیں دیتے؟'' یہ فتویٰ کہیں سے بھی آیا ہو بہر حال عوامی تحریک کو اس موقع پر مذہبی تائید حاصل ہوگئی۔ یہ ثابت ہو گیا کہ ایران کی ہر وہ سیاسی تحریک جسے مذہبی تائید حاصل ہو اُس کی کامیابی کے روشن امکانات ہوا کرتے ہیں۔

تمباکو کے معاہدے کی تنسیخ پر برطانوی کمپنی نے ہرجانے کا دعویٰ کر دیا۔ چنانچہ پانچ لاکھ پاؤنڈ کی خطیر رقم برطانوی امپیریل بینک سے چھ فیصد سالانہ سود پر قرض لے کر ادا کی گئی' اور عوام پر اس کا بوجھ بھی آپڑا۔ علماء نے یہ سمجھ لیا کہ معاملہ ختم ہو گیا ہے' اس لیے وہ دوبارہ خاموش ہو گئے۔ یہ مالی نقصان ایک طرف رہا' لیکن یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہوگئی کہ عوام کی مرضی کے خلاف مستقبل میں ایران میں کوئی کام بھی ممکن نہیں ہوگا۔

سید جمال الدینؒ کا ایک اور خط

لندن سے آپ نے علماء کو لکھا کہ بادشاہ اب آپ کو اور عوام کو دبانے کی کوشش کر رہا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی فوج اور پولیس کو یورپی کرائے کے افسروں اور فوجیوں کی مدد سے منظم کر رہا ہے اور اگر اسے موقع مل گیا تو پھر کچھ بھی باقی نہیں بچے گا۔ یہ خط جو آیت اللہ حسن شیرازی اور دیگر علماء کو لکھا گیا' اس کے کچھ مندرجات اس طرح ہیں:

> ''اے مذہبی رہنماؤ! آپ کا فتویٰ سامنے آنے سے اسلام کی عظمت زندہ ہوگئی ہے۔ اس عظیم روحانی طاقت کے سامنے اہل مغرب ٹھہر نہیں سکے۔ یہ معلوم ہو گیا ہے کہ آپ عوام کے لیے ایک مضبوط حصار ہیں' لیکن امر افسوس یہ ہے کہ وہ ظالم (بادشاہ) اب بھی برسرِ اقتدار ہے۔ اب وہ علماء کو صوبوں سے جلاوطن کر رہا ہے'

فوج اور پولیس کی استعماری خطوط پر تنظیم نو کر رہا ہے۔ اگر کسی کا خیال ہے کہ شاہ کو اقتدار سے مرحوم کرنے کے لیے توپوں' بندوقوں یا فوج کی ضرورت ہے تو یہ اس کی غلط فہمی ہے۔ خدا نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ آپ لوگوں کے پاس عظیم قوت ہے۔ آپ کے فتویٰ نے سب کی آنکھیں کھول دی ہیں۔ آپ کا ایک لفظ سنتے ہی عوام آج کے فرعون کو نیست و نابود کر دیں گے۔ ایک شخص جس نے مسلمانوں کا خون چوسا ہے' ان کی ہڈیاں توڑی ہیں اور قوم کو اقوامِ عالم میں ذلیل و رسوا کروا دیا ہے' یہ اس ملک و قوم کو اغیار کو سونپنے کے درپے ہے جو مذہب کی عظمت کی علامت رہا ہے۔ آج وزراء' کمانڈر' فوج' عوام اور ظالموں کے اپنے بچے آپ کے حکم کے منتظر ہیں۔ آپ کا وہ ایک لفظ سننے کے منتظر ہیں جس کے بعد وہ اسے تاج و تخت سے محروم کر کے رکھ دیں گے۔''

اس خط میں کئی ایسی اندرونی سرکاری معلومات شامل تھیں جو شاہ کے قریبی کارندوں نے خفیہ طور پر سید جمال الدین کو بہم پہنچائی تھیں۔ اس میں اس بات کی طرف بھی اشارہ تھا کہ آرمی کے افسروں اور جوانوں میں ایرانی مسلح افواج میں غیر ملکی افسروں کی شمولیت کے باعث بددلی پھیل رہی ہے اور وہ شاہ کے خلاف کسی وقت بھی استعمال ہو سکتے ہیں۔

اسی دوران تہران میں موجود برطانوی سفارت خانے نے ایک خط ۱۸۹۲ء میں وزارت خارجہ کو تحریر کیا جس میں درج تھا کہ:

''سید جمال الدین نے علماء کو ایک خط لکھا ہے جس میں بادشاہت کے خلاف واضح الفاظ میں غیظ و غضب اور نفرت کا احساس ہوتا ہے اور ہمیں (برطانیوں کو) ڈر ہے کہ اس خط سے خوفناک نتائج برآمد ہوں گے۔ حتیٰ کہ خود شاہ بھی اس خط کے مندرجات سے پریشان ہے اور اسے خوف ہے کہ کہیں ایران میں انارکی نہ پھیل جائے۔ اس خط کا اہم پہلو یہ ہے کہ شاہ کو سخت پریشانی اس امر پر ہے کہ بہت سے سرکاری راز بھی اس میں مندرج ہیں۔''

افسوس اس امر کا ہے کہ سید جمال الدین کے اس تاریخی خط کے مندرجات کا علماء پر خاطر خواہ اثر نہ ہوا اور یہ لوگ مصلحتاً خاموش رہے۔ تمباکو کی تحریک کی کامیابی کے بعد ان کے سامنے شاید اور کوئی مقصد ایسا نہیں تھا جس کے نام پر وہ عوام کو متحرک کر سکیں۔

علاوہ بریں وہ عوام کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی مسائل کا واضح انداز میں حل پیش کرنے سے بھی قاصر تھے جن سے ایران انیسویں صدی کے نصف آخر میں دوچار تھا۔ اجتہاد کا استعمال محدود پیمانے پر تھا اور وہ بھی صرف معمولی شرعی مسائل کے حل تک۔ روشن فکر دانشوروں کی سوچ کو اسلامی اجتہاد کے دائرے میں لانا ابھی باقی تھا۔ اجتہاد کی ان نئی جہتوں کا ادراک علماء کو خاطر خواہ حد تک ابھی تک نہیں ہو سکا تھا۔

تاہم سید جمال الدین کا اثر و رسوخ اسلامی دنیا پر بڑھتا رہا، کیونکہ انہوں نے بادشاہت کے قدیم اور مستحکم ادارے کو نہ صرف غیر اسلامی کہہ کر چیلنج کیا تھا بلکہ مغربی استعمار کی لوٹ کھسوٹ اور معاشی استحصال کا توڑ بھی پیش کیا تھا۔ اب سید جمال الدین علماء کی بجائے براہ راست عوام کی جانب متوجہ ہونا شروع ہو گئے تھے اور آپ کو آخری زندگی میں یہ خیال بھی آ گیا تھا کہ ان کے لیے کیا ہی بہتر ہوتا کہ وہ اسلامی افکار کی رو سے ملت اسلامیہ کے سیاسی اور معاشی مسائل کے حل کا ادراک پیش کر سکتے۔ اب وہ سمجھتے تھے کہ اقتدار اعلیٰ سے ایک شخص کی علیحدگی سے بھی مسائل حل نہیں ہوتے جب تک فکری اور سماجی انقلاب برپا نہ کیا جائے۔ آپ نے تحرک، جدوجہد اور عمل کا راستہ پیش کیا اور آپ کے بقول آپ نے وہ بیج بوئے جن کا ثمر بعد میں ظاہر ہونا تھا۔

ناصر الدین قاچار کا انجام

شاہ ناصر الدین قاچار ۱۳۱۳ھ (۱۸۹۶ء) میں اپنی تخت نشینی کا پچاسواں سال (گولڈن جوبلی) منانے والا تھا اور اس جشن میں ابھی تین دن باقی تھے کہ تہران کے نواح میں شہر رے میں وہ مزار شاہ عبدالعظیمؒ میں جمعہ کی نماز ادا کرنے کے لیے آیا۔ سید جمال الدین کے ایک پیروکار مرزا رضا کرمانی نے عین اس جگہ جہاں سے سید جمال الدین کو گھسیٹ کر باہر لایا گیا تھا، شاہ کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ مقدمے کی سماعت کے دوران جب اس سے وجہ پوچھی گئی تو اس نے بتایا کہ "اس (شاہ) نے اس عظیم انسان (سید جمال الدین) کو جو پیغمبر اسلام کے خاندان سے تھے، شاہ عبدالعظیم کی مقدس چاردیواری سے اس ذلت سے گھسیٹ کر نکالا تھا کہ ان کی شلوار بھی تار تار ہو گئی تھی۔

انہوں نے سچائی بیان کرنے کے علاوہ کیا کہا تھا؟ انہوں نے سوئے ہوئے لوگوں کو جگایا تھا اور بلند مقاصد کا بیج لوگوں کے دلوں میں بویا تھا۔ لیکن میں اس خدائے واحد کی قسم کھا کر کہتا ہوں جو سید جمال الدین اور کل دنیا کا خالق ہے' کہ میرے ارادۂ قتل کا علم میرے اور ان کے سوا کسی کو نہ تھا۔ سید اب قسطنطنیہ میں ہیں' جایئے اور اگر ان کا کچھ بگاڑ سکتے ہیں تو کچھ کیجیے۔''

دراصل جمال الدین افغانی نے انقلاب کی راہ ہموار کر دی تھی اور لوگوں کو آزادی کی جدوجہد کا درس دے دیا تھا۔ علامہ اقبال نے جمال الدین افغانی کی زبانی اپنی کتاب ''جاوید نامہ'' میں کیا عظیم پیغام دیا ہے:

عالمے در سینۂ ما گم ہنوز
عالمے در انتظارِ قُم ہنوز

(ایک تصوراتی جہان ہماری سوچوں کے دریچوں میں چھپا ہوا ہے۔ یہ جہان ''قُم باذنِ اللہ'' کے حکم کا منتظر ہے۔)

عالمے بے امتیازِ خون و رنگ
شامِ اُو روشن تر از صبحِ فرنگ

(یہ جہان رنگ اور نسل کے امتیازات سے خالی ہے اور اس کی شامیں بھی یورپ کی صبحوں سے زیادہ روشن ہیں۔) جس سے مراد یہ ہے کہ اس کا ادنیٰ ترین پہلو بھی یورپ کی آزاد فضاؤں سے بہتر ہے۔

عالمے پاک از سلاطین و عبید
چوں دلِ مؤمن کرانش ناپدید

(یہ جہان بادشاہوں اور غلاموں سے پاک ہے۔ اور مؤمن کے دل کی مانند اِس کی وسعتیں بے پناہ ہیں۔)

عالمے رعنا کہ فیضِ یک نظر
تخمِ او افگند در جانِ عمرؓ!

(یہ جہان اتنا خوبصورت ہے کہ اس پر ایک نظر پڑتے ہی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ

کی جان میں نئے ولولوں کے بیج بکھر گئے تھے۔)

لایزال و وارداتش نو بنو
برگ و بارِ محکماتش نو بنو

(اس جہان پر کبھی زوال نہیں آ سکتا اور اس میں نئے نئے انکشافات ہوتے رہتے ہیں۔ اس کے ثمرات اور اس کے محصولات نئے سے نئے ہوتے ہیں۔)

باطنِ اُو از تغیر بے غمے
ظاہرِ اُو انقلابِ ہر دمے

(اس کا راز اس تبدیلی میں ہے جو بغیر کسی کشت وخون یا غم کے رونما ہوتی ہے اور اس کے ظاہر میں ہر لحہ نئے سے نئے انقلابات آتے رہتے ہیں۔)

اندرونِ تست آں عالم نگر
می دہم از محکماتِ او خبر!

(اچھی طرح دیکھ، یہ جہان تم میں پوشیدہ ہے۔ غور کرو تو میں تمہیں اس کے ثمرات اور اسرار کی خبر دے سکوں۔)

دراصل افغانی کے اثرات اگلی صدی پر مرتب ہوئے، جب اقبال اور شریعتی نے آپ کی پیروی میں ایک نئے ولولے سے مشرق کو روشناس کروایا۔

علامہ اقبال حضرت جمال الدین افغانی (رحمہما اللہ) کے وحدتِ ملتِ اسلامیہ (Pan Islamism) کے تصور سے بھی بے حد متأثر ہوئے۔ ''جاوید نامہ'' میں ایک آسمانی مقام پر مولانا روم سے پوچھتے ہیں:

من نیابم از حیات ایں جا نشاں
از کجا می آید آوازِ اذاں؟

(مجھے اس سرزمین پر زندگی کا کوئی نشان تو نظر نہیں آ رہا مگر یہ اذان کی آواز کہاں سے آ رہی ہے؟)

گفت رومی ایں مقامِ اولیاست
آشنا ایں خاکداں با خاکِ ماست

(مولانا روم نے فرمایا: ''یہ اولیائے کرام کا مقام ہے اور یہ دھرتی ہماری سرزمین سے وابستہ ہے۔'')

رفتم و دیدم دو مَرد اندر قیام
مقتدی تاتار و افغانی امام

(ہم وہاں پہنچے تو دو حضرات کو نماز میں حالت قیام میں پایا۔ امامت کے فرائض افغانی (جمال الدین) انجام دے رہے تھے اور مقتدی ایک تاتاری (سعید حلیم پاشا) تھے۔)

قرأتِ آں پیر مَردے سخت کوش
سورۂ والنجم و آں دشت خموش

(اس خاموش صحرا کی وسعتوں میں اس سخت کوش بزرگ کی سورۃ النجم کی قراءت نے ایک سرور اور ولولہ پیدا کر رکھا تھا۔)

ایرانیوں نے سید جمال الدین کی بابت کہے گئے علامہ اقبال کے ان اشعار کی روشنی میں تصاویر (paintings) بھی تیار کر رکھی تھیں۔ اصلی تصویر جناب عبدالحمید عرفانی کے پاس تھی جسے وہ علامہ اقبال کے اشعار کی وضاحت کے لیے اکثر و بیشتر سرورق پر طبع کیا کرتے تھے۔ یہ تصور انقلابِ اسلامی سے پہلے ایران میں بہت مقبول ہوا تھا۔

ایران میں پارلیمانی انقلاب

آئین سازی اور پارلیمانی جمہوریت کا آغاز

مظفر الدین قاچار

اس بادشاہ نے ۱۳۱۳ھ (۱۸۹۶ء) سے ۱۳۲۴ھ (۱۹۰۷ء) تک ایران پر تاریخ کے نازک دور میں حکومت کی۔ وہ اپنی تخت نشینی کے وقت تبریز سے انگریزوں اور روسیوں کی معیت میں تہران آیا' اور ان کے زیر سایہ اپنی کٹھ پتلی حکومت کا آغاز کیا۔ وہ بنیادی طور پر ایک سلیم الفطرت اور شریف آدمی تھا۔ اس نے ملک کی بدترین اقتصادی

بدحالی کے پیش نظر روسیوں سے بھاری قرضے لیے اور وائسرائے ہند لارڈ کرزن کی ایران میں آمد کے بعد یہاں انگریزوں کے مزید قونصل خانے کھلے اور برطانوی ہند سے تجدید تعلقات ہوئی۔ ہر چند کہ بادشاہ بذاتِ خود تو ایک شریف انسان تھا لیکن وہ مفاد پرست امراء اور مشیروں میں گھرا ہوا تھا۔ ملک کا بجٹ مسلسل خسارے میں جا رہا تھا۔ عمّال حکومت بددیانت تھے' تاجر ذخیرہ اندوزی کرتے رہتے تھے اور محلاتی سازشیں عروج پر تھیں۔ کہنے کو تو ایران ایک آزاد ملک تھا لیکن داخلی اور خارجی اعتبار سے انگریزوں اور روسیوں کی غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔

انقلاب

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے' سید جمال الدین افغانی کے مزارِ شاہ عبدالعظیم میں قیام اور پناہ لینے کے بعد وہ جگہ سیاسی اعتبار سے اہمیت اختیار کر گئی تھی' اور ناصر الدین قاچار کو بھی وہیں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۴ء تک کا دور ایران میں روشن دماغی اور فکری احیاء کا دور تھا۔ بیرون ملک سے کئی فارسی اور عربی جرائد اور مجلّات ایران میں کسی نہ کسی طرح سے پہنچ جاتے تھے۔ میلکم خان کا رسالہ ''قانون'' اور مؤید الاسلام کا رسالہ ''حبل المتین'' بہت اہمیت کا حامل رہا ہے۔ نیز ''حکمت'' اور ''اختر'' کا ایران کی ذہنی بیداری میں اہم کردار ہے۔ حاجی زین العابدین کے ''سیاحت نامہ ابراہیم بیگ'' میں مؤلف نے اُس دَور کے ایران کے المناک حالات کو دلچسپ فکاہی پیرائے میں پیش کیا ہے۔

عوام کی بڑھتی ہوئی دلچسپی کے پیش نظر علماء اور مجتہدین میں سے کچھ لوگ میدان میں اُتر گئے تھے۔ اسی دور میں ایک خفیہ تنظیم (اصلاح طلبان) قائم ہوئی' جس کے سرپرست حجۃ الاسلام سید محمد طباطبائی تھے۔ واعظ حضرات نے منبروں پر خطبات کے دوران مظالم کا نقشہ کھینچنا شروع کر دیا تھا۔ خصوصاً جمال الدین واعظ اصفہانی کی آتش بیانی نے قوم کے جذبات کو اُبھارنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ وزیراعظم عین الدولہ نے علماء و مجتہدین کو انتقامی کارروائیوں سے ڈرایا دھمکایا۔ جب عین الدولہ کی وزارتِ عظمیٰ

سے علیحدگی کا عوامی مطالبہ زور پکڑ گیا تو مقتدر سادات' علماء اور تجار کو برسرِ عام تختہ دار پر لٹکایا جانے لگا تھا۔

ان حالات میں ایران کے متعدد تاجر جید علماء مثلاً سید عبداللہ بہبہانی اور سید طباطبائی کے ہمراہ احتجاجاً مسجد شاہ (تہران کی جامع مسجد) میں دھرنا مار کر بیٹھ گئے۔ پولیس کی طرف سے ان لوگوں کا محاصرہ کرلیا گیا اور ان کی رسد بند کردی گئی۔ اب کچھ لوگ کسی نہ کسی طرح وہاں سے نکل کر قم چلے گئے اور حضرتِ معصومہ کے مزار میں جا بیٹھے۔ اسی دن سید محمد طباطبائی اور سید عبداللہ بہبہانی وہاں سے نکل کر اپنے اعزہ واقارب کے ہمراہ شہر ''رے'' میں شاہ عبدالعظیم کے مزار کی عمارت میں بیٹھ گئے۔ رفتہ رفتہ دیگر علماء' تاجر اور طلبہ بھی اس جگہ جمع ہو گئے۔ ان لوگوں کی مدد ولئ عہد شہزادہ محمد علی مرزا نے بھی کی جو عین الدولہ کی وزارتِ عظمیٰ کا مخالف تھا۔ بادشاہ نے ہر طرح سے یہ دھرنا ختم کروانے کی کوششیں کیں اور جب وہ بار آور نہ ہوسکیں تو ایک فرمان تحریر کروا کر اپنے دستخطوں سے ان لوگوں کے ہاں بھجوا دیا کہ ان کے دونوں مطالبے تسلیم کر لیے گئے ہیں' وزیر اعظم کو برطرف کر دیا گیا ہے اور عدالت خانہ قائم کر دیا گیا ہے۔ مظاہرین شاہی سواریوں میں بٹھا کر پوری شان وشوکت سے تہران لائے گئے اور خود بادشاہ نے بنفسہٖ ان کا خیر مقدم کیا۔ پوری قوم نے اس موقع پر ''فتحِ ملت'' کے نام سے ایک شاندار جشن منایا۔ لیکن جلد ہی حسب عادت بادشاہ اپنے اس وعدے سے مکر گیا اور فرمان پر عمل کرنے میں پس وپیش سے کام لینے لگا۔

عوام علماء کی قیادت میں ایک بار پھر اُٹھ کھڑے ہوئے اور فارس وخراسان کے صوبوں میں خوفناک بلوے شروع ہو گئے۔ عین الدولہ نے پکڑ دھکڑ شروع کر دی اور گرفتار شدگان کو نادر شاہ کے بنائے ہوئے قلعہ کلات میں قید کر دیا۔ ہرچند کہ سید محمد طباطبائی اور سید عبداللہ بہبہانی نے شاہ کو ایک خط کے ذریعے اس کا [illegible]ہ یاد دلایا مگر اس نے مزید سختی شروع کر دی۔ ان دونوں علماء نے دوبارہ مساجد کے منبروں پر سے ملوکیت کے استبدادی حربوں کی مذمت شروع کر دی۔ علماء کے علاوہ ''انجمن مخفی'' اور ''کتاب

خانۂ ملی'' نے بھی اپنی حریت پسندانہ سرگرمیاں شروع کر دیں۔ یورپ سے چھپ کر ایران آنے والے فارسی مجلات کا لہجہ بھی بتدریج تلخ تر ہونے لگا۔

عین الدولہ نے آپ کی انقلابی سرگرمیوں سے سیخ پا ہو کر آقا سید جمال الدین واعظ اصفہانی کو شہر بدر کر دیا' جو قُم میں پناہ گزین ہو گئے۔ ایک اور عالم دین شیخ محمد کو بھی تذلیل کے ساتھ شہر بدر کر دیا' جنہیں گدھے پر بٹھا کر جب شاہی پولیس کے سپاہی لے جا رہے تھے تو عوام کے ایک مشتعل ہجوم نے سپاہیوں کو آ لیا۔ انہوں نے شیخ محمد کو ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا۔ لوگوں نے کوٹھڑی کا دروازہ توڑنا چاہا تو سپاہیوں نے اندھا دھند فائرنگ کر دی جس کے نتیجے میں پندرہ افراد مارے گئے' مگر عوامی مزاحمت کے نتیجے میں سپاہی بھاگ نکلے' لوگوں نے شیخ محمد کو آزاد کروا لیا اور عبدالمجید شہید (جس نے دروازہ توڑنے میں پہل کرتے ہوئے گولی کھائی تھی) کا جنازہ جب شہر کی گلیوں اور بازاروں سے گزارا گیا تو لوگوں کا غیظ و غضب اپنے عروج پر جا پہنچا۔

اب آزادی خواہوں نے اسے ایک محفوظ مقام سمجھ کر مشہور مذہبی مرکز قُم کی جانب ہجرت کرنا شروع کی۔ یہ ایران کی تاریخ میں ''ہجرتِ کبریٰ'' کہلاتی ہے۔ اس دوران چار ہزار افراد نے کچھ عرصہ کے لیے برطانوی سفارت خانہ میں بھی پناہ لیے رکھی۔ مظاہرین کا اب یہ مطالبہ تھا کہ ملک میں جمہوریت قائم کر دی جائے اور بادشاہت صرف آئینی طور پر باقی رہ جائے۔ ان مطالبات کی بادشاہ نے سخت مزاحمت کی۔ اس دوران سرکاری عہدیدار بھی جدوجہد آزادی میں شریک ہو گئے اور شاہی فوج میں بھی بغاوت کے آثار نمودار ہونے لگے۔ آخر کار ۵/اگست ۱۹۰۶ء کو تمام عوامی مطالبات تسلیم کر لیے گئے' اور ایران میں آئینی بادشاہت کے ساتھ پارلیمانی جمہوریت کے قیام کا اعلان کیا گیا۔ آئین کے تحت لوگوں کو ہر طرح کی مذہبی اور سماجی آزادی کی ضمانت مل گئی۔ نئے آئین کے تحت اکتوبر ۱۹۰۶ء میں پہلی پارلیمنٹ قائم ہو گئی جو تیس برس سے ستر برس کی عمر کے افراد کے لیے براہ راست ووٹوں سے منتخب ہوئی تھی۔ یکم جنوری ۱۹۰۷ء کو مظفر الدین قاچار نے باقاعدہ طور پر پارلیمنٹ کا افتتاح کیا۔ جمہوری دستور عطا کرنے کے فوراً بعد

ہی یہ بادشاہ ۲۴ ذی قعد ۱۳۲۴ھ (۸جنوری ۱۹۰۷ء) کو وفات پا گیا۔
شاہ کے آخری ایام کے دوران یہ محسوس ہونے لگا کہ اب ایران سے مطلق العنان بادشاہت اپنے منطقی انجام کو پہنچ چکی ہے اور بادشاہ کا کردار آئینی ذمہ داریوں تک محدود ہو کر رہ گیا ہے جبکہ تمام انتظامی اختیارات عوام کے منتخب نمائندوں کو منتقل ہو چکے ہیں' عوام کو شخصی آزادیاں مل چکی ہیں اور ملک میں قرآن وسنت کی بالادستی قائم ہو چکی ہے۔ مگر جلد ہی یہ تمام امیدیں خاک میں مل گئیں اور ایران ایک بار پھر ایک تاریک دور میں داخل ہو گیا۔

محمد علی شاہ قاچار

اس بدفطرت اور بددیانت بادشاہ نے ۱۳۲۴ھ تا ۱۳۲۷ھ (۱۹۰۷ء تا ۱۹۰۹ء) کے مختصر عرصہ کے لیے ایران پر حکومت کی۔ اس بادشاہ نے مجلس (پارلیمنٹ) کو ختم کرنا چاہا اور آئینی بادشاہت کی بجائے ملکی معاملات میں شاہی مداخلت مسلسل جاری رکھی۔ اس وجہ سے ایران میں ایک مرتبہ پھر سے بدامنی پھیلنے لگی۔ اصفہان' شیراز اور تبریز میں فسادات کی آگ بھڑک اٹھی اور تبریز میں فوج کو بھجوایا جانے والا سرکاری اسلحہ لوٹ لیا گیا۔ کرمان شاہ میں شاہ کے بھائی سالار الدولہ نے قسمت آزمائی کرتے ہوئے تاج و تخت کے حصول کے لیے مسلح بغاوت کر دی اور تین دن کی جنگ کے بعد ناکام ہو کر اپنی جان بچانے کی غرض سے برطانوی قونصل خانے میں پناہ گزین ہو گیا۔

اس ناعاقبت اندیش بادشاہ نے عوام اور جمہوریت کے خلاف استبداد اور مخالفت کا سلسلہ جاری رکھا۔ مجلس یعنی پارلیمان میں سید عبداللہ بہبہانی' سید محمد طباطبائی اور سید جمال الدین واعظ نے حق گوئی و بے باکی کا سلسلہ جاری رکھا' مسجدوں کے منبروں سے بھی صدائے حق بلند ہوتی رہی اور ہر بار بادشاہ قرآن پر ہاتھ رکھ کر مجلس میں آکر یہ عہد کرتا رہا کہ وہ دستور کا وفادار رہے گا' مگر پھر واپس جاتے ہی وہ مکر جاتا اور اپنے استبداد کا از سرِ نو آغاز کر دیتا۔

۱۵ دسمبر ۱۹۰۸ء کو شاہ نے مکر و فریب سے کام لیتے ہوئے تمام اراکینِ مجلس کو

شاہی محل میں بلوایا اور منتخب وزیر اعظم ناصر الملک کو گرفتار کروادیا۔ غنڈوں کو لوٹ مار کی کھلی اجازت دے دی تاکہ حریت پسندوں کو سزا دلائی جاسکے۔ شاہ نے پہلے اس خیال کا اظہار کیا کہ مجلس (پارلیمنٹ) کو توڑ دیا جائے، مگر عوام کے ممکنہ غم وغصہ کے پیش نظر اس نے مشہور عالمِ دین سید جمال الدین واعظ، ملک المتکلمین، تقی زادہ اور مشیر الدولہ کی رکنیت ختم کرنے کا عندیہ دیا۔ اب تبریز، رشت، قزوین، مشہد، اصفہان اور کرمان کے لوگوں نے اجتماعی طور پر مجلس پر مکمل اعتماد کا اظہار کیا۔ اہلِ تبریز نے تمام غیر ملکی سفارت خانوں کو تار دے کر مطلع کیا کہ وہ بادشاہ کے تمام ظالمانہ اقدامات کی زبردست مذمّت کرتے ہیں اور آذربائیجان سے تعلق رکھنے والے فوجیوں کو پیغام بھیجا کہ اگر انہوں نے مجلس کو نقصان پہنچایا تو ان کے گھر جلا دیے جائیں گے اور ان کے اہل خاندان کو قتل کر دیا جائے گا۔ قزوین سے مسلح دستے تہران آنا شروع ہوئے اور تبریز سے ایک ہزار مسلح افراد تہران کے لیے روانہ ہوئے تاکہ وہ حریت پسندوں کے ساتھ مل کر شاہی استبداد اور غیر ملکی غلبے کے خلاف مزاحمت کرسکیں۔

اس دوران روس اور برطانیہ میں ایک معاہدہ طے پایا جس کے تحت برطانیہ اور روس نے ایران میں اپنے اثر ونفوذ کے علیحدہ علیحدہ زون بنا لیے، اور ایران کو اس فیصلے میں کسی طرح سے بھی شریک نہیں کیا گیا۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے ایران کو تقسیم کر کے یہ دونوں ملک آپس میں مفتوحہ خطے کی صورت میں بانٹنا چاہتے ہوں۔

اب بادشاہ پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ ہر چند کہ مجلس نے اس کی مذمت کی اور اپنی لاتعلقی کا اظہار کیا مگر شاہ کو شک صرف اراکینِ مجلس پر ہی رہا۔ اس نے روسیوں کے ذریعے مظاہرین پر گولیاں چلوائیں اور بہانے بہانے سے عوامی رہنماؤں کو شہر کے باہر ایک باغ میں بلوا کر گرفتار کروالیا۔ اب بادشاہ نے عوام کو عبرت ناک سبق سکھانے کے لیے روس کی مسلح افواج سے مدد لینے کی ٹھان لی۔ روسی کرنل لیا خوف کی سرکردگی میں ملک بھر میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا اور مسجد سپہ سالار میں موجود مجتہدین کے اجتماع کو منتشر کرنے کے لیے روسی فوج نے دباؤ ڈالا۔ جب یہ کوششیں بارآور نہ ہوئیں تو اب بادشاہ

نے ایوانِ مجلس پر زبردست بمباری کروائی جس میں روسی بریگیڈ اور دوسرے مسلح دستوں نے حصہ لیا۔ متعدد اراکینِ مجلس شہید ہو گئے۔ بعض نمائندے برطانوی سفارت خانے کی عمارت میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ بہبہانی اور طباطبائی جیسے عظیم علماء گرفتار ہوئے۔ سید جمال الدین واعظ اصفہانی قبرستان جاتے ہوئے راستے میں مارے گئے۔ ملک المتکلمین اور مرزا جہانگیر تختۂ دار پر چڑھا دیے گئے۔ بالآخر اس خوفناک کارروائی کے نتیجے میں تہران پر کرنل لیاخوف کا قبضہ ہو گیا۔

اب آزادی کے بچے کھچے متوالوں نے مجبوراً تبریز کا رُخ کیا اور وہاں پر عوامی بغاوت ہو گئی جس کی قیادت ستار خان اور سالارِ ملّی باقر خان نے کی۔ شاہ کی فوج نے عین الدولہ کی قیادت میں اس اہم تاریخی شہر کا بھی محاصرہ کر لیا۔ کچھ عرصے کے بعد روسیوں اور انگریزوں کی مداخلت پر یہ محاصرہ اٹھا لیا گیا۔

اب اصفہان سے صمصام السلطنت نجف علی خان ''بختیاریوں'' کا لشکر لے کر تہران کی جانب روانہ ہوا۔ اہل رشت نے محمد ولی خاں سپہ دار اعظم کی قیادت میں علم آزادی بلند کیا اور بختیاری سردار حاجی علی قلی خان سردار اسعد نے اپنے لنگر کے ہمراہ کوچ کر کے صمصام الدولہ کے ہاتھ مضبوط کیے۔ اب اس متحدہ فوج کا مقابلہ کرنے کے لیے روسی اور انگریز تیاریاں کرنے لگے۔ روسی افواج آذربائیجان کے دارالحکومت باکو میں جمع ہو گئیں اور تین ہزار روسی فوجی بحیرۂ خزر (Caspian Sea) کی بندرگاہ انزلی پر اُتر گئے۔ روسی افواج اور انگریزوں کے تہران پہنچنے سے پہلے ہی آزادی کے متوالوں نے صمصام الدولہ کی قیادت میں تہران کی شاہی افواج کو شکست سے دوچار کر دیا۔ عوام کے غیظ وغضب سے بچ کر بادشاہ ۱۶ر جولائی ۱۹۰۹ء کو روسی سفارت خانے میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا گیا۔

اب بچے کھچے اراکینِ مجلس (پارلیمنٹ) نے اپنا خصوصی اجلاس بلوا کر شاہ کو تاج وتخت سے معزول کر کے اس کے بارہ سالہ بیٹے احمد شاہ کو بادشاہ بنانے کا اعلان کر دیا۔

احمد شاہ قاچار

اس ناعاقبت اندیش بادشاہ کا عہد حکومت ۱۳۲۷ھ (۱۹۰۹ء) تا ۱۳۴۳ھ (۱۹۲۴ء) تک محیط تھا۔

اب بادشاہ نابالغ تھا' خزانہ خالی تھا' ہر طرف بدامنی پھیلی ہوئی تھی' انگریز اور روسی ایران پر نگاہیں لگائے کھڑے تھے اور ہر ممکنہ مداخلت سے باز نہیں آتے تھے۔ اس دوران مجلس (پارلیمنٹ) میں بھی پھوٹ پڑ چلی تھی' ایک گروہ انتہا پسندوں کا اور دوسرا اعتدال پسندوں کا تھا۔ انگریز فوجیں جنوبی ایران میں گھس بیٹھی تھیں۔

اس دوران روسیوں کی مدد سے معزول بادشاہ محمد علی قاچار نے ۱۹۱۱ء میں استر آباد آ کر دوبارہ ایران کے اقتدار پر قبضہ کرنا چاہا مگر وہ بری طرح شکست کھا کر یورپ کی جانب چلا گیا۔

اسی دوران امریکی مالی ماہرین نے شوستر کی قیادت میں ایران میں مالیاتی نظام کی اصلاح کرنا چاہی تو روسیوں نے سخت احتجاج کیا۔ بالآخر روسیوں نے اپنے ہراول دستے تہران بھجوا دیے اور ۱۳۲۹ھ (۱۹۱۱ء) میں اپنی فوج ایک بار پھر بحیرۂ خزر کی بندرگاہ انزلی پر اتار دی۔ ادھر برطانوی حکومت ہندوستان نے بھی شاہی رسالے کے دو دستے شیراز بھجوا دیے۔ اب حکومت روس نے مطالبہ کیا کہ شوستر کو معزول کیا جائے اور آئندہ برطانوی اور روسی سفیروں کے مشورے کے بغیر حکومت ایران کوئی غیر ملکی مشیر مقرر نہ کرے۔

مجلس (پارلیمنٹ) نے غیر ملکی استعماری طاقتوں کے یہ تمام مطالبات پوری جرأت کے ساتھ مسترد کر دیے۔ اُدھر علماء نے ایک فتویٰ جاری کیا جس کے تحت انگلستان اور روس کی ہر طرح کی درآمدات ممنوع قرار دے دی گئیں۔ یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ یہ زمانہ برصغیر میں گاندھی کی ترکِ موالات سے پہلے کا دور تھا' فرق صرف یہ تھا کہ ایران میں ایسی تحریک کا محرک علماء کا ایک فتویٰ تھا۔ اس موقع پر شوستر نے اپنی کتاب ''اختناقِ فارس'' (Strangling of Persia) میں لکھا ہے کہ ایران میں روسی افواج کے اترتے ہی مردوں کے ساتھ ساتھ ایرانی عورتیں بھی ہر قربانی کے لیے تیار ہو

گئیں۔ وہ اگرچہ اَن پڑھ تھیں مگر وطن کی آزادی کی قدر و قیمت سے پوری طرح باخبر تھیں۔ وہ ہر روز اپنے گھریلو اخراجات سے کچھ رقم بچا کر دفاعی فنڈ میں جمع کرواتی تھیں۔ جب جوان مردوں کے دلوں پر خوف و ہراس طاری تھا اور مجلس کے اراکین کے پاؤں بھی ڈگمگا رہے تھے' ایک بار تین سو عورتیں اپنے چہروں پر نقاب ڈال کر اور چادروں میں پستول چھپا کر اچانک مجلس میں آ گئیں' یہاں انہوں نے نقاب پھاڑ ڈالے اور پارلیمنٹ کے اراکین کو دھمکی دی کہ اگر تم نے ملت کی شرافت اور حریت کی پاسداری نہ کی تو ہم تمہیں گولی مار کر خود بھی خودکشی کر لیں گی۔

بالآخر روسیوں نے مجلس کو محاصرے میں لے لیا اور اپنی استعماری شرائط من و عن تسلیم کرنے پر دباؤ ڈالا جو مجبوراً تسلیم کر لی گئیں اور شوسٹر کو ایران سے واپس امریکہ بھجوا دیا گیا۔

یہ تمام تر شرمناک مطالبات تسلیم ہونے کے باوجود روسیوں نے تبریز پر فوجی یلغار کر دی۔ بے گناہ عورتوں' بچوں اور مردوں کو سخت ایذائیں دے دے کر قتل کر دیا گیا۔ عین عاشورہ کے دن ایک متدین عالم دین ثقۃ الاسلام کو دو مجتہدین اور پانچ ایرانی افسروں سمیت تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا۔ گیلان میں دارالحکومت رشت اور بندرگاہ انزلی میں بھی نہتے عوام کے خون کی ہولی کھیلی گئی۔ بعد میں ۱۹۱۲ء میں مشہد میں عوام پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی گئی۔ حضرت امام رضاؑ کے روضے کے بیرونی حصوں کو زبردست نقصان پہنچا اور متعدد بے گناہ زائرین شہید ہوئے۔

ایران ابھی تباہ حالی سے دوچار ہی تھا کہ جنگِ عظیم اوّل کے منحوس سائے پوری دنیا پر منڈلانے لگے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی ایران متحارب جنگی قوتوں کے مفادات کی زد میں تھا۔ جرمنوں نے بوشہر میں ۱۸۹۷ء سے اپنا قونصل خانہ کھول رکھا تھا۔ انہوں نے حکومتِ ایران کی اجازت سے تہران میں ایک کالج بھی کھول لیا' جہاں جرمن استاد تعلیم دیتے تھے۔ علاوہ بریں انہوں نے اپنے کچھ تجارتی اڈے بھی قائم کر لیے۔ جنگ سے پہلے ایران میں روسیوں کا ایک قاذق بریگیڈ تھا جس میں آٹھ ہزار سپاہی اور افسر تھے اور

اس کا صدر مقام تہران تھا۔ مالیاتی وصولی کے لیے ژاندارمری کے نام پر سویڈن کی سات ہزار فوج بھی ایران میں موجود تھی جو شاہراہوں کا تحفظ بھی کیا کرتی تھی۔ یہ لوگ زیادہ تر صوبہ فارس میں مقیم تھے۔ ایران کے اپنے فوجی دستوں کی اپنے ہی ملک میں کوئی عسکری اہمیت نہیں تھی۔

ہر چند کہ ایران اپنے طور پر اِس جنگ میں غیر جانبدار رہا مگر جلد ہی اپنے جغرافیائی حالات اور داخلی کمزوریوں کی وجہ سے جنگ عظیم کے شعلوں کی لپیٹ میں آ گیا۔ روسی اور ترک ایران کے شمال مغربی علاقوں پر قابض ہو گئے اور روسیوں نے تو زبردست تیزی دکھاتے ہوئے ۱۹۱۶ء میں اپنے زیرِ اثر علاقے میں ریلوے کی پٹڑی بھی بچھا دی۔ وہ تبریز جیسے اہم شہر پر قابض ہو گئے۔ مغربی علاقے خوزستان میں قدرتی تیل کی ایک اہم پائپ لائن جو ۱۵۰ میل لمبی تھی اور کوہ تفتون سے اہواز کے راستے ابادان تک بچھائی گئی تھی، انگریزوں کی ملکیت تھی۔ اپنے عراقی مقبوضات سے پیش قدمی کرتے ہوئے ترکوں نے اس پائپ لائن کو تباہ کرنے کے لیے ایران کی حدود میں فوج کشی کر دی، مگر چند ایک ابتدائی فتوحات کے بعد ترک لشکر انگریزوں کے ہاتھوں پسپا ہو گئے۔

اب جرمنوں نے بھی ایران پر توجہ مبذول کر دی۔ انہوں نے ایران میں اپنا اثر و رسوخ قائم کرنے کے لیے پیسہ پانی کی طرح بہایا۔ لوگوں میں جدید اسلحہ بانٹا اور پیشہ ور لوگوں کو اپنی فوج میں بھرتی کرنا شروع کیا۔ قبائلیوں کو پراپیگنڈے اور پیسے کے زور پر اپنے ساتھ ملا لیا۔ ۱۹۱۵ء میں ترکوں نے کرمان شاہ کی طرف پیش قدمی کی تو کرمان شاہ کے جرمن قونصل جنرل نے اپنی پراپیگنڈا مہم تیز کر دی۔ اس دوران اصفہان میں ایک جرمن تاجر ایرانی لباس میں ملبوس ہو کر آیا اور اس نے اپنی چکنی چپڑی باتوں سے علماء اور عوام کو یقین دلایا کہ جرمن قوم حلقہ بگوشِ اسلام ہو چکی ہے اور ان کا بادشاہ قیصر ولیم ایک حاجی ہے۔ ان بہروپئے جرمنوں نے عیسائیوں کے خلاف بھی پراپیگنڈا شروع کر دیا۔ اس کے نتیجہ میں وہاں کا روسی نائب قونصل لوگوں کے ہاتھوں مارا گیا اور برطانوی قونصل جنرل پر بھی حملہ ہوا جس میں وہ سخت زخمی ہو گیا۔ شدید دباؤ کے نتیجے میں انگریز

اور روسی بھاگ کر اہواز آ گئے۔ سویڈن کے دستے بھی جرمنوں کے حامی تھے۔ جنوبی ایران میں جرمنوں نے استحکام حاصل کرنے کے بعد تہران کی جانب توجہ دی۔ روسیوں نے بھی اپنی افواج جرمنوں کو بھگانے کے لیے بھیجیں۔ جرمن اہلکاروں نے شاہ عبدالعظیم کے مزار کے احاطے میں احمد شاہ کو بلوایا۔ شاہ مسلسل گومگو کی کیفیت میں تھا' کبھی انگریزوں اور روسیوں کی سنتا کبھی جرمنوں کی' مگر اس نے بالآخر تہران میں رہنے کا فیصلہ کر لیا۔

ایران کو مسلسل اپنی سیاسی' فوجی اور انتظامی کمزوریوں کی سزا مل رہی تھی اور متحارب طاقتوں نے اسے اپنی آماجگاہ بنا رکھا تھا۔ اس دوران ایران پر کبھی ترک آ دوڑتے' کبھی روسی اور کبھی انگریز۔ جنوب میں انگریز ملیشیا ساؤتھ پرشین رائفلز (South Persian Rifles) کی مدد سے ایک بار پھر انگریزوں نے علاقے میں امن وامان قائم کیا۔ جنگ عظیم میں اتحادیوں کی فتح سے ایران کی جان تو چھوٹ گئی مگر برسرپیکار قوتوں کی بار بار فوج کشی کے نتیجہ میں یہ ملک تباہی و بربادی سے ہمکنار ہو گیا۔

عہد قاچاری میں اسلامی تحریکوں کا احیاء

گزشتہ صفحات میں سیاسی اور انتظامی حالات تفصیل سے پیش کیے گئے ہیں۔ ایک تو یہ ایران کے ماضی قریب کے تاریخی واقعات ہیں جن کو سمجھے بغیر ایران کے ذہن وفکر کا ادراک کچھ مشکل ہے۔ علاوہ بریں یہ حالات وہاں کی تہذیب وتمدن کے اہم ارتقائی دور سے متعلق ہیں' جس کو سمجھے بغیر قارئین ایران پر اسلام کے حالیہ اثرات کا پوری طرح ادراک نہیں کر سکتے۔ اب ہم خالصتاً مذہبی اور فکری نوعیت کے اُمور کا خلاصہ پیش کرتے ہیں۔

اوّلاً: قاچاری دور ایران میں عمومی طور پر بے چینی' مایوسی اور پریشانی کا دور تھا۔ مایوس عوام حالتِ یاس وفقر میں مذہب ہی کی جانب دیکھتے تھے اور اپنی مدد کے لیے خدا کو پکارتے تھے۔ ایران کا یہ دور یورپ کے عہد بیداری (Renaissance) سے مماثلت رکھتا ہے' جہاں تاریک دَور سے روشنی کی طرف سفر ہوتا ہے۔ ابھی تک ایران پر

مذہبی علماء اور مجتہدین کا گہرا اثر ونفوذ قائم تھا' بلکہ ان کی سماجی حیثیت مزید مستحکم ہو چکی تھی۔ صفوی دَور کے غیر ملکی شاہ پرست شیعہ علماء کی بجائے اب ایرانی علماء کے اثر ورسوخ کا دَور دَورہ تھا۔ ان کا مقصد اب صفوی طرز کی شیعیت کی تبلیغ ہی نہیں بلکہ ایک مایوس قوم کی سچی رہنمائی کرنا بھی تھا۔ ابتدائی عہدِ یاس والم میں جب علماء ابھی تک سرگرم نہیں ہوئے تھے اور ابھی سیاسی امور کی بابت اپنی رہنمائی سے لاتعلق تھے تو ایرانی عوام امامِ غائب کے ممکنہ ظہور کی جانب اپنی نظریں جمائے بیٹھے تھے۔ اس عقیدے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بابیت اور بہائیت کی ترویج ہوئی اور ان لوگوں کی کامیابی کے پس منظر میں مایوس اور تاریک حالات میں عوام کا قنوطیت اور اُمید کا جذبہ تھا۔ طاہرہ قرۃ العین کی صورت میں ہم آزادیٔ نسواں کی متحرک اور جاندار مگر ایک گمراہ کن صورت بھی دیکھتے ہیں۔

ثانیاً: شاہی استبداد سے نجات کے لیے عوام ایک عرصۂ دراز سے روزِ مکافات کے منتظر تھے' ایک بار پھر وہ اُمید بھری نظروں سے خدا کی جانب دیکھ رہے تھے۔ انہی حالات میں خدا اور بندے کے تعلقات کا نیا رُخ پیش کرتے ہوئے سید جمال الدین اسد آبادی (افغانی) نے جدوجہد اور تحرک کے لیے اسلام کا روشن پہلو اُجاگر کیا اور اپنی انتھک مساعی سے عوام کو میدانِ عمل میں لے آئے۔ لوگوں نے جان و مال کی قربانیاں دیں اور یہ ثابت ہو گیا کہ مذہبی فتویٰ آنے کے بعد عوام کے دلوں میں جوش وجذبہ کئی گنا بڑھ سکتا ہے۔ ہرچند کہ حضرت آیت اللہ حسن شیرازی کا فتویٰ من گھڑت ہی سہی' اس کے نتیجہ سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ اس کے بعد ایرانی سیاست پر مذہب کی گہری چھاپ پڑ گئی تھی اور علماء ومجتہدین کو واضح طور پر معلوم ہو گیا تھا کہ وہ اب مزید مصلحت سے کام لینے کی بجائے اعلیٰ عوامی قیادت کی اہلیت کا مظاہرہ کر سکتے ہیں۔ احمد شاہ کے زمانہ میں انگریزوں اور روسیوں کی درآمدات کا بائیکاٹ کرنے کے لیے بھی علماء کے فتویٰ نے اہم رول ادا کیا۔ یہی اسلوب بعد میں گاندھی نے اپنی تحریک ترکِ موالات میں اپنایا اور علماء کی تائید کے لیے اپنی تحریک کو تحریکِ خلافت سے وابستہ کر لیا۔ سید جمال الدین نے جس نہج پر ایرانی قوم کو ڈالا وہ بعد میں اسلامی انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔

ثالثاً : ہر چند کہ علماء کی اکثریت روایتی اُمور کی انجام دہی میں مشغول رہی مگر کچھ باہمت علماء مردِ میدان بھی ثابت ہوئے۔ جن علماء نے شاہ کا ساتھ دیا انہیں منہ کی کھانا پڑی تھی۔ یہ چیز ہم تمباکو کی تحریک کے موقع پر مسجد شاہ کے امام جمعہ کی عوام کے ہاتھوں بننے والی درگت میں دیکھتے ہیں۔ اسی طرح علماء کرام نے تحریک مشروطیت میں اہم کردار ادا کیا اور مجلس (پارلیمنٹ) میں بھی حق گوئی کے ریکارڈ قائم کیے اور پھر وقت پڑنے پر اپنی جان کی قربانیاں بھی دیں۔ ان واقعات نے علماء و مجتہدین میں بے پناہ اعتماد پیدا کیا' دنیاوی معاملات' بین الاقوامی حالات اور سیاسی امور پر ان کا مطالعہ وسیع ہوا' وہ عوام کے مسائل اور خارجی و داخلی حالات سے آگاہ ہوئے۔ اس طرح وہ محراب و خانقاہ سے باہر نکل کر میدانِ عمل میں اتر آئے۔

رابعاً : اسی دور میں عوام کی اسلام سے گہری وابستگی اور ان کی فطری سادگی کا علم ہوتا ہے۔ جرمنوں نے انگریزوں اور روسیوں کے خلاف (پہلی جنگ عظیم میں) یہ عجیب وغریب پراپیگنڈا کیا تھا کہ پوری جرمن قوم مسلمان ہو چکی ہے۔ اس طرح جرمنوں کے زیر اثر ایرانی روسیوں اور انگریز سفارتکاروں پر انہیں عیسائی سمجھتے ہوئے پل پڑے۔ عوام کو بادشاہوں نے بیرونی دنیا کے حالات سے قطعاً بے خبر رکھا ہوا تھا اور ایرانی قوم تاریخ کی بدترین جہالت کے دور سے گزر رہی تھی۔ سید جمال الدین اور دیگر لوگوں نے بیرونِ ملک سے جو تحریری مواد ایران بھجوانا شروع کیا تھا اس نے قومی بیداری کی جدوجہد میں اہم کردار ادا کیا۔ انقلابِ جمہوریت کے بعد نوّے کے قریب اخبارات اور مجلات ایران میں چھپنا شروع ہوئے۔ عوام کو خارجی حالات اور اپنے مسائل اور ان کے حل سے آگاہی نصیب ہوئی۔

خامساً : مذہبی مقامات کو سیاسی مراکز کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ ہر مشکل وقت میں لوگ بڑی تعداد میں درگاہ حضرت عبدالعظیم' تہران کی مسجد شاہ' قم میں مزارِ حضرت معصومہ اور دیگر مذہبی مراکز میں دھرنا مار کر مظاہرے کرنے لگے۔ اسی طرح علماء کے گھر اور خانقاہیں مظلوم عوام کی پناہ گاہوں میں تبدیل ہو گئیں۔ یہ سلسلہ بعد کے اَدوار میں بھی

جاری رہا۔

سادساً : شاہی دربار کا رعب اور ہیبت ختم ہونے لگا اور بادشاہوں کا روایتی دبدبہ اور ولولہ مشکوک ہوتا گیا۔ ناصرالدین قاچار جیسا طویل المدت بادشاہ سید جمال الدین کے ایک مرید کے ہاتھوں مارا گیا۔ محمد علی قاچار مجلس کے ہاتھوں معزول ہوا۔ ایران میں شاہ کی ذات جو خدا کا عکس سمجھی جاتی تھی' وہ اس دیومالائی مقام سے محروم ہوتی چلی گئی اور عوام میں بادشاہت' شاہی افواج اور دیگر ایجنسیوں سے ٹکرانے کا عزم اور حوصلہ پیدا ہو گیا۔

سابعاً : اس دور میں کچھ علماء شاہ کے بدستور وفادار اور روایتی تصورات کے امین بھی بنے رہے۔ ان کی وجہ سے آزادی کی تحریکوں کو کئی بار نقصان بھی پہنچا۔ علماء نے مجلس پر دباؤ ڈالا کہ عورتوں کو ووٹ کا حق نہ دیا جائے۔ شیخ فضل اللہ جیسے عالم نے مجلس (پارلیمنٹ) کی جانب سے پیش کردہ اصلاحات کی مخالفت کی۔ اسی طرح پریس کی آزادی کی بھی مخالفت کی گئی۔ شیخ فضل اللہ کے بقول پریس کی آزادی سے مخربِ اخلاق لٹریچر عام ہو جائے گا اور ولیٹر جیسے فرانسیسی مصنف کی رسول اللہ ﷺ کی شان میں گستاخی سے پُر کتب بھی چھپ جائیں گی۔ مجلس کے لوگ ہمارے مذہبی فنڈ ریلوے اور کارخانوں کی تنصیب میں خرچ کریں گے۔ یہ لوگ ایسی آزادیاں دینا چاہتے ہیں جن کی رُو سے دنیا کے تمام لوگ برابر ہو جائیں گے اور ایک دوسرے کی بیویاں بھی تبدیل کر سکیں گے۔ یہ آزادی' مساوات اور اخوّت زندہ باد تو کہتے ہیں' یہ لوگ آخر کیوں اسلام اور قرآن زندہ باد کا نعرہ نہیں لگاتے؟ افراسیابی اور دہقانی کی کتاب ''طالقانی اور تاریخ'' کے مندرجات کے مطابق ان لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ آئینی انقلاب کے پیچھے بہائیوں کا ہاتھ ہے جو آزادانہ طور پر اپنے کافرانہ عقائد کی ترویج کرنا چاہتے ہیں۔

علماء کے اس موقف سے شہ پا کر اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے جاگیردار اور قبائلی سردار بھی بادشاہ کی حمایت اور پارلیمنٹ کی مخالفت میں اتر آئے۔ ان تمام استحصالی طبقوں کے اتحاد کے باعث آئین کی دھجیاں اڑائی گئیں۔ روسی اور برطانوی استعمار نے ایران پر اپنے دانت گاڑ دیے اور عوام الناس شاہی جبر و استبداد کا شکار ہو کر رہ گئے۔

ایران کی پہلی اسلامی حکومت، مرزا کوچک

مرزا کوچک صوبہ گیلان کے دارالحکومت رشت کے ایک غریب خاندان میں پیدا ہوئے۔ آپ کا نام مرزا یونس تھا۔ آپ نے رشت کے سکول میں ابتدائی تعلیم کے بعد تہران کے دینی مدرسہ میں داخلہ لیا۔ علمی موشگافیوں سے اُکتا کر آپ جلد ہی تعلیم ادھوری چھوڑ کر میدانِ عمل میں اتر آئے۔ تہران میں قیام کے دوران آپ خفیہ تنظیم ''اتحاد اسلامی'' کے رکن بن گئے جسے سید جمال الدین افغانی نے اپنے استنبول میں قیام کے دوران تشکیل دیا تھا۔ تہران سے تنِ تنہا واپس وطن لوٹنے کے بعد آپ اپنے چار دوسرے انقلابی نوجوانوں کے ساتھ مل کر سرکاری فوج پر حملے کرنے لگے۔ پھر ان کے ساتھ مزید لوگ بھی ملتے گئے' یہ لوگ مزید گوریلا کارروائیوں کے لیے گیلان کے گھنے جنگل میں چلے گئے۔ ان لوگوں کے سر اور داڑھی کے بال بہت لمبے ہوتے تھے' کیونکہ انہوں نے قرآن پر حلف اٹھایا تھا کہ ایران کو روس اور برطانیہ سے آزاد کرائے بغیر یہ لوگ اپنے بال نہیں کٹوائیں گے۔ اس طرح اپنی چال ڈھال سے یہ لوگ طالبان سے ملتے جلتے تھے۔

مرزا کوچک خان نماز روزے کے پابند تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ انسان کا ہر عمل خدا کی رضا کے مطابق ہونا چاہیے۔ آپ نے عوام کو عصرِ حاضر کے فرعونوں کے سامنے پیغمبروں کے راستہ پر چلنے کی تلقین کی تھی۔ گیلان کے جنگلات میں بغاوت کے دوران شاہ کے روسی کمانڈر نے آپ کو تہران سے خط لکھا کہ اگر وہ اپنے ہتھیار ڈال دیں تو انہیں ایک محفوظ' خوشحال اور مرفہ حال زندگی گزارنے کی ضمانت دی جا سکتی ہے۔ اس خط میں روسی افسر نے قرآن پاک کے حوالوں سے گمراہ کن استدلال کرتے ہوئے لکھا تھا کہ آپ جیسے راست باز اور درویش منش انسان کی بغاوت کے باعث غریب عوام زبردست پریشانی کا شکار ہیں' اس لیے کہ اس طرح کے تخریب کارانہ اقدامات آپ جیسے مردِ کامل کو زیب نہیں دیتے۔ آپ نے جوابی خط میں لکھا کہ '' الفاظ کی شیرینی دراصل حق کو باطل کے دھندلکوں میں گم کرنے کے کام لائی جاتی ہے اور آپ صرف

قابلِ نفرت بادشاہ کی خوشنودی کے حصول کے لیے مجھے میرے عظیم مقصد سے ہٹانا چاہتے ہیں۔ مجھے برطانوی اہلکاروں نے تو ایران کی حکومت کی پیشکش بھی کر رکھی ہے، بشرطیکہ میں ان کا آلۂ کار بن جاؤں۔ میں نے انہیں اس لیے دھتکار دیا ہے کہ میں ایک عظیم مقصد کے حصول کے لیے کوشاں ہوں۔ یہ اسلام کا ابدی اصول ہے کہ جب کافر مسلمانوں کے مقدس وطن پر قابض ہو جائیں تو وہ جہاد کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔ انگریز اسلام اور انصاف کے ابدی تصور سے بے بہرہ ہیں، وہ تو صرف کمزور قوموں کو ہڑپ کرنا جانتے ہیں تاکہ انہیں غلامی کی زنجیروں میں جکڑا جا سکے''۔ مرزا کوچک نے (روسی انقلاب سے قبل) اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ وہ ظلم و استبداد میں پسے ہوئے عوام کی دادرسی اور آزادی چاہتے ہیں۔ انہوں نے لکھا: ''میرا جواب تمہیں بھی وہی ہے جو موسیٰ علیہ السلام کا فرعون کو اور رسول اللہ ﷺ کا ابوجہل کو تھا۔''

مرزا کوچک ایک منکسر المزاج اور سادہ طبیعت کے انسان تھے۔ ان کی تقریر سادہ ہوتی تھی اور ان کا مقصد غیر ملکی غلبہ سے آزادی، ناانصافی کا خاتمہ، ہر ایک کے لیے تحفظ اور انصاف کا آسان حصول اور آمریت اور شخصی استبداد کے خلاف مسلح جدوجہد کرنا تھا۔

ان دنوں شمالی ایران میں کئی بڑے جاگیرداروں نے روسی شہریت لے رکھی تھی اور وہ زارِ روس کی وفاداری کا دم بھرتے تھے۔ مرزا کوچک کا پہلا نشانہ ان لوگوں کی جائیداد تھی۔ آپ کے ہر ایکشن سے عوام کو آزادی نصیب ہوئی اور آپ کی تحریک کو مجاہدین اور اسلحہ کی کھیپ ملتی رہی۔ ۱۹۱۸ء میں یہ تحریک گیلان کے صوبے میں مکمل کامیابی سے ہمکنار ہو چکی تھی اور اب مازندران اور بحیرۂ خزر (Caspian Sea) کے اردگرد کے دوسرے صوبوں تک پھیل رہی تھی۔ یہاں کی حکومت ''اتحادِ اسلامی'' کی ایک کمیٹی کے سپرد تھی جس کا سرکاری اخبار ''جنگل'' کے نام سے شائع ہوتا تھا۔

زیر انتظام علاقے میں فوجی تربیت کے کیمپ قائم تھے جہاں پر دیہاتی نوجوانوں کو جنگی تربیت دی جاتی تھی۔ جونہی ۱۹۱۷ء میں روس میں کمیونسٹ انقلاب برپا ہوا، اس تحریک کو ایران میں بہت استحکام نصیب ہوا، کیونکہ زارِ روس کی حکومت کے خاتمے کے

باعث اب روس کی جانب سے انہیں وقتی طور پر کوئی خطرہ نہ رہا۔ روس کی نئی حکومت نے اپنے توسیعی عزائم جاری رکھے۔ ایک بار پھر ۱۹۲۰ء میں روسی دستے انزلی کی بندرگاہ پر اُترنے لگے۔ ان کا کوئی واضح مقصد نہیں تھا۔ انہوں نے ابتدا میں ایک ایسے برطانوی اڈے کو نشانہ بنایا جو برطانوی فوجی بہت عرصہ پہلے چھوڑ کر جا چکے تھے۔ تاہم روسیوں کی آمد کے موقع پر ایران سے بہت سے لوگ' جو کمیونسٹ انقلاب سے متاثر تھے' انزلی میں جمع ہو گئے (جو گیلان کے صوبے میں واقع ہے)۔ ان لوگوں نے اجتماعی طور پر مرزا کوچک خان سے رابطہ قائم کیا' کیونکہ آپ اب اس علاقے کے مسلمہ رہنما تھے۔ گزشتہ عہد کے برطانوی اور شاہی روس کے گٹھ جوڑ سے اپنی ازلی نفرت کے باعث مرزا کوچک نے انقلاب کے بعد کے روسیوں پر اعتماد کرتے ہوئے انزلی آنے کی دعوت قبول کر لی۔ آپ نے اعلان کیا کہ روسیوں سے ملنے میں آپ کا یہ مقصد ہے کہ وہ تمام دنیا اور انسانیت کے دشمن برطانیہ کو (جو روس کا بھی دشمن ہے) ایران سے نکال باہر کریں۔ روسیوں نے مرزا کوچک خان کے زیرانتظام علاقہ میں بالشویک جمہوری ریاستوں کی طرز پر ریاستیں بنانے کا مطالبہ کیا جو مرزا کوچک خان نے مسترد کر دیا۔ روسیوں نے پھر یہ تجویز پیش کی کہ مرزا کوچک خان ایرانی کمیونسٹوں کی پارٹی ''عدالت پارٹی'' کے اشتراک سے حکومت بنائیں۔ یہ تجویز اس لیے مسترد کر دی گئی کہ مرزا کوچک کے بقول ان لوگوں کو ایران کی روایات' بود و باش' اخلاقی اصولوں اور عوام کے عقائد وافکار کا کچھ علم نہیں تھا۔ مرزا کوچک اپنے مذہبی تصورات کو چھوڑنے پر تیار نہیں تھے۔

پھر مرزا کوچک سے روسیوں کا ایک معاہدہ طے پایا جس کے مطابق بالشویک طرز کا نظام گیلان اور دیگر علاقوں میں فی الحال قائم نہیں کیا جانا تھا' اپنے زیرِانتظام علاقے میں ایک انقلابی حکومت کا قیام عمل میں آنا تھا اور تہران کی فتح کے بعد عوام کی منتخب پارلیمنٹ کا قیام عمل میں لایا جانا تھا جس کی قائم کردہ حکومت کے معاملات میں روس کسی قسم کی مداخلت کا مجاز نہیں تھا۔ اسی طرح کچھ اور شرائط بھی اس معاہدے میں شامل تھیں۔

جون ۱۹۲۰ء میں کوچک خان نے رشت اور انزلی کی بندرگاہ پر قبضہ کرلیا اور اپنے مرکز منجیل سے شمال میں منتقل ہو گئے۔ اس طرح آپ کی انقلابی حکومت گیلان میں قائم کر دی گئی جسے روسیوں کا تعاون حاصل تھا اور اس علاقے میں لوگوں کی جان و مال اور جائیداد کا تحفظ اور اسلامی اصولوں کی پاسداری شامل تھی۔ اس وقت کے تہران میں مقیم برطانوی سفیر کے مطابق مرزا کوچک خان اس قدر مضبوط ہو چکے تھے کہ اگر وہ ۱۹۲۰ء میں حالات کا صحیح ادراک کر کے تہران میں داخل ہو جاتے تو کوئی چیز اُن کے مانع نہ ہوتی۔

اس وقت حکومت میں مرزا کوچک خان اور اُن کے مذہبی اور قوم پرست ساتھیوں کے علاوہ بورژوا دانشوروں کے طبقے کا نمائندہ احسان اللہ خان اور ایک کمیونسٹ خالو قربان (جسے عسکریت پسند گردوں کی حمایت حاصل تھی) شامل تھے۔ آہستہ آہستہ ان لوگوں کی آپس میں پھوٹ پڑ گئی اور کمیونسٹوں نے مرزا کوچک کے خلاف بغاوت کر دی۔ مرزا ایک بار پھر جنگل میں روپوش ہو گئے۔ مگر کچھ عرصہ کے بعد ان تمام لوگوں میں پھر تصفیہ ہو گیا اور مرزا کوچک خان کی قیادت تسلیم کر لی گئی۔ قصہ مختصر یہ کہ رضا خان نے جب گیلان کی جانب پیش قدمی کی تو مرزا جنگل میں چلے گئے اور پھر برفانی طوفان میں گھر کر فوت ہو گئے۔ ان کا سر کاٹ کر تہران لایا گیا' جہاں سے ان کے ایک فدائی نے ان کا سر دوبارہ وہاں سے نکال کر ان کے دھڑ کے ہمراہ گیلان میں سلیمان دارات کے مقام پر دفن کر دیا' جہاں ان کی قبر حریت اور آزادی کی نشانی کے طور پر موجود ہے۔

اپنی وفات کے چوالیس برس بعد ۱۹۶۵ء میں مرزا کوچک خان کے افکار ایک دفعہ پھر انقلابی نوجوانوں کے سامنے آنا شروع ہوئے۔ شہنشاہِ ایران کے خلاف سرگرمِ عمل مجاہدین خلق نے جنگل کی تحریک کی طرز پر اپنے مشن کا آغاز کیا۔ انہوں نے اپنے پہلے زیرزمین اخبار کا نام ''جنگل'' رکھا۔ ۱۹۷۹ء کے اسلامی انقلاب کے موقع پر مرزا کوچک کو قومی ہیرو کا درجہ دیا گیا اور ان کا ذکر روایتی مذہبی علماء نے بھی احترام سے کیا' جبکہ ان

کے پیش رَو مرزا کوچک کو کمیونسٹ قرار دے کر مطعون کرتے رہتے تھے۔ اس کا اظہار مرزا کوچک نے اپنی زندگی میں اس طرح کیا تھا:

''یہ امر افسوس ہے کہ ایرانی مردہ لوگوں کا احترام تو کرتے ہیں مگر کبھی زندہ لوگوں کی جدوجہد کی اہمیت کو تسلیم نہیں کیا کرتے۔ ہمارے بعد ایک ایسی صبح طلوع ہوگی جس کے اُجالے میں یہ لوگ جان لیں گے کہ ہم کون لوگ تھے اور کن لوگوں کے حقوق کے لیے لڑ رہے تھے۔ آج ہمیں لوگ رہزن اور ڈاکو کہہ لیں لیکن کل یہ ضرور ثابت ہو جائے گا کہ ہمارا ایک ایک قدم لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے تھا۔ ہم تمام الزامات سنتے رہیں گے اور فیصلہ اللہ پر چھوڑ دیں گے۔''؎

عمر بھر سنگ زنی کرتے رہے اہلِ وطن
یہ الگ بات ہے دفنائیں گے اعزاز کے ساتھ

اور بقول عرفانی: ؎

پس زمن آوای عشق پاکِ من
می دہد ای دوستان از خاکِ من
حرفِ عرفانی صدائے تو بود
ہوی و ہایش ہوی و ہائے تو بود

(اے میرے دوستو! میرے بعد میرے سچے عشق کا شور وغل اور ہنگامے میری خاک سے ابھریں گے۔ میری صدا تیری صدا بن جائے گی اور میری آہ وزاری تیری آہ وزاری بن جائے گی۔)

یہاں ایک چیز بہت اہم ہے اور اس کا ذکر اس لیے ضروری بھی ہے تاکہ برصغیر کے مسلمانوں کا جذبہ بھی ریکارڈ میں آ جائے کہ کس طرح انہوں نے اپنی مجبوریوں اور سادگی کے باوجود ایران میں اسلامی انقلاب کی بنیاد رکھنے میں مدد دی۔ یہ اس طرح ہوا کہ مرزا کوچک خان کو کچلنے کے لیے انگریزی فوج بھی شمالی ایران بھیجی گئی، اس میں سادہ لوح مسلمان فوجی بھی بڑی تعداد میں موجود تھے جن میں سے بیشتر کا تعلق پوٹھوہار سے تھا۔ یہ لوگ گیلان کے جنگلات میں فوجی کارروائی کر کے مرزا کوچک کے ساتھیوں کا

صفایا کرنے کے لیے بھجوائے گئے تھے۔ مسلمان سپاہیوں نے مرزا کوچک کا لٹریچر پڑھ کر (ان دنوں فارسی سمجھنا ہمارے نیم خواندہ لوگوں کے لیے بھی چنداں مشکل نہیں تھا) آپ کے مشن سے واقفیت حاصل کی۔ پھر اپنے مشاہدے اور تجربے سے یہ لوگ گوریلا جنگ لڑنے والے مسلمان انقلابیوں کی سرگرمیوں سے آگاہ ہوئے تو ان سے اس قدر متاثر ہوئے کہ فوج سے بھاگ کر مرزا کوچک خان کے دستوں سے جا ملے اور اپنے ایرانی بھائیوں کے شانہ بشانہ لڑنے لگے۔ ایک بڑی تعداد میں یہ لوگ جنگ لڑتے لڑتے شہید ہو گئے اور کافی تعداد میں اس چند روزہ اسلامی ریاست کے سقوط کے موقع پر گرفتار ہوئے۔ انہیں باندھ کر بغداد لایا گیا اور سب کے سب پھانسی چڑھ گئے۔ "اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلَھُمْ وَارْحَمْھُمْ" ۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک وخون غلطیدن

خدا رحمت کند این عاشقانِ پاک طینت را!

(خاک وخون میں لوٹ کر ان لوگوں نے کیسی اچھی رسم کی بنیاد رکھی! خدا ان نیک سیرت، مخلص اور جذباتی عاشقوں پر اپنی رحمت کا نزول فرمائے!)

اس طرح انقلاب کی بنیاد میں اپنا خون شامل کرنے والوں میں کچھ ہمارے سرپھرے لوگ بھی تھے جن کو خراجِ عقیدت پیش کرنا ہمارا فرض بنتا ہے۔

پہلوی دَور

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے' قاچاریوں کے عہد میں ایران طوائف الملوکی کا شکار تھا اور بادشاہ کی حیثیت غیر ملکی طاقتوں کے ہاتھوں ایک کٹھ پتلی کی سی رہ گئی تھی۔ برطانوی اور روسی افواج ملک میں آزادی سے دندناتی پھر رہی تھیں۔ اس زمانے میں ایک غیر معروف معمولی سپاہی رضا خان کو اقتدار نصیب ہوا۔ یہ شخص شمالی صوبہ مازندران میں ۱۸۷۸ء میں پیدا ہوا اور چودہ برس کی عمر میں جب فوج میں بھرتی ہوا تو بالکل اَن پڑھ تھا۔ فوج میں آنے کے بعد اس نے کچھ واجبی سی تعلیم حاصل کی اور آہستہ آہستہ ترقی کر کے کرنل کے عہدے پر فائز ہو گیا۔

اس نے چھوٹے چھوٹے خودمختار حکمرانوں کو شکست دیتے ہوئے ایک بار پھر ایران میں مرکزی اقتدار قائم کیا۔ تہران پر اپنے قبضہ کے بعد سید ضیاء الدین کو وزارتِ عظمٰی سے ہٹایا اور قوّام السلطنت کو وزارتِ عظمٰی سونپ کر خود وزیرِ دفاع بن گیا۔ پھر ایرانی فوج کی تنظیم نو کی اور اس کی تعداد ڈھائی ہزار سے بڑھا کر چالیس ہزار کر دی۔ آہستہ آہستہ مالیاتی اصلاحات پر توجہ دی اور ملس پاگ کی مدد سے ایران کا ایک متوازی بجٹ بنوایا۔ وہ اکتوبر ۱۹۲۳ء میں فوج کے سپہ سالار اور وزیر دفاع کے عہدوں کے ساتھ وزیراعظم بھی بن گیا۔ کئی چھوٹی چھوٹی قبائلی افواج کو غیر مسلح کیا' خودمختار ریاستوں کا قلع قمع کیا' مرزا کوچک خان کی گیلان کی ریاست کو ختم کیا اور پھر خوزستان کی طرف توجہ دی اور وہاں عرب شیوخ کا اثر و رسوخ ختم کیا۔

اسی زمانے میں ترکی میں ری پبلک پارٹی بنی تھی اور مصطفیٰ کمال پاشا نے وہاں خلافت کا خاتمہ کر کے جمہوریت کی داغ بیل ڈالی تھی۔ اس طرح ترکی کے تجربے سے متاثر ہو کر رضا خان نے ایران میں بادشاہت کے خاتمے اور اسے جمہوریہ بنانے کا عہد

کیا، مگر علماء نے اس مسئلے پر اس کا ساتھ نہ دیا۔

ترکی میں خلافت کے خاتمے سے علماء کو بہت دکھ پہنچا تھا اور وہاں پر جس طرح مذہبی اور قدیم روایات کی بیخ کنی کی گئی تھی اس سے ایرانی علماء بھی خائف تھے۔ شروع شروع میں رضا خان نے ایرانی عوام میں تحریک چلائی کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ملک سے بادشاہت کو ختم کر دیں، اور انہیں قُم میں جمع کیا، مگر علماء نہ مانے۔ مجلس میں ان کے نمائندے موجود تھے اور آیت اللہ مدرّس بہت بلند آہنگ پارلیمنٹیرین تھے۔ اس لیے علماء کے اصرار پر رضا خان نے بادشاہت کو برقرار رکھنے کا مطالبہ منظور کر لیا۔ بعد کے واقعات میں علماء کا یہ قدم بہت زیادہ حیرت و استعجاب کا باعث بنا ہے، مگر عموماً علماء (ماسوائے چند مواقع کے) ہمیشہ سے پرانی روایات کا ساتھ دیتے رہے ہیں۔ ۱۴ دسمبر ۱۹۲۵ء کو احمد شاہ کی ملک سے عدم موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے رضا خان نے رضا شاہ پہلوی کے نام سے تاج و تخت پر قبضہ کرنے کے بعد اپنی آمرانہ حکومت کا آغاز کیا اور اتاترک کے طریق اپنانا شروع کر دیے۔ اس موقع پر علامہ اقبال نے فرمایا:

نہ مصطفیٰ نہ رضا شاہ میں نمود اس کی
کہ روحِ شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی

بادشاہت سنبھالنے کے بعد رضا شاہ نے روسیوں سے معاہدہ کیا اور انگریزوں سے معاہدہ منسوخ کر دیا۔ ہمسایہ اسلامی ممالک سے بھی علیحدہ علیحدہ دوستی کے معاہدے کیے۔ ملک میں تعلیم کے فروغ کے لیے آدھے ملکی وسائل وقف کر دیے۔ جدید تعلیم کی علماء نے زبردست مخالفت کی مگر اسے وہ خاطر میں نہ لایا۔ ۱۹۳۵ء میں تہران میں یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔ فارسی زبان کی ترویج و ترقی کے لیے کام کیا اور صنعت و حرفت کو فروغ دیا۔ ملک بھر میں ریلوے کا وسیع جال بچھایا اور تیل کے چشموں سے ہونے والی آمدنی میں اپنا زیادہ حصہ مانگا۔

عورتوں کے پردہ کرنے پر پابندی عائد کر دی گئی اور پولیس کو حکم دیا گیا کہ جہاں کوئی عورت چادر اوڑھے ہوئے نظر آئے اسے زبردستی نوچ لیا جائے۔ جدید تعلیم اور

پردے کے خاتمے کے علاوہ رضا شاہ نے کئی ایسے اقدام کیے جن کے نتیجہ میں ایران مغربیت کی جانب مائل ہوا۔ اس وجہ سے علماء نے سخت احتجاج کیا۔ تمام لوگوں کے لیے رضا شاہ نے یورپین لباس لازمی قرار دیا اور پگڑی پہننے پر پابندی لگا دی۔ اب عمامہ صرف لائسنس پانے والے لوگ ہی پہن سکتے تھے۔ علماء نے جب سخت احتجاج کیا تو ان کے وظائف بند کر دیے گئے اور مقاماتِ مقدسہ سرکاری تحویل میں لے لیے گئے۔ پھر علماء کی آواز کو زبردستی دبا دیا گیا۔

اسی دوران دوسری جنگِ عظیم شروع ہو گئی' جس کے نتیجے میں ایران پر اتحادی قابض ہو گئے۔ رضا شاہ کو اپنے اٹھارہ سالہ بیٹے محمد رضا شاہ کے حق میں حکومت سے دستبردار ہونے کو کہا گیا اور اسے ۱۹۴۱ء میں جنوبی افریقہ کے شہر جوہانسبرگ میں جلاوطن کر دیا گیا' جہاں وہ ۱۹۴۴ء میں فوت ہو گیا۔ بعد میں اس کے تابوت کو نکال کر تہران کے نواح میں شہر ''رے'' میں دفن کیا گیا۔ اسلامی انقلاب سے پہلے وہاں سے اس کا تابوت نکلوا کر قاہرہ بھجوا دیا گیا جہاں اسے دفن کیا گیا۔

محمد رضا شاہ پہلوی (۱۹۴۱ء۔۱۹۷۹ء)

یہ اپنے باپ کی معزولی پر برسرِ اقتدار آیا۔ دوسری جنگِ عظیم کے خاتمہ پر اسے صحیح اقتدار ملا تو اس نے کل پرزے نکالے۔ یہ وہی دور تھا جب مختلف ممالک میں مغربی استعمار سے آزادی کی تحریکیں کامیابی سے ہمکنار ہو رہی تھیں۔ چین اور انڈونیشیا کی آزادی کے علاوہ برصغیر کی آزادی کے بعد دو اہم ملک ہندوستان اور پاکستان دنیا کے نقشے پر اُبھرے تھے۔ ایران پہلا ملک تھا جس نے پاکستان کو تسلیم کیا۔ اس بادشاہ کے زمانے میں مصدّق کے انقلاب (جس کا ہم آگے مفصل ذکر کریں گے) کا واقعہ پیش آیا۔ پھر تیل کی دولت سے مالا مال ہونے کے بعد ملک میں لوٹ کھسوٹ شروع ہوئی۔ عوام کی آواز کو کچلنے کے لیے جبر و استبداد کا ہر حربہ آزمایا گیا اور ساواک جیسی خوفناک خفیہ سرکاری تنظیم قائم کی گئی۔ آمرانہ شخصی اقتدار کا دور دورہ شروع ہوا۔ امریکیوں کو خصوصی حقوق دیے گئے اور انہیں ایرانی قوانین کے اطلاق سے مستثنیٰ قرار دیا گیا۔ امریکہ سے

دفائی معاہدے ہوئے اور ایران کی مضبوط مسلح افواج وجود میں آئیں۔

ہر چند کہ تعلیم کے فروغ اور نئی سڑکیں بنانے پر توجہ دی گئی، لیکن دیہات اور قصبات کے عوام جہالت کی پستیوں میں پڑے رہے۔ شراب نوشی کھلے عام ہونے لگی۔ فحاشی، عریانی اور مغربی طرز کی بے پردگی کا سیلاب آ گیا۔ ایران کو ایک مغربی اور سیکولر ملک کی صورت میں پیش کرنے کی ہر ممکنہ کوشش کی گئی۔ پریس کی آزادی چھین لی گئی۔ اظہارِ رائے کرنے والے حضرات کو قابل گردن زدنی قرار دیا گیا۔ خوشامد اور قصیدہ گوئی کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ فارسی سے عربی الفاظ باہر نکالنے کے لیے ''فرہنگستان'' کا ادارہ قائم کیا گیا۔ عوام کے پیسے کو رنگا رنگ تقاریب میں بہایا گیا۔ اسلامی عظمت پر فخر کرنے کی بجائے ڈھائی ہزار سالہ ایرانی بادشاہت کی یاد میں جشن منا کر اپنا ناطہ قبل از اسلام کی زرتشتی تہذیب سے جوڑنے کی کوششیں ہوئیں۔ مذہبی علماء کی زبان بند کر دی گئی یا وہ جلاوطن کر دیے گئے۔

ان حالات کے پیش نظر علماء، روشن فکر دانشوروں اور عوام الناس میں بے چینی اور بے زاری کی لہر دوڑ گئی۔ پھر نوجوانوں نے مجاہدین خلق اور فدائین خلق کے نام سے اپنی اپنی تنظیمیں بنا کر گوریلا کارروائیاں شروع کر دیں۔ ان کو کچلنے کے لیے جبر و استبداد کا ہر حربہ آزمایا گیا۔

اس صورت حال میں انقلابِ اسلامی کی راہ ہموار ہوئی۔ اگست ۱۹۵۳ء میں ڈاکٹر مصدق نے بادشاہت کا خاتمہ کرنے میں وقتی طور پر کامیابی حاصل کر لی، مگر اس وقت شاہ مغربی استعمار (امریکہ)، فوج اور علماء کی مدد سے واپس آ کر اپنے اقتدار پر متمکن ہو گیا۔ ۱۹۶۳ء میں سفید انقلاب کے نام پر شاہ نے جو اصلاحات لانا چاہیں وہ علماء کے لیے ناقابل قبول تھیں۔ آیت اللہ روح اللہ خمینی کی آواز پر ملک میں ہلچل مچی تو انہیں جلاوطن کر دیا گیا۔

جمال الدین افغانی کے افکار اور علامہ اقبال کے نظریات کو فروغ حاصل ہوا اور یہ انقلاب کی آواز بن گئے۔ ڈاکٹر علی شریعتی نے اسلام کی وضاحت سرگرم اور متحرک انداز

میں کی۔ انہیں (روایات کے مطابق) ۱۹۷۷ء میں لندن میں زہر دلوا کر مروا دیا گیا۔ آیت اللہ طالقانی جیسے عظیم مذہبی رہنما نے انتہائی خطرناک حالات میں قوم کی بے لوث قیادت کی اور امام خمینی کی ملک سے طویل جلاوطنی کے دوران فکری اور عملی قیادت کی کمی محسوس نہ ہونے دی ــــــ اور پھر اسلامی انقلاب آ گیا۔ اس کا ذکر آئندہ صفحات میں موجود ہے۔

ڈاکٹر محمد مصدّق کے جرأت مندانہ اقدامات

ڈاکٹر مصدّق ایک آزاد اور خودمختار ایران کے حامی تھے۔ بطور وزیراعظم ان کی یہ دلی خواہش تھی کہ بڑی طاقتوں سے ٹکر لیے بغیر ایران کے مفادات کا تحفظ کیا جائے۔ مصدّق سمجھتے تھے کہ ایران کے کسی ایک طاقت کی جانب جھکاؤ سے اس طاقت کا ملکی معاملات پر اثر ہونا لازمی امر ہے، کیونکہ بالآخر ملک کے سیاستدان دانستہ یا نادانستہ اس طاقت کے آلۂ کار بن جاتے ہیں۔ دراصل وہ مرزا کوچک خان کے الفاظ ہی دہرا رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ ایرانی معاشرے سے ان تمام آلودگیوں کا خاتمہ ضروری ہے جو وہاں کی سیاست، معیشت، سماجی اور ثقافتی معاملات میں ابھی تک موجود تھیں۔ اُس کا کہنا تھا کہ میں ایک ایرانی ہوں اور مسلمان ہوں اور جب بھی ایران اور اسلام کو خطرہ ہوگا تو میں اس کا ڈٹ کر مقابلہ کروں گا۔

مصدّق کو نیشنل فرنٹ کی حمایت حاصل تھی جس میں مختلف طبقات کی نمائندگی موجود تھی۔ اس میں آیت اللہ کاشانی بھی شامل تھے جو روایتی مذہبی رہنما تھے اور وہ فدائین اسلام کی قیادت کر رہے تھے، جس کا مقصد روایتی اسلامی نظریات کے خلاف کسی بھی تحریک کا مقابلہ کرنا تھا۔ یہ لوگ برطانوی اور روسی سامراجیت کے زبردست مخالف تھے، مگر امریکہ کی روس دشمنی کے باعث سرد جنگ کے اس ابتدائی دَور میں ان کا اس وقت جھکاؤ فطری طور پر امریکہ کی جانب تھا۔ ان دنوں برطانیہ کا عملی اور انتظامی کنٹرول ایران کے اس وسیع و عریض ڈھائی لاکھ مربع کلومیٹر علاقے پر تھا جو تیل کی دولت سے مالا مال تھا، اور صرف ابادان کی ریفائنری برطانیہ کے لیے سالانہ پچیس ملین ٹن صاف تیل مہیا

کرتی تھی۔ ۱۹۱۴ء سے ۱۹۵۰ء تک کے عرصے میں برطانیہ نے ۳۲۴ ملین ٹن ایرانی تیل برآمد کرنے کے عوض ایران کو صرف ۴۲۰ ملین ڈالر کی معمولی رقم ادا کی تھی جو تیل کی تمام آمدنی کا صرف آٹھ فیصد تھی، جبکہ اس دوران بحرین، سعودی عرب اور عراق کی حکومتیں تیل کی آمدنی کا بالترتیب ۳۵ فیصد، ۵۶ فیصد اور ۶۰ فیصد وصول کر رہی تھیں۔

عوام کی جانب سے جب ایرانی تیل کے قومیائے جانے کی تحریک نے زور پکڑا تو مصدّق ایک قومی ہیرو کی حیثیت اختیار کر گیا۔ برطانیہ نے اپنے استعماری مفادات کے تحفظ کے لیے اپنی بحریہ کو ابادان کے قریب تعینات کر کے ایران کو انتہائی نتائج کی دھمکی دے دی۔ مئی ۱۹۵۱ء میں مصدّق نے ایک کمیٹی تشکیل دی جس میں مہدی بازرگان بھی شامل تھے (جو انقلابِ اسلامی کے بعد پہلے وزیر اعظم بنے)۔ اس کمیٹی کے ذمے تیل کو قومیانے کے عمل کے لیے تفاصیل کی تیاری تھی۔ اس کمیٹی نے ایران کی قومی تیل کمیٹی تشکیل دی جس نے برطانوی کمپنی سے کنٹرول سنبھالنا تھا۔ برطانیہ اس کے لیے تیار نہ ہوسکا اور امریکی صدر ٹرومین نے بھی مصدّق کو دوبارہ مذاکرات کے لیے کہا۔ مصدّق کے اقدامات نے تیل پیدا کرنے والے دیگر ممالک میں بھی بے چینی کی لہر پیدا کر دی اور دنیا میں ہلچل مچ گئی۔ اسی کشمکش کے نتیجہ میں مصر کے شاہ فاروق کا تختہ الٹا گیا، اور جمال عبدالناصر نے نہر سویز پر قبضہ کر لیا۔

علماء نے ایک بار پھر بادشاہ کی حمایت میں مصدّق کے اقدامات کو کمیونسٹ اثرات کے زیر اثر ہونے کا الزام دیتے ہوئے اس پر طرح طرح کے الزامات لگانا شروع کر دیے۔ اس دوران شیعہ دنیا کے عظیم ترین رہنما حضرت آیت اللہ العظمیٰ بروجردی نے شاہ پرست اراکین مجلس کے ہمراہ پہلوی بادشاہت کے حق میں مدرسہ فیضیہ قُم سے ایک زبردست جلوس نکالا، جس میں مصدّق کے اقدامات کی کھلم کھلا مذمت کی گئی۔ حتیٰ کہ علماء کے زبردست دباؤ کے نتیجہ میں آیت اللہ کاشانی بھی مصدّق کی حمایت سے دستبردار ہو گئے اور انہوں نے ایک ایسی اسلامی کانفرنس کے انعقاد کا بے وقت مطالبہ کر دیا جو منشیات کے پھیلاؤ، بدعنوانی اور قحبہ گری کے مسائل کا جائزہ لے، جو ان کی نظر میں ان دنوں

مسلمان نوجوانوں کو درپیش تھے۔ اس کا مقصد عوام کی توجہ اس مسئلے سے ہٹا کر دیگر معاملات کی جانب مبذول کرنا تھا۔

تیل کے مسئلے سے توجہ ہٹانے کے لیے اب آیت اللہ کاشانی نے حکم دیا کہ اُن مغرب زدہ خواتین کے چہروں پر تیزاب پھینکا جائے جو پردے کے بغیر گھر سے نکلتی ہوئی پائی جائیں۔ علماء نے نعرہ لگایا کہ اسلام خطرے میں ہے اور مصدق کا اقتدار ایک کمیونسٹ نظام کا قیام ہے۔ کمیونسٹ پارٹی کو بدنام کرنے کے لیے کئی دوسری چالیں چلی گئیں۔ آیت اللہ محمود طالقانی کے بقول رات بھر طلبہ اور علماء کمیونسٹ پارٹی کی جانب سے آیت اللہ بہبہانی کے گھر بیٹھ کر علماء کو دھمکی آمیز جعلی خطوط لکھتے رہے۔ یہ خط سرخ سیاہی سے لکھے گئے، اور ہزاروں علماء کو ارسال کیے گئے۔ انہیں لکھا گیا کہ بہت جلد ہم تمہاری پگڑیوں سے باندھ کر تمہیں ذلیل ورسوا کر کے سر عام پھانسی دینے والے ہیں۔ مزید برآں کرائے کے لوگوں سے تہران کی سڑکوں پر اسلام کے خلاف نعرے بھی لگوائے گئے۔

اس کے نتیجہ میں آیت اللہ العظمیٰ بروجردی نے مفرور شاہ کو رُوم میں ایک تار بھیجی جس میں کہا گیا کہ شیعیت اور اسلام کو آپ کی ذات کی اشد ضرورت ہے اور آپ جلاوطنی ترک کر کے فوراً واپس تشریف لے آئیں۔ اس تار میں یہ بھی لکھا گیا تھا کہ چونکہ آپ شیعیت سے وابستہ ہیں اور آپ کے سفر شیعوں اور شیعیت کے تحفظ کے لیے ہیں اس لیے آپ ہوائی سفر سے اجتناب فرمایا کریں۔

اب فوج، علماء اور امریکہ کی مدد سے شاہ ملک میں واپس آ گیا۔ تہران کے ہوائی اڈے پر شاہ کا استقبال کرنے والوں میں حضرت آیت اللہ بروجردی بھی موجود تھے۔ ۱۸/اگست ۱۹۵۳ء کو تہران میں کرائے کے غنڈوں کے غول داخل ہو گئے اور لوٹ مار کرنے لگے۔ ان کے جواب میں جنرل زاہدی نے ٹینکوں اور توپوں کی مدد سے تہران میں داخل ہو کر شہر پر قبضہ کر لیا اور مصدق گرفتار ہو گیا۔ اس تمام عمل پر امریکہ کی سی آئی اے کا کل خرچ تین لاکھ نوے ہزار ڈالر اٹھا۔

اس موقع پر بھی علماء کا کردار مشکوک نظر آتا ہے، کیونکہ پہلوی بادشاہت کو اقتدار کی بازیابی میں ان کی تمام تر ہمدردیاں ایک بار پھر شاہ کے ساتھ تھیں۔

آیت اللہ خمینی کی جدوجہد

اِن دنوں آیت اللہ روح اللہ خمینی قُم کی اسلامی درس گاہ میں شرع، فلسفہ اور روحانیت کے اُستاد تھے، اور ۱۹۶۲ء میں آیت اللہ العظمیٰ بروجردی کی وفات کے بعد انہوں نے نئے آیت اللہ العظمیٰ کی حیثیت سے شیعہ دنیا میں شہرت حاصل کی۔ آپ نے یہ بھانپ لیا تھا کہ ملک کا بادشاہ دین کو ریاست سے علیحدہ کر کے تیزی سے مغربیت کی اندھی تقلید کی جانب قدم بڑھا رہا ہے اور یہودیت اور سامراجیت کا مکمل طور پر آلۂ کار بن چکا ہے۔ آیت اللہ خمینی نے انتہائی جرأت مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے آوازِ حق بلند کی۔ اسی دوران ۱۹۶۱ء کی آئینی تبدیلیوں کے نتیجہ میں عورتوں کو ووٹ کا حق عطا ہوا۔ اسی طرح سرکاری عُمال کو حلف برداری کے لیے قرآن پاک کی بجائے اپنی پسند کی کسی بھی مذہبی کتاب (جس کا وہ پیروکار ہو) پر حلف اٹھانے کی اجازت مل گئی۔ اسی طرح جداگانہ انتخابی نظام کو ختم کر کے ایک غیر مسلم انتخابی امیدوار کے لیے بھی مسلمان ووٹوں کا حصول ممکن بنا دیا گیا۔ عورتوں اور مردوں کو برابری کے حقوق دیے جانے کو بھی آیت اللہ خمینی نے تباہی، بدعنوانی اور قحبہ گری کے دروازے کھل جانے پر محمول کیا۔ ان آئینی تبدیلیوں سے قبل وہ بھی باقی روایتی مذہبی رہنماؤں کی طرح شاہ کے حامی اور مؤید سمجھے جاتے تھے۔ جب شاہ نے ۱۹۶۲ء کے مقامی کونسلوں کے انتخاب میں علماء کے دباؤ پر عورتوں کو ووٹ کے برابر کے حقوق دینے کا قانون واپس لے لیا تو خمینی نے شاہ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا تھا کہ اعلیٰ حضرت شہنشاہ نے قرآنی تعلیمات کی پاسداری کی ہے۔ انہوں نے شاہ کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے شاہ کی وفاداری کے لیے لوگوں سے درخواست کی، کیونکہ شاہ ان کی نظر میں (اُس وقت) آئین، آزادی اور ملک کے تحفظ کے سرپرست کی حیثیت رکھتا تھا۔

لیکن ۱۹۶۲ء میں اپنے نام نہاد انقلابِ سفید کے ذریعے شاہ نے جب مذہبی رہنماؤں کی پوزیشن پر کاری ضرب لگانا چاہی اور لوگوں سے زمینیں چھیننا چاہیں تو آیت اللہ خمینی نے اپنی آواز بلند کرتے ہوئے ایک بار پھر عورت کے ووٹ کے حق کی مخالفت کی۔ انہوں نے شاہ سے مطالبہ کیا کہ ۱۹۰۶ء کے آئین کو امامِ غائب کے ظہور تک اپنی اصلی حالت ہی میں برقرار رہنے دیا جائے۔ عورت کے ووٹ کی مخالفت کے علاوہ خمینی نے عورتوں کے سرکاری اور غیر سرکاری دفتروں میں کام کرنے کی بھی مخالفت کی' کیونکہ اُن کے نزدیک اِس سے جنسی بے راہ روی اور فحاشی پھیلنے کا خطرہ تھا۔ ۲۱ مارچ ۱۹۶۳ء کو عیدِ نوروز کے موقع پر قُم کے مدرسہ فیضیہ میں عوام کے پُر جوش اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے اپنے دیگر مطالبات کو دُہراتے ہوئے واشگاف الفاظ میں اعلان کیا:

''ایران کی جابرانہ شخصی حکومت نے اسلام کے اصولوں کی خلاف ورزی کی ہے۔ یہ حکومت اٹھارہ برس کی لڑکیوں کو زبردستی فوجی ڈیوٹی کے لیے لے جانا چاہتی ہے۔ یہ پاکباز خواتین کو فحاشی کی جانب دھکیل رہی ہے۔ غیر ملکی کفار کا نشانہ اب قرآنِ حکیم اور علماءِ اسلام ہیں اور شاہ ان کا آلۂ کار بنا ہوا ہے۔ یہ ہمیں تباہ و برباد اور قید کر کے امریکی اور اسرائیلی یہودیوں کو خوش کرنا چاہتا ہے۔ آج کا دن ایران بھر میں یومِ ماتم کے طور پر مناتے ہوئے میں اس حکومت کے خاتمے کی فیصلہ کن جدوجہد کا اعلان کرتا ہوں' تاکہ ایک اسلامی اصولوں پر مبنی حکومت برسرِ اقتدار آسکے جسے ایرانی عوام سے ہمدردی ہو۔''

پھر شاہی فوج مدرسہ فیضیہ میں داخل ہوگئی۔ اس کی ظالمانہ کارروائی کے نتیجہ میں ایک درجن افراد مارے گئے اور سو کے قریب لوگ بری طرح زخمی ہو گئے۔ اس کے جواب میں ایران کی تاریخ میں پہلی بار آیت اللہ العظمیٰ نے عوام سے شاہی حکومت کی برطرفی کی تحریری طور پر اپیل کی۔ اب محرم کا مہینہ آنے والا تھا۔ انہوں نے ایران کی ایک لاکھ بیس ہزار مساجد کے ائمہ کو اپنا فرمان ارسال کیا اور پہلوی بادشاہ کی صورت میں یزیدِ وقت کے ظالمانہ اقدام کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ ۱۹۶۳ء میں جو محرم

کے ماتمی جلوس تہران اور دیگر شہروں میں نکلے' ان میں سیاسی عنصر غالب نظر آنے لگا۔ عاشورہ کے موقع پر خمینی نے ایک بار پھر سخت الفاظ میں اپنے مطالبات دہرائے اور ان کی تقریر نے ملک بھر میں آگ لگا دی۔ اب زبردست مظاہرے شروع ہو گئے۔ قُم میں ایک دن میں فوج کے ذریعے حالات پر قابو پالیا گیا' مگر تہران میں تین دن تک عوام اور فوج کا زبردست مقابلہ جاری رہا۔ مذہبی راہنماؤں کے مطابق اس دوران پندرہ ہزار افراد مارے گئے جبکہ شاہ کے مطابق مرنے والوں کی تعداد صرف چھپن (۵۶) تھی۔

شاہ نے کمیونسٹ عناصر اور رجعت پسند علماء کے باہمی اتحاد کے الزامات عائد کرتے ہوئے عہد کیا کہ انقلاب کا راستہ روکنے والوں کا صفایا کر دیا جائے گا۔ اس سے پہلے وہ آیت اللہ خمینی پر مصر کے صدر ناصر کا ایجنٹ ہونے کا الزام بھی عائد کر چکا تھا۔ روسی خبر رساں ایجنسیوں نے نہ صرف ان واقعات کے خلاف طرح طرح کی باتیں بنائیں بلکہ اس تحریک کو رجعت پسند علماء کی جدوجہد قرار دیا۔ فرانسیسی رسالے ''لی مونڈ'' (Le Monde) کے ایک مضمون کے مطابق ''اگرچہ علماء کی اکثریت تاجروں اور زمینداروں کے مسائل سے لاتعلق رہی ہے' لیکن خمینی اور ان کے پیروکاروں کا رویہ ان سے قطعاً مختلف ہے۔'' اس طرح دراصل آیت اللہ خمینی جو بات کر رہے تھے وہ عوام کے دلوں کی بات تھی۔ ان انقلابی مساعی کے نتیجہ میں جناب خمینی گرفتار کر لیے گئے۔ اس پر تمام آیت اللہ تہران میں جمع ہوئے اور شاہ کو پیغام بھجوایا کہ وہ غیر ذمہ دارانہ اقدام سے گریز کرے۔ مارچ ۱۹۶۴ء میں انہیں رہا کر دیا گیا اور وہ قُم واپس چلے گئے۔

اب خمینی کی تقاریر عوام کے مسائل کے بارے میں عوام کے دلی جذبات کی ترجمانی کرتی تھیں۔ انہوں نے ۴ جون ۱۹۶۴ء کو یومِ ماتم منانے کا اعلان کیا لیکن اس کے لیے جو بلیٹن شائع کیا گیا اس پر صرف دو تین آیت اللہ حضرات کے دستخط موجود تھے' کیونکہ مذہبی رہنماؤں کی اکثریت یا تو اس سے قطعی طور پر لاتعلق تھی یا پھر اس کی اشاعت کی مخالف تھی۔ اس طرح ۴ جون کو آیت اللہ خمینی وسیع پیمانے پر عوام کو میدان میں لانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

اس دوران ایک سرکاری بل پاس ہوا جس کے تحت ایران میں مقیم امریکیوں پر ایران کے قانون کی پابندی کی ضرورت باقی نہ رہی اور ایران میں قیام کے دوران انہیں ڈپلومیٹک تحفظ (diplomatic security) حاصل ہو گیا۔ عوام کے غم و غصہ کی ترجمانی کرتے ہوئے آیت اللہ خمینی نے ۲۶/اکتوبر ۱۹۶۴ء کے دن (جب شاہ اپنی پینتالیسویں سالگرہ کا جشن منا رہا تھا) ایک تقریر میں اس بل کی سخت مخالفت کرتے ہوئے ملک میں پھیلتی ہوئی بے حیائی اور فحاشی کی سخت ترین الفاظ میں مذمت کی اور صاف لفظوں میں اس حکومت کو امریکی آلۂ کار قرار دیا۔

۴ نومبر ۱۹۶۴ء کو آیت اللہ خمینی کو ساوک نے قُم سے گرفتار کر لیا اور مہرآباد ایئرپورٹ سے خصوصی پرواز پر ترکی پہنچا دیا۔ وہاں سے وہ عراق چلے گئے جہاں چودہ برس تک نجف میں مقیم رہے۔ جلاوطنی کے چند ہی یوم بعد اُن کے پیروکاروں کے ایک گروپ نے (جو فدائینِ اسلام کے نام سے موسوم تھا) ملک کے وزیراعظم حسین منصور کو قتل کر دیا۔ پھر آخر میں سید جمال الدین کی طرح خمینی کو پیرس جانا پڑا۔ پیرس کے قیام کے دوران بین الاقوامی پریس اور دیگر خبر رساں ایجنسیوں نے خمینی کے پیغامات کی اشاعت میں اہم کردار ادا کیا۔

چونکہ گزشتہ قاچاری دور میں علماء کو وسیع پیانے پر زمینیں اور جاگیریں دی گئی تھیں اس لیے وہ بھی جاگیردارانہ طبقہ میں شامل تھے، اور ذاتی مفادات پر زد پڑنے کی وجہ سے ان کی شاہ کے انقلابِ سفید کی مخالفت کو لوگ قدرے شک کی نظر سے دیکھتے تھے۔ مزید برآں ملک کے روشن فکر دانشور، اس کے باوجود کہ وہ شاہ کے مخالف تھے، عورتوں کے ووٹ کے حق کی مخالفت نہیں کرتے تھے۔ مہدی بازرگان کی تحریک آزادی نے اس لیے آیت اللہ خمینی کا ساتھ دیا تھا کیونکہ یہ لوگ شاہ کے مخالف تھے۔ ان تمام عوامل کے باوجود یہ تحریک بھی دب کر رہ گئی اور اگلے پندرہ برس ڈاکٹر علی شریعتی، مجاہدینِ خلق، فدائینِ خلق اور خود جناب خمینی کو اپنے اپنے مخصوص انداز میں شاہی نظام کے خلاف سخت جدوجہد کرنا پڑی، جس کے نتیجہ میں ایران میں انقلاب کی راہ ہموار ہو سکی۔

مجاہدین خلق: راہِ حق کے مجاہد

پہلوی استبدادی نظام نے آزادیٔ رائے کے اظہار کی تمام راہیں مسدود کر دی تھیں اور جمہوری جدوجہد کا کوئی امکان باقی نہ رہا تھا۔ ایسے میں کچھ متدین نوجوان اُٹھے اور انہوں نے فکری تربیت سے مہم کا آغاز کیا۔ اس اجتماعیت کے اراکین پر لازم تھا کہ پہلے وہ قرآن پڑھیں' اسے سمجھیں' حضرت علیؓ کی نہج البلاغہ کو سمجھیں' اسلامی اور ایرانی تاریخ کا مطالعہ کریں اور اس کے ساتھ گوریلا جنگ کے لیے عسکری تربیت حاصل کریں۔ ارکان کا انتخاب بڑی مشکل سے ہوتا تھا اور پھر انہیں دو برس تک متواتر مذہبی اور عسکری تربیت دی جاتی تھی۔ اس تحریک کے پانچ بانی اراکین تھے جو تہران یونیورسٹی کے گریجوایٹ تھے' ان کا قائد ستائیس سالہ حنیف نجاد تھا۔ اس تحریک کا آغاز ۱۹۶۵ء میں ہوا۔ یہ لوگ مہدی بازرگان کی تحریک آزادی سے متاثر تھے اور آیت اللہ محمود طالقانی نے انہیں مذہبی تعلیم و تربیت کی ضرورت پر قائل کیا تھا۔ حنیف نجاد نے امام خمینی کی ۱۹۶۳ء کی جدوجہد میں بھی حصہ لیا تھا اور جیل میں طالقانی کی رفاقت میں قرآن کے انقلابی پیغام سے گہری واقفیت حاصل کی تھی۔ باقی چار بانی ارکان میں سے سعید محسن (سفید پوش گھرانے کے انجینئر)' علی اصغر بدیع زادگان (تہران یونیورسٹی میں کیمسٹری کے استاد) اور احمد رضائی (سکول ٹیچر' جن کے تین بھائی اور ایک بہن بعد میں ساوک کے ہاتھوں شہید ہوئے) کے نام آتے ہیں۔ ان لوگوں نے اپنی مہم کا آغاز وہیں سے کیا جہاں مرزا کوچک خان نے چھوڑا تھا۔ یہ لوگ اسلامی جذبے سے سرشار تھے اور جبر و استبداد' سرمایہ داری' استعماریت اور روایتی مذہبی قیادت (شاہ پسند) کے مقابلے میں میدانِ عمل میں اترے تھے۔

ان لوگوں کا خیال تھا کہ ایرانی عوام نے کبھی بھی سرفروشی اور قربانی سے دریغ نہیں کیا تھا۔ ماضی میں انقلابی تحریک کی ناکامی کی وجہ دراصل مناسب مذہبی تربیت کی کمی' راہِ عمل اور منزل مقصود کا صحیح تعین نہ ہونا اور قیادت کا فقدان تھا۔ لوگ ایک آدھ وزیر کو قتل کر کے یا اعلیٰ عہدے پر فائز کسی ایک شخص کو عہدے سے ہٹا کر مطمئن ہو جاتے تھے

اور طویل المیعاد مقاصد کے حصول سے بے خبر تھے۔ پہلی تحریکوں میں لوگ مذہبی جذبات تو رکھتے تھے مگر مذہبی نظریات سے قطعاً بے خبر تھے' یہ لوگ فکری اعتبار سے خام تھے۔ اب ضرورت اس امر کی تھی کہ اسلام کے بنیادی نظریات کی وضاحت کی جائے۔ مثلاً یہ کہ انسان کیا ہے؟ اسلام کے معاشی پہلو کیا ہیں؟ اسی طرح موجودہ افکار و حالات کی رو سے کافر اور منافق کی اصطلاحات کی وضاحت کی جائے۔ اسی طرح دنیا کے آغاز اور اس کے منتہائے مقصود کا علم ہو اور تاریخ کے فلسفے کو بیان کیا جائے۔

گزشتہ تحریکوں میں قیادت اور انتظامی ڈھانچے کا فقدان بھی تھا۔ تحریک میں ایک آدھ قائد ہوتا تھا اور اس کے خاتمے سے تحریک دم توڑ جاتی تھی۔ مرزا کوچک خان اور ڈاکٹر محمد مصدق کی مثال ان کے سامنے تھی۔ اسی طرح ان تحریکوں کی قیادت کو سماجی معاملات' انقلاب کی صحیح غرض و غایت' انقلابی تحریک میں مزاحمت کے پہلو اور اس کی مقصدیت کا علم نہیں تھا۔

دینی تربیت حاصل کرنے کے بعد ان لوگوں نے فکری اور عسکری تربیت کی جانب توجہ دی اور اُردن میں شاہ حسین کے خلاف لڑنے والے فلسطینیوں کے کیمپوں میں جا کر ۱۹۷۱ء میں جنگی تربیت حاصل کی۔ جب ان لوگوں کی تعداد دوسو تک پہنچ گئی تو انہوں نے محمود اصغری زادہ کی قیادت میں تہران میں بجلی کی ترسیل کے نظام کو نقصان پہنچایا۔ شاہ کے ایک امریکی فوجی مشیر اور تہران پولیس کے سربراہ کو قتل کر دیا۔ کوکا کولا فیکٹری کی عمارات کو بم سے اڑا دیا۔ ایک ہوائی جہاز کو اغوا کرنے کی ناکام کوشش بھی کی اور صدر نکسن کی ۱۹۷۲ء میں ایران آمد کے موقع پر متعدد مقامات پر بم دھماکے بھی کیے۔

۱۹۷۲ء میں انہیں اس وقت مصیبت کا سامنا کرنا پڑا جب تودہ پارٹی (کمیونسٹ پارٹی) کے قیدی رکن شاہ مراد دلفائی نے ساوک کی حراست میں ان کے بعض اہم ارکان کی نشاندہی کی۔ یہ سب قید ہوئے۔ دو وقتی طور پر بھاگ نکلے اور نوے افراد نے اللہ اکبر' استعمار مردہ باد اور شاہ مردہ باد کے نعرے لگاتے ہوئے شاہ کے فوجیوں کے ہاتھوں گرفتار شدہ حالت میں موت کو قبول کر لیا۔

مجاہدین نے جب تاریخ کا مطالعہ کیا تو انہیں معلوم ہوا کہ گزشتہ کئی صدیوں سے مفاد پرست' ابن الوقت اور ہوس کے پجاری علماء نے ایران میں اسلام کی غلط توجیہات پیش کر کے صحیح توحیدی معاشرے کو قائم ہی نہیں ہونے دیا' بلکہ اسلام کی تعلیمات کو توہمات کے خول میں بند کر کے ظالمانہ بادشاہت اور استبدادی نظام کے استحکام میں مدد دی ہے۔قرآن پاک کی غلط توجیہات سے معاشرے کو گہری نیند سلانے کی کوشش کرتے ہوئے ان لوگوں نے اسلام کی صحیح روح سے لوگوں کی توجہ ہٹائے رکھی ہے۔اس طرح مجاہدین کی نظر میں آج جو اسلام کی شکل نظر آرہی تھی وہ اُس اِسلام سے بالکل مختلف تھی جو رسول اللہ ﷺ نے پیش کیا تھا۔۱۹۷۲ء میں جب مہدی رضائی پر گرفتاری کے بعد مقدمہ چلایا گیا تو ان سے پوچھا گیا تھا کہ آپ کس جہاد کی بات کر رہے ہیں؟ جہاد یا تو اپنے نفس کے خلاف ہوتا ہے یا پھر کافروں کے خلاف؟ ہر چند کہ مہدی رضائی کو موت کی نیند سلا دیا گیا مگر حکومت وقت کی اصلیت سامنے آ گئی' کیونکہ علماء کی شہ پر ایران کے تمام بادشاہ خود کو ظلّ اللہ' خلیفۃ اللہ اور اسلام کا سر پرستِ اعلیٰ سمجھتے ہوئے حق کی آواز کو دباتے رہے ہیں۔

مجاہدین کے خیال میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی پیشین گوئی اب پوری ہو چکی ہے کہ ایک وقت آئے گا جب قرآنی مطالب کو مسخ کر دیا جائے گا' اسلام کا فقط نام باقی رہ جائے گا' قرآن کے کاغذ پر حروف ہی رہ جائیں گے اور اس کی اصل روح ختم ہو جائے گی۔ مجاہدین کے تصورات کے مطابق تاریخ کے مختلف اَدوار میں تمام تر کامیاب انقلاب خدا کے پیغمبروں نے ہی برپا کیے تھے۔انہوں نے کمزوروں (مستضعفین) کو روئے زمین کی حکومت عطا کی تھی۔انہوں نے تاریک ادوار میں مساواتِ انسانی کا تصور پیش کیا تھا۔سورۃ الحدید کی آیت ۲۵ کے مطابق ''ہم نے انبیاء کو واضح دلائل کے ساتھ کتاب اور میزان دے کر بھیجا تا کہ لوگ اُٹھ کھڑے ہوں اور انصاف پر مبنی معاشرہ قائم کریں۔'' خدا کے دشمنوں نے انبیاء علیہم السلام کے راستوں کو مسدود کرنے کی کوشش کی تھی اور اس خوف سے کہ کہیں غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی انسانیت ان کا ساتھ دینے پر نہ اتر آئے'

انہوں نے انبیاء کے ساتھیوں کو قتل کرنے یا قید و بند کی صعوبات دینے میں تأمل سے کام نہیں لیا تھا۔ علاوہ بریں، انبیاء کے مشن کے خلاف غلط پراپیگنڈا کیا گیا تھا تاکہ لوگوں کے دلوں میں شک و شبہ پیدا کر کے انبیاء کو ان سے الگ تھلگ کر دیا جائے۔ موجودہ ایران اور دیگر اسلامی ممالک میں بھی رجعت پسندانہ سیاسی نظام کو بچانے کے لیے بادشاہوں اور حکومتوں نے علمائے سوء کی سرپرستی کرتے ہوئے اس امر کی ہر ممکن کوشش کی تھی کہ اسلام کے سماجی انصاف پر مبنی نظام کو قائم ہونے سے روکا جا سکے اور لوگوں کو شکوک و شبہات میں مبتلا کر دیا جائے۔ بادشاہِ وقت اور اس کے زیرِ سرپرستی زندگی بسر کرنے والے علماء کو اس بات کا خوف لاحق رہا ہے کہ اگر کہیں اسلام کی صحیح روح بیدار ہونے لگی تو پیشہ ور مُلّا اپنے اثر و رسوخ سے محروم ہو جائیں گے، چنانچہ یہ ایک فطری عمل تھا کہ بادشاہِ وقت اس بات کا پراپیگنڈا کرواتا رہا ہے کہ ''مجاہدین خلق اور ان کا ساتھ دینے والے علمائے حق مارکسسٹ، دہشت گرد اور گمراہ ہیں، اس لیے وہ قابل گردن زدنی ہیں۔''

مجاہدین نے اس کا جواب یوں دیا کہ مکر و فریب کی آڑ میں شاہ کے اسلام کے سرپرستِ اعلیٰ ہونے کے تمام دعوے یزید کے دعوؤں کی طرح ہیں اور انہی دعوؤں کی آڑ میں تیرہ سو برس قبل خلافت کی بجائے اسلامی دنیا میں ملوکیت کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ اور آہستہ آہستہ عالمِ اسلام میں وہ لوگ برسرِ اقتدار آ گئے تھے جنہوں نے زمانہ قبل از اسلام کے شاہانِ فارس و روم کے روپ میں جبر و استبداد کا نظام قائم کر دیا تھا۔ مجاہدین خلق نے کہا کہ زبان سے تو شاہ ایران اسلام کی بات کر رہا ہے، مگر یہودیوں کو اس لیے پٹرول دے رہا ہے کہ وہ مظلوم فلسطینیوں پر بمباری کر سکیں۔ دوسری جانب وہ ڈھائی ہزار سالہ ایرانی بادشاہت کے جشن مناتے ہوئے سربراہانِ مملکت کو فرانس کی پچاس سال پرانی شراب پیش کر رہا ہے۔ حق گوئی کی پاداش میں جناب خمینی کو ظلم و تشدد کا نشانہ بنا کر جلاوطنی کی سزا دینے کا نام ہی کیا اسلام ہے؟ شاہ جس اسلام کا نام لے رہا ہے یہ استعماریت کا اسلام ہے۔ استعماری طاقتیں اسلام کے نام پر ہی غلامی کی لعنت مسلط کر کے مسلمان ممالک کے تمام وسائل ضبط کرنے کے درپے ہیں اور شاہِ ایران جیسے کٹھ پتلی حکمرانوں کے تعاون سے

غریب مسلمانوں پر غلامی کی لعنت مسلط کر رہی ہیں۔ ہم (مجاہدینِ خلق) کوئی نیا دین تو پیش نہیں کر رہے، بلکہ اسلام تو شروع ہی سے انقلابی دین رہا ہے جس نے مظلوموں کی دادرسی کی ہے۔ شاہ مسلمانوں کی بیداری اور انقلابی اسلام سے خوفزدہ ہے اور آج وہ یہ کہہ رہا ہے کہ مسلمان انقلابی نہیں ہوسکتا، یا تو کوئی شخص انقلابی بن سکتا ہے یا مسلمان رہ سکتا ہے۔ درحقیقت سچا مسلمان تو ہر صورت میں انقلابی ہی ہوگا، کیونکہ اسلام جبر واستبداد اور اخلاقی بے راہ روی کا مقابلہ کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ بدعنوانی کے خلاف جہاد ہی تو اسلام ہے۔ آزادی کی خواہش اور استحصالی قوتوں کا قلع قمع کرنا ہی تو عین اسلام ہے۔

مجاہدینِ خلق نے برملا کہا کہ اگر شاہ کے استبدادی نظام کا نام اسلام ہے تو خدانخواستہ تمام ایران کافر ہو چکا ہے۔ اگر محنت کش عوام کا خون چوسنا، کسانوں اور مزدوروں کی محنت کے ثمرات کو لوٹنا، یہودیوں اور امریکیوں کے اشارے پر ناچنا، قلعوں اور محلات میں زندگی گزارنا، پرائیویٹ ہوائی جہازوں کی ملکیت (جب کہ غریب عوام روٹی کو ترستے ہوں)، نہتے طلبہ اور مزدوروں کو گولیوں سے اُڑانا، مجاہدین کی ماؤں، بہنوں، بچوں اور عزیز واقارب پر ظلم وستم کا بازار گرم کرنا اور بھوکے اور مظلوم عوام کے کروڑوں ڈالر ڈھائی ہزار سالہ بادشاہت کی تقاریب میں پانی کی طرح بہانے کا نام ہی اسلام رہ گیا ہے تو ہم ایران کے تمام عوام کے ساتھ یہ اعلان کرتے ہیں کہ ہم غیر مسلم ہیں اور صرف بادشاہ، اس کے تنخواہ دار علماء اور حاشیہ بردار مفاد پرست لوگ ہی مسلمان رہ گئے ہیں، جو اس کے فرعونی نظام کے تحفظ کے لیے رات دن کوشاں ہیں۔ ہمارے لیے یہ امر باعث سعادت ہے کہ کسی نہ کسی صورت میں تو ہم بادشاہت کے دشمن ہیں۔

مجاہدین خلق نے جب ایران میں زور پکڑا تو شاہ کی خفیہ تنظیم ساواک نے اپنے ظلم واستبداد کی انتہا کر دی، جس کی نظیر قرونِ مظلمہ میں بھی نہیں ملتی۔ مجاہدین کے سامنے شہادت سے کم گویا کوئی منزل ہی نہیں تھی۔ آہستہ آہستہ اس تحریک میں دی جانے والی قربانیوں کے نتیجے میں اُمید کی کرنیں پھوٹنا شروع ہوگئیں اور یوں محسوس ہونے لگا کہ عہدِ غلامی کی تاریک رات اپنے اختتام کے قریب پہنچ رہی ہے۔ مجاہدین کے تصورات کا

سرچشمہ خدا کا ابدی پیغام اسلام تھا' جس کے سماجی پہلو آہستہ آہستہ روشن ہو رہے تھے اور آہستہ آہستہ ایران کے نوجوان ان کے گرد جمع ہونے لگے تھے۔ اب مجاہدین نے اسلام کو استعماریت' استحصال اور جبر و استبداد کے خلاف ایک انقلابی نظریے کے طور پر اپناتے ہوئے انسان کی سماجی و معاشی زندگی کے مسائل کی جانب توجہ دینا شروع کر دی۔ ان لوگوں نے حضرت علیؑ ' مرزا کوچک خان' اپنے شہید ساتھیوں' مہدی رضائی اور فاطمہ امینی کو ماڈل کے طور پر پیش کرنا شروع کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مارکسسٹ اشتراکی نظریات ایران میں غیر مقبول ہونا شروع ہو گئے۔ اس کا اثر یونیورسٹیوں اور دانشوروں کے طبقات پر بھی پڑنے لگا۔ اسلامی نظریات کی مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ایران میں اسلام کے ساتھ جذباتی اور سماجی تعلق ابھی تک معاشرے میں بہت گہرا تھا۔ حکومتِ وقت اس تنظیم کو ختم کرنے میں ناکام رہی اور اس کی مقبولیت بڑھتی چلی گئی۔

اس دوران کچھ روایتی علماء نے ایک فتویٰ بھی جاری کر دیا جس کے مطابق مجاہدینِ خلق کافر قرار دیے گئے۔ اس کے جواب میں مجاہدین نے یہ موقف اختیار کیا کہ گزشتہ کئی برسوں سے منافق اور بدنیت علماء نے بادشاہ کو اللہ کا عکس (ظلّ اللہ) قرار دینا شروع کیا ہے اور بادشاہ خود کئی بار یہ دعویٰ کر چکا ہے کہ وہ خدا کا سب سے بڑا مقرب ہے اور اسے حضرت عباس علمدار اور حضرت امام مہدی کا تحفظ حاصل ہے۔ اس کے علاوہ کافی عرصے سے پیشہ ور علماء نے عوام میں انقلابی روح کو کچلے رکھا ہے' جس کی وجہ یہ ہے کہ بادشاہ نے جُبّہ و عمامہ میں ملبوس لوگوں کو حرص و ترغیب اور مالی منفعت کا لالچ دے کر خریدنا شروع کر رکھا ہے' جنہیں اسلام کی روح کا قطعاً کوئی علم نہیں ہے۔ اس طرح شاہ نے انقلابیوں اور عوام کے درمیان خلیج کو وسیع تر کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ بادشاہ تو مجاہدین کی شہادت کے بعد ان کے مردہ جسموں سے بھی خائف ہے' اسی لیے تو انہیں ورثاء کے سپرد کرنے سے بھی انکار کر رہا ہے۔ اسے تو یہ بھی ڈر ہے کہ کہیں ان کی قبریں بھی انقلابیوں کی جدوجہد کے مراکز نہ بن جائیں' اس لیے ان پر کمیونسٹ' کافر' چور' ڈاکو' دہشت گرد اور غدار ہونے کے بے معنی الزامات عائد کر رہا ہے۔

انقلابِ ایران کے فکری و عملی راہنما

۱۹۷۰ء کی دہائی میں مجاہدین پر قیامت ٹوٹتی رہی‘ انہیں بڑے پیمانے پر گرفتار کر کے موت کے گھاٹ اتارا جاتا رہا اور وہ عزم و ہمت کی شاندار روایات قائم کرتے رہے‘ لیکن ان میں کچھ ایسے بھی تھے جو انقلاب کی صبح کو طلوع ہوتا دیکھ سکے۔ ان لوگوں کے پیچھے آیت اللہ طالقانی اور ڈاکٹر علی شریعتی کی شخصیات تھیں اور یہ لوگ فکرِ اقبال سے جذباتی حد تک متاثر تھے۔ اب ہم ان شخصیات کا مختصر جائزہ پیش کرتے ہیں۔

ڈاکٹر علی شریعتی: مفکرِ انقلاب

زندگی: دسمبر ۱۹۳۳ء میں خراسان کے ایک چھوٹے سے گاؤں مازینان میں پیدا ہوئے جو صحرائے کویر کے ایک کونے میں واقع ہے۔ ان کے والد مجتہد استاد تقی شریعتی ایک عظیم عالم دین تھے اور مشہد میں حقانیت اسلام کی ترویج کے مرکز کے بانی تھے‘ جس کی بنیاد طاہر احمد زادہ کے ساتھ مل کر ۱۹۴۱ء میں رکھی گئی تھی۔ اسی طرح ۱۹۵۲ء میں استاد تقی شریعتی نے مہدی بازرگان کی تحریک آزادی میں مؤسس رکن کے طور پر شرکت کی تھی‘ جس میں ان کے علاوہ آیت اللہ طالقانی‘ طاہر احمد زادہ اور ڈاکٹر یداللہ جیسے عظیم دانشور شامل تھے۔

ڈاکٹر شریعتی نے ۱۹۵۶ء میں مشہد یونیورسٹی کی فیکلٹی ادبیات میں داخلہ لیا۔ یہاں سے ڈاکٹر علی شریعتی نے دو محاذوں پر اپنی جنگ کا آغاز کیا۔ ان کا پہلا نشانہ روایتی علماء اور رجعت پسندوں کا طبقہ تھا جنہوں نے خود کو اپنی ذات کے خول میں بند کر کے اسلام کو توہمات کے مجموعے کے طور پر پیش کرتے ہوئے‘ اسے عوام کی روزمرہ زندگی کے مسائل سے نکال باہر کیا تھا اور دوسرا طبقہ ان نام نہاد ترقی پسندوں کا تھا جو مغرب کی اندھی تقلید میں مگن تھے۔ ڈاکٹر شریعتی ۱۹۵۸ء میں سرکاری وظیفہ پر فرانس چلے گئے جہاں انہوں نے اگلے پانچ برس تک پیرس میں مذہبی تاریخ اور سماجی علوم کا مطالعہ کیا۔ ۱۹۶۰ء میں انہوں نے پروفیسر ماسیکتان کی نگرانی میں اپنی ڈاکٹریٹ کی تحقیق کا آغاز کیا۔ اس دوران

دنیا بھر کی سماجی تحریکوں اور اسلام کی انقلابی رُوح کا مطالعہ کیا' اور ۱۹۶۴ء میں اپنی بیوی اور دو بچوں کے ہمراہ ایران آ گئے۔ انہیں ملک کی سرحد پر ہی گرفتار کرلیا گیا۔ چنانچہ اگلے چھ ماہ انہوں نے جیل میں گزارے۔

رہائی کے بعد ڈاکٹر شریعتی کو ایران کی کسی بھی یونیورسٹی میں پڑھانے سے روک دیا گیا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے گاؤں کے قریب ایک دُور دراز قصبے کے سکول میں پڑھانا شروع کر دیا۔ ۱۹۶۶ء میں انہیں مشہد یونیورسٹی میں اسسٹنٹ پروفیسر کا عہدہ پیش کیا گیا' لیکن ان کے مذہب اور سماجی مسائل کے علم سے خائف ہو کر ملازمت سے فارغ کر دیا گیا۔ ۱۹۶۷ء میں تہران آ گئے اور ''حسینیہ ارشاد'' کے نام سے ایک تدریسی ادارہ قائم کیا۔ اگلے چھ برس تک آپ اسلامی علوم کی تدریس اور تصنیف و تالیف میں سرگرم رہے۔ اس دوران اپنے شاگردوں کو اسلام کی اصل روح سے آشنا کروایا اور ثابت کیا کہ بدلتے ہوئے حالات میں اسلام کا مکمل ضابطہ حیات کس طرح مسائل کا حل پیش کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ اس ادارے کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ ۱۹۷۳ء میں گرمیوں کے سیشن میں چھ ہزار طلبہ نے یہاں پر داخلہ لے لیا۔ اب حکومت نے اس ادارے پر پابندی عائد کر دی۔ ۱۹۷۲ء میں جب شریعتی نے علامہ اقبال کے افکار و نظریات پر ہفتہ بھر کا ایک سیمینار منعقد کروایا تو ان پر مسجدوں کے منبروں سے طرح طرح کے الزامات عائد کیے گئے۔ ان کو سنّی' وہابی' بہائی' مارکسسٹ اور نہ جانے کیا کیا کہا گیا' اور علماء نے یہ الزام لگایا کہ ایک سنّی شخص (اقبال) کے افکار کی ترویج کر کے شریعتی نے اپنے غیر شیعہ ہونے کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ اس طرح آپ کے ادارے کو بھی کافرستان قرار دے دیا گیا۔ ادارہ بند ہوتے ہی شریعتی کو گرفتار کر لیا گیا۔ سال بھر اذیتیں دے کر بھی جب ساواک کو اپنا مطلوبہ مقصد حاصل نہ ہو سکا اور ڈاکٹر علی شریعتی کے پائے استقلال میں لغزش نہ آ سکی تو ان کے بوڑھے والد جناب استاد تقی شریعتی کو بھی عقوبت خانے میں ڈال دیا گیا۔

نومبر ۱۹۷۴ء سے مارچ ۱۹۷۵ء تک ڈاکٹر شریعتی کو قیدِ تنہائی میں رکھ کر بے حد

اذیتیں دی گئیں۔ ملکی اور بین الاقوامی سطح پر ہونے والے احتجاج کے پیش نظر جناب شریعتی کو مارچ ۱۹۷۵ء میں قید سے رہا تو کر دیا گیا مگر ان کی تبلیغی مساعی پر پابندی عائد کر دی گئی۔ ڈاکٹر شریعتی ۱۶ مئی ۱۹۷۷ء کو خاموشی سے لندن چلے گئے اور ۱۹ جون ۱۹۷۷ء کو لندن کے مضافات میں اپنے چھوٹے سے گھر میں مردہ پائے گئے۔ عام خیال یہی تھا کہ ساواک کے کارندوں نے ان کو زہر دے کر ہلاک کیا تھا۔ ایک سرکاری اعلامیہ کے مطابق ڈاکٹر علی شریعتی کو ایک عظیم سکالر کے طور پر سراہتے ہوئے ان کی وفات پر افسوس کا اظہار کیا گیا۔ انہیں دمشق میں حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی بہن حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے پہلو میں دفن کیا گیا۔

طریق کار: ڈاکٹر علی شریعتی نے اپنے تصورات کے مطابق اسلام کے انقلابی پیغام کو عام کرنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقۂ کار اپنانے کا دعویٰ کیا ہے' جو روایتی' انقلابی اور اصلاحی تحریکوں سے مختلف تھا۔ روایتی لوگ معاشرے کی اقدار کو نہیں چھیڑتے' کیونکہ اس طرح ان کے خیال میں معاشرے کی بنیادیں ختم ہو جاتی ہیں' اس کے برعکس انقلابی لوگ تمام قدیم اقدار کا یکسر خاتمہ چاہتے ہیں تاکہ ایک نئے دور کا ماضی سے الگ تھلگ ہو کر آغاز کیا جا سکے۔ اصلاحی تحریکوں میں اعتدال کی راہ اختیار کی جاتی ہے مگر اس میں بہت عرصہ درکار ہوتا ہے' لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریق کار بالکل مختلف تھا۔ آپؐ نے مختلف اقدار کو باقی رہنے دیا مگر ان کے معانی تبدیل کر دیے۔ چونکہ لوگ مختلف رسوم و رواج سے صدیوں سے آشنا تھے اس لیے انہیں اچانک ختم نہیں کیا بلکہ ان کی روح' مقصدیت اور عملی معانی ایک دم بدل دیے۔ یہ طریق کار سب سے کامیاب رہا۔ مثلاً اسلام سے پہلے بھی ہر برس حج کیا جاتا تھا۔ طوافِ کعبہ کا مقصد پہلے بتوں کی پرستش' اسلاف کی تعظیم اور توہمات کا استحکام ہوتا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کا ڈھانچہ تو کافی حد تک وہی رہنے دیا مگر اس کے معانی یکسر بدل دیے۔ اس سے لوگوں میں ایک دم ذہنی تبدیلی رونما ہوگئی' اس لیے عربوں کو اچانک نسل ہا نسل سے مروّج طریقِ کار کو ایک دم ختم کرنے کے صدمے سے نہ گزرنا پڑا۔ اس کی بجائے انہوں نے یوں سمجھا جیسے حج کا اصل

پہلو سامنے آنے سے اس مقدس فریضے میں موجود ہر طرح کی آلائشوں کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ اس لیے رسول اللہ ﷺ کا طریقہ اپنا کر معاشرے سے تعلق ایک دم منقطع نہیں ہو جاتا۔ چونکہ ایرانی مسلمان تھے اس لیے ان کی اسلامی روایات کا احیاء ممکن تھا' بلکہ وہ کسی نہ کسی رنگ میں ان روایات (مسخ شدہ حالت میں ہی سہی) کی پاسداری کرتے چلے آ رہے تھے۔ اگر کوئی ایسا معاشرہ ہو جس میں کوئی پختہ اقدار و روایات موجود نہ ہوں تو وہاں یہ سب کچھ ممکن نہیں تھا۔

حج کی مثال دیتے ہوئے شریعتی نے کہا کہ طواف سے مراد انسانی تصورات کے ارتقاء کا سفر ہے' جب وہ مسلسل اپنی تکمیلِ ذات کی طرف رواں دواں ہونے کا تصور ذہن میں لاتا ہے۔ حج کے روحانی پہلو کے ساتھ ساتھ اس عمل کی سیاسی اور سماجی جہتیں بھی نہایت خوبصورت انداز میں اُجاگر کی گئیں۔ شریعتی کے خیال میں جن تین شیطانوں کو کنکریاں ماری جاتی ہیں وہ آج کے دور میں سرمایہ داری' جبر واستبداد اور مذہبی منافقت کے مظاہر سمجھے جا سکتے ہیں۔ یہاں پر توحید کے معنی اس آیت قرآنی سے مشتق ہیں' جس میں کہا گیا ہے کہ انسان کو ایک ہی واحد جان سے پیدا کیا گیا ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ﴾ (النساء:۱)۔ اس طرح تمام بنی نوعِ انسان کو وحدت کے رشتے میں سمو دیا گیا ہے۔ اسی طرح حج وہ عمل ہے جس میں انسان حضرت ابراہیم علیہ السلام کے طریقے پر عمل کرتے ہوئے قدیم روایات کے بتوں کو پاش پاش کرنے پر اتر آتا ہے اور اپنے معاشرے میں اُن تعلقات کو ختم کر دیتا ہے جو اُس کے مشن کے حصول کے لیے غیر ضروری ہوں۔ اسی طرح آپ مقامِ ابراہیمؑ پر کھڑے ہو کر اپنے ربّ سے یہ وعدہ کریں کہ آپ بنی نوع انسان کو ظلم' جہالت اور رجعت پسندی کی آگ میں جلنے سے بچائیں گے۔ طوافِ کعبہ کرتے ہوئے آپ یہ عہد کریں کہ لوگوں کو جمود اور بے مقصد زیست کی حدود و قیود سے آزاد کر کے انہیں اسلامی معاشرے کے افراد میں تبدیل کریں گے۔ خدا کی راہ میں جدوجہد کے لیے تقویٰ اپنانا ہوگا' اس کے لیے آپ کو ایک ذمہ دار ''باغی'' بننا ہوگا اور معاشرے کی غلط اَقدار سے بغاوت کرتے ہوئے اپنے

آپ کو لوگوں کے جائز مسائل کے حل کے لیے کوشاں ہونا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ درویشی اور رہبانیت اختیار کر کے اگر کوئی دوسروں کے مسائل سے لاتعلق ہو جائے تو پھر وہ تقویٰ اختیار نہیں کر سکتا۔ جہاد کا مقصد یہ ہے کہ آپ خود کو خطرات کے شعلوں کی نذر کر کے باقی لوگوں کو تحفظ فراہم کر رہے ہیں۔ مجاہد بننا کوئی آسان کام نہیں' اس کے لیے سرفروشی' جان نثاری اور ایثار کی راہیں اپناتے ہوئے قید و بند کی صعوبات' ظلم و ستم' تکالیف اور بے شمار خطرات کا سامنا کرنا ہوگا اور جلاوطنی اور سزائے موت کے لیے تیار رہنا ہوگا۔

رسول اللہ ﷺ کی راہ پر چلتے ہوئے توحید کو اپنانا ہوگا۔ شریعتی کے بقول توحید کے سماجی' مادی اور انسانی پہلو بھی ہیں۔ ان سے مراد انسانیت کی وحدت کی اساس فراہم کرنا ہے تاکہ مختلف طبقات کے لوگوں کو مساوات کے نظام میں مربوط کیا جا سکے۔ توحید سے مراد ایک خدا ہے اور ایک ہی انسانیت ہے تاکہ خدا اور بندے کے باہمی روابط کی داغ بیل ڈالی جا سکے۔ آپ کے نزدیک انسان ملکوتی اور حیواناتی جبلتوں کا امتزاج ہے۔ حیوانی پہلوؤں کو دبا کر ہی یہ ممکن ہے کہ انسان کے ملکوتی پہلو اُجاگر ہو سکیں تاکہ انسان خدا کا تقرب حاصل کر سکے۔ انسان خدا کی رضا کا مظہر ہے اور وہ تکمیلِ ذات کے مراحل سے گزر کر خدا کا قرب حاصل کر سکتا ہے۔ انسان اپنے خاکی اور روحانی پہلوؤں کی موجودگی میں ایک ثنویت (Dualism) کا شکار رہے۔ یہ جنگ ہابیل اور قابیل کے معرکے میں واضح نظر آتی ہے۔ ہابیل قدیم دور کا نمائندہ ہے جب زندگی گلہ بانی کے گرد گھومتی ہے اور ذاتی ملکیت کا تصور نہیں' جبکہ قابیل اس دَور کی نمائندگی کرتا ہے جب انسان کاشتکاری کی طرف مائل ہوتے ہوئے ذاتی ملکیت کے تصور سے آشنا ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ہی اس میں سفلی جذبات بھڑک اٹھتے ہیں۔ اس باہمی جھگڑے سے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے جب خدا کی زمین اور اس کے وسائل (مثلاً پانی) پر انسان اپنی ذاتی ملکیت کا دعویٰ کرتا ہے۔ یہ مضمون بڑے دلچسپ پیرائے میں ان کی کتاب ''خدا و بشر'' میں بیان کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر شریعتی توحید اور شرک کے سماجی پہلوؤں پر بھی بحث کرتے ہوئے ایک معاشرے میں سماجی' اخلاقی اور نسلی تضادات کو شرک گردانتے ہیں'

جبکہ خلوصِ نیت اور باہمی ہم آہنگی کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے احکامات کی پیروی میں قائم ہونے والے متحدہ معاشرے کو توحیدی معاشرے کا نام دیتے ہیں۔

عقائد: راقم الحروف کو ڈاکٹر شریعتی کی کچھ کتب مثلاً ''خدا و بشر''، ''شہادت''، ''اقبال دما'' اور ''خطاب بادوستانِ آشنا'' کے مطالعے کا موقع ملا ہے۔ انہوں نے ہر موقع پر روایتی اسلوب سے ہٹ کر معاملات کی انقلابی انداز میں وضاحت فرمائی ہے۔ مثلاً ''خطاب بادوستانِ آشنا'' (جو غالباً اُن کی آخری کتاب ہے) میں ان خیالات کا اظہار کیا ہے کہ میں شیعہ ہوں اور شیعیت میں امامت کا واضح تصور ہے جس کے مطابق امام میں اعلیٰ انسانی صفات اور قائدانہ خوبیاں موجود ہوتی ہیں، مگر جب میں حضرت زین العابدینؒ کو دیکھتا ہوں تو مجھے وہ خوبیاں نظر نہیں آتیں، کیونکہ مجھے وہ یزید کے دربار میں اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کا اظہار کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اسی طرح موسیٰ کاظمؒ کی مثال دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب ہارون الرشید مدینہ میں آتا ہے تو اس کی خواہش ہے کہ بنو ہاشم پر روا رکھے جانے والے ماضی کے ظلم و ستم کا کچھ مداوا کیا جا سکے تو وہ آپ کی درخواست پر آپ کی مالی اعانت کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ شریعتی کے بقول اگر مجھے کوئی امامت کا اہل نظر آتا ہے تو وہ احمد بن حنبلؒ کی ذاتِ گرامی ہے جو ظلم و ستم سہتے ہیں اور ان کے پائے استقامت میں لغزش نہیں آتی۔ دراصل رواداری کا یہ وہ مشکل مقام ہے جہاں پر ڈاکٹر شریعتی کی سوچ ہی پہنچ سکتی ہے۔ ڈاکٹر شریعتی نے علامہ اقبال کے اقوال و افکار اور اشعار کی ترویج کے لیے بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ ان کے بقول بیسویں صدی میں اسلام کی حقانیت کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ اقبال جیسا عظیم مفکر عالمِ اسلام میں پیدا ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر شریعتی کے بقول قرآن پاک کا تین چوتھائی حصہ زیادہ تر معاشرتی اور نظریاتی امثال اور اُمورِ زندگی کی وضاحت کرتا ہے اور قرآن کی ۱۱۴ سورتوں میں صرف دو سورتیں ہی مذہبی عبادات کے بارے میں ہیں۔ سماجی ذمہ داریاں، نیک نیتی اور اختیار اسلام میں انسان کے بنیادی کردار کا تعین کرتے ہیں۔ قرآن مجید خدا اور بندے کے

مابین ایک مسلسل تعلق کا قیام عمل میں لاتا ہے۔ معاشرے سے تعلق توڑ کر انسان ایک فلسفی، شاعر، ادیب یا مصور تو بن سکتا ہے مگر مسلمان نہیں بن سکتا۔ اس طرح شریعتی مارکسزم اور مغربی تہذیب دونوں پر تنقید کرتے ہوئے اسلام کے انقلابی پہلوؤں کو اُجاگر کرتے ہیں۔

بالآخر شریعتی کی محنت رنگ لائی تو ان کے شاگردوں کی ایک بڑی تعداد مجاہدینِ خلق کے روپ میں اپنے دور کی فرعونیت سے نبردآزما ہوگئی۔ قرآن کے ابدی اصولوں کی رہنمائی میں یہ لوگ سرفروشی کے لیے میدانِ عمل میں اتر آئے اور فکرِ اقبال کی روشنی میں شخصی آزادی اور سماجی استحکام کی کوششیں شروع ہوئیں۔ شریعتی کی وفات سے ایک برس بعد جب راقم الحروف کو ایران جانا ہوا تو ہر طرف ان کا نام گونج رہا تھا۔ سفید کاغذ کی جلدوں میں ان کی کتابیں ہر جگہ دستیاب تھیں۔ ان کے شاگردوں نے موت کو مسکراتے ہوئے سینے سے لگا لیا تھا۔ ڈاکٹر شریعتی نے ایک موقع پر فرمایا کہ ''میری مثال زینب رضی اللہ عنہا کی ہے جو کربلا کے شہیدوں کا حال بیان کرنے کے لیے دِمشق کے بازاروں اور دربار میں موجود تھی۔ میں بھی شہیدانِ آزادی کا حال بیان کرنے کے لیے آج کے دور میں موجود ہوں۔'' بقول اقبال:

غوطہ ہا زد در ضمیرِ زندگی اندیشہ ام
تا بدست آوردہ ام افکارِ پنہانِ شما

(زندگی کی گہرائیوں میں میری سوچوں نے غوطے کھا کر تمہارے خفیہ افکار تک رسائی حاصل کی ہے۔)

آیت اللہ طالقانی: ایک بے باک عالمِ دین

آپ ۱۹۱۱ء میں تہران کی نواحی بستی کرج میں پیدا ہوئے۔ روایتی دینی مدرسوں میں دین کی تعلیم حاصل کی اور جرأت و بے باکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اعلائے کلمۃ الحق کا عظیم فریضہ سرانجام دیا۔ پہلی مرتبہ ۱۹۳۵ء میں جیل گئے تو آپ کو اسی کوٹھڑی میں بند کیا گیا جس میں وہ نوجوان کمیونسٹ بھی بند تھے، جنہوں نے چھ برس بعد ۱۹۴۱ء میں کمیونسٹ

پارٹی (حزبِ تودہ) کی بنیاد رکھنا تھی۔ طالقانی ان لوگوں کو اسلام کے ابدی اور انقلابی اصولوں کی پاسداری کی تلقین کرتے رہے۔ اسی دوران آپ ان نوجوانوں کے جذبہ اور ایثار سے متأثر بھی ہوئے اور زندگی بھر اُن کے جذبات کا احترام کرتے رہے۔ ڈاکٹر مصدّق کی تیل کو قومیانے کی تحریک کے دوران طالقانی ان چند علمائے دین میں سے تھے جنہوں نے مصدّق کی حمایت جاری رکھی تھی۔ ۱۹۵۳ء میں ناکام انقلاب کے بعد مصدّق کی گرفتاری کے بعد انہوں نے بادشاہ کی طرف سے تاریخ کو مسخ کرنے کی ہر کوشش کی مخالفت کی اور مشہور انقلابی اسلامی اسکالر طاہر احمد زادہ اور استاد تقی شریعتی (ڈاکٹر علی شریعتی کے والد) کے ساتھ مل کر قومی مزاحمتی تحریک کی بنیاد رکھی۔ اس کے بعد ۱۹۶۲ء میں جب مہدی بازرگان (اسلامی انقلاب کے بعد ایران کے پہلے وزیرِاعظم) نے اپنے اسلامی ذہن رکھنے والے روشن فکر دانشوروں کے ساتھ مل کر تحریک آزادی کی بنیاد رکھی تو طالقانی بھی ان کے ساتھ شامل ہوگئے۔ اس تحریک کا مقصد مذہب پر روایتی علماء کی اجارہ داری ختم کرکے اسلام کے سماجی اور انقلابی پہلوؤں کو غیر متعصّبانہ فضا میں اُجاگر کرنا تھا۔

طالقانی نے ۱۹۶۰ء میں تہران کے نواحی قصبہ کرج کی مسجدِ ہدایت میں نوجوانوں کے لیے خطبات اور لیکچروں کا سلسلہ شروع کیا۔ ان کی تعلیمات کے نتیجے میں تہران کے نوجوانوں میں اسلامی روح بیدار ہونے لگی۔ ان کے ہفتہ وار خطبات میں بڑی تعداد میں دانشور، طلبہ، تاجر حضرات اور اساتذہ کرام شامل ہونے لگے۔ یہ اجتماعات بعد کے زمانے میں ڈاکٹر علی شریعتی کی حسینیہ ارشاد کے منظّم ادارے کا پیش خیمہ ثابت ہوئے۔ مسجدِ ہدایت کے ان اجتماعات کے انتظامات کے لیے چندہ جمع کرنے کی کوششوں میں مشہور تاجر جناب حاج صادق پیش پیش رہے جن کے صاحبزادے ناصر صادق کو مجاہدینِ خلق کی اعلیٰ قیادت میں خاص مقام حاصل رہا ہے۔ جناب حاج صادق کے مطابق انہوں نے آج تک طالقانی کے علاوہ کسی بھی شخص کو اسلام کی حقانیت کی بابت اس قدر استدلال اور صاف گوئی کے ساتھ نہیں دیکھا، جن کے خطبات میں شرکت کے

لیے نوجوان ہر ہفتے ستر اسّی کلومیٹر کا سفر طے کر کے مسجد ہدایت پہنچتے اور ان کی تقاریر کے دوران حاضرین پر سکوت کی کیفیت طاری رہتی۔ طالقانی کے خطبات کے مستقل شرکاء میں حنیف نجاد اور احمد رضائی جیسے نوجوان شامل تھے، جنہوں نے آپ سے متاثر ہو کر مجاہدینِ خلق کی بنیاد رکھی اور اپنی جان کے نذرانے راہِ حق میں پیش کیے۔

طالقانی ایک بار پھر ۱۹۶۵ء میں قید کر لیے گئے اور انہیں اپنی طویل اسارت کے زمانے میں مجاہدینِ خلق اور فدائینِ خلق (کمیونسٹ نوجوانوں کی تنظیم) کے ارکان پر ہونے والے غیر انسانی مظالم کو ملاحظہ کرنے پر مجبور کیا جاتا رہا۔ طلبہ اور انقلابیوں کی خون آلود نعشیں اور شدید زخمیوں کے جسموں کو بھی طالقانی کی کوٹھڑی میں ڈال دیا جاتا، تاکہ وہ ان نوجوانوں پر بیتنے والی قیامت کا مشاہدہ کر سکیں جن کو راہِ حق کی تلقین آپ نے فرمائی تھی۔ جیل سے رہائی کے بعد بھی طالقانی نے اپنے انقلابی خطبات کا سلسلہ جاری رکھا۔ ۱۹۷۴ء میں انقلابی نوجوان جن کی تعداد نو تھی، ایران کی قومی ہوائی کمپنی ''ھُما'' کا ایک مسافر بردار طیارہ اغوا کر کے بغداد لے گئے اور وہاں پر گرفتار کر لیے گئے۔ ان کی رہائی کے لیے طالقانی نے آیت اللہ خمینی کو، جو نجف میں مقیم تھے، ایک خفیہ خط لکھا (جس کے لیے نظر نہ آنے والی روشنائی استعمال کی گئی تھی) کہ آپ ان کی رہائی کے لیے ذاتی طور پر کوشش کریں۔ جناب خمینی نے مقدور بھر کوشش کی مگر بالآخر تنظیم آزادیٔ فلسطین کے دباؤ پر یہ لوگ رہا کروا لیے گئے۔

بادشاہ کے وفادار اور روایت پرست علماء نے جناب طالقانی کی انقلابی سرگرمیوں کی مخالفت شروع کر دی اور ان سے متاثر ہو کر انقلابِ اسلامی کی جدوجہد کے لیے کوشاں نوجوانوں کو کافر کہنا شروع کر دیا۔ اس دوران مشہور کمیونسٹ رہنما احمد کسروی کو اپنے گھر میں خفیہ طور پر پناہ دینے کے جرم کو بھی علماء نے تنقید کا نشانہ بنایا۔

طالقانی ۱۹۷۵ء میں پھر گرفتار کر لیے گئے اور انہوں نے اگلے تین برس تک جیل میں زبردست مشکلات کا سامنا کیا۔ خرابیٔ صحت اور بڑھاپے کے باوجود صبر و استقامت سے ہر مشکل کو برداشت کیا۔ عوام کے زبردست دباؤ کے باعث اکتوبر ۱۹۷۸ء میں

طالقانی سینکڑوں سیاسی قیدیوں کے ہمراہ جیل سے باہر آ گئے اور ان کی ذات انقلابِ اسلامی کی تمام سرگرمیوں کا مرکز بن گئی۔ ان کا گھر انقلابیوں کا ہیڈ کوارٹر قرار دے دیا گیا' اور اب ان کا پیرس میں مقیم جناب خمینی سے مسلسل رابطہ قائم رہا جنہیں یہ تمام انقلابی سرگرمیوں کی پل پل کی خبر دیتے رہے۔ اب طالقانی انقلاب کے ترجمان اور انقلابی سرگرمیوں کے منتظم کے طور پر سامنے آئے۔ انہوں نے ہڑتالوں اور دھرنوں کے پروگرام تشکیل دیے۔ ان کی رہنمائی میں نومبر ۱۹۷۸ء سے لے کر جنوری ۱۹۷۹ء تک تیل کی پیداوار کے کارکنوں کی ہڑتال نے ایران میں زندگی کو عملاً مفلوج کر کے رکھ دیا۔ ان کا گھر نہ صرف انقلابیوں کا ہیڈ کوارٹر بنا ہوا تھا بلکہ انقلابی سرگرمیوں کے لیے تمام تر چندہ یہیں جمع ہوتا اور انقلابی سرگرمیوں میں ہلاک یا زخمی ہونے والے افراد کے لواحقین کو یہیں سے تقسیم کیا جاتا تھا۔ آیت اللہ خمینی کی جانب سے پیرس سے جو پیغامات یا پمفلٹ جاری ہوتے وہ بھی ان کے دفتر کے توسط سے تقسیم کیے جاتے تھے۔

طالقانی نے ۱۰ دسمبر ۱۹۷۸ء کو یومِ عاشورہ منانے کا اعلان کیا جس میں وسیع پیمانے پر جلوس نکال کر جنرل اظہری کے مارشل لاء کی خلاف ورزی کی جانی تھی۔ اس سے ایک یوم قبل جناب طالقانی نے ایک ہدایت نامہ جاری کیا' جس میں اس موقع کو سیاسی رنگ دے کر پہلوی بادشاہت پر کاری ضرب لگانے کے بارے میں عوام کو جلوس کے طریق کار سے آگاہ کیا گیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے لکھا تھا کہ اس دن اپنے سینے اور جسم پر دوہتڑ مارنے کی بجائے آپ لوگ پہلوی کارندوں کو مکے دکھاتے ہوئے عہد کریں کہ عہدِ استبداد کا خاتمہ اب اللہ کی رضا ہے اور اس کے سامنے فرعونی قوتیں ٹھہر نہیں پائیں گی۔ عاشورہ سے ایک دن پہلے سڑکوں پر ٹینک اور بکتر بند گاڑیاں کھڑی کر دی گئیں اور فوجی حکومت کے زیرِ انتظام چلنے والے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعے لوگوں کو جلوسوں میں شرکت کرنے کے خوفناک نتائج سے خبردار کیا گیا۔ یہ خبر بھی پھیل گئی کہ جناب طالقانی کے گھر پر ایک فوجی حملے کی تیاری کر لی گئی ہے۔ اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک سے ٹیلی فون کے ذریعے مسلسل جناب طالقانی سے اپیل کی جاتی رہی کہ آپ یہ جلوس منسوخ

کر دیں، مگر انہوں نے افواہوں، کشیدگی اور غیر یقینی کی کیفیت میں اپنا پروگرام جاری رکھا۔ اگلے روز (۱۰ دسمبر کو) دس لاکھ لوگ تہران کی سڑکوں پر نکل آئے۔ عوام کے جوش و خروش کے سامنے فوج پسپا ہونے لگی اور لوگوں کو اپنی فتح واضح طور پر نظر آنے لگی۔ شاید اسی دن کے بارے میں شہزادی اشرف پہلوی نے لکھا ہے کہ اس نے ہیلی کاپٹر پر پرواز کرتے ہوئے لاکھوں عوام کو تہران کی سڑکوں پر غیظ و غضب کی حالت میں دیکھا، ان میں بڑی تعداد میں سر سے پاؤں تک چادر میں لپٹی ہوئی خواتین بھی شامل تھیں۔ یہ وہی خواتین تھیں جن کو عریانی کی جانب مائل کرنا شہزادی اشرف (شاہ کی جڑواں بہن) کا زندگی بھر مشن رہا تھا۔ شہزادی اشرف لکھتی ہے کہ میں یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ میری عمر بھر کی محنت چند دنوں میں یوں اکارت چلی جائے گی اور وقت کا پہیہ ایک بار پھر چشمِ زدن میں پیچھے کی جانب گھوم جائے گا۔ اسی مظاہرے کے بعد امریکہ نے اپنے افراد کو ایران سے نکالنے کا مربوط پروگرام بنالیا اور اپنے مفادات کو وہاں سے سمیٹنا شروع کر دیا۔ اس لیے کہ امریکہ کو معلوم ہو گیا تھا کہ اب شاہ کو ہر صورت میں جانا ہی ہوگا۔

بالآخر انقلاب برپا ہو گیا۔ علماء کے ایک خاص گروہ نے (جس نے ابھی تک خود کو انقلابی سرگرمیوں سے علیحدہ رکھا تھا یا پھر بہت محتاط رویہ اختیار کیے رکھا تھا) جناب طالقانی کی کوششوں سے صرفِ نظر کرتے ہوئے ان کو آہستہ آہستہ پیچھے چھوڑنا شروع کر دیا۔ جناب طالقانی کو انقلاب کے بعد وہ مقام نہ دیا گیا جس کے وہ صحیح حق دار تھے۔ ان کے احتجاج پر ان پر سختی کی گئی اور ان کے اہلِ خاندان کو ہراساں کیا گیا۔ آپ انقلاب کے بعد مایوسی کا شکار ہو گئے اور ستمبر ۱۹۷۹ء میں وفات پا گئے۔

❁ ❁ ❁

علامہ اقبال اور ایران کا "اسلامی انقلاب"

علامہ اقبال اور ایران

اس کتاب میں ہم اقبالیات کا اجمالی جائزہ تو شامل نہیں کر رہے، صرف علامہ اقبال کے ایران کے انقلاب اور فکری ارتقاء پر اثرات کا ایک مختصر سا خاکہ قارئین کو پیش کریں گے، تاکہ شاعر مشرق کے افکار و اثرات کے وہ پہلو اُجاگر ہو سکیں جو ممکن ہے کہ ہمارے قارئین کی نظر سے اوجھل رہے ہوں۔

ذاتی تجربات

راقم الحروف کو بچپن سے ہی بتایا گیا تھا کہ علامہ اقبال کا بیشتر کلام فارسی زبان میں ہے، مگر اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آ پا رہی تھی۔ ۱۹۷۰ء میں جب راقم الحروف نے فاضل فارسی (منشی فاضل) کے امتحان کی تیاری کرنا شروع کی تو آہستہ آہستہ علامہ اقبال کے فارسی کلام سے شناسائی ہونے لگی۔ اس کے کورس میں صادق سرمد کی مشہور نظم شامل تھی جس میں انہوں نے یومِ اقبال پر شاعرِ مشرق کو زبردست خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا تھا:

اگرچہ مرد بمیرد بگردشِ مہ و سال
نمردہ است و نمیرد محمد اقبال

(اگرچہ انسان گردشِ ایام کے باعث اس جہان سے چلا جاتا ہے، لیکن محمد اقبال نہ مرے ہیں اور نہ کبھی انہیں موت آئے گی۔)

راقم الحروف اس قصیدہ کے صوتی اور معنوی اثرات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ یہ قصیدہ سارے کا سارا زبانی یاد ہو گیا۔ پھر ایف ایس سی کے لیے اسلامیہ کالج گوجرانوالہ میں داخلہ لیا تو وہاں کے پرنسپل جناب خواجہ عبدالحمید عرفانی سے شناسائی ہوئی اور پھر وہ

زندگی بھر کے تعلق میں ڈھل گئی۔ ان سے جب علامہ اقبال اور ایران کا ذکر ہوا تو میں نے وہی قصیدہ سنا دیا، جس پر انہیں بہت حیرت ہوئی کہ ایف ایس سی کے ایک طالب علم کو نہ صرف صادق سرمد کے اشعار سے شناسائی ہے بلکہ وہ ان کے علامہ اقبال کی بابت افکار و اشعار سے کافی حد تک باخبر ہے۔ آہستہ آہستہ آپ کی صحبت اور تربیت سے علامہ اقبال کی فارسی شاعری اور اس کے ایران پر اثرات کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہوتا گیا۔ آپ کی کتب ''رومیٔ عصر'' (علامہ اقبال کے بارے میں فارسی میں لکھی گئی پہلی کتاب تھی جو کسی غیر ایرانی نے لکھی تھی اور ریکارڈ تعداد میں شائع ہوئی) ''اقبال ایرانیوں کی نظر میں''، ''گفتہ ہائے رومی و اقبال'' اور بعد کی کتب ''اقبالِ ایران'' اور ''اقبالِ عرفانی'' پڑھیں تو معلوم ہوا کہ آپ (جناب عرفانی مرحوم) ہی وہ شخصیت ہیں جنہوں نے اقبال کو ایران میں متعارف کروانے میں زبردست کردار ادا کیا ہے اور اس کارِ خیر میں سب سے اہم رول آپ ہی کی شخصیت کا رہا ہے۔

لاہور میں قیام کے دوران خانۂ فرہنگ ایران کے توسط سے اور پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج کے اساتذہ کے ذریعے اس بارے میں میری معلومات میں اضافہ ہوتا رہا۔ ایک چیز پوری طرح واضح ہوگئی کہ اقبال اس وقت تک ایران کے کونے کونے میں اقبالِ لاہوری کے نام سے متعارف ہو چکے تھے اور آپ کے افکار وہاں پر خاص و عام کی زبان پر تھے۔ اقبال پر مختلف مجلّات کے خصوصی شمارے چھپ رہے تھے۔ علامہ اقبال پر ایران میں لکھی گئی کئی ایک فارسی کتب بھی اس چیز کا مظہر تھیں۔ اسی طرح ایران میں فارسی ادب کی کتب، جو سکول میں پڑھائی جاتی تھیں، ان میں کلامِ اقبال کو زبردست اہمیت دی جاتی تھی۔ پھر ۱۹۷۷ء میں لاہور میں علامہ اقبال کے سوسالہ یوم پیدائش پر ایک بین الاقوامی کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ راقم الحروف کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں پڑھ رہا تھا اور ایم اے فارسی (پہلی پوزیشن میں) پنجاب یونیورسٹی سے (تھرڈ ایئر ایم بی بی ایس میں) پاس کرنے کے بعد پی ایچ ڈی فارسی کے لیے رجسٹرڈ ہو چکا تھا اور ایران کے خانۂ فرہنگ، کلچرل کونسل اور مرکز تحقیقاتِ ایران و پاکستان سے شناسائی پیدا ہو چکی تھی اور اِکا دُکا فارسی

نظمیں بھی ایران کے مجلّات میں شائع ہو چکی تھیں۔ علاوہ بریں خانۂ فرہنگ ایران لاہور کی تقریبات میں فارسی نظمیں پیش کرتے کرتے ایک حد تک پاکستان میں فارسی دان طبقہ میں شناسائی پیدا ہو چکی تھی۔ مزید برآں ایران کے کچھ علمی حلقوں سے علمی اور ادبی روابط بھی قائم ہو چکے تھے۔ ان دنوں پاکستان میں ایران کے کلچرل کونسلر پروفیسر جعفر محجوب تھے جو تہران کے فارسی ادب کے اساتذہ میں ممتاز ترین تھے اور جناب عرفانی مرحوم کے دوست جناب حسین خطیبی کے شاگردوں میں سے تھے۔ ڈاکٹر محجوب سے خط و کتابت شروع کی تو آپ نے راقم الحروف کی فارسی نثر کو سراہتے ہوئے ملاقات کا شرف بخشا اور پھر یہ ملاقاتیں مستقل علمی روابط میں ڈھل گئیں۔ راقم الحروف ان ہی کے ذریعے ایران کے ادبی حلقوں میں متعارف ہوا۔

بات علامہ اقبال کانفرنس کی ہو رہی تھی' اس میں شرکت کے لیے ایران سے جو دانشور تشریف لائے ان میں مشہد یونیورسٹی کے چانسلر جناب جلال متینی اور ایران کے مشہور صحافی (رکن سینٹ) جناب سیف اللہ وحید نیا (مدیر مجلّہ وحید تہران) بھی شامل تھے۔ جناب جعفر محجوب کے توسط سے ان لوگوں سے ملاقات ہوئی اور فارسی میں مختلف ادبی موضوعات پر بات چلتی رہی۔ ان لوگوں نے ایران آنے کو کہا اور جناب وحید نیا نے مجلّہ وحید تہران کا پاکستان میں نمائندہ بھی نامزد کیا اور بعد میں ایک آدھ رپورٹ بھی بھجوائی جو مجلّے میں چھپی۔ ان زعماء سے بات چیت کر کے معلوم ہوا کہ گویا اقبال ہی ایران اور پاکستان میں رابطے کی ایک مضبوط کڑی کا کام دے سکتے ہیں۔

اگلے برس فروری ۱۹۷۸ء میں پشاور یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب یونس سیٹھی کی کوششوں سے وہاں پر مولانا رومؒ پر بین الاقوامی کانفرنس منعقد ہوئی۔ راقم الحروف کو وہاں بہترین مقالہ پیش کرنے پر صدر فضل الٰہی چوہدری سے طلائی تمغہ عطا ہوا اور مزید ایرانی زعماء اور شعراء و ادباء سے ملاقات ہوئی اور ایک بار پھر ایران آنے کی دعوت ملی۔ فورتھ ایئر ایم بی بی ایس کا امتحان دیتے ہی اور گرمیوں کی تعطیلات کا سہارا لیتے ہی ایران کا عزمِ سفر کیا۔ سرکاری دعوت نامہ حکومتِ ایران کا بھی تھا اور جناب عرفانی کے تعارفی

خطوط بھی تھے......اور عرفانی بھی وہ جو کہا کرتے تھے:

بودہ ام من رابطِ مہر و ولا
درمیانِ دوستانِ باصفا
آرزو می داشتم گردد یکی
کشورِ اقبال و بومِ مولوی

(میں صاف دل دوستوں میں محبت اور دلی تعلقات کا رابطہ استوار کرتا رہا ہوں اور میری خواہش یہی تھی کہ کشورِ اقبال یعنی پاکستان اور بومِ مولوی یعنی مولانا روم کی سرزمین، جس سے مُرادخراسانِ بزرگ سے لے کر ایران اور ترکی شامل ہیں، ایک ہو جائیں۔)

ایران میں میری پہلی منزل مشہد تھی۔ یہاں پر دو تقاریب ہوئیں، ایک تو یہ کہ پاکستانی قونصل خانے نے مجھے ایک تقریب میں بلایا اور ایران میں اردو پڑھنے والے طلبہ کو چائے کی پارٹی دی۔ وہاں پر بھی کلام اقبال کے حوالے سے بات چلی اور دلی روابط کا ذکر ہوا۔ جلد ہی معلوم ہوا کہ اقبال کی فکر کو ایرانی اور خصوصاً اہل خراسان اپنا چکے ہیں اور ہمارے پاس شاید فکرِ اقبال کا بہت کم حصہ رہ گیا ہے۔ راقم الحروف نے اپنی ایک آدھ غزل سنائی جس کے دو شعر ملاحظہ ہوں:

مرگ را درپیش گاہش رہ نمی باید گہی
آنکہ بہر دیگراں خونِ جگر می افگند
پا بہ جا خونِ سیاوش است و ماند جاوداں
زندہ گردد ہر کہ خود را در خطر می افگند

(موت کو اس عظیم انسان کے دربار تک رسائی نہیں ہو پاتی جو دوسروں کی زندگی کے لیے اپنے خونِ جگر کو نچھاور کر دے۔ خونِ سیاوش آج بھی اپنی جگہ پر قائم ہے اور وہ شخص امر ہو جاتا ہے جو دوسروں کے لیے خطرات میں کود پڑتا ہے۔)

سیاوش قدیم اساطیری عہد کا ایران کا ہیرو تھا جس نے قوم کے لیے قربانی دی تھی اور آج بھی ایران میں ایک خوبصورت پھول کو خونِ سیاوش کا نام دیا جاتا ہے۔ صائب تبریزی کی پیروی میں لکھی گئی یہ غزل انقلابیوں نے اچک لی اور اس کی

بازگشت دُور دُور تک سنائی دیتی رہی۔ پھر علامہ اقبال کے حوالے سے بات ہوئی تو ایرانی نوجوانوں نے حیرت سے پوچھا کہ اس عظیم مفکر کے ملک کے لوگ اس کے افکار سے بے بہرہ کیوں ہیں اور اس کی بات مان کر اپنے معاملات درست کرنے میں کوتاہی سے کام کیوں لے رہے ہیں؟

اگلے چند روز کئی ایرانی نوجوان اپنے اپنے گھروں میں کھانوں پر بلاتے رہے اور یہ سلسلہ چلتا رہا۔ اُن دنوں شاہ کے جبر و استبداد کا عروج تھا۔ طلبہ کی تمام سرگرمیوں پر پابندی تھی اور صرف نصابی سرگرمیوں کی اجازت تھی اور وہ بھی اس طرح کہ یونیورسٹی کے باہر ٹینک کھڑے رہتے تھے، جن کی نالیوں کا رُخ تدریسی عمارات کی جانب تھا۔ دوپہر کے کھانے (جو یونیورسٹی کی طرف سے ملتا تھا) کے موقع پر گتے کے گلاس استعمال ہوتے تھے۔ معلوم ہوا کہ پہلے شیشے کے گلاس ہوتے تھے' اب اس خوف سے کہ کہیں طلبہ توڑ کر ان کو ہتھیار کے طور پر استعمال نہ کر لیں' ان پر پابندی عائد کر دی گئی تھی۔ طلبہ نے مل بیٹھنے کا ایک بہانہ یہ ڈھونڈا کہ ہمیں ایک دن فیکلٹی ادبیات کی کینٹین میں چائے پر چپکے سے بلا لیا اور یہ کینٹین طلبہ اور طالبات (جو ابھی تک مغربی لباس میں ہی ملبوس تھیں) سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ پوچھا گیا کہ کلامِ اقبال سے کچھ کہا جائے اور کچھ سنا جائے؟ تو علامہ اقبال کی اس غزل کا خیال آیا: ؎

خضرِ وقت از خلوتِ دشتِ حجاز آید بروں

کارواں زیں وادیٔ دور و دراز آید بروں

(وقت کا خضر پھر حجازِ مقدس کے صحرا سے ہماری جانب بڑھ رہا ہے اور پھر قافلوں کے قافلے اس دُور دراز وادی سے باہر آ رہے ہیں۔)

اس سے یہ مُراد لی گئی کہ نااُمیدی کی رات ختم ہونے کو ہے اور اُمید کی صبح طلوع ہونے والی ہے۔ لیکن ہماری اُمیدوں کا مرکز وہی مکہ و مدینہ کے حرم ہیں اور وہی قافلہ ہائے شوق ہیں جو ان وادیوں سے ابدیت کا پیغام لے کر اس ملک (ایران) کی جانب بڑھ رہے ہیں ؎

من بسیمائے غلاماں فرِّ سلطاں دیدہ ام

شعلۂ محمود از خاکِ ایاز آید بروں

(میں نے غلاموں کے چہروں پر بادشاہی کا جلال دیکھ لیا ہے اور آج پھر ایاز کی مٹی سے محمود کے شعلے اُٹھ رہے ہیں۔)

مشہد خراسان میں واقع ہے اور محمود کو شاہ خراساں کہا جاتا تھا۔ اس نسبت سے مفہوم یہ واضح کیا گیا کہ آج غلامی کی زنجیریں ٹوٹنے والی ہیں اور آپ لوگ جو خود کو مجبور و مقہور محسوس کر رہے ہیں آپ کے چہروں پر مردنی چھائی ہوئی ہے، لیکن اس مٹی سے وہ شعلے لپک رہے ہیں جن کی آب وتاب مستقبل کا نور ہوگا۔

عمر ہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

(مدتوں تک زندگی کعبے اور بت خانے میں آہ وزاری کرتی رہتی ہے، پھر کہیں محفل شوق سے کوئی ایک آدھ راز دان نظر آ ہی جاتا ہے۔)

اس سے مراد یہ لی گئی کہ وہ پختہ کار رہنما جو قوم کی تقدیر بدل کر رکھ دیتا ہے، اس کے ظہور سے پہلے قوموں کو بہت انتظار کرنا پڑتا ہے اور ارتقاء کے عمل میں بہت سی قربانیاں دینا پڑتی ہیں:

طرح نو می افگند اندر ضمیرِ کائنات
نالہ ہا کز سینۂ اہل نیاز آید بروں

(وہ نالے جو نیاز مند مجبوروں کے دلوں سے اٹھتے ہیں وہ تو کائنات کے ضمیر میں انقلاب برپا کر کے رکھ دیتے ہیں۔)

اس سے انقلابی نوجوانوں کی جدوجہد مراد لی گئی۔

چنگ را گیرید از دستم کہ کار از دست رفت
نغمہ ام خون گشت واز رگہاے ساز آید بروں

(میرے ہاتھوں سے سارنگی واپس لے لو کہ میرا کام پورا ہوگیا۔ میرا نغمہ تو خون بن کر خود بخود ساز کی رگوں سے اُبل پڑا ہے۔)

اس سے مراد لی گئی کہ بقول اقبال میری کوششیں بارآور ثابت ہوگئی ہیں اور اب میرے نغمات خود بخود اُبل رہے ہیں، یعنی ہر شخص میرا ہم آواز بن گیا ہے۔

اس غزل کے بعد علامہ کا یہ شعر پڑھا گیا:

زمانہ کہنہ بتاں را ہزار بار آراست

من از حرم نگذشتم کہ پختہ بنیاد است

(زمانے نے پرانے بتوں کو ہزار بار مختلف انداز سے سجایا ہے، لیکن میں نے حرم پاک کو نہیں چھوڑا کہ اس کی بنیادیں بہت مضبوط ہیں۔)

اس سے مراد یہ لی گئی کہ اسلام ہی مستقبل کا دین ہے اور ڈھائی ہزار سالہ بادشاہت کے آثار ہمارے لیے عبرت کا سامان تو ہیں، فخر ومباہات کے مراکز قطعاً نہیں۔ اس غزل کی وضاحت میں دبے دبے الفاظ میں وہ کچھ کہا جو حاضرین سننا چاہتے تھے۔

پھر تہران جانا ہوا تو بھی نوجوانوں سے علمی، ادبی اور ثقافتی روابط جاری رہے۔ ایک دن (غالباً مئی یا جون ۱۹۷۸ء کی بات ہے) طلبہ اور شاہ کی فورس میں زبردست مقابلہ ہوا اور یونیورسٹی کی سڑکیں میدانِ کارزار بنی رہیں۔ پھر یونیورسٹی کے ایک حصے پر طلبہ نے قبضہ کر لیا۔ میں اُن دنوں تہران یونیورسٹی کی لائبریری میں اپنی پی ایچ ڈی کی تحقیق میں مگن ہوتا تھا۔ مجھے طلبہ وہاں سے اپنے زیرِ انتظام حصے میں زبردستی لے گئے اور وہ ہال دکھایا جو اُن کی انقلابی سرگرمیوں کا مرکز تھیں۔ اس کی بڑی دیوار پر تین تصاویر (پنسل سے بنائے ہوئے اسکیچ) آویزاں تھیں۔ درمیان میں علامہ اقبال کی تصویر تھی، جس کے ایک طرف حضرت سید جمال الدین افغانی کی تصویر تھی اور دوسری طرف ایک ناآشنا سی تصویر تھی (بعد میں معلوم ہوا کہ وہ آیت اللہ خمینی کی تصویر تھی)۔ علامہ اقبال کی تصویر کے نیچے درج تھا ''مولانا محمد اقبال لاہوری بزرگ ترین فیلسوفِ جہانِ اسلام'' (عالمِ اسلام کے سب سے بڑے مفکر) اور علامہ اقبال کی رباعی درج تھی:

ساحل افتادہ گفت، گرچہ بسے زیستم

ہیچ نہ معلوم شد آہ کہ من چیستم

موجِ زخود رفتۂ تیز خرامید و گفت

ہستم اگر می روم گر نہ روم نیستم

(ایک بوسیدہ ساحل نے کہا کہ اگرچہ ایک طویل عرصہ سے میں موجود ہوں لیکن اب تک کچھ بھی معلوم نہیں ہو پایا کہ میں کیا ہوں۔ اس کے جواب میں ایک

مست لہراٹھی اور تیزی سے چلتی ہوئی کہہ گئی کہ میں اگر چلوں تو ہوں اور اگر رُک جاؤں تو کچھ بھی نہیں!)

طلبہ نے مجھ سے کہا کہ آپ کو اس لیے لایا گیا ہے کہ ہمیں معلوم ہوا تھا کہ آپ اقبال کے وطن اور شہر (لاہور) سے آئے ہیں۔ آپ گواہ رہنا کہ ہم جس انقلاب کے لیے جدوجہد کررہے ہیں وہ فکرِ اقبال کا مرہونِ منت ہے۔

تہران میں اور بھی کئی مواقع پر معلوم ہوا کہ اقبال کی فکر نوجوان نسل کے دلوں پر گہرا اثر رکھتی ہے۔ اور تقریباً ہر علمی اور سماجی محفل میں علامہ اقبال کے افکار پر بحث ہوتی رہی۔

پھر اصفہان، شیراز اور تبریز جانا ہوا اور یہی سلسلۂ کلام چلتا رہا۔ اقبال کے وہ اشعار زبان پر آئے جو اِن شہروں کی بابت ہیں، مثلاً:

مطرب غزلے بیتے از مرشدِ روم آور
تا غوطہ زند جانم در آتشِ تبریزے

(اے نغمہ خواں! مولانا روم کی غزل کا شعر سنا تاکہ میری جان تبریز کی آگ میں غوطہ لگائے۔)

یہاں پر مولانا روم کی حضرت شمس تبریزی سے معنوی عقیدت کی جانب اشارہ ہے ع

''آتش اندر دلِ شیراز و صفاہاں زدہ ام''

(یعنی میں نے شیراز اور اصفہان کے دلوں میں آگ لگا دی ہے)

یہاں پر بھی ہر جانب فکرِ اقبال کی چھاپ نظر آئی۔ علامہ اقبال کے کلام کے مقامی ایڈیشن نظر آئے۔ تہران میں خیابانِ مولانا محمد اقبال لاہوری (علامہ اقبال روڈ) اور مختلف مقامات پر اقبال کے نشانات نظر آئے۔ واقعی آپ نے شیراز، اصفہان اور تبریز میں فکری اور معنوی اعتبار سے آگ لگا دی تھی اور آپ کی یہ حسرت پوری ہونے کو تھی:

نہ اُٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب و گِلِ ایراں، وہی تبریز ہے ساقی
نہیں ہے نا اُمید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

سامراجیت اور بادشاہت اپنے اختتام کو تھی اور جبر واستبداد کے دامن سے آزادی پھوٹ رہی تھی، صفویت کے ظالمانہ اور جابرانہ تفکرات ختم ہونے کو تھے اور پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے افکار پر مبنی ایک نظام کی ابتدا ہونے کو تھی، جس کے بارے میں اقبال نے کہا تھا: ؎

دیکھا ہے ملوکیتِ افرنگ نے جو خواب
ممکن ہے کہ اس خواب کی تعبیر بدل جائے
طہران ہو گر عالمِ مشرق کا جنیوا
شاید کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے

کچھ عرصہ کے بعد خاک وخون میں ڈوبے ہوئے ایران کو چھوڑا اور حالات کی سنگینی کے پیش نظر ایران کی سرزمین کو خیر باد کہا۔ ابھی تک تختِ طاؤس پر بادشاہِ وقت متمکن تھا اور وہ خود کو آریا مہر، ظلِ الٰہی اور بادشاہوں کا بادشاہ کہلانے پر مصر تھا۔ مگر بقول اقبال : ع

''لا سلاطین، لا کلیسا ، لا الٰہ''

اور: ؎

نہ مصطفیٰ نہ رضا شاہ میں نمود اس کی
کہ روحِ شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی!

اب وہ وقت گزر گیا۔ اِمتدادِ زمانہ سے مئی ۱۹۹۰ء میں جب کچھ رفقاء کی معیت میں دوبارہ ایران جانا ہوا تو تہران میں اترتے ہی معلوم ہوا کہ سارا زمانہ بدل چکا ہے۔ سڑکوں کے نام بدل چکے تھے، تہران تین گنا بڑا ہو چکا تھا۔ مغربی تہذیب اپنا دامن لپیٹ چکی تھی، خواتین حجاب میں تھیں اور اکثر مرد حضرات کے چہروں پر داڑھی کی نورانیت تھی۔ صرف چند پرانی سڑکیں، عمارات اور زبان وہی تھی۔ فارسی میں عربی کے کلمات اور اصطلاحات پھر سے داخل ہو گئے تھے۔ جس ترکیب میں ''شاہ'' کا لفظ استعمال ہوتا تھا وہ بھی بدل چکی تھی، مثلاً شاہراہ اب ''بزرگ راہ''، تھی، شاہ سوار بھی ''بزرگ سوار'' ہو گیا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے اصحابِ کہف کی طرح صدیوں کے بعد بیدار ہوا ہوں۔ بقول اقبال : ؎

باش تا بینی کہ بے آوازِ صور
ملتے برخیزد از خاکِ قبور

(تھوڑی دیر انتظار کر اور دیکھ کہ صورِ اسرافیل کے بغیر بھی ایک قوم قبروں کی مٹی سے کفن پھاڑتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔)

اب ہم جہاں بھی گئے لوگوں نے دکتر فاضل (یعنی پڑھا لکھا ڈاکٹر) کہنا شروع کر دیا اور اردگرد جمع ہونے لگے۔ یار لوگوں کو غصہ آیا کہ ایران آتے ہی صرف ایک ڈاکٹر پڑھا لکھا رہ گیا ہے اور باقی تمام کے تمام جاہل ہو گئے ہیں۔ ہمارے ہاں جناب حسن حبیبی (نائب صدر جمہوریہ) کی اہلیہ تشریف لائیں تو ذکرِ اقبال ہوا' اگر پارلیمنٹ کے ارکان آئے تو انہوں نے اقبال کے اشعار پڑھے' اور اگر ایک عام شخص بھی آیا تو اس کی زبان پر اقبال کا نام تھا۔ ہمیں فکری ہم آہنگی' لسانی مماثلت اور سوچوں کا اشتراک ہی نظر آیا اور ملک الشعراء بہار کے وہ اشعار یاد آئے: ؎

درود باد بروحِ مطہرِ اقبال
کہ بود حکمتش آموزگارِ پاکستان

(اقبال کی پاک روح پر رحمتیں ہوں کہ جس کی دانائی پاکستان کی رہنما بن گئی۔)

جُدا نبود و نباشند ملّتِ ایران
زطبع و خوی و شعار و دثارِ پاکستان

(ایران کی قوم عادت واطوار اور افکار یا لباس کے معاملے میں پاکستان کی قوم سے نہ کبھی مختلف رہی ہے اور نہ ہی کبھی مختلف ہوگی۔)

گماں مبر کہ بود بیشتر ز ایرانی
کسی بہ رُوی زمیں دوستدارِ پاکستان

(یہ کبھی بھی نہ سوچنا کہ روئے زمین پر ایرانی قوم سے بڑھ کر کوئی اور قوم پاکستان کی زیادہ دوست ہو سکتی ہے۔)

اب لوگوں نے دیکھا کہ میں مولانا محمد اقبال لاہوری کے اشعار وافکار بیان کرتا تو ایرانی نوجوان سر جھکائے احتراماً کھڑے ہو جاتے۔ ہمارے ایک بزرگ میری زبانی بار بار مولانا اقبال لاہوری کا نام سنتے' تو بالآخر پریشان ہو کر کہنے لگے یہ بتاؤ یہ لاہور کا کون سا مولوی تھا جو یہاں بہت ہی مشہور ہے' ہمیں تو اس کا پتا بھی نہیں' تو بتانا پڑا کہ یہ مولوی وہ

ہے جسے ہم بطورِ مولوی پہچان ہی نہیں پائے اور آپ ہیں علامہ اقبال۔

گیلان سے تہران واپس آئے تو سفارت خانے کی جانب سے ایک پُر تکلف ضیافت کا اہتمام ہوا جس میں سفارت خانے کے حکام کے علاوہ بااثر ایرانی احباب کو بھی مدعو کیا گیا۔ اس کے بعد ناچیز کو ''علامہ اقبال کے افکار کی روشنی میں پاکستان اور ایران کے روابط'' کے موضوع پر خطاب کی دعوت دی گئی جس کا پیغام پہلے ہی دیا جا چکا تھا۔ میں نے کسی ایرانی شاعر (نام یاد نہیں) کے یہ شعر پڑھے:۔

تا جہان باقیست تا خورشید و مہ تابندہ است

بینِ پاکستان و ایران دوستی پائندہ است

(جب تک یہ دنیا قائم و دائم رہے گی اور جب تک چاند سورج چمکتے رہیں گے پاکستان اور ایران کے مابین دوستی قائم رہے گی۔)

آفریں برخلقِ پاکستاں کہ با اقبالِ خویش

چشمۂ اندیشہ ای دارد کہ خوش زایندہ است

(پاکستان کے عوام پر آفرین ہے کہ اس کے پاس اقبال کی صورت میں افکار و تصورات کا وہ سرچشمہ موجود ہے جو ہمیشہ جاری و ساری رہے گا۔)

پھر علامہ اقبال کے اشعار و افکار کی روشنی میں اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی۔ بارہ برس کے طویل عرصہ کے بعد تہران میں انہی خیالات کی بازگشت تھی جو دوبارہ سنائی دے رہی تھی۔ ملوکیت، جبر و استبداد، ذہنی غلامی، حیلہ و تزویر اور مکر و ریا پر مبنی ایران کے صدیوں سے قائم بوسیدہ نظام پر تبصرہ کرتے ہوئے ملتِ ایران کے اس جذبہ کی داد دی جس کا مشاہدہ اپنی آنکھوں سے کیا تھا اور پھر یہ رباعی سنائی:۔

مسلمانے کہ داند رمزِ دیں را

نساید پیشِ غیر اللہ جبیں را

اگر گردوں بکامِ او نہ گردد

بکامِ خود بگرداند زمیں را

(وہ مسلمان جسے دین کے راز کا علم ہے، وہ کسی غیر کے سامنے اپنی پیشانی نہیں

رگڑا کرتا۔ اگر آسمان اس کی مرضی کے مطابق گردش نہ بھی کرے تو وہ زمین کو تو
اپنی مرضی کے مطابق گردش میں لے ہی آتا ہے۔)

فضا میں سکوت طاری تھا اور دیر تک ان لوگوں کا تذکرہ ہوتا رہا جنہوں نے ۱۹۴۰ء کی دہائی میں یا اس سے بھی پہلے علامہ اقبال کو یہاں عام کیا تھا۔ جناب محیط طباطبائی' پروفیسر سعید نفیسی اور ملک الشعراء بہار کا ذکر چلا اور حضرت عرفانی مرحوم کی یادیں تازہ ہوئیں۔ ڈاکٹر رضازادہ شفق جیسے عظیم ایرانی شاعر نے ۱۹۵۰ء کی دہائی کے آغاز میں کیا خوب کہا تھا:

آنکہ اقدامِ مقبلاں کردہ
شعرِ اقبال را بیاں کردہ
دفترِ خویش از گلِ عرفان
پاک محسود گلستان کردہ
مسلکِ عارفانِ ایراں را
بہرِ پیر و جواں عیاں کردہ
شاعرِ دلنشینِ پاکستان
پیشِ صاحب دلاں نشاں کردہ
گر بپرسی زنامِ اُو کہ چنیں
کارِ نیکی دریں زماں کردہ
من نمی گویمت تو خود دانی
خواجہ عبد الحمید عرفانی

(وہ شخص جس نے عظیم لوگوں والا کام کیا' یعنی اقبال کے اشعار کو بیان کیا' علم و عرفان کے پھولوں سے اپنی بیاض اس قدر بھر کر رنگین کر دی کہ وہ باغ و گلستان کا رشک بن گئی۔ اس نے ایران کے صوفیاء کے مسلک کو جوانوں اور بوڑھوں کے سامنے پیش کیا۔ دل والوں کے حضور پاکستان کے شیریں بیان شاعر کو متعارف کرایا۔ وہ شخص جس نے اس زمانے میں نیکی کا وہ کام کیا ہے' اگر اس کا نام پوچھنا چاہو تو میں کچھ نہیں بتاتا' آپ خود جانتے ہیں اور وہ ہیں خواجہ عبدالحمید عرفانی)

پھر ایران جا کر دوستانِ باصفا کے حضور وہی اقبال لاہوری کے اشعار و افکار کا قصہ چھیڑنے کی پھر آرزو ہے۔

علامہ اقبال اور شعرِ فارسی

ایران کے حال و مستقبل کے آئینہ میں

حضرت علامہ اقبال نے اپنے زمانے کے متدین مسلمان گھرانوں کے دستور کے مطابق بچپن میں عربی اور فارسی کا وسیع مطالعہ کیا اور آہستہ آہستہ آپ کی ذات میں پوشیدہ عجمیت کی روح آپ پر غالب آنے لگی۔ آپ کے بچپن میں سیالکوٹ کے تدریسی نصاب میں فارسی کتب مثلاً ''ہندنامۂ عطار''، ''گلستان و بوستانِ سعدی''، ''سکندر نامۂ نظامی'' اور ''دیوانِ حافظ'' کی تعلیم شامل تھی۔ آپ اسلام کی حقانیت سے پوری طرح متأثر ہوئے اور فکرِ اسلامی کے زبردست مبلغ بن کر شعر اور نثر کے ذریعے پیغامِ حق کی اشاعت میں منہمک ہو گئے اور اسے اپنی زندگی کا اہم ترین مشن بنالیا۔ آپ کو اپنے کشمیری اور برہمن زادہ ہونے کا بھرپور احساس تھا اور آپ کی سوچوں پر مولانا رومؒ کا فلسفۂ ایمانی اور فارسی گو شعراء، متصوفین اور مفکرین کی گہری چھاپ نظر آنے لگی اور آپ نے فرمایا: ؎

مرا بنگر کہ در ہندوستان دیگر نمے بینی
برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریزاست

(مجھے اچھی طرح دیکھ لو کہ ہندوستان میں پھر ایسا کوئی اور شخص آپ کو کبھی نظر نہیں آئے گا جو برہمنوں کی اولاد سے ہو کر روم اور تبریز کے فکری خزانوں کا رازدان ہو۔)

یہاں روم سے مولانا جلال الدین رومیؒ کے اشعار اور تبریز سے مُراد حضرت شمس الدین تبریزی کی فکری اور روحانی قوت ہے۔ شمس تبریزی مولانا روم کے پیر و مرشد بھی تھے اور مولانا رومؒ کا دیوان بھی دیوانِ شمس تبریزی کہلاتا ہے۔

آہستہ آہستہ ریگزارِ عرب کی فطری سادگی آپ کے دل کو بھاتی چلی گئی اور مکہ و مدینہ میں حرمین شریفین کی موجودگی کے باعث آپ کو سرزمینِ حجاز سے ایک خاص محبت ہوگئی تھی۔ آپ اپنے دل کو حرم کی روحانیت سے وابستہ قرار دیتے تھے۔ ایران میں ثقافتی، علمی، ادبی اور تاریخی مرکز کے اعتبار سے شیراز کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ مزید برآں یہ شہر وہاں کے قدیم ثقافتی اور اخلاقی و روحانی مرکز فارس کے صوبے کا دارالحکومت ہے اور وہاں کی فارسی زبان ٹکسالی زبان سمجھی جاتی ہے۔ آپؒ فرماتے ہیں ؎

تنم گلے ز خیابانِ جنّتِ کشمیر
دل از حریمِ حجاز و نوا ز شیراز است

(میرا جسم کشمیر کی جنت نظیر وادی کے باغ کا ایک پھول ہے۔ میرا دل حجاز کے حرم سے وابستہ ہے اور میری آواز شیراز کی ہے۔)

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ نے اپنے اشعار کے لیے فارسی زبان کا انتخاب کیوں کیا؟ آپ خود فرماتے ہیں کہ آپ کے زمانے میں فارسی ابھی تک برّصغیر کے دانشور اور سنجیدہ طبقے (intellectuals) کی معنوی اور ثقافتی زبان ہے اور میں اپنا پیغام صرف دانشوروں کے اسی طبقہ تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ میں نے فارسی کو سیکھنے اور اس میں استعداد بہم پہنچانے کے لیے اپنی جوانی میں سخت محنت کی ہے۔ عامّۃ الناس چونکہ اس زبان میں کہے گئے اشعار کو سمجھ نہیں پائیں گے اس لیے قصداً میں نے اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے اس زبان کا انتخاب کیا ہے۔ اپنے اشعار میں آپؒ نے اس کی اور توجیہہ بھی کی ہے اور فرمایا ہے کہ: ؎

ہندیم از پارسی بیگانہ ام
ماہِ نو باشم تہی پیمانہ ام
حسنِ اندازِ بیاں از من مجو
خوانسار و اصفہاں از من مجو

گرچہ ہندی در عذوبت شکر است
طرزِ گفتارِ دری شیریں تر است

(میں ہندوستانی ہوں اور فارسی کی زیادہ سوجھ بوجھ نہیں رکھتا۔ نئے چاند کی طرح میرا پیمانہ ابھی تک خالی ہے۔ اس لیے اندازِ بیان کی ممکنہ خوبیاں اور شعری محاسن میرے کلام سے مت تلاش کرنا اور جو خوبیاں اہل زبان یعنی ایران کے مشہور مقامات اصفہان اور خوانسار کے شعراء کے کلام میں پائی جاتی ہیں وہ میرے ہاں تو نہیں ملیں گی۔ اگرچہ ہندی یعنی اردو زبان میں بھی شیرینی شامل ہے، مگر فارسی میں بات کرنے کا اور ہی مزا ہے۔)

پھر آپ فرماتے ہیں:۔

پارسی از رفعتِ اندیشہ ام
در خورد با فطرتِ اندیشہ ام

(میرے افکار اس قدر بلند ہیں کہ فارسی ہی وہ واحد زبان ہے جو اِن کو اپنے وسیع دامن میں سمو سکتی ہے۔)

درحقیقت یوں لگتا ہے کہ یہ بھی مشیتِ ایزدی ہی تھی کہ آپ فارسی زبان میں شاعری کریں تا کہ بالآخر آپ کا کلام اردو بولنے اور سمجھنے والے علاقوں کی حدود و قیود سے نکل کر فارسی گو ممالک مثلاً ایران، افغانستان، تاجکستان اور ازبکستان کے علاوہ ان ممالک میں بھی پہنچ جائے جہاں کے باہمی رابطے کی زبان ابھی تک فارسی ہی ہے، مثلاً ترکمانستان، آذربائیجان، قفقاز کے کچھ علاقے اور چینی صوبہ زنجیانگ۔ شاید یہ بھی مشیتِ ایزدی تھی کہ کبھی نہ کبھی یہ ممالکِ عجم احیائے اسلام کے مراکز بن جائیں۔

آپ کی دُور رَس نگاہیں مستقبل میں دُور دُور تک دیکھ رہی تھیں اور آپؒ آنے والے زمانے کا چشم حال سے مشاہدہ فرماتے ہوئے محسوس کر رہے تھے کہ ایک نہ ایک دن آپ کا پیغام ان خطوں کے عوام تک پہنچنے والا ہے اور وہاں پر کئی ایک فکری اور معنوی انقلابات کا بالآخر محرک بننے والا ہے۔ آپ کو یہ بھی علم تھا کہ اسلام کی روح کی بیداری کا وقت اب قریب آن پہنچا ہے اور صدیوں سے خوابِ گراں کے مزوں میں مدہوش اہلِ

مشرق بالآخر بیدار ہونے والے ہیں: ؎

انتظارِ صبح خیزاں می کشم
اے خوشا زرتشتیانِ آتشم
نغمہ ام از زخمہ بے پرواستم
من نوائے شاعرِ فرداستم
عصرِ من دانندۂ اسرار نیست
یوسفِ من بہرِ ایں بازار نیست
اے بسا شاعر کہ بعد از مرگ زاد
چشم خود بربست و چشم ما کشاد
رخت باز از نیستی بیروں کشید
چوں گل از خاکِ مزارِ خود دمید

(میں اِس رات کے اندھیروں میں صبح صبح بیدار ہونے والوں کا انتظار کر رہا ہوں۔ کتنے خوش نصیب ہوں گے وہ لوگ جو میرے سینے میں جلنے والی آگ کے زرتشتی ہوں گے۔ میں تو ایک نغمہ ہوں جسے ساز کی کوئی پروا نہیں ہے' کیونکہ میں تو مستقبل کے شاعر کی آواز ہوں۔ میرا دَور راز ہائے ہستی سے بے خبر ہے اور میری قیمتی متاع یعنی یوسف اس مصر کے بازار کے لیے نہیں ہے۔ کئی بار ایسا بھی تو ہوا ہے کہ شاعر اپنی موت کے بعد پیدا ہو گیا ہو' جس نے اپنی آنکھیں موندتے ہی سب کی آنکھیں کھول دی ہوں' جس نے ایک بار پھر عدم سے اپنے ساز و سامان کے ہمراہ ظاہر ہونے کی سعادت حاصل کر لی ہو اور اپنی قبر کی مٹی سے پھول کی طرح دوبارہ ظاہر ہو گیا ہو۔)

دراصل یورپ میں اپنے قیام کے دوران آپ کو ایرانِ قدیم کے فلسفہ اور افکار کے ارتقاء کے وسیع مطالعہ کا ایک نادر موقع فراہم ہوا اور آپ نے فارسی ادب اور شعر کو پوری گہرائیوں سے پڑھا اور سمجھا تھا اور یورپ میں ایران کے فلسفہ کا اس قدر مطالعہ فرمایا کہ آپ ایرانیت اور فارسیت میں پوری طرح جذب ہو گئے۔ اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ اس

کے بعد آپ نے فارسی زبان ہی میں سوچنا شروع کر دیا۔ اس طرح آپ کی سوچ پر عجمی اثرات گہرے ہونا شروع ہو گئے۔ آپ کے پی ایچ ڈی کے مقالہ کا عنوان بھی ''فارس میں افکار کا ارتقاء'' تھا اور آپ نے جس عالمانہ اور ناقدانہ انداز میں اپنے تحقیقی مطالب اور دلی احساسات کو قلمبند فرمایا' اس پر ڈاکٹر حسین نصر (جو تہران یونیورسٹی کے چانسلر اور ایران کی مجلسِ فلسفہ کے سربراہ رہے ہیں) اپنی کتاب ''تاریخ فلسفۂ ایران'' میں لکھتے ہیں کہ ''علامہ اقبال کے علاوہ عصرِ حاضر میں کسی بھی شخص کو ایران کے فلسفہ کا ایک تقابلی' ارتقائی اور تنقیدی جائزہ پیش کرنے کا خیال نہیں آیا۔ آپ نے اپنے مقالہ سے عجم کی آنکھیں کھول کر رکھ دی ہیں۔''

ایک بار آپ نے علی گڑھ یونیورسٹی کے طلبہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ اسلام کی تاریخ کا سب سے اہم واقعہ ایران کی فتح تھا۔ کیونکہ اگر ایران فتح ہو کر ملتِ اسلام کا حصہ نہ بنتا تو اسلام اہم تاریخی اور ثقافتی وَرثے سے محروم ہو جاتا اور اس میں وہ چاشنی اور بوقلمونی نہ پیدا ہوتی جو اس کی ثقافت اور معاشرت میں ماقبل اسلام'' کی تہذیب کو اپنے اندر سمونے سے پیدا ہوئی۔

علامہ اقبال کے مطالعہ نے آپ کو ایک مستقل اِضطراب اور کرب سے روشناس کروا دیا اور آپ کی ذات میں ایک تڑپ اور لگن پیدا ہو گئی' جس کے دامن سے ایک ایسی ناتمام آرزو نے جنم لیا جو ایک نہ ایک دن اس بے بس جہان کو تہہ و بالا کر کے ایک عظیم فکری و سماجی انقلاب برپا کرنے والی تھی جس کی اساس اسلام کا ابدی پیغام تھی۔

فقر بخشی؟ باشکوہِ خسروِ پرویز بخش — یا عطا فرما خرد بافطرتِ رُوح الامیں

یا چناں کن یا چنیں!

یا بکُش در سینۂ من آرزوے انقلاب — یا دگرگوں کن نہادِ ایں زمان و ایں زمیں

یا چناں کن یا چنیں!

(اے خدا!! اگر تو نے مجھے فقر عطا کرنا ہے تو اس کے ساتھ ساتھ مجھے خسرو پرویز جیسے بادشاہ کی شان و شوکت بھی عطا کر۔ اگر یہ ممکن نہیں تو مجھے حضرت جبرائیل

علیہ السلام کی فطرت عطا کر کے عقل و دانش سے مالا مال کر دے۔ یا یہ عطا کر دے یا وہ عطا کر دے۔ یا تو میرے سینے میں سے انقلاب کی آرزو کو کچل دے، اگر یہ ممکن نہیں تو اس زمانے اور اس سرزمین کی فطرت بدل کر رکھ دے۔ یا تو یہ کر دے یا وہ کر دے۔)

علامہ اقبال کے ذہن میں بار بار یہ خیال آتا تھا کہ آپ بذاتِ خود ایک فارسی گو شاعر ہیں۔ اگرچہ آپ نے اپنے اشعار و نغمات میں اپنے دلی احساسات کو سمو کر دینِ اسلام سے گہری وابستگی کا نہ صرف ثبوت فراہم کیا بلکہ اپنے احساسات کو ممالکِ عجم میں اس طرح عام کر دیا ہے کہ آج اُن کی بازگشت تمام فارسی گو ممالک میں سنائی دے رہی ہے۔ بعض اوقات آپ کا جی چاہتا تھا کہ آپ عربی شعر و نغمہ کی لَے میں بھی گیت گائیں تاکہ آپ کا مافی الضمیر سرزمین عرب میں بھی عام ہو سکے۔ مگر آپ نے حریمِ حجاز سے جس دلی تعلق کی جانب اشارہ فرمایا، اس کے بارے میں کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

گہے شعرِ عراقی را بخوانم گہے جامی زند آتش بجانم
ندانم گرچہ آہنگِ عرب را شریکِ نغمہ ہائے ساربانم

(کبھی تو میں حضرت فخر الدین عراقیؒ کی غزلیات گا رہا ہوں اور کبھی مولانا نورالدین عبدالرحمٰن جامیؒ کی نعتیں اور دوسرے اشعار میری جان میں آگ لگا رہے ہیں۔ اگرچہ میں عرب کی زبان اور آہنگ سے ناواقف ہوں لیکن پھر بھی صحرائے عرب کے ساربانوں کے نغمات میں شریک ہوں۔)

اسی طرح آپ فرماتے ہیں کہ آپ صحرائے عرب سے ہوتے ہوئے حضورِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں پہنچتے ہیں تو حضورِ رسالتؐ میں یہ پوچھا جاتا ہے:

امیرِ کارواں! آں اعجمی کیست؟ سرودِ او بآہنگِ عرب نیست
زند آں نغمہ کز سیرابیٔ اُو خنک دل در بیابانے تواں زیست

(اے امیر کارواں! وہ عجمی یعنی علامہ اقبال کون شخص ہے؟ جس کے نغمات کی آہنگ عربی آہنگ سے مختلف ہے، پھر بھی اس کے نغمات میں وہ چاشنی ہے کہ اگر وہ بیابان میں بھی گائے جائیں تو وہاں پر بھی جینے کا لطف آجائے۔)

ان اشعار میں علامہ اقبال کا خیال یہ ہے کہ آپ کے فارسی اشعار اس قدر بلند پایہ ہیں

کہ ان میں وہ تمام مشکل مضامین ومطالب بیان ہو سکتے ہیں جن کے باعث وہ دین کے رموز اور کنایات کی صحیح ترجمانی کر سکتے ہیں، جن کے باعث ویرانوں میں یعنی دینی فکر سے بے بہرہ خطوں میں بھی وہی ماضی کی رونق واپس آ سکتی ہے۔ آپ اس عہد میں عرب وعجم کے مسلمان معاشرے میں ذہنی زوال اور فکری ابتری سے پریشان تھے اور آپ کو محسوس ہو رہا تھا کہ انگریزوں نے جو نام نہاد جدید تہذیب کا شوشہ مسلمانوں میں چھوڑا ہوا تھا وہ مسلمانوں کی روحانی بنیاد کو کمزور کر رہا تھا۔ آپ پریشانی کے عالَم میں آنحضور ﷺ کے حضور عرض کرتے ہیں:

در عجم گردیدم و ہم در عرب
مصطفیؐ نایاب و ارزاں بو لہب

(عرب وعجم میں ہر جگہ میں نے گھوم پھر کر یہی دیکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے دین کے اثرات اب نایاب ہیں، جبکہ شیطانی اثرات یعنی ابولہب کے آثار ہر جگہ موجود ہیں۔)

ایں مسلماں زادۂ روشن دماغ
ظلمت آبادِ ضمیرش بے چراغ

(عصرِ حاضر کے روشن دماغ مسلمان زادہ کے ضمیر کی تاریکیوں میں ایک بھی ہدایت کا دیا جلتا ہوا نظر نہیں آ رہا۔)

ایں غلام ابنِ غلام ابنِ غلام
حُریت اندیشۂ اُو را حرام

(یہ پشتوں سے غلامی کی زندگی گزار رہا ہے اور صدیوں کی غلامی نے اس کی سوچوں سے آزادی کو ختم کر دیا ہے۔)

آتشِ افرنگیاں بگداختش
یعنی ایں دوزخ دگرگوں ساختش

(اہلِ مغرب کی مسلط کردہ سوچوں کی دوزخ میں جلتے جلتے یہ تباہ وبرباد ہو چکا ہے اور اپنے تشخص کو مکمل طور پر کھو چکا ہے۔)

اُس دور میں آپ کے نزدیک ملتِ اسلامیہ قطعاً غیر منظّم اور پریشان حال تھی۔ نہ تو اس کا کوئی رہنما (امام) موجود تھا جو سامنے آ کر اس کی بد بختیوں کا ازالہ کر کے اسے صحیح راہ دکھا سکتا اور نہ ہی اس ملت کی کوئی واضح منزل متعین تھی۔ اکثر ممالک استعماری قوتوں کے غلام تھے جبکہ نام نہاد آزاد اسلامی ممالک پر بھی انگریزوں کے کٹھ پتلی اور بے اختیار بادشاہ چھائے ہوئے تھے اور کچھ علاقوں میں تو براہ راست انگریز بادشاہ کا حکم چلتا تھا۔ ایران پر اُن دنوں ایسی بے جان اور دقیانوسی طرز کی روایتی بادشاہت مسلط تھی جو پوری طرح انگریزوں اور روسیوں کے شکنجے میں جکڑی ہوئی تھی۔ اس قدیم اور ظلم و استبداد پر مبنی شاہی نظام نے انسانیت کو اس کے حقیقی جوہر سے محروم کر رکھا تھا۔

ہنوز ایں چرخِ نیلی کج خرام است
ہنوز ایں کارواں دُور از مقام است
زکارِ بے نظامِ اُو چہ گویم
تو می دانی کہ ملت بے امام است!

(ابھی تک نیلے آسمان کی گردش ہمارے موافق نہیں ہوئی۔ ابھی بھی ہماری قوم کا کارواں اپنی منزل سے بہت دُور بیابانوں میں بھٹک رہا ہے۔ اس قوم کی بدانتظامی کا رونا کیا کیا روؤں؟ آپ تو جانتے ہیں کہ یہ قوم اس وقت اپنے امام کی تلاش میں ہے۔)

پھر آپ انہی الفاظ کو کچھ اس طرح دہراتے ہوئے ہمیں اپنے صحیح ضابطۂ حیات سے آگاہ کرتے ہیں:

ہنوز اندر جہاں آدم غلام است
نظامش خام و کارش ناتمام است
غلامِ فقرِ آں گیتی پناہم
کہ در دینش ملوکیت حرام است

(ابھی تک دنیا میں آدمی غلامی کے شکنجوں میں جکڑا ہوا ہے۔ اس کا نظام برائے نام ہے اور اس کی کوئی منزل متعین نہیں ہے۔ میں رسول اللہ ﷺ جیسی عظیم

شخصیت کا غلام ہوں جنہوں نے اس جہاں کو امن عطا کیا اور ایسا دین دیا جس
میں بادشاہت کا کوئی وجود نہیں۔)

آپ مسلمانوں کو اس ملوکیت کے خطرات سے آگاہ کرتے ہوئے یہ درس دیتے ہیں کہ اگر جذبۂ صادق موجزن ہو تو ایک فقیر بھی اپنی ہمت سے کام لے کر بادشاہت کو ختم کر سکتا ہے' اور یہ بات بعد کے زمانے میں بالکل سچ ثابت ہوئی۔ ؎

در افتد با ملوکیت کلیمے
فقیرے ' بے کلاہے' بے گلیمے
گہے باشد کہ بازی ہائے تقدیر
بگیرد کارِ صرصر از نسیمے

(شہنشاہِ وقت سے ایک کلیم ٹکرا سکتا ہے۔ شہنشاہت کے مقابلے میں ایک ننگے سر اور بغیر کمبل کے فقیر بھی آ سکتا ہے۔ کئی بار ایسا ہوا ہے کہ تقدیر کے کھیل نے بادِ نسیم کے نرم نرم جھونکوں کو طوفانوں کا روپ دے دیا ہے۔)

آپ جن فقیروں کا ذکر کرتے ہیں انہیں اپنے اصل کی جانب لوٹنے کا اشارہ فرماتے ہیں: ؎

فقیراں تا بمسجد صف کشیدند
گریبانِ شہنشاہاں دریدند
چو آں آتش درونِ سینہ افسرد
مسلماناں بدر گاہاں خزیدند!

(جب فقیروں نے مسجدوں میں صفیں باندھی تھیں تو انہوں نے دینِ مبین کے صحیح جذبے سے سرشار ہو کر شہنشاہوں کے گریبان پھاڑ کر رکھ دیے تھے' لیکن جب دینی حمیت کی یہ آگ سینوں میں بجھنے لگی تو وہ آہستہ آہستہ خانقاہوں میں دبک کر گوشہ نشین ہو گئے۔)

یعنی یہ لوگ حالات و واقعات سے لاتعلق ہو گئے اور شہنشاہیت کو عوام پر مسلط ہونے کا موقع مل گیا۔

ایک بار پھر آپ کو اس روایتی فقر و مستی اور جذب و حال میں سرشار صوفیاء اور درویش ایک نئے دور کے تقاضوں کے خلاف نظر آ رہے تھے۔ آپ مراقبہ ہائے خلوت اور گردشِ غار و کوہ کی بجائے ان فقیروں اور درویشوں کو استغناء اور تقویٰ کا درس دے رہے تھے جن کا عمل جرأت اور ہمت کی خوبیوں سے مالا مال فقرِ غیور یعنی اسلام کے ابتدائی ایام کی یاد تازہ کر دے، جب مسلمان آئین جہانداری و جہانبانی کے امین بن کر قیصر و کسریٰ سے ٹکرا گئے تھے:

چوں بہ کمال می رسد فقر دلیلِ خسروی است

مسندِ کیقباد را در تہِ بوریا طلب

(جب فقر پختہ ہو کر اپنے کمال تک پہنچ جاتا ہے تو یہی فقر ایران کی حکومت یعنی خسرو نوشیروان یا خسرو پرویز جیسی سلطنت کی دلیل بن جاتا ہے۔ کیقباد جیسے عظیم اساطیری دور کے ایرانی بادشاہ کا اگر تخت تلاش کرنا ہو تو ایسے ہی اہل فقر کے بوریے کے نیچے سے مل سکتا ہے۔)

یہاں آپ کی مراد یہی ہے کہ اگر خود کو صفائے قلب و رُوح کے مراحل سے گزارتے ہوئے خدا کی رضا حاصل کر لی جائے تو پھر جبر و استبداد کے بند آنکھوں میں جچتے ہی نہیں۔ انسان غیرت و حمیت کی دولت سے مالا مال ہو کر ان سے ٹکرا جاتا ہے اور پھر وہ وقت آ جاتا ہے جب یہ تخت و تاج حقیر پتھروں کی طرح اس کے قدموں میں لڑھکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ درحقیقت آپ نے بادشاہت کے خلاف تحریک اور عظیم انقلاب کی پیش بینی فرماتے ہوئے اس کے صحیح راستے کا تعین فرما دیا۔ آپ کا خیال تھا کہ ایسا انقلاب برپا کرنے والے لوگ درویش طبع اور راسخ العقیدہ مسلمان ہوں گے جنہیں مال و متاع کے حصول کی بجائے خدا کی خوشنودی عزیز ہو گی۔ آپ نے علمِ دین اور علمِ عصرِ حاضر کے حصول کو ابتدائی شرط تو قرار دیا ہی تھا مگر اس کے بعد آپ نے مستی و سوز اور جذبِ دروں کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے اس امر کی جانب اشارہ فرمایا کہ زندگی صرف کتابی معلومات کے سہارے نہیں گزر سکتی بلکہ علمِ قرآن اور علمِ عصرِ حاضر سے

گوہر ہائے یکتا کو جمع کر کے انہیں دل و جاں میں سمو لینے سے ہی انسان کندن بن سکتا ہے۔ امام فخر الدین رازیؒ کی تفاسیر پڑھ لینا ہی کافی نہیں اور ان کے استدلال پر اکتفا کر لینا بھی خامی کی علامت ہے۔ یہ سب کچھ سیکھ کر انسان قرآن کے رموز و آیات کو اپنے اوپر طاری کر لے اور پھر صاحب قرآن بن کر' خدا کے احکامات کا مجسم بن کر عصرِ حاضر کے ہر چیلنج کا مقابلہ کرنے کی سکت حاصل کرے۔ ؎

ز رازی حکمتِ قرآن بیاموز
چراغے از چراغِ اُو بر افروز
ولے ایں نکتہ را از من فراگیر
کہ نتواں زیستن بے مستی و سوز

(امام فخر الدین رازیؒ سے قرآن پاک کی حکمت و دانائی کو سیکھ لے اور ان کے چراغ سے اپنا چراغ جلاتے ہوئے ان کی روشنی اور نور کا امین بن جا' لیکن یہ نکتہ مجھ سے سیکھ لے کہ مستی اور سوز کے بغیر جینا ممکن نہیں ہے۔)

جہاں حکمت و دانائی اور فلسفیانہ موشگافیاں رازی پر ختم ہیں وہاں جوش و مستی آپ کو مولانا جلال الدین رومیؒ کے ہاں ملتی ہے۔ جلال الدین رومی ایران کے معاصر میں مولوی کے نام سے پہچانے جاتے تھے۔ آپ کے ہاں فقر غیور اور جذبۂ ایمانی کی فراوانی ملتی ہے۔ علامہ اقبال نے ہر قدم پر مولانا روم کی پیروی کو شعار بنایا ہے۔ اس کا تفصیلی ذکر تو شاید اس جگہ ممکن نہ ہو' ہم صرف ایک رباعی پر اکتفا کرتے ہیں جس میں اقبال فرماتے ہیں: ؎

چو رومی در حرم دادم اذاں من
ازو آموختم اسرارِ جاں من
بہ دورِ فتنۂ عصرِ کہن او
بہ دورِ فتنۂ عصرِ رواں من

(رومیؒ کی طرح میں نے حرم میں اذان دی ہے اور میں نے وہ راز جن کا روح

کی گہرائیوں سے تعلق ہے، مولانا رومی ہی سے سیکھے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ گزشتہ دور کے فتنہ وفساد کے عینی شاہد ہیں اور میں اس عہد کے فتنہ کا چشم دید گواہ ہوں۔)

یہاں یہ یاد رہے کہ مولانا روم کا دَور چنگیز خان کے استیلاء سے ذرا بعد کا اور ہلاکو خان کے فتنہ اور قتل و غارت کا دور تھا۔ مولانا رومؒ (۶۰۴ھ تا ۶۷۲ھ) نے شمالی خراسان (موجودہ افغانستان) کے شہر بلخ سے اٹھ کر ایران سے گزرتے ہوئے فتنہ وفساد کے مراکز سے بہت دور ترکی کے شہر قونیہ میں زندگی گزار دی تھی اور آپ نے اپنے ابتدائی دور میں اور دورانِ سفر ملتِ اسلامیہ کی مایوسی اور تباہ حالی کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ فرمایا تھا۔ آپ نے یہ دیکھا تھا کہ اسلامی سلطنت کے انقراض کے بعد مسلمانوں میں یاس والم کے سبب ایک سکوت سا طاری ہو گیا تھا اور مسلمان جہد و ہمت کی بجائے خانقاہوں کے کونوں کھدروں سے سکون تلاش کر رہے تھے۔ آپ نے اپنے دور میں مسلمانوں میں حریت کی رُوح بیدار کرنے کی کوشش فرمائی تھی اور اس بات کا درس دیا تھا: ؎

مصلحت در دینِ عیسیٰؑ غار و کوہ
مصلحت در دینِ ما جنگ و شکوہ

(حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین کی مصلحت دنیا کے ہنگاموں سے دور پہاڑوں اور غاروں میں چلے کاٹنے میں ہو سکتی ہے، لیکن ہمارے دین کی مصلحت لڑ کر شان و شوکت اور جلال کے حصول میں ہے۔)

علامہ اقبال کے ہاں ہمیں اس شعر کی بازگشت یوں ملتی ہے ؎

زندگی او را فرارِ غار و کوہ
زندگی ما را ز مرگِ با شکوہ

(اس کے ہاں زندگی دنیا کے ہنگاموں سے فرار ہو کر پہاڑوں اور غاروں میں گھس جانے میں تھی، لیکن ہمارے ہاں زندگی سے مراد جد و جہد اور جہاد کرتے ہوئے شان و شوکت کے ساتھ مر جانے، یعنی شہید ہونے میں ہے۔)

یہی وجہ ہے کہ آپ کو ٹیپو سلطانؒ سے خاص محبت ہے۔ المختصر یہ کہ علامہ نے ہمیں رومی

کے اشعار کا مطالعہ اور ان کا جوش درون اپنی روح میں سمیٹنے کا درس دیا ہے۔ ؎

بکامِ خود دگر آں کہنہ مے ریز
کہ با جامش نیرزد ملکِ پرویز
ز اشعارِ جلال الدین رومیؒ
بہ دیوارِ حریمِ دل بیاویز

(اس شرابِ کُہن یعنی سوز و مستی کے چند گھونٹ پی لو جس کے ایک جام کی قیمت خسرو پرویز جیسے شہنشاہ کی تمام بادشاہی سے بڑھ کر ہے۔ مولانا جلال الدین رومیؒ کے اشعار کی برکت سے آپ دل کی دنیا کی متاعِ پنہاں حاصل کر کے خود دل یعنی روح کو حرم کی دیوار کے ساتھ لٹکا لیں۔)

یاد رہے کہ خسرو پرویز حضرت رسول اللہ ﷺ کا معاصر وہی مشہور ایرانی بادشاہ تھا جس کو آپؐ نے ایک تاریخی خط کے ذریعے اسلام کی دعوت دی تھی۔ اور یہی وہ بادشاہ تھا جس نے شروع شروع میں سلطنتِ رُوم کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دی تھی اور اس کی فتح ہی کے موقع پر سورۂ روم نازل ہوئی تھی۔ یہاں ایک بار پھر علامہ اقبال نے جوش و مستی کے حصول کو بادشاہت سے ٹکرانے کی پہلی ضرورت قرار دیا ہے۔ اسی نکتے کی جانب آپ نے ایک بار پھر اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے: ؎

بیا ساقی بگرداں جامِ مے را
ز مے سو زندہ تر کن سوزِ نے را
دگر آں دل بنہ در سینۂ من
کہ پیچم پنجۂ کاؤس و کے را!

(اے ساقی! آ اور جامِ مے، یعنی سوز و مستی کی کیفیت کو حرکت میں لا۔ اس کیفیت کے سوز کو شراب کے سوز سے زیادہ پُرسوز اور پُرجوش کر دے۔ اس کے باعث میرے سینے میں وہ دل رکھ دے کہ جس کی طاقت سے میں قدیم ایران کے اساطیری عہد کے شہنشاہوں کیکاؤس، کیقباد، کیخسرو اور کیانی عہد کے دوسرے بادشاہوں سے پنجہ آزما ہو جاؤں۔)

یہاں بادشاہوں سے مُراد ہر عہد کے وہ فرعون اور صاحبِ جاہ وحشم بادشاہ مراد ہیں جو اپنے جلال اور ہیبت کا نفسیاتی تائثر پیدا کر کے لوگوں کے دلوں میں غلامی کا رُعب طاری کر دیں۔ علامہ اقبال نے اسی تائثر اور خوف کو زائل کرنے کے لیے خداوند تعالیٰ کے حضور سجدہ ریز ہونے کو کہا ہے کہ وہ ایک سجدہ تمہیں ان ہزار سجدوں سے نجات دلا دے گا، جو تم بادشاہوں کے درباروں اور غیر اللہ کے حضور کرتے ہو۔ حضرت مجدّد الفِ ثانی (شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ) نے اسی سجدے کے زیرِاثر دربارِ جہانگیری میں سجدے سے انکار کر دیا تھا۔ پورے خشوع وخضوع کے ساتھ خدا کے حضور سر جھکانے کے بعد انسان کو دُنیا کے بادشاہوں کی قدر ومنزلت کا پتا چل جاتا ہے اور پھر یہ تخت وتاج اس کی نظر میں بے مایہ ہو جاتے ہیں۔

مسلمانیم و آزاد از مکانیم
بروں از حلقۂ نُہ آسمانیم
بما آموختند آن سجدہ، کز وے
بہائے ہر خداوندے بدانیم

(ہم مسلمان ہیں اور ہر مکان یعنی غلامی اور استبداد کے تمام تر مظاہر اور نشانات کے اثرات سے آزاد ہیں اور ہماری آزادی تمام دنیاوی حدود و قیود سے بالاتر ہے، اور نو آسمان بھی ہمیں اپنی حدود و قیود میں بند نہیں رکھ سکتے۔ ہمیں خدا کے حضور وہ سجدہ کرنا سکھایا گیا ہے جس کی لذّت نے ہماری آنکھوں کے سامنے تمام بادشاہوں کی حقیقت واضح کر دی ہے۔)

یہاں یہ بیان کرنا دلچسپی کے لیے ضروری ہے کہ جب ایران کا آخری بادشاہ محمد رضا شاہ پہلوی ۱۹۵۰ء میں پاکستان کے سرکاری دورے پر لاہور آیا تو اس نے حضرت علامہ اقبال کے مزار پر حاضری دی اور دعا مانگی۔ مزار کی عمارت کی چھت پر آپ کی ایک مشہور فارسی غزل تحریر ہے، جس کے آخری شعر پر جب شاہ کی نگاہ پڑی تو اس کے چہرے پر اضمحلال اور رنج وملال کے آثار نمودار ہو گئے۔ اس واقعے کے عینی شاہد ایران کے اُس

وقت کے ملک الشعراء جناب صادق سرمد تھے' جنہوں نے یہ واقعہ بعد میں میرے استاد جناب ڈاکٹر عرفانی مرحوم کو بتایا۔ وہ شعر یوں ہے کہ : ؎

در آ بسجدہ و یاری ز خسرواں مطلب
کہ روزِ فقر نیاگانِ ما چنیں کردند

(خدا کے حضور سجدہ ریز ہو جاؤ اور بادشاہوں سے خیر کی توقع مت کرو' کیونکہ ہمارے اسلاف نے اپنے فقر و مستی میں صرف خدا کو ہی سجدہ کیا ہے۔)

اس شعر نے شاہ کے دِل میں وہ کیفیت پیدا کر دی جس نے اسے بیخ پا کر کے رکھ دیا۔ شاہ کو اُس وقت کیا علم تھا کہ اقبال کے دیگر افکار و اشعار ایک دن اس کے خلاف اٹھنے والی فیصلہ کن تحریک کا محرک بن کر جوانوں کے دلوں میں ان کے اسلاف کی آگ روشن کر رہے ہوں گے! آپ نے ایک اور موقع پر فرمایا تھا: ؎

دل بحق بند و کشادے ز سلاطیں مطلب
کہ جبیں بر درِ ایں بتکدہ سودن نتوان

(خدا سے اپنے دل کو وابستہ کر لو اور سلطانوں سے رزق اور مراعات کی توقع مت رکھو۔ ان کے دربار بُت خانے ہیں اور ان پر اپنی پیشانیوں کو مت رگڑو!)

اقبال تو بادشاہت کو بھی شرک قرار دیتے تھے ع ''لا سلاطین' لا ملوک و لا الٰہ'' کا پیغام دیتے ہوئے آپ ان بُتانِ عصر سے ٹکرانے کی تلقین کرتے تھے۔ آپ کے ہاں ''اَلْمُلْکُ لِلّٰہِ'' کے مصداق بادشاہت بھی خداوند تعالیٰ کی ایک صفت ہے۔ اس طرح فرعون اور نمرود کی طرح جو انسان خود کو اس صفت سے متصف کرتے تھے وہ اور اُن کی بادشاہت کو تسلیم کرنے والے لوگ شرک کے مرتکب ہوتے تھے۔ آپ نے ارمغانِ حجاز میں حضورِ رسالت مآب ﷺ میں عرض کرتے ہوئے کہا ہے : ؎

گہے افتم' گہے مستانہ خیزم
چہ خوں بے تیغ و شمشیرے بریزم
نگاہِ التفاتے بر سرِ بام
کہ من با عصرِ خویش اندر ستیزم!

(کبھی میں گرتا ہوں اور کبھی مستانوں کی طرح اٹھ کھڑا ہوتا ہوں۔ میں بغیر کسی تلوار اور خنجر کے ایک خونی جنگ لڑ رہا ہوں۔ آنحضور ﷺ کی نظرِ التفات کا اُمیدوار ہوں، کیونکہ میں آپؐ کی سنّت کی پیروی میں اپنے دَور کے تمام ہنگاموں کے خلاف جہاد کر رہا ہوں۔)

علامہ اقبال آہستہ آہستہ فقیروں، دردمندوں، غلاموں اور ظلم و استبداد کے شکار اہلِ مشرق کو فقر و اِستغناء کا درس دیتے ہوئے جوش و مستی سے روشناس کروا رہے تھے اور مستقبل میں اسلام کے غلبے کے لیے آپ کی نگاہیں اہل عجم اور خصوصاً اہلِ ایران پر لگی ہوئی تھیں۔ آپ اس سرزمین سے اسلام کے احیاء، شہنشاہیت کے خاتمے اور ایک عظیم انقلاب کی راہ دیکھ رہے تھے۔ آپ کو اپنی صدا اہلِ ایران کی صدا محسوس ہو رہی تھی۔ آپ تہران کو اقوامِ مشرق کے مرکز، یعنی جنیوا کے طور پر دیکھ رہے تھے۔ آپ آب و گلِ ایران اور تبریز سے کسی رُومی کے اُٹھنے کے منتظر تھے۔ آپ فرما رہے تھے:

تنم گلے ز خیابانِ جنتِ کشمیر
دل از حریم حجاز و نوا ز شیراز است

(میرا جسم کشمیر کے جنت جیسے باغ کی کیاری کا ایک پھول ہے۔ میرا دل حجاز کے حرم سے ہے تو میری آواز شیراز سے ہے۔)

یہاں آپ حرم کے سوز و مستی کو شیراز کی آواز میں بیان فرما رہے تھے:

رہِ عراق و خراساں زن اے مقام شناس
بہ بزمِ اعجمیاں تازہ کن غزل خوانی

(اے منزل پر رکے ہوئے مسافر! عراق اور خراسان کی جانب چل پڑ، یعنی سبک عراقی اور سبک خراسانی میں شعر کہتے ہوئے ایرانیوں کی محفل میں غزل چھیڑ دے!)

ظلم و استبداد پر مبنی سامراجی نظام جو اُن دنوں روسی اور فرنگی غلبے کے باعث ایران پر مسلط تھا، اس نے ایرانیوں کے ملّی، روحانی اور مذہبی تشخص کا خاتمہ کر دیا تھا۔ جہاں بدترین شخصی شاہی نظام عوام کی رگوں سے خون کے آخری قطرے کو نچوڑ رہا تھا، جہاں

عام انسان کی زندگی جانوروں سے بدتر تھی' جہاں مذہب کے مقدس نام پر مخصوص قسم کی کلیسائی ظلم و بربریت کا دَور دَورہ تھا اور بقول حضرت آیت اللہ طالقانی مذہب کا جو رُخ عوام کو دکھایا جا رہا تھا اس کے باعث نوجوانوں کے دلوں میں مذہب کی کشش آہستہ آہستہ ختم ہو رہی تھی۔ اقبال کو اس پر شدید رنج و ملال تھا۔ آپ نے ایک بار واضح انداز میں اس انحطاط کا ذکر کرتے ہوئے ایک راہِ عمل کا تعین کیا' جس کی رہنمائی کے لیے آپ نے قرآن پاک کی اصل تعلیمات کی جانب رجوع کرنے کو کہا۔ آپ نے فقر کا ذکر کرتے ہوئے کہا: ؎

فقرِ خیبر گیر با نانِ شعیر
بستۂ فتراکِ اُو سلطان و میر

(جَو کی روٹی کھا کر حضرت علی رضی اللہ عنہ فقر کی بدولت قلعہ خیبر فتح کر لیتے ہیں۔ فقر کے پھندے میں سلطان اور امیر آ جاتے ہیں۔)

فقر ذوق و شوق و تسلیم و رضاست
ما امینیم ایں متاعِ مصطفیٰؐ ست

(فقر ذوق و شوق اور تسلیم و رضا کا نام ہے۔ ہم اس کے امانت دار ہیں اور در حقیقت یہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سرمایہ ہے۔)

با سلاطیں در فتد مردِ فقیر
از شکوہِ بوریا لرزد سریر

(ایک فقیر آدمی سلطانوں سے ٹکرا جاتا ہے اور فقیروں کے بوریا کی ہیبت تختِ شاہی پہ لرزہ طاری کر دیتی ہے۔)

قلبِ اُو را قوت از جذب و سلوک
پیشِ سلطان نعرۂ اُو لا ملوک

(اس کے دل کی طاقت جذب اور سلوک ہے اور بادشاہوں کے دربار میں وہ توحید کا پیغام دیتے ہوئے لا ملوک یعنی ''خدا کے سوا کوئی بادشاہ نہیں ہے'' کا نعرہ لگا دیتا ہے۔)

فقر را تا ذوقِ عریانی نماند
آں جلال اندر مسلمانی نماند

(جب سے فقر میں اپنے اظہار کا جذبہ باقی نہیں رہا' مسلمانوں کا جاہ وجلال مٹ کر رہ گیا ہے۔)

فقرِ عریاں گرمیٔ بدر و حنین
فقرِ عریاں بانگِ تکبیرِ حسینؓ

(فقر کا اظہار غزوۂ بدر اور غزوۂ حنین کی گرمی کی شکل میں ہوتا ہے یا پھر حضرت امام حسینؓ کے سرزمینِ کربلا میں بلند ہونے والے نعرۂ تکبیر سے۔)

از سہ قرن این اُمّتِ خوار و زبوں
زندہ بے سوز و سرورِ اندروں

(گزشتہ تین صدیوں سے اُمتِ محمدیؐ ذلیل وخوار ہو رہی ہے اور اندرونی سوز و سرور کے بغیر جی رہی ہے۔)

پست فکر و دُوں نہاد و کور ذوق
مکتب و مُلّائے اُو محروم شوق

(اس کی سوچ پست ہو چکی ہے' فطرت کمینگی کی طرف مائل ہے اور ذوق اندھا ہو چکا ہے۔ اس کے تعلیمی ادارے اور مذہبی رہنما' یعنی ملاّ شوق سے محروم ہیں۔)

طبعِ اُو بے صحبتِ مردِ خبیر
خستہ و افسردہ و حق نا پذیر

(اس کی طبیعت کا میلان کسی باخبر انسان کی صحبت کی جانب مائل نہیں ہوتا۔ یہ اُمت تھک چکی ہے' پریشان حال ہے اور حق بات کو قبول کرنے سے اجتناب کر رہی ہے۔)

من نہ مُلاّ' نے فقیہِ نکتہ ور
نے مرا از فقر و درویشی خبر

(میں نہ تو مُلا ہوں اور نہ ہی نکتہ ورقسم کا فقیہہ ہوں اور نہ ہی مجھے فقر اور درویشی کا چنداں علم ہے۔)

در رہِ دیں تیز بین و سست گام
پختۂ من خام و کارم ناتمام

(میں دین کے معاملات کو آسانی اور تیزی سے سمجھ تو لیتا ہوں مگر اس کی راہ پر اپنی سستی کے باعث آہستہ آہستہ چل رہا ہوں۔ میں جسے پختہ سمجھتا ہوں میری وہ فکر بھی خام ہے اور میں اپنے افکار کے جو نقوش آپ کو پیش کرتا ہوں وہ بھی ابھی تشنۂ تکمیل ہیں۔)

لیکن اس کے باوجود: ؎

تا دلِ پُر اضطرابم دادہ اند
یک گرہ از صد گرہ بکشادہ اند

(چونکہ مجھے خداوند تعالیٰ کی طرف سے اضطراب اور بے چینی سے مالا مال ایک دل نصیب ہوا ہے' اس لیے میرے سو عقدوں میں سے ایک عقدہ کھل گیا ہے۔)

یعنی مجھ پر کچھ نہ کچھ اسلام کی حقانیت اور ابدی سچائی کی حقیقت واضح ہو چکی ہے۔ ؎

از تب و تابم نصیبِ خود بگیر
بعد ازیں ناید چو من مردِ فقیر

(میری تب و تاب سے فیض حاصل کر لو' کیونکہ ممکن ہے کوئی میرے جیسا فقیر شخص شاید پھر کبھی بھی پیدا نہ ہو سکے۔)

پھر آپ نے عصرِ حاضر کے خطرات سے آگاہ کرتے ہوئے ظلم و استبداد کے اس نظام کو (جو اس دَور میں مسلمانوں پر مسلط تھا) پوری شدت سے ردّ کرتے ہوئے صحیح اسلامی افکار کی جانب توجہ دلائی اور فرمایا کہ اب آپ خانقاہوں اور پناہ گاہوں سے باہر نکل آئیں اور قرآن پاک کے رموز کو فاش کرتے ہوئے ایک نئے اور دیرپا اسلامی انقلاب کی تیاری کریں۔ ایران اور برِّصغیر کے مسلمانوں کی حالت زار کو مدِ نظر رکھتے ہوئے آپ نے فرمایا: ؎

از ضعیفاں ناں ربودن حکمت است
از تنِ شاں جاں ربودن حکمت است

(کمزوروں یعنی مستضعفین سے روٹی کے نوالے تک چھین لینے کو آج کی دنیا میں دانائی کا نام دیا جارہا ہے۔ان کے جسموں سے خون کے آخری قطرے کو نچوڑ کر انہیں زندگی سے محروم کردینے کو حکمت کہا جارہا ہے۔)

شیوۂ تہذیبِ نو آدم دری است
پردۂ آدم دری سوداگری است

(نئی تہذیب کا شیوہ تو قوموں کا قتل عام ہے اور انسانیت کے قتلِ عام کے پردے میں سوداگری ہورہی ہے۔)

تا تہ و بالا نگردد ایں نظام
دانش و تہذیب و دیں سودائے خام

(جب تک یہ استبدادی نظام تہ و بالا نہیں ہوجاتا اس وقت تک تہذیب، دانش اور دین کی جو صورت مذہبی رہنما پیش کررہے ہیں وہ سب ایک واہمے سے زیادہ نہیں ہے۔)

تختِ جم پوشیدہ زیر بوریاست
فقر و شاہی از مقاماتِ رضاست

(اللہ کی رضا حاصل کرنے سے ہی فقیری ملتی ہے اور وہی فقیری بادشاہت سے برتر ہے۔دراصل اہلِ فقر کے بوریے کے نیچے ایران کے اساطیری عہد کے عظیم بادشاہ جمشید کا تخت بھی چھپا ہوا ہے۔)

اے کہ می نازی بہ قرآنِ عظیم
تا کجا در حجرہ می باشی مقیم؟

(اے کہ تجھے قرآن پاک پر ناز ہے، تو کب تک خانقاہوں اور حجروں میں مقید ہو کر اپنے حال میں مست پڑا رہے گا؟)

در جہاں اسرارِ دیں را فاش کن
نکتۂ شرعِ مبیں را فاش کن!

(اِس دنیا میں دین کے تمام پوشیدہ رازوں کو فاش کردے اور شرعِ مبین کے باریک نکتوں کو دنیا پر روشن کردے!)

مکتب و ملاّ سخن ہا ساختند

مؤمناں ایں نکتہ را نشناختند

(آج تک دینی مدرسوں اور علماء کی محفلوں میں بے شمار عالمانہ باتیں ہوتی رہی ہیں، لیکن ان تمام علمی مباحث کے باوجود مؤمنوں کی نظر سے یہ اصلی نکتہ چھپا رہا ہے۔)

اگر مندرجہ بالا اشعار پر غور فرمایا جائے تو ایران کے اِسلامی انقلاب کی تمام تر تاریخ آپ کی نگاہوں کے سامنے خود بخود گھوم جاتی ہے۔ اسی لیے تو آیت اللہ علی خامنائی نے فرمایا ہے کہ ایران کا انقلاب اقبال کے اسلامی افکار کا ہی مرہونِ منت ہے۔ آپ کے اِنہی افکار کی روشنی میں ڈاکٹر علی شریعتی اور آیت اللہ طالقانی کے دیئے جانے والے وہ لیکچرز ہیں جنہوں نے ایران میں انقلاب کی رُوح بیدار کر دی اور علمائے حق حجروں سے نکل کر میدانِ عمل میں اتر آئے۔

علامہ اقبال کے دور ہی میں انگریز برصغیر پر اپنا اقتدار مستحکم کرنے کے بعد جنوبی اور مغربی ایران میں بن بلائے مہمان کی طرح گھس بیٹھے تھے' اور انگریزی تہذیب و ثقافت ایران میں شاہی سرپرستی میں مقبول ہوتی جا رہی تھی۔ اہلِ ایران کا خود اپنے اوپر اعتماد اُٹھ چکا تھا اور وہ اپنے تئیں مجبورِ محض تصور کرنے لگ گئے تھے۔ کامیابی اور ترقی کا راز اہلِ مغرب کی اندھی تقلید میں مضمر سمجھا جا رہا تھا۔ ایسے میں آپ نے فرمایا:

اے اسیرِ رنگ پاک از رنگ شو

مؤمنِ خود کافرِ افرنگ شو

(اے رنگ و نسل کے اسیر! ان چکروں سے باہر نکل آ۔ افرنگی تہذیب کا انکار کرتے ہوئے اپنے آپ کو پہچان لے!)

رشتۂ سود و زیاں در دست تست

آبروئے خاوراں در دست تست

(تمہارے ہاتھوں سے سود و زیاں کا کنٹرول چھن چکا ہے اور خاوران یعنی مشرق کی آبرو چھن چکی ہے۔)

یہ نکتہ یہاں اہم ہے کہ خاوران کبھی کبھی ماضی قدیم میں خراسان کو بھی کہا جاتا تھا' اور فارسی گوخطہ خراسان وہی ہے جس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے احیائے اسلام کے ابتدائی مرکز ہونے کی پیشین گوئی فرمائی تھی۔

این کہن اقوام را شیرازہ بند
رایتِ صدق و صفا را کن بلند

(ان قدیم اقوام کوایک اتحاد میں جمع کرنے والے اے مشرقی انسان! تو آخرکار سچائی اور صفا کے علم کو بلند کردے۔)

اہلِ حق را زندگی از قوت است
قوتِ ہر ملّت از جمعیت است

(حق والوں کی زندگی دینی' روحانی' سیاسی غلبے اور بین الاقوامی قوت میں موجود ہے اور ہر قوم کی قوت کا دارومدار اس کے عوام کے باہمی اتحاد میں مضمر ہے۔)

رائے بے قوت ہمہ مکر و فسوں
قوتِ بے رائے جہل است و جنوں

(وہ رائے جس کے ساتھ قوت شامل نہ ہو یعنی وہ فقہی اصول یا قوانین جن پر عمل درآمد نہ کرایا جاسکے وہ صرف مکروفسوں' یعنی نظروں کا دھوکا بن کر رہ جاتے ہیں' اور اگر ایسی قوت حاصل ہوجائے جس کے ساتھ قوانین اور اصولوں کی پاسداری کے دساتیر نہ ہوں وہ بھی اندھی جہالت اور دیوانگی کو جنم دیتی ہے۔)

اے امینِ دولتِ تہذیب و دیں
آں یدِ بیضا برآر از آستیں!

(اے تہذیب اور دین کی دولت کے امانت دار! اپنی آستین سے یدِ بیضا نکال کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح آج تو عصر حاضر کے فرعون کے دربار کی تاریکیوں میں روشنی کا اظہار کردے' یعنی حق کا اعلان کردے۔)

خیز و از کارِ امم بکشا گرہ
نشۂ افرنگ را از سر بنہ

(اٹھواور قوموں کی مشکلات کا ایک واضح حل پیش کرواور انگریزوں کی تہذیب کا نشہ اپنے دماغ سے اتار دو۔)

نقشے از جمعیتِ خاور فگن
واستاں خود را زدستِ اہرمن

(ایک دفعہ پھر مشرقی اقوام یعنی ایشیائی مسلمانوں کے عزم و ہمت کے نشانات جہان پر واضح کر دو اور خود کو اہرمن یعنی شیطان کے پنجے سے رہا کر والو۔)

دراصل قبل از اسلام کے ایران مین خدائے بدی کو ''اہرمن'' کے نام سے پہچانا جاتا تھا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد فارسی ادب میں ابھی تک زردشتی مذہب کے خدائے بدی یعنی اہرمن کی اصطلاح باقی رہ گئی تھی اور یہ اصطلاح اب ابلیس کے لیے استعمال ہونے لگی تھی۔ ابلیس تو راندۂ درگاہ ہے مگر اہرمن کو تمام تر برائیوں کے خوفناک مظہر کے طور پر ایک انتہائی جاندار شخصیت کے روپ میں پیش کیا جاتا رہا ہے۔ مشرقی مفکرین خصوصاً علامہ اقبال کے افکار میں اہرمن کا تصور بہت واضح نظر آتا ہے اور اس کی تمام تر قوتوں سے ٹکرانے کی تلقین کی جاتی ہے۔

اس تناظر میں اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ علامہ اقبال کو اپنے عہد کے ایران کے حالات و واقعات اور ملتِ ایران کی زبوں حالی کی بابت کس طرح کی معلومات حاصل تھیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ آپ نے کبھی بھی اپنی زندگی میں ایران کا سفر نہیں فرمایا۔ آپ کے مشہور ایرانی اسکالر جناب سعید نفیسی کے نام تحریر شدہ خطوط کی تحریروں سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ آپ کے دل میں ایران کے سفر کی آرزو ضرور تھی۔ آپ اس سرزمین کے تیزی سے مٹتے ہوئے نقوشِ کہن کا ذاتی طور پر مشاہدہ کرنا چاہتے تھے اور اس قوم کے زُعماء سے ملاقات کرنا چاہتے تھے، مگر جو آہنی پردہ انگریزوں کے دورِ حکومت میں دونوں اقوام (ایران اور ہند اسلامی) کے درمیان حائل ہو چکا تھا اس کے باعث آپ اس سفر سے محروم رہے۔ تاہم کسی نہ کسی صورت میں آپ کا رابطہ ایرانیوں سے قائم ضرور تھا اور آپ وہاں کی سیاسی اور فکری تحریکوں کے جوش و خروش سے پوری طرح باخبر تھے۔ اس

کا ثبوت ہمیں ''جاوید نامہ'' کے اُن اشعار سے ملتا ہے جو آپ نے آسمانوں پر ایرانی بادشاہ نادر شاہ افشار سے ایک تصوراتی ملاقات کے ضمن میں کہے ہیں۔ ان اشعار سے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ علامہ اقبال ایران کے حالات و واقعات سے مکمل طور پر واقف تھے' بلکہ آپ فکری اعتبار سے وہیں کے باسی اور مفکر دکھائی دیتے تھے۔ نادر شاہ افشار آپ کا استقبال کرتے ہوئے کہتا ہے:

خوش بیا اے نکتہ سنجِ خاوری
اے کہ می زیبد ترا حرفِ دری

(اے مشرق کی سرزمین کے رازداں! خوش آمدید۔ اے کہ تیری زبان پر فارسی گفتگو کس قدر دلکش محسوس ہو رہی ہے۔)

محرمِ رازیم! با ما راز گوے
آنچہ می دانی ز ایران باز گوے!

(ہم ایک دوسرے کے رازدان ہیں' ہمارے ساتھ کوئی راز کی بات کر۔ جو کچھ تمہیں ایران کے بارے میں معلوم ہے کھل کر بیان کرو۔)

اس کے جواب میں علامہ اقبال ''زندہ رود'' کے نام سے اپنا پیغام دیتے ہیں۔ ''زندہ رود'' دراصل اس دریا کا نام ہے جو ایران کے تاریخی شہر اصفہان کے بیچوں بیچ سے گزرتا ہے اور اس عظیم شہر اور قدیم ایرانی دارالحکومت کی شان دوبالا کرنے کے علاوہ اسے زندگی (کیونکہ خدا نے ہر چیز کو پانی سے زندہ کیا ہے) عطا کرتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

بعدِ مدّت چشم خود بر خود کشاد
لیکن اندر حلقۂ دامے فتاد

(ایک طویل عرصہ کے بعد اس نے اپنی نگاہ اپنے آپ پر ڈالی تو ضرور تھی اور خود آگاہی و خود بینی کی لذت پائی تھی' لیکن بہت جلد ایک اور جال کے تانے بانے میں الجھ کر رہ گیا تھا۔)

یہ واقعات دراصل تحریکِ مشروطیت (پارلیمانی جمہوریت کی تحریک) کے بعد کے اور رضا خاں کے دوبارہ بادشاہت کی بحالی اور مغربی اقتدار کے بزور فروغ سے متعلق

ہیں، جن کی جانب آپ نے ایک دقیق اور نازک اشارہ فرمایا ہے:

کشتۂ نازِ بتانِ شوخ و شنگ
خالقِ تہذیب و تقلیدِ فرنگ!

(آج کا ایران مغربی استعمار کے زیر اثر انگریزوں کی اندھی پیروی میں مبتلا ہے اور مغربی تہذیب کی تمام برائیاں اپنے دامن میں سمیٹنے میں کوشاں ہے اور عصرِ حاضر کے پُرفریب بتوں (بتانِ رنگ وخوں) کی فریب کاری کا شکار ہے۔ افسوس کہ وہ ایران جو کبھی تہذیب وتمدن کا گہوارہ تھا' آج خود فراموشی کے عالَم میں مغرب کی تہذیب پر والہ وشیفتہ ہو رہا ہے۔)

کارِ آں وارفتۂ ملک و نسب
ذکرِ شاپور است و تحقیرِ عرب!

(آج کے ایران میں قبل از اسلام کے عہد کی روایات سے وابستگی کے آثار و شواہد مل رہے ہیں اور وہ اپنے ملک کی قدیم تاریخ اور نسل آریائی کی برتری پر فخر کر رہا ہے۔ آج وہ عظیم ساسانی فاتح شاہ پور کا ذکر کر رہا ہے اور عربوں کی تحقیر اور تذلیل میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کر رہا۔)

آنحضورﷺ سے تقریباً تین سو برس پہلے ایرانی بادشاہ شاہ پور ساسانی نے عرب کے علاقے فتح کرنے کے بعد عربوں پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑ دیے تھے۔ عربوں کی قدیم تاریخی کتب میں اسے ''شَافُور ذُوالاکتاف'' کہا جاتا ہے' جس کے معنی ہیں ''شاہ پور کندھوں والا''۔ یہ اصطلاح اس لیے رائج ہوئی تھی کہ اُس نے عرب اسیروں کے کندھوں میں سوراخ کر کے ان میں رسے ڈال کر انہیں انتہائی بے دردی سے ہانکا تھا اور ذلیل وخوار کیا تھا۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ اس موقع پر ایک ضعیف العمر عرب خاتون نے بادشاہ کو خطاب کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ ''اے فاتح بادشاہ! اپنی قوت کا اس قدر گھمنڈ مت کر' ایک وہ وقت بھی آئے گا جب عرب سے ایک عظیم انسان کا ظہور ہو گا جو ایران کی بادشاہت کا خاتمہ کر دے گا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تیری قوم کو تیرے ان تمام گناہوں کی مکافات مہنگی پڑ جائے''۔ مؤرخین اس بات کو رسول اللہﷺ کی بعثت کے لیے ایک

پیشین گوئی بھی سمجھتے ہیں۔ خیر اس شعر میں ایران میں نسلی تفاخر کے احیاء کی تحریک کی جانب اشارہ ہے، جو پہلوی دور میں آخر تک زوروں پر رہی۔

روزگارِ اُو تہی از واردات

از قبورِ کہنہ می جوید حیات!

(ایران کے موجودہ عہد میں قدامت پرستی، شہنشاہیت کے فروغ اور ماضی کے ساسانی و ہخامنشی عہد کے آثار پر فخر و مباہات کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اس میں ابھی جدید عہد کے تقاضوں کے مطابق ڈھلنے کی گنجائش کم ہی ہے۔ افسوس اس امر کا ہے کہ وہ اپنی قدیم غیر اسلامی تاریخ پر فخر کرتے ہوئے پرانی قبروں، یعنی ماضی کے کھنڈرات سے زندگی تلاش کرنے کی فضول کوشش میں لگا ہے۔)

بعد کے دور میں علامہ اقبال کا خیال سچ ثابت ہوا، کیونکہ ۱۹۶۷ء میں منایا جانے والا ڈھائی ہزار سالہ شہنشاہیت کا جشن ایرانی بادشاہت کے ابدی زوال کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ علامہ اقبال نے بہت عرصہ پہلے اس کی جانب اشارہ فرما دیا تھا:

با وطن پیوست و از خود در گذشت

دل بہ رستم داد و از حیدرؓ گذشت

(ایرانیوں نے اپنے وطن کو بُت بنا کر پوجنا شروع کر دیا ہے اور اپنی مخفی توانائیوں اور خصوصیات سے آنکھیں بند کر لی ہیں۔ انہوں نے رُستم جیسے قبل از اسلام کے کرداروں سے اپنے آپ کو وابستہ کر لیا ہے اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے اپنا قلبی تعلق توڑ لیا ہے۔)

پہلوی دور میں کوشش یہ کی جا رہی تھی کہ ماقبل اسلام کے عہد کے ہیرو دوبارہ قابلِ تعظیم و تکریم قرار دیے جائیں اور آہستہ آہستہ مذہب سے دُوری اختیار کر لی جائے۔ علامہ اقبال کے ہاں ایرانی افراد دنیا کے ذہین ترین اور قابل ترین لوگ تھے، جنہوں نے قبولِ اسلام کے بعد اپنی علمی، سائنسی، فنی اور فکری خوبیوں اور جوہرِ ذاتی کا لوہا منوایا تھا، وہ اپنے وطن پر فخر کرنے کی بجائے اگر اسلام کے سپاہی بن کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی پیروی کو ایک بار پھر سے اپنا شعار بنا لیں تو وہ اپنی کھوئی ہوئی عظمتِ دیرینہ کو بحال کر سکتے ہیں:

نقشِ باطل می پذیرد از فرنگ
سرگزشتِ خود بگیرد از فرنگ!

(آج کا ایران اہلِ مغرب کے غلط نظریات کو اپنا رہا ہے اور خود کو مغربی رنگ میں رنگنے میں کوشاں نظر آ رہا ہے۔)

یہ سب کچھ واضح انداز میں بیان فرمانے کے بعد علامہ اقبال ایرانیوں کو ان کی اصلیت یاد دلاتے ہیں۔ ایک وہ وقت تھا جب ساسانی عہد میں ایران کی بادشاہت شکست و ریخت کے عمل سے دوچار ہو چکی تھی اور اس کی صدیوں کی عظمت کی کشتی ڈگمگاتی ہوئی ہچکولے کھا رہی تھی تو مسلمانوں نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد میں عرب سے اُٹھ کر اس کے عروقِ مردہ میں جان دوڑا دی تھی اور اسلام قبول کرنے کے بعد ایک بار پھر ایرانیوں کی جملہ خوبیاں دنیا میں نئے پہلوؤں کے ساتھ روشناس ہوئی تھیں۔ اگر اسلام کی قوت اس وقت ایرانیوں کی خوبیوں کا سرچشمہ نہ بنتی تو ممکن تھا کہ سلطنت روما (Roman Empire) کی طرح ایران کا وجود بھی مکمل طور پر مٹ جاتا۔ آپ فرماتے ہیں:

پیریِ ایراں زمانِ یزدجرد
چہرۂ اُو بے فروغ از خونِ سرد!

(یزدگرد سوم ساسانی بادشاہ کی نوبت آتے آتے ایران کی قدیم بادشاہت پر بڑھاپا طاری ہو چکا تھا۔ امتدادِ زمانہ کے باعث اس کی رگوں میں خون جم چکا تھا اور اس کے چہرے پر کوئی سرخی اور چمک باقی نہیں رہی تھی۔)

یزدگرد سوم وہ بادشاہ تھا جس کی فوجوں سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں مسلمانوں کی کئی فیصلہ کن جنگیں ہوئیں اور بالآخر مسلمانوں نے تمام ایرانی مقبوضات پر قبضہ کر لیا، اور یہ بادشاہ قبل از اسلام عہد میں ایران کا آخری تاج دار ثابت ہوا۔

دین و آئین و نظامِ اُو کہن
شید و تارِ صبح و شامِ اُو کہن!

(اس کا دینِ زرتشت، اس کی قدیم شہنشاہیت کا استبدادی آئین اور اس کا

ظالمانہ نظامِ حکومت سب کے سب بوسیدہ ہو چکے تھے، حتیٰ کہ اس کی صبح کا سورج اور رات کی تاریکی بھی پرانی ہو چکی تھی۔)

موجِ مے در شیشۂ تاکش نبود
یک شرر در تودۂ خاکش نبود!

(اس کے انگور کی بیل کی رگوں میں شراب کی کوئی لہر باقی نہیں تھی اور ایران ایک مٹی کا تودہ بن چکا تھا، جس میں ایک چنگاری بھی باقی نہیں بچی تھی۔)

اس سے مراد یہ ہے کہ اس کا قدیم جوش و جذبہ اور حرارت ختم ہو چکی تھی۔

تا ز صحرائے رسیدش محشرے
آن کہ داد اُو را حیاتِ دیگرے!

(حتیٰ کہ صحرائے عرب سے ایک محشر برپا ہوا، جو ایران پر قیامت بن کر نازل ہوا اور اس قیامت کے باعث ایران کو ایک نئی زندگی مل گئی۔)

جس طرح مسلمانوں کا ایمان ہے کہ قیامت کے باعث مُردے اپنی قبروں سے اُٹھ کھڑے ہوں گے، اسی طرح ایرانی قوم بھی اپنی موت کے بعد زندہ ہو گئی۔

ایں چنیں حشر از عنایاتِ خدا است
پارس باقی! رومۃ الکبریٰ کجاست؟

(ایسی قیامت بھی دراصل اللہ کی عنایت ہی ہوتی ہے، کیونکہ آج رومۃ الکبریٰ کی بادشاہت کے آثار تو مٹ چکے ہیں لیکن سلطنتِ فارس کی حدود اور سرزمین اب بھی موجود ہے۔)

آن کہ رفت از پیکرِ اُو جانِ پاک
بے قیامت بر نمی آید زخاک!

(ایک بار اگر کسی کے جسم سے روح نکل آئے تو پھر اس کا جسم قیامت کے بغیر تو مٹی سے دوبارہ نہیں اٹھ سکتا۔)

مردِ صحرائی بایراں جاں دمید
باز سوئے ریگزارِ خود رمید!

(ان صحرائی مجاہدین نے ایران میں پھر سے زندگی کی روح پھونک دی اور اپنا

مشن مکمل کرنے کے بعد دوبارہ اپنے صحرائے حجاز کو پلٹ گئے۔)

کہنہ را از لوحِ ما بسترد و رفت

برگ و سازِ عصرِ نو آورد و رفت!

(تمام فرسودہ نقوش اور روایات کو وہ صحرائی مجاہد ہماری لوح سے مٹا کر چلے گئے اور ایک نئے عظیم دور کا آغاز کر کے چلے گئے۔)

یہاں علامہ اقبال نے خود کو ملتِ ایران کے افراد کے ساتھ شامل کرتے ہوئے جمع متکلم کا صیغہ استعمال کیا ہے۔ آپ اکثر اوقات روحانی اور لسانی اعتبار سے خود کو ایک ایرانی معاشرے کا فرد ہی تصور فرماتے تھے (جیسے آپ نے اُردو میں بھی کہا تھا): ع

''تو نہ مٹ جائے گا ایران کے مٹ جانے سے!''

دراصل آپ کی نظر میں تمام قدیم ایرانی مقبوضات (قبل از اسلام) کی اقوام ایک ہی مزاج اور ایک ہی سوچ کی حامل ہیں۔

آہ احسانِ عرب نشناختند

از تشِ افرنگیاں بگداختند!

(آہ ایرانیوں نے عربوں کا احسان بھلا دیا اور افرنگیوں کی آگ کی گرمی میں پگھل کر اپنا وجود کھو بیٹھے، کیونکہ ایک بار پگھل کر کوئی چیز کسی بھی نئے سانچے میں ڈھل سکتی ہے۔)

ان اشعار سے یہ واضح ہوتا ہے کہ آپ کو ایران کے مایوس کن حالات و واقعات پر نہ صرف گہرا دلی دکھ تھا بلکہ آپ وہاں سے مغربی استعمار کے آثار کے مکمل خاتمے کی خواہش کرتے ہوئے اس قوم کی اسلام کی جانب رجعت کی آرزو اپنے دل میں بسائے ہوئے تھے۔ آپ نے جب ایرانیوں کے ساتھ ''ہم'' کا صیغہ استعمال کیا تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس احیائے اسلام کے نئے دور میں اپنی قوم کو بھی ایرانی ملت کے ساتھ بطور شریک و سہیم تصور فرما رہے تھے۔ جب مغربی تہذیب پر مبنی علم ایران و ہند کو اس کے اصل جواہر سے محروم کر کے اہلِ عجم کو مخمور کر رہا تھا اور جہد و عمل کی سکت چھن رہی تھی تو آپ ایک بار پھر ان اقوام کو خوابِ گراں سے بیداری کی تلقین فرما رہے تھے۔ جہاں آپ

ایران کے عظیم مفسرِ قرآن حضرت امام فخر الدین رازیؒ کی تفسیر اور استدلال و فلسفہ کا ذکر فرماتے ہیں وہاں ساتھ ہی جوش و ولولہ کے حصول کے لیے حضرت حیدرِ کرارؓ کی پیروی کا ذکر بھی فرماتے ہیں، جن کی تعظیم اہلِ ایران کے دل و جان میں موجود رہی ہے:

من آں علم و فراست با پرِ کاہے نمی گیرم
کہ از تیغ و سپر بیگانہ سازد مردِ غازی را!
بہر نرخے کہ این کالا بگیری سود مند افتد
بزورِ بازوے حیدرؓ بدہ ادراکِ رازی را

(میری نظر میں اس علم و فراست کی قیمت گھاس کے تنکے کے برابر بھی نہیں ہے جو مردانِ غازی کو تلوار اور ڈھال سے محروم کر دے۔ تمہیں جس قیمت پر بھی یہ مال ملے اسے خرید لو، جس میں رازی کا تدبر حضرت علیؓ کے قوتِ بازو پر ڈال دیا گیا ہے۔)

اب آپ اصل ایران کے باسیوں کو قدیم بادشاہت کے بچے کھچے آثار سے بیزاری کا درس دینے لگے اور آپ کی نظر میں ماضی کے مزاروں میں چونکہ زندگی کی رمق باقی نہیں رہی تھی اس لیے لازمی تھا کہ انقلاب کے لیے جدوجہد کا آغاز کر دیا جائے۔

مدّتے در آتشِ نمرود می سوزد خلیلؑ
تا تہی گردد حریمش از خداوندانِ پیر
دَورِ پرویزی گذشت اے کشتۂ پرویز خیز
نعمتِ گم گشتۂ خود را ز خسرو باز گیر

(ایک طویل عرصہ تک حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نمرود کی جلائی ہوئی آگ میں جلنا پڑتا ہے، پھر کہیں اس کا حریمِ دل ماضی کے خداؤں اور بتوں سے پاک ہوتا ہے۔ اے خسرو پرویز کی شہنشاہیت پر مٹنے والے بے خبر انسان! اپنی طویل نیند سے بیدار ہو جا، کیونکہ اب بادشاہت کا دور ختم ہو چکا ہے۔ اپنی آزادی اور مذہبی حمیت سمیت تمام نعمتوں کو، جو شہنشاہوں نے تم سے سلب کر رکھی ہیں، اب اٹھ کے واپس لے لو)۔

ایک بار پھر علامہ اقبال کو ایران کی خوابِ گراں میں سوئی ہوئی قوم پر ترس آتا تھا‘ جو کبھی کبھار اپنی آنکھ کھولتی تھی مگر پھر کسی اور فلاکت و بربادی کے چکر میں پڑ جاتی تھی۔ آپ کی نگاہ میں نہ صرف شاہی نظام کے استبداد کا مسئلہ تھا بلکہ علماء کے جس منظّم گروہ کی حمایت بھی شاہی نظام ہی کو حاصل تھی آپ نے اس پر اظہارِ افسوس کرتے ہوئے کہا: ؎

آسیا آں مرز و بومِ آفتاب
غیر بیں از خویشتن اندر حجاب
صیدِ ملّایان و نخچیرِ ملوک
آہوے اندیشۂ اُو لنگ و لوک

(ایشیاء جو سورج کی سرزمین ہے‘ وہ اب غیروں کی ہمدردی کی امید لگائے بیٹھی ہے اور اپنے ملی اور فکری تشخص سے محروم ہے۔ یہ آج کل ملاؤں کا شکار ہے اور بادشاہوں کے پھیلائے ہوئے جال میں بری طرح جکڑی ہوئی ہے اور اس کی سوچوں کا آزاد ہرن اب لنگڑا لولا ہو چکا ہے۔)

اب یہاں یہ بات بہت اہم ہے کہ ایشیا سے مراد علامہ اقبال کے ہاں اسلامی ایشیا ہے‘ کیونکہ یہاں پر ملاّؤں کا ذکر ہے اور اس براعظم میں پھر ملاّؤں کا منظّم نظام ہمیں صرف ایران ہی میں نظر آتا تھا اور بادشاہت بھی وہیں تھی۔ ایران ہی کو مرز و بومِ آفتاب کہا جاتا رہا ہے اور رضا شاہ پہلوی کے دور تک ایران کے جھنڈے پر آفتاب کی علامت بنی ہوئی تھی۔ اس طرح ایشیا کے براعظم میں بھی جس قوم سے خطاب کیا گیا ہے وہ بھی ایرانی قوم ہی ہے۔ یہ حقیقت مندرجہ ذیل اشعار میں بالکل واضح ہو جاتی ہے: ؎

بگذر از کاؤس وکے اے زندہ مرد
طوفِ خود کن گردِ ایوانے مگرد
از مقامِ خویش دور افتادہ ای
کرگسی کم کن کہ شاہیں زادہ ای

(اے زندہ انسان! ایران کے اساطیری بادشاہوں کیکاؤس اور کیقباد کے

چکروں سے باہر نکل آ۔شاہی محلات کے اردگرد طواف کرنے کی بجائے تو اپنی ذات کا ادراک کر۔تو اپنے اصلی مقام سے کہیں بہت دور گرا پڑا ہے۔تو شاہینوں کی اولاد ہے‘ تو نے پھر گِدھوں کی فطرت کیوں اپنا رکھی ہے؟)

یہاں پر کیکاؤس اور کیقباد کا تذکرہ اور شاہی محلات کا طواف اسی جانب اشارہ ہے۔پھر آپ نے شاہینی اوصاف اپنانے اور اپنی خودی کو پہچاننے کی جانب زور دیا ہے۔ وہ جوہرِ ذاتی جو ایران و ہند کے جوانوں میں تھے‘ وہ کھو چکے تھے اور اہلِ ایران تو مکمل مایوسی اور ذہنی جمود کا شکار تھے۔ وہ خود کو فراموش کر چکے تھے اور مغربی تعلیم اور تہذیب سے دل و نظر کی روشنیاں تلاش کرنے میں منہمک تھے۔آپ نے ''گلشنِ رازِ جدید'' میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے منصور حلاج کی زبانی کہلوایا ہے کہ:

ہر کجا پیدا و ناپیدا خودی
بر نمی تابد نگاہِ ما خودی
نار ہا پوشیدہ اندر نورِ اُوست
جلوہ ہائے کائنات از طورِ اوست
ہند و ہم ایراں ز نورش محرم است
آنکہ نارش ہم شناسد آن کم است

(ہر جگہ خودی ظاہر بھی ہے اور غائب بھی ہے‘ لیکن ہماری نظروں سے وہ اوجھل ہی رہتی ہے۔اس کی روشنی میں حرارت‘ یعنی آگ بھی ہے اور کائنات کے تمام تر جلوؤں کا مرکز اسی کا کوہِ طور ہے۔ ہندوستان اور ایران کو اس کی روشنی کا ادراک تو ہے‘ مگر اس کی گرمی اور حرارت سے مستفید ہونے والے لوگ بہت کم نظر آتے ہیں۔)

اب کم از کم ایران و ہند میں آپ کو خودی کے ایک پہلو سے باخبر کچھ نہ کچھ لوگ تو مل گئے تھے۔اب خودی کی آگ اُن کے دلوں میں روشن کرنا مقصود تھی۔اسی طرح آپ نے پیامِ مشرق میں ایک جگہ فرمایا ہے کہ ایرانی قوم میں جو فقر و درویشی اور استغناء کے عناصر تھے وہ امتدادِ زمانہ کے باعث باقی نہیں بچے۔اس طرح کسی بھی ملک کی سرزمین

کے وجود کی اس وقت تک کوئی اہمیت نہیں جب تک اس کے باسیوں میں بھی اس کی قوم سے وابستہ اصلی خوبیاں اور خصائل عود نہ کر آئیں۔

عشق را آئینِ سلمانی نماند
خاکِ ایراں ماند و ایرانی نماند!
سوز و سازِ زندگی رفت از گلش
آں کہن آتش فسرد اندر دلش!

(عشق میں حضرت سلمان فارسیؓ کے درویشانہ خصائل باقی نہیں رہے۔ ایران کی سرزمین تو اپنی جگہ قائم و دائم رہ گئی ہے مگر اس میں بسنے والے ایرانی لوگ باقی نہیں رہے۔ ایرانیوں کے ضمیر سے زندگی کا سوز و ساز ختم ہو چکا ہے۔ ان کی قدیم ایرانی آگ ان کے دلوں سے بجھ چکی ہے۔)

یہ آگ کیا تھی؟ یہ آگ ہر چند کہ روایتی طور پر قدیم قبل از اسلام ایران کی آتشِ مقدس ہی سمجھی جاتی رہی ہے، مگر اقبال کی نظر میں یہ ایرانیوں کا مخفی جذبہ، حرارتِ ایقانی، حرکیت اور جوش و جنون کا جذبہ تھا جس نے اسلام کے لبادے میں آنے کے بعد عظمتوں کے آثار اور مظاہر جنم دیے تھے۔ اقبال اسی آگ کو اپنے سینے میں روشن سمجھتے تھے اور اسی آگ کے گرد ایرانیوں کو جمع ہونے کا درس دیتے تھے، جیسے کہ آپ نے اسرارِ خودی میں فرمایا تھا:

انتظارِ صبحِ خیزاں می کشم
اے خوشا زرتشتیانِ آتشم

(میں اذانِ حق دینے کے بعد صبح صبح جلد بیدار ہونے والے لوگوں کا منتظر ہوں۔ میرے سینے میں روشن آگ کے زرتشتی یعنی پجاری کس قدر عظیم ہوں گے!)

ہم یہاں تلمیحات اور شاعرانہ موشگافیوں میں نہیں الجھنا چاہتے، ورنہ اکثر فارسی شعراء نے آگ کا ذکر پورے طمطراق سے کیا ہے اور نظیری نیشاپوری کے بقول انسان کے دل میں خامی (یعنی کچا ہونے) کی بو آتی ہے اور اس کو پکنے کے لیے آگ کی ضرورت ہے۔ اسی طرح نادر شاہ کے جواب میں علامہ کے اشعار میں ہم نے ایران کے

مٹی کے تودے میں چنگاری نہ ہونے کا ذکر کیا ہے۔

اب مزید تفصیل میں جانے کی بجائے علامہ اقبال کی اس تاریخی غزل کی جانب آتے ہیں جو ایرانی انقلاب سے قبل ایران میں بہت مقبول ہوئی تھی اور اس میں آپ نے ایرانی قوم کی نوجوان نسل کو خطاب کرتے ہوئے نہ صرف اپنے ذوق وشوق کی واردات کی خبر دی ہے' بلکہ اسلامی انقلاب کے خدوخال واضح فرماتے ہوئے آپ نے ممکنہ واقعات کی اس انداز سے پیشین گوئی فرمائی ہے گویا آپ مستقبل کے واقعات کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ فرما رہے تھے' کیونکہ یہ تمام پیشین گوئیاں حرف بحرف صحیح ثابت ہوئیں۔ یہ غزل زبورِ عجم میں موجود ہے اور آپ کی خدمت میں پیش کی جاتی ہے:

چوں چراغِ لالہ سوزم در خیابانِ شما
اے جوانانِ عجم جانِ من و جانِ شما!

(اے ایران کے جوانو! میں آپ کے ہمراہ آپ سے یکجا ہو کر آپ ہی کے باغ کی کیاری میں سرخ لالے کے پھول کا دیا بن کر جل رہا ہوں۔)

غوطہ ہا زد در ضمیرِ زندگی اندیشہ اَم
تا بدست آوردہ ام افکارِ پنہانِ شما!

(میری بے چین سوچیں زندگی کے ضمیر میں غوطوں پر غوطے لگاتی رہی ہیں اور بڑی مشکل سے میری رسائی آپ کے ان افکار تک ہوئی ہے جو سب کی نگاہوں سے ابھی تک مکمل طور پر اوجھل رہے ہیں۔)

مہر و مہ دیدم نگاہم برتر از پرویں گذشت
ریختم طرحِ حرم در کافرستانِ شما!

(میری بلند نگاہیں چاند اور سورج کی فضاؤں سے گزرتے ہوئے ستاروں کے جھرمٹ پروین سے بھی کہیں بلندی پر جا پہنچی ہیں اور میں نے چپکے سے تمہارے کافرستان میں حرم کی بنیاد رکھ دی ہے۔)

تا سنانش تیز تر گردد فرو پیچید مش
شعلۂ آشفتہ بود اندر بیابانِ شما!

(تمہارے بیابان میں ایک شعلہ سا جل رہا تھا' اسی کی مشعل یا نیزے کو میں نے

پکڑ کر اور تیزی سے گھما گھما کر اس کا رُخ اتنی سرعت سے بدلا ہے کہ وہ تیز سے تیز ہو کر بھڑک سکے اور تمہارے خاموش شعلوں کی روشنی اور حرارت سب پر آشکار ہو جائے۔)

فکر رنگینم کند نذرِ تہی دستانِ شرق
پارۂ لعلے کہ دارم از بدخشانِ شما!

(آپ کے بدخشاں سے میرے ہاتھ جو لعل کا ٹکڑا لگا تھا اسی کو میری رنگین سوچیں مشرق میں بسنے والے خالی ہاتھ' بے مایہ لوگوں میں حیرت کی صورت میں بانٹ رہی ہیں۔)

می رسد مردے کہ زنجیرِ غلامان بشکند
دیدہ ام از روزنِ دیوارِ زندانِ شما!

(میں نے تمہارے قید خانے کی دراڑ سے اس آدمی کا چہرہ بھی دیکھ لیا ہے جو اچانک آزاد فضاؤں میں آ کر تمام غلاموں کی زنجیروں کو توڑ کر رکھ دے گا۔)

حلقہ گردِ من زنید' اے پیکرانِ آب و گِل
آتشے در سینہ دارم از نیاگانِ شما!

(اے کچی مٹی کے بنے ہوئے مجسموں جیسے بے جان جسمو! میرے اردگرد جمع ہو جاؤ اور میری قلبی حرارت کے باعث پک جاؤ' کیونکہ میرے سینے میں تمہارے ہی اسلاف کی آگ روشن ہے۔)

اب اس قدر واضح الفاظ میں جہد و عمل کا پیغام اور روشن مستقبل کی خوشخبری دیتے ہوئے آپ نے شہنشاہیت کے اس مذموم پراپیگنڈے کا توڑ پیش کیا کہ شہنشاہیت کے مٹ جانے سے ایران اور ایرانی قوم ختم ہو جائے گی۔ آپ نے فرمایا: ؎

سکندر رفت و شمشیر و علَم رفت
خراجِ شہر و گنج کان و یم رفت
اُمم را از شہان پائندہ تر دان
نمی بینی کہ ایراں ماند و جم رفت

(سکندر کا زمانہ بھی بیت گیا ہے اور جدید اسلحے کی ایجاد اور جنگی فنون میں ترقی کے

باعث شمشیر اور علم بھی اپنی اہمیت و افادیت کھو بیٹھے ہیں۔ مفتوحہ شہروں سے خراج وصول کرنے کا عہد بھی گزر گیا ہے اور کانوں اور سمندروں سے نکلنے والے خزانوں کے نشانات بھی مٹ گئے ہیں۔ قومیں بادشاہوں کی نسبت زیادہ طویل عرصہ تک قائم ودائم رہتی ہیں۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ جمشید جیسے بادشاہ کے خاتمے کے باوجود بھی ایران اپنی جگہ پر قائم ودائم رہ گیا ہے؟ اس لیے بادشاہت کے خاتمے سے اقوام مٹ نہیں جایا کرتیں۔)

ہر چند کہ آپ کے اپنے زمانے میں سرزمین ایران میں آپ کے اشعار وافکار کو وہ فروغ حاصل نہیں ہو رہا تھا جس کا مستحق آپ کا کلام تھا۔ برصغیر کے اکثر لوگ فارسی سے نابلد ہونے کی وجہ سے (ماسوائے چند لوگوں کے) آپ کے افکار کو سمجھنے سے ویسے ہی قاصر تھے اور ان دنوں باہمی روابط کے فقدان کے باعث ایران تک آپ کے کلام کو پہنچنے میں تاٗخیر ہو رہی تھی اور بہت کم لوگوں تک آپ کا کلام پہنچ پایا تھا، اور وہ بھی تا حال رائج الوقت محاورے کے فرق کے باعث اس کی تہہ تک پہنچنے میں کسی حد تک دشواری کا احساس کر رہے تھے۔ آپ نے اس بارے میں فرمایا: ؎

مسنج معنیٔ من در عیارِ ہند و عجم
کہ اصل ایں گہر از گریہ ہائے نیم شبی است

(میرے افکار کو ہندوستان اور ایران میں مروج پیمانوں سے مت ناپو اور ان کی کسوٹی پر مت پرکھو، کیونکہ اس ہیرے کا سرچشمہ میری آدھی رات کی عبادات اور گڑگڑا کر مانگی ہوئی دعائیں ہیں۔)

اس کے باوجود آپ اپنے نغمات اور افکار عام کرنے کی جدوجہد جاری رکھے ہوئے تھے اور فرما رہے تھے: ؎

ز جانِ بے قرار آتش کشادم
دلے در سینۂ مشرق نہادم
گلِ اُو شعلہ زار از نالۂ من
چو برق اندر نہادِ اُو فتادم

(میں نے اپنی بے قرار جان سے آگ روشن کر کے اسی آگ کا دل بنا کر مشرق

کے سینے میں رکھ دیا۔ اب وہاں کی مٹی میرے نالے کے باعث شعلوں کو جنم دے رہی ہے اور میں اس کی فطرت میں آسمانی بجلی بن کر گر پڑا ہوں۔)

یہ سب کچھ مستقبل کی طرف اشارے تھے۔ اسی لیے آپ فرمارہے ہیں : ؎

پس از من شعرِ من خوانند و دریابند و می گویند
جہانے را دگر گوں کرد یک مردِ خود آگاہے

(میرے بعد لوگ میرے اشعار پڑھیں گے اور جب اُن پر ان کے معانی واضح ہوں گے تو یہ کہا کریں گے کہ ایک خود شناس انسان نے دنیا کو تہہ و بالا کر کے رکھ دیا ہے۔)

اب آپ کو ایک انقلاب کا عہد نظر آ رہا تھا اور قدیم نظام کے تار و پود بکھرتے ہوئے نظر آ رہے تھے' ان کو جوانانِ عجم سے جو امیدیں وابستہ تھیں ان کے بارے میں ہر چند زمانہ بے خبر تھا مگر ہم علامہ اقبال کے تصورات کی ایک جھلک اُنہی کی زبان سے پیش کرتے ہیں' تاکہ جو کچھ آپ کی دُور بین نگاہوں کے سامنے تھا اس کی ایک تصویر کھنچ سکے اور مستقبل کے آئینے میں اس کا ادراک کیا جاسکے۔ ؎

من درین خاکِ کہن گوہرِ جاں می بینم
چشمِ ہر ذرّہ چو انجم نگراں می بینم

(مجھے اس قدیم سرزمین میں جان کا گرانقدر موتی نظر آ رہا ہے اور اس کی مٹی کے ہر ایک ذرّے کی آنکھ ستاروں کی طرح بے چین اور دیدہ ور نظر آ رہی ہے۔)

دانہ ای را کہ بہ آغوشِ زمین است ہنوز
شاخ در شاخ و برومند و جوان می بینم

(وہ دانہ جو زمین کی آغوش میں ابھی پڑا ہوا ہے' مجھے اس دانے سے پیدا ہونے والا درخت نظر آ رہا ہے جس کا پھیلاؤ اور شاخیں میری نظر میں ایک سایہ دار درخت کا منظر پیش کر رہی ہیں۔)

کوہ را مثلِ پرِ کاہ سبک می یابم
پرِ کاہے صفتِ کوہِ گراں می بینم

(آج جو پہاڑوں کی طرح عظیم اور بوجھل نظر آنے والے اجسام ہیں وہ مجھے

گھاس کے تنکے کی طرح ہلکے نظر آرہے ہیں اور مستقبل کی آنکھ سے گھاس کے تنکوں کو میں پہاڑوں کی شکل میں دیکھ رہا ہوں۔)

اس سے مراد یہ ہے کہ آج کے مضبوط اور بااثر لوگ کل خوار و رسوا ہونے والے ہیں اور کمزور لوگوں کو اختیار و اقتدار ملنے والا ہے۔

انقلابے کہ نگنجد بہ ضمیرِ افلاک
بینم و ہیچ ندانم کہ چسان می بینم

(ایک ایسا انقلاب جو آسمانوں کی وسعتوں میں بھی سمانہیں رہا' اسے میں دیکھ بھی رہا ہوں اور مجھے یہ بھی سجھائی نہیں دے رہا کہ کیسے دیکھ رہا ہوں۔)

خرم آں کس کہ دریں گرد سوارے بیند
جوہر نغمہ ز لرزیدنِ تارے بیند

(آپ اس شخص کی خوشی کا اندازہ لگا سکتے ہیں جو اس گرد و غبارِ ایام میں ایک سوار کے آثار و نقوش واضح طور پر دیکھ رہا ہو اور آلۂ موسیقی کے تار کے ہلنے سے ہی اس میں پوشیدہ نغمات کا جوہر محسوس کرنے لگ جائے؟)

اِس انقلاب کے نتیجہ میں جو کچھ سامنے آنے والا تھا وہ کچھ یوں تھا' جسے علامہ اقبالؒ نے ایک اور مقام پر ''زبورِ عجم'' میں بیان کیا ہے: ؎

سطوت از کوہ ستانند و بکاہے بخشند
کلۂ جم بہ گدائے سرِ راہے بخشند

(پہاڑ سے اس کی عظمت و ہیبت چھین کر ایک گھاس کے تنکے کو عطا کر دی جائے گی اور جمشید بادشاہ کا تاج ایک سرِ راہ بیٹھے ہوئے فقیر کی نذر ہو جائے گا۔)

گاہ شاہی بہ جگر گوشۂ سلطاں ندہند
گاہ باشد کہ بزندانیؑ چاہے بخشند

(کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ شاہ کا ولی عہد تخت و تاج سے محروم رہ جائے اور اقتدار حضرت یوسفؑ کی طرح اس شخص کو مل جائے جسے کنویں میں پھینک کر قید رکھا گیا ہو۔)

اسی اسلوب میں ایک اور مقام پر آپ نے ماضی سے استناد فرماتے ہوئے یہ یاد دلایا کہ پہلے بھی ایسے کئی اَدوار آئے جب عظیم بادشاہ اُٹھے' آناً فاناً دنیا پر چھا گئے اور پھر

چند ہی برسوں میں ان کا نشان تک باقی نہ رہا۔

چوں پرِ کاہ کہ در رہ گزرِ باد افتاد
رفت اِسکندر و دارا و قباد و خسرو

(اس گھاس کے تنکے کی طرح جو تیز ہوا کے جھونکوں کے مدمقابل گرا پڑا ہو' اسکندر اعظم مقدونی' داریوش ہخامنشی یا دارا' قباد ساسانی اور خسرو نوشیرواں یا خسرو پرویز جیسے شہنشاہ اپنا نام ونشان کھو بیٹھے۔)

علامہ اقبال کو دکھ اس اُمر کا تھا کہ بیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں بھی لوگ غلامانہ ذہنیت اور بادشاہوں کے استبدادی نظام کے جال سے باہر نہیں نکل سکے تھے۔

آدم از بے بصری بندگیٔ آدم کرد
گوہرے داشت ولے نذرِ قباد و جم کرد

(انسان نے بصیرت کے فقدان کے باعث انسانوں کی غلامی اور پرستش کو اپنا شعار بنالیا۔ اپنے جوہرِ ذاتی اور آزادی کے قیمتی ہیرے کو قباد ساسانی اور جمشید جیسے شہنشاہوں کے حضور نذرانے کی صورت میں پیش کردیا۔)

یعنی از خوئے غلامی زسگاں خوار تر است
من ندیدم کہ سگے پیشِ سگے سر خم کرد

(درحقیقت غلامی سے خوگری کے باعث آج کا انسان کتوں سے بھی بدتر ہے' کیونکہ آج تک میں نے کسی کتے کو دوسرے کتے کے سامنے سر جھکاتے ہوئے نہیں دیکھا۔)

اس تمام کشمکش میں آپ خود فارسی گو خطوں یعنی ایران' افغانستان اور سمرقند و بخارا کی سرزمین کی جانب دیکھ رہے تھے۔ آپ مستقبل کی اُمیدیں بھی اسی خطے سے وابستہ کیے ہوئے تھے۔

اگرچہ زادۂ ہندم فروغِ چشمِ من است
زخاکِ پاکِ بخارا و کابل و تبریز

(اگرچہ میں ہندوستان میں پیدا ہوا ہوں مگر میری آنکھوں کی روشنی بخارا' کابل اور تبریز کی پاک مٹی کی وجہ سے ہے۔)

آپ کو اہلِ تبریز (یعنی ایرانیوں) سے خاص قسم کی امیدیں وابستہ تھیں۔ آپ یہاں کے لوگوں کی مخفی توانائیوں اور خصائل کے معترف تھے۔ آپ نے کس خوبصورت انداز میں اپنے اردو اشعار میں فرمایا:

نہ اُٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب و گِلِ ایراں، وہی تبریز ہے ساقی
نہیں ہے نااُمید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

شروع شروع میں آپ کو خاکِ عرب اور اہلِ عرب سے بھی توقعات وابستہ رہی ہیں۔

عرب از سرشکِ خونم ہمہ لالہ زار بادا
عجم رمیدہ بو را نفسم بہار بادا

(میرے خون کے آنسوؤں کے باعث سرزمین عرب لالہ زار بن جائے اور وہ عجم جس کی خوشبو اُڑ چکی ہے، اس کے لیے میری سانسیں بہار کے جھونکوں میں بدل جائیں۔)

لیکن مرورِ ایام کے ساتھ ساتھ آپ کی توقعات اہلِ عجم سے وابستہ ہوتی چلی گئیں اور آپ اہلِ عرب سے مایوس ہوتے چلے گئے۔

نوائے من بہ عجم آتشِ کہن افروخت
عرب ز نغمۂ شوقم ہنوز بے خبر است

(میری نواؤں کے باعث ایران کی قدیم آگ دوبارہ روشن ہو کر وہاں کے لوگوں کی روح کو گرما رہی ہے مگر عرب میرے شوق کے نغموں سے ابھی تک بے خبر ہے۔)

پھر آپ نے عجم کو اپنے اشعار و افکار (چشمِ حال) سے جس طرح متاثر پایا، اس کا اظہار یوں فرمایا:

عجم از نغمہ ام آتش بجان است
صدائے من درائے کاروان است

(میرے شوق کے نغموں کے باعث عجم کی جان میں آگ لگ گئی ہے اور میری

آواز قافلے کے آگے آگے بجنے والی گھنٹی یعنی درا کا کام کر رہی ہے۔)

اور: ؎

حدی را تیز تر خوانم چو عرفیؔ
کہ رہ خوابیدہ و محمل گران است

(میں عرفی شیرازی کی طرح حدی یعنی قافلے کے ساتھ ساتھ گائے جانے والے مخصوص گیت کو تیز تیز انداز میں گا رہا ہوں، کیونکہ راستے بھر میں لوگ سوئے ہوئے ہیں اور محمل کافی بھاری محسوس ہو رہی ہے۔)

آپ کی صدائیں جب عجم میں روح پھونک رہی تھیں تو آپ کو اپنی محنت بار آور ہوتی ہوئی نظر آ رہی تھی اور آپ ایک صبحِ تاباں کا انتظار فرما رہے تھے۔ آپ نے کس خوش اسلوبی سے فرمایا: ؎

عجم از نغمہ ہائے من جواں شد
ز سودایم متاعِ اُو گراں شد
ہجوے بود رہ گم کردہ در دشت
ز آوازِ درایم کارواں شد

(بالآخر ایران میرے مسلسل گائے جانے والے نغمات کی بدولت جوان ہو گیا اور اس میں زندگی کا جوش واپس لوٹ آیا۔ یہ میرا جوشِ جنون تھا جس نے اس کی قدر و قیمت میں اضافہ کر دیا۔ ایران کیا تھا، کسی صحرا میں بھٹکے ہوئے لوگوں کا قافلہ تھا، جو میری بانگ درا یعنی قافلے کو مجتمع کرنے والی گھنٹی کی آواز سے ایک کارواں بن گیا۔)

اقبال کا ترانہ بانگِ درا ہے گویا
ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

اس کاروان کے راستے میں مشکلات تھیں اور پریشانیاں تھیں۔ نہ کوئی منزل متعین تھی اور نہ راستے کے نقوش واضح تھے۔ علامہ اقبال کی آرزو تھی کہ وہ ایک منزل پا لے۔

شبِ تاریک و راہِ پیچ پیچ و بے یقیں راہی
دلیلِ کارواں را مشکل اندر مشکل افتاد است

(رات اندھیری ہے اور راستہ بل کھاتا ہوا اور پیچا پیچ ہے، مسافر بے یقینی کی کیفیت سے دوچار ہیں، ایسے کارواں کی منزلِ مقصود کی جانب سفر میں مشکلات ہی مشکلات درپیش ہیں۔)

ان تمام واقعات اور حالات کے ادراک کے باوجود آپ کبھی محبت سے اور کبھی تشویق سے کارواں کو آگے بڑھاتے ہوئے کہہ رہے تھے :

زندہ کن باز آن محبت را کہ از نیروے اُو
بوریائے رہ نشینے درفتد با تخت گے

(ایسی محبت کو زندہ کرو، یعنی وطن اور دین کی محبت میں سرشار ہو جاؤ اور موت کی پروانہ کرو۔ آپ کے اس جذبہ کے باعث ایک رہ نشین درویش کا بوریا کیقباد کے تخت سے ٹکرا جائے گا۔)

آپ کی نگاہوں میں جو قوم مشرق کے دینی اور فکری اِحیاء کے باعث مستقبل کی موہوم تصویر تھی، وہ شاید کچھ اس طرح کی تھی :

دیکھا ہے ملوکیتِ افرنگ نے جو خواب
ممکن ہے کہ اس خواب کی تعبیر بدل جائے
طہران ہو گر عالمِ مشرق کا جنیوا
شاید کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے

یہاں یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ دوسرے شعر کا ترجمہ جناب عرفانی مرحوم نے فارسی میں یوں کیا:

گر شود تہراں جنیوا از برائے اہلِ شرق
بو کہ تغیرے کند تقدیر شومِ روزگار

یہ ترجمہ ایران میں اس قدر مقبول ہوا کہ اکثر لوگوں نے اسے شعری ترجمہ کی بجائے حضرت علامہ اقبال کا اصلی شعر ہی سمجھ لیا۔

یہاں ہم نے علامہ اقبال کے بیان کردہ دیگر موضوعات سے پہلو تہی کی ہے جن کا فکری اور معنوی احاطہ آپ نے اپنے اشعار میں فرمایا ہے اور جس سے ایرانی قوم متاثر

ہوئی ہے یا جن کا غلغلہ آج دوسرے فارسی گو علاقوں میں سنا جا رہا ہے۔ یہاں صرف انقلابِ ایران کے بارے میں بیان کردہ اشعار اور وہ بھی دانستہ طور پر فارسی اشعار ترجمے کے ہمراہ پیش کیے گئے ہیں۔ یہ تمام اشعار وافکار آہستہ آہستہ ایران میں ترویج پاتے چلے گئے اور ان کے باعث دیگر ایرانی شعراء و متکلمین نے آپ کی پیروی میں آپ ہی کے انداز واسلوب میں شعر کہنا شروع کر دیے اور مضامین لکھے۔ اگلے صفحات میں ہم بہت مختصر انداز میں' چیدہ چیدہ' اُن شعراء اور مفکرین کے بارے میں کچھ لکھنے کی کوشش کریں گے جنہوں نے ایران میں علامہ اقبال کے کلام کی اشاعت اور آپ کے افکار کی تبلیغ میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ان میں جناب محیط طباطبائی' ملک الشعراء محمد تقی بہار' جناب صادق سرمد' رضا زادہ شفق' جناب سعید نفیسی اور جناب علی شریعتی کے علاوہ ممتاز عالمِ دین علامہ آیت اللہ فیض، مجتبیٰ مینوی اور احمد سروش کی علامہ اقبال کے کلام کی ترویج کے لیے کاوشوں کا ایک اجمالی جائزہ پیش کر رہے ہیں۔ ان کے ذکر کے ساتھ ساتھ مجھے فخر ہے کہ میرے استاد جناب خواجہ ڈاکٹر عبدالحمید عرفانی مرحوم نے اقبال کو ایرانیوں میں روشناس کروانے میں مرکزی کردار ادا کیا ہے۔ آپ کے بے شمار مقالات کے علاوہ اقبال ایرانیوں کی نظر میں' ''گفتہ ہائے رومی و اقبال'' ''رومی عصر'' ''اقبال'' ''عرفانی'' اور ''اقبالِ ایران'' جیسی کتب اس کا منہ بولتا ثبوت ہیں' جن میں سے کچھ تو ایران میں بے حد مقبول ہوئیں۔ آپ فکرِ اقبال کے مبلغ کے طور پر ایران میں پہچانے گئے اور راقم الحروف نے اس کا مشاہدہ خود اپنے ایران کے سفروں کے دوران کیا۔

❀❀❀

دورحاضر کا ایران

ایران میں اَفکارِ اقبال کا اثر

علامہ اقبال کی زندگی میں

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے لاہور میں رہتے ہوئے بھی علامہ اقبال اپنی اُفتادِ طبع اور فکری پس منظر کے باعث اب خود کو روحانی طور پر سرزمین ایران میں ہی مقیم محسوس کر رہے تھے۔ کبھی تو آپ اصفہان اور خوانسار کے شعراء کے ایجاز و حسنِ بیان کا ذکر فرماتے، کبھی خطۂ تبریز کی خاک کو اپنی آنکھوں کے سرمہ کا درجہ دے کر اسے نورِ نظر کا سرچشمہ قرار دیتے اور کبھی اہلِ شیراز سے ہم زبانی کا دعویٰ فرماتے۔ کبھی تبریز کی زرخیز مٹی کے لیے نمی کی آرزو فرماتے ہوئے کہتے کہ آپ اس کشتِ ویراں کے مستقبل سے ناامید نہیں ہیں اور کسی جلال الدین رومیؒ کے اس خاکِ قدیم سے دوبارہ ظہور کے حسین خواب دیکھتے۔ کبھی آپ کو یہ نظر آتا کہ کسی نہ کسی دن تہران عالم مشرق کا جنیوا بننے والا ہے اور اس کی ممکنہ عالمی مرکزیت کے باعث زمانے کی تقدیر بدلنے والی ہے۔ آپ اپنے اشعار میں دماوند اور الوند کی چوٹیوں کا ذکر فرماتے اور قدیم ایران کی بستیوں کے آثار اور کھنڈرات سے ہم کلام ہو جاتے۔ اصفہان کے بیچوں بیچ گزرنے والے دریا یعنی ''زندہ رود'' کا نام اپنے تصوراتی آسمانی سفر میں اپنی ذات کے لیے نام کے طور پر منتخب فرماتے۔ قدیم ایرانی تاریخ میں زرتشت، مزدک اور مانی کے مذہبی نظریات اور مذہبی کتب اوستا اور ژند و پاژند کے خوبصورت پیرائے میں تذکرے فرماتے اور قدیم اساطیری عہد کے ایرانی بادشاہوں جمشید، کیکاؤس اور کیقباد کے عظیم اَدوار کے واقعات کا ذکر شعری تلمیحات کے طور پر فرماتے ہوئے ان سے عبرت حاصل کرنے پر زور دیتے۔ ہخامنشی دَور کے شہنشاہ داریوش (یا دارا) کی وسعتِ سلطنت اور سکندرِ مقدونی کے ہاتھوں اس کے انقراض کا کئی مقامات پر تذکرے فرماتے اور عہدِ ساسانی کے ایرانی بادشاہوں اردشیر، قباد، خسرو

نوشیروان، خسرو پرویز اور یزدگرد کے ادوار میں بادشاہت کے عروج و زوال کے واضح انداز میں نقشے کھینچتے چلے جاتے، مگر ایران کے قوم پرست شاعر فردوسی کی طرح ان داستانوں پر مسلسل نوحہ و ماتم کرنے کی بجائے اپنے قارئین کو درسِ عبرت دیتے اور ایران میں اسلام کی اشاعت کو تاریخِ ایران کے لیے حیاتِ نو یا حیاتِ جاوِداں کا مظہر قرار دیتے۔ ایران کی بعد از اسلام تاریخ کا مکمل احاطہ فرماتے ہوئے آپ نادرشاہی اور پہلوی بادشاہت پر ایک انتہائی دلکش پیرائے میں شعر کہتے ہوئے ایران کے استبدادی، ظالمانہ اور عوام کو کچلنے والے فرسودہ شاہی اور مذہبی نظام (جو وہاں پر بدقسمتی سے اسلام کے مقدس نام پر رائج تھا) کا اکثر اوقات دردِ دل کے ساتھ ذکر فرماتے۔ اس طرح آپ ایران کو اسلام کی صحیح روح سے روشناس کروانے کی کوشش میں مگن ہو جاتے۔

یہ انتہائی افسوس ناک امر تھا کہ آپ اپنی زندگی میں ایران میں بطورِ شاعر اور مفکر کماحقہ مشہور نہ ہو پائے اور آپ کا کلام ماسوائے چند اہل دل افراد کے، وہاں پر متعارف نہ ہو سکا۔ اُن دنوں ایران کے مخدوش داخلی حالات کی سنگینی، ایران کی برصغیر سے جبری لاتعلقی (انگریزوں کی وجہ سے) اور ممکنہ صعوباتِ سفر کی وجہ سے باہمی روابط کا عمومی فقدان آڑے آیا۔ بادشاہ کی سرپرستی میں مشہور شاعر فردوسی کا ہزار سالہ جشن منایا گیا تو عوام اور ایران کے دانشوروں کی رائے تھی کہ علامہ اقبال کو ایران کے دورے کی سرکاری دعوت دی جائے۔ مگر آپ کی انقلابی فکر سے خوف زدگی کے باعث اس سے اِعراض کیا گیا اور نوبل انعام یافتہ بنگالی شاعر رابندر ناتھ ٹیگور کو مدعو کیا گیا جس پر ملتِ ایران نے اپنی سخت ناراضگی کا اظہار کیا۔ پھر بھی افغانستان کے ذریعے کسی نہ کسی طرح آپ کی کچھ نظمیں اور کتب ایران تک پہنچ گئیں۔ اپنی زندگی میں آپ کسی حد تک نہ صرف افغانستان میں متعارف ہو چکے تھے، بلکہ آپ کے سفرِ افغانستان کے باعث آپ کو وہاں کے علماء، شعراء اور زُعماء سے تعارف اور ملاقات کا موقع فراہم ہو چکا تھا اور آپ کی نظمیں اکثر اوقات وہاں کے فارسی ادبی مجلات کی زینت بنتی رہتی تھیں۔ آپ کی زندگی ہی میں ایران کے ممتاز علمی مجلّہ ''سخن'' میں آپ کی ایک نظم شائع ہوئی تھی جو کابل کے کسی

رسالے سے نقل کی گئی تھی اور غلطی سے آپ کو افغانستان ہی کا ایک شاعر سمجھا گیا تھا۔

اُن دنوں پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور شعبۂ فارسی کے اساتذہ کے ایران کے اہل علم سے واجبی سے تعلقات بھی کسی نہ کسی حد تک قائم تھے اور ایران سے لاہور آنے والے اصحاب یا برصغیر سے زیارتوں کے لیے ایران جانے والے حضرات کی پروفیسر اقبال (جو علامہ کے ہم نام تھے) سے میل ملاقات بھی رہتی تھی۔ ان کے ذریعے سے ہمیں علامہ اقبال کی خط و کتابت کا علم ایران کے اس دور کے کچھ ادباء اور شعراء کے ساتھ ہوتا ہے۔ ان دانشوروں میں جناب محیط طباطبائی مرحوم اور جناب سعید نفیسی مرحوم کے نام بہت اہم ہیں۔ ان عظیم حضرات نے آپ کے کلام کے محاسن اور فکری بلندی کو سراہا تھا اور انہی کی خط و کتابت کے بعد آپ نے تحریر فرمایا تھا: ؎

نوائے من بہ عجم آتشِ کہن بر افروخت

عرب ز نغمۂ شوقم ہنوز بے خبر است

(میری دردبھری شاعری نے ایران میں وہ حالات پیدا کر دیے ہیں کہ وہاں کے آتش کدوں کی قدیم آگ کے شعلے دوبارہ بھڑک اٹھے ہیں۔ لیکن ابھی تک عرب کی سرزمین میرے شوق و جذبہ سے معمور نغمہ سے بے خبر ہے۔)

جناب محیط طباطبائی مرحوم

شاہی سرپرستی میں جب ۱۹۳۳ء میں ایران کے مشہور قومی شاعر ابوالقاسم فردوسی کا ہزار سالہ جشن ایران میں منعقد ہوا تو افغانستان سے ممتاز دانشور جناب سرور گویا بھی مدعو کیے گئے اور آپ اس غرض سے تہران تشریف لے گئے۔ سرور نے وہاں ایرانی ادباء اور شعراء کی محفل میں علامہ اقبال کے شعر و فکر کی تعریف کی۔ دورانِ گفتگو مجلس یعنی پارلیمنٹ کے ایک اہم رکن (غالباً) ملک الشعراء بہار نے کہا کہ میں نے اقبال کے کلام کا ایک مجموعہ دیکھا تو ہے، مگر ایران میں ان کے کلام کو ابھی تک چنداں پذیرائی حاصل نہیں ہو پائی۔ جناب محیط طباطبائی کو اس بات پر بے حد دکھ ہوا اور انہوں نے سرور گویا سے علیحدگی میں مل کر علامہ کے چار شعری مجموعوں کی بابت تفصیل سے بات کی اور کہا کہ ''جاوید نامہ''

(اشاعت کے دو برس بعد بھی) مجھ تک نہیں پہنچا' آپ کسی نہ کسی طرح میرے لیے اس کے ایک نسخے کا بندوبست کردیں۔ محیط طباطبائی نے علامہ اقبال سے متاثر ہوکر آپ سے خط وکتابت کا سلسلہ بھی شروع کردیا' مگر آپ اپنی شدید خواہش اور دلی آرزو کے باوجود (جس کا ذکر آپ نے بار بار کیا ہے) علامہ اقبال سے بالمشافہ طور پر مل نہ سکے۔ علامہ اقبال کی وفات کے چھ برس بعد آپ نے اپنے مجلّہ ''محیط'' کا ایک شمارہ ''اقبال نمبر'' کی صورت میں شائع فرمایا۔ ۲۵/اپریل ۱۹۴۴ء کو شائع ہونے والے اس مجلّے کے تمام مضامین محیط کے اپنے ہی قلم سے ہیں۔ یہ امر آپ کی علامہ اقبال سے گہری محبت کا مظہر اور دیگر ایرانی شعراء سے بے اعتنائی کا شاہد ہے۔

آپ نے لکھا کہ علامہ اقبال نے سلطنت عثمانیہ کے انقراض کے بعد اہلِ مغرب کو اپنی شدید تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے اقوامِ مشرق میں خودی کے جذبے کو اُبھارا ہے اور ایک نئے اور جاندار فلسفے کی بنیاد رکھی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ اقبال سب سے پہلے ایک مسلمان ہے' پھر ہندی اور پھر ایک ایرانی۔ علامہ اقبال کے کلام سے اسلامی ممالک کے لوگوں سے آپ کے عشق ومحبت کا جذبہ واضح ہوتا ہے اور آپ خصوصاً افغانستان' ایران اور ہندوستان کے لوگوں کو ان مذموم سازشوں سے آگاہ کرتے ہیں جو اہلِ مغرب ان میں اسلامی وحدت اور دینی حمیت کو ختم کرنے کے لیے کررہے ہیں۔ پہلوی دَور کی ترقی کی آڑ میں لائی جانے والی سماجی تبدیلیاں علامہ کے روحانی' فکری اور عرفانی مزاج سے متصادم ہیں اور آپ ایران کے موجودہ سیاسی اور سماجی حالات پر تنقید فرماتے ہیں اور ایران کی بھونڈے انداز میں اہل مغرب کی اندھی تقلید کو انتہائی مایوسی کے عالم میں دیکھتے ہیں۔ لیکن رومی کی رہنمائی میں جو عشق علامہ اقبال کو ایرانی روحانیت سے ہے وہ کسی ایرانی معاصر شاعر اور مفکر کو بھی نصیب نہیں ہوا ہوگا۔ اگرچہ آپ ظاہری اعتبار سے تو لاہور میں محوِ خواب ہیں' مگر آپ کا مزار اُن اہلِ دل کے سینوں میں ہے جو آپ کے سات فارسی شعری مجموعوں کے مطالعے سے ان کی ابدی فکری اور ادبی زندگی کا مشاہدہ اور مطالعہ کرتے ہیں۔ آپ کے ہاں مضمون کی باریکی' معلومات کی وسعت وفراوانی'

بلند حقائق کا ادراک اور فکری گہرائی موجود ہے جن کی روشنی میں آپ عصرِ حاضر کے دگرگوں حالات کے متعلق اپنی اجتماعی اور فلسفیانہ معلومات کو فارسی کے قدیم اور روایتی اسلوب اور طرزِ بیان کے ذریعے ہندوایران کے اہلِ درد قارئین تک ایک دلکش پیرائے میں پہنچاتے رہے ہیں۔ میں (محیط طباطبائی) گزشتہ بیس برس سے علامہ کے کلام کا مسلسل مطالعہ کرتا رہا ہوں اور میں نے مقدور بھر کوشش کی ہے کہ میری تحریروں کے ذریعے ایران کے لوگ آپ کے کلام کو سمجھیں اور آپ کی عظمت کا اعتراف کریں۔ اب سے پانچ برس پہلے تک ایرانی لوگ علامہ اقبال کی بات تک بھی سننا گوارا نہیں کرتے تھے' مگر تیزی سے بدلتے ہوئے سیاسی اور سماجی حالات کے تناظر میں لوگوں نے بالآخر آہستہ آہستہ آپ کے افکار اور نظریات کو قبول کرنا شروع کر دیا ہے۔ اب ملتِ ایران نے بھی علامہ اقبال کی عظمت کا اعتراف کر کے ہندوستان کے مسلمانوں پر ثابت کر دیا ہے کہ مشترک تہذیب و ثقافت پر مبنی ہماری قدیم دوستی لازوال ہے اور اسے استعماری قوتوں کی سازشوں کا شکار نہیں بنایا جاسکا ہے۔

جناب محیط طباطبائی کے خیالات کے اس خلاصے سے ایران میں اقبال شناسی کے اوّلین دَور تک ہماری رسائی ہوتی ہے۔

جناب استاد سعید نفیسی مرحوم

آپ بیسویں صدی کے ایران کے عظیم علماء وفضلاء میں سے تھے۔ آپ کو عربی' فارسی اور فرانسیسی کے علاوہ روسی زبان پر بھی مکمل عبور تھا۔ آپ نے ۱۳۰ (ایک سوتیس) کے لگ بھگ کتابیں لکھی ہیں۔ حضرت علامہ اقبال نے پروفیسر اقبال کے توسط سے آپ کو ''مثنوی اسرارِ خودی'' اور ''رموزِ بے خودی'' کے علاوہ ''زبورِ عجم'' کا شعری مجموعہ بھی بھجوایا تھا۔ اس کے بعد جناب پروفیسر نفیسی کی درخواست پر ''پیامِ مشرق'' کی بھی ایک جلد ارسال فرمائی تھی۔ آپ نے علامہ کی شاعری اور افکار سے متاثر ہو کر آپ کی خدمت میں ایک جذباتی خط بھی ارسال کیا تھا۔ علامہ اقبال نے آپ کو ۲۶/اگست ۱۹۳۲ء کی تاریخ میں ایک خط لکھا تھا جس میں علامہ اقبال نے تحریر فرمایا کہ ''میرے دل میں سالہا

سال سے آپ کے ایران کو دیکھنے کی تمنا ہے۔ میری زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ میری فارسی شاعری ہے اور میرے لیے یہ ایک گونہ سعادت اور فخر کی بات ہے کہ آپ جیسے نامور عالم اور محقق نے اپنی پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا ہے۔'' اس خط کے ہمراہ ''پیامِ مشرق'' کی بھی ایک جلد بھجوائی گئی تھی، جس پر سعید نفیسی مرحوم نے شکریے کا ایک اور خط تحریر فرمایا۔ اس کے جواب میں ہمیں علامہ اقبال کا نفیسی کے نام سے دوسرا خط ملتا ہے جس پر ۴ رنومبر ۱۹۳۲ء کی تاریخ درج ہے۔ اس میں یہ تحریر ہے کہ ''''جس طرح ایران کے اُدباء اور فضلاء کو مجھ سے ملاقات کی آرزو ہے، اسی طرح نیاز مند بھی ان سے ملنے اور ایران کو دیکھنے کا آرزومند ہے، لیکن ممکن ہے کہ میری کمزوری اور علالت اس راہ میں رکاوٹ پیدا کر دے۔ کچھ عرصہ بعد مجھے افغانستان کا سفر درپیش ہے اور میری دلی آرزو ہے کہ کسی نہ کسی دن اپنی آنکھوں سے سرزمینِ ایران کو دیکھوں اور میری خدا سے دعا ہے کہ آپ جیسے شفیق اور مہربان دوست سے بھی ملاقات ہو سکے۔'' جناب نفیسی اپنے ایک مقالہ میں لکھتے ہیں کہ ''علامہ اقبال کو مشرق کے بہترین مستقبل پر بہت اعتماد ہے۔ آپ کے خیال میں مغرب کی برتری اور غلبے کا دور اپنے منطقی اختتام تک پہنچنے والا ہے اور اس کے بعد مشرق کے عروج اور اقتدار کی باری ہے۔''

ابتدائی دور میں علامہ اقبال پر ایران میں فارسی زبان میں لکھی جانے والی ڈاکٹر عبدالحمید عرفانی کی اہم کتاب ''رومیٔ عصر'' کا مقدمہ بھی جناب نفیسی نے ہی تحریر فرمایا تھا۔ اس میں آپ نے علامہ اقبال کو برصغیر اور ایران کی نو سو سالہ فارسی شاعری کی عظیم روایات کا وارث قرار دیا اور آپ کی تصانیف کو برہانِ قاطع اور قاطعِ برہان قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ علامہ کا تصوف جدید معارف اور فلسفہ کے علاوہ مشرق و مغرب کے جدید علوم سے بہرہ اندوز ہے۔ آپ جس قدر سنائیؒ اور رومیؒ کے افکار سے باخبر ہیں، اسی طرح ہیگل، کانٹ، شوپنہاور، نٹشے، گوتم بدھ اور کنفیوشس کے افکار سے بھی آگاہ ہیں۔ مزید برآں جس طرح پہلے بزرگوں نے مثنویٔ مولانا رومؒ کو ''قرآنِ پہلوی'' کا نام دیا ہے اسی طرح معاصر دانشور اقبال کی مثنوی کو مثنویٔ قرنِ حاضر سمجھ سکتے ہیں۔ آپ

شاعری کے ایک نئے اسلوب کے بانی اور مجدّد ہیں اور آپ کا نام تواریخِ ادبیات میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ علاوہ بریں گزشتہ سات سو برسوں میں مختلف شاعروں نے مولانا رومؒ کے تتبع میں کئی مثنویاں لکھی ہیں مگر جس انداز سے اقبال نے یہ کارنامہ سرانجام دیا ہے وہ کسی اور کے حصے میں نہیں آ سکا۔ آپ نے کمزور اقوام کو غیروں کے نوآبادیاتی تسلط سے نجات حاصل کرنے اور اپنے گمشدہ مقام کے حصول کے لیے جوش دلایا ہے۔ آپ کا جاندار انقلابی پیغام مسلمانانِ عالَم کے لیے ایک صحیفے یا وصیت نامے کی حیثیت کا حامل ہے۔

جناب اُستاد نفیسی ۱۹۵۶ء میں اقبال اکادمی کی دعوت پر پاکستان تشریف لائے اور ۲۶ فروری ۱۹۵۶ء کو کراچی میں دیے گئے اپنے ایک خطبہ میں فرمایا کہ اب اہلِ ایران اقبال کو رومیؒ اور حافظؒ کا ہم پلہ شاعر قرار دیتے ہیں۔ سات سو برس کے بعد قونیہ میں بسنے والے رومیؒ کے افکار کا مظہر اس بار سیالکوٹ میں اقبال کی صورت میں رونما ہوا ہے اور ایسے افراد ہزار برس کی تاریخ میں بہت ہی کم تعداد میں پیدا ہوتے ہیں۔ معاصر ایرانی دانشوروں کی نظر میں آپ کا وہی مقام ہے جو قدیم یونان میں افلاطون کا اور عالَمِ اسلام میں ابنِ سینا اور رومیؒ کا تھا۔ عظیم شعراء کے ہاں دستور رہا ہے کہ وہ معنی کو لفاظی اور موسیقیت پر قربان کر دیتے ہیں، لیکن اقبال کی توجہ ہمیشہ بلند، لطیف اور دقیق معانی کی طرف مبذول رہی ہے۔ آپ سنائیؔ، عطارؔ، مولانا روم اور عراقیؔ کی قائم کردہ عظیم صوفیانہ روایات کے خاتم ہیں اور آپ نے تمام تشنہ مطالب کی تکمیل فرماتے ہوئے لکھا:

ذرّہ ام مہر منیر آنِ من است
صد سحر اندر گریبانِ من است

(میں ایک ذرّہ ہوں مگر چمکتا ہوا سورج میری ملکیت ہے اور میرے گریبان میں سینکڑوں صبحیں اپنے نمودار ہونے کی منتظر ہیں۔)

خاکِ من روشن تر از جامِ جم است
محرم از نازاد ہائے عالم است

(میری مٹی جامِ جمشید سے بھی زیادہ روشن اور شفاف ہے اور دنیا کے ان ہنگاموں کی بھی رازدان ہے جنہوں نے ابھی جنم لینا ہے۔)

۲۱/اپریل ۱۹۵۶ء کو کراچی میں ایک تقریب میں اپنے خطبہٗ صدارت کے دوران آپ نے فرمایا کہ زرتشتیوں کی مشہور مذہبی منظوم کتاب ''ارتائی ویراف نامک'' میں انسانی روح عالمِ سفلیٰ سے اپنے سفر کا آغاز کر کے بتدریج بلندیوں سے ہوتی ہوئی اپنے بامِ عروج تک جا پہنچتی ہے۔ ایرانی صوفیاء نے اسے اپنانے کے بعد فلسفہٗ ارتقاء یا معراجِ روح کا نام دیا ہے، جس میں روح بالآخر ذاتِ خداوندی میں مدغم ہو جاتی ہے۔ عطارؒ اسی تصور کو اپنی ''مثنویٔ منطق الطیر'' میں بیان فرماتے ہیں۔ پندرہویں صدی عیسویں کے فارسی شاعر فضولی بغدادی نے اس تصور کو اپنی کتاب ''مسافرتِ روح'' میں بیان کیا ہے۔ اسی طرح مشہور عرب نابینا مفکر ابوالعلاء معرّیؒ نے اپنی تصنیف ''الغفران'' میں اس پر مضمون آفرینی کی ہے۔ یورپ میں جرمن شاعر دانتے نے اپنی کتاب ''طربیہٗ آسمانی'' (Divine Comedy) میں انسانی معراج کے بیان کا اعلیٰ ترین نمونہ لطیف ترین معانی میں بیان کیا ہے۔

علامہ اقبال کا ''جاوید نامہ'' اسی موضوع پر تحریر شدہ ایک عظیم شاہکار ہے، جس میں آپ اپنے عالمِ بالا کے تصوراتی سفر کے دوران زرتشت، پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ مولانا رومیؒ، عارفِ ہندی، جہان دوست، سید جمال الدین افغانی، سعید حلیم پاشا، مہدی سوڈانی، حسین بن حلاج (منصور)، طاہرہ قرۃ العین، شاہ ہمدان، غنی کاشمیری، محمود غزنوی، ٹیپو سلطان، نادر شاہ افشار اور احمد شاہ درّانی (ابدالی) اور حتیٰ کہ قدیم دیو مالائی تصورات کے دیوتاؤں سے بھی ملتے ہیں۔ اس دوران آپ پیچیدہ، دقیق اور لطیف فلسفیانہ اور عارفانہ نکات کے علاوہ عصر حاضر کے سیاسی اور سماجی مسائل کو بھی زیر بحث لائے ہیں۔ اس طرح ''جاوید نامہ'' ہمیں تصوف کی آخری کتاب کی صورت میں دکھائی دیتی ہے۔

آپ کے کلام کے بغور مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ آپ نے مثنویٔ مولانا روم، شیخ

محمود شبستری کی گلشنِ راز، آثارِ سید علی ہمدانی، دیوانِ عراقی اور دیوانِ حافظ کا دقیق مطالعہ کیا ہے۔ آپ نے روایتی تصوف سے جمود کو ختم کر کے اس میں تحرک، اجتماعیت اور انقلاب کے مفاہیم کو شامل کیا ہے۔ مملکتِ خداداد پاکستان کا وجود بھی بہت حد تک آپ کے فکر کا مرہونِ منت ہے۔ آپ کے پیغام کے مخاطب مسلمانانِ مشرق ہیں۔ آپ نے پہلے برصغیر کے مسلمانوں کو خوابِ گراں سے بیدار کیا، پھر آپ نے اہلِ ایران کے دلوں میں ایمان و ایقان کا جوش و ولولہ پیدا کیا۔ سیالکوٹ اور لاہور کے سفر کے دوران مجھے اُن مقامات پر کچھ وقت گزارنے کا موقع ملا جن کے ماحول میں علامہ اقبال کی زندگی بسر ہوئی تھی۔ اس تجربے نے مجھ پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔

اسی طرح جناب محمد ایوب کے فارسی دیوان ''نوائے فردا'' کے متعلق اظہارِ خیال فرماتے ہوئے موصوف کے نام خط میں پروفیسر نفیسی نے علامہ اقبال کو مسیحا نفس اور مسیحا دم قرار دیا اور کہا کہ آج برصغیر اور ایران کے متعدد شعراء اور مفکرین نے علامہ اقبال کی پیروی میں اظہارِ خیال کرنا اور شعر کہنا شروع کر دیا ہے۔ اقبال نے مشرقی فلسفہ کی جو نئی بنیاد رکھی ہے اس کے پیرووں اور مداحوں کی تعداد دن بدن بڑھ رہی ہے۔ آپ نے ۱۹۵۶ء میں علامہ اقبال کے مزار پر حاضری دیتے ہوئے یہ تاریخی قطعہ بھی کہا :؎

بخاکِ پاکِ تو آمد غبارے از ایران
کشای چشم و سر از خاکِ یک زمان بردار

(آپ کی پاک سرزمین پر ایران سے مٹی کا ناچیز سا پتلا آیا ہے۔ اے کاش کہ آپ اپنی آنکھ کھول سکتے اور ایک لحہ بھر کے لیے اپنی قبر کی مٹی سے سر اٹھا کر اسے دیکھ سکتے۔)

زخاکِ سعدی و فردوسی آمدم، برخیز
پیامِ حافظ آوردہ ام، بشو بیدار

(میں شیخ سعدی شیرازیؒ اور ابوالقاسم فردوسی طوسیؒ کی سرزمین سے آیا ہوں اور آپ کی خدمت میں حافظ شیرازیؒ کا پیغام بھی لایا ہوں۔ اے کاش آپ اٹھ کر

دیکھ سکتے اور نیند سے بیدار ہو سکتے!)

بدستِ من گلے زبوستانِ مولاناست
بپاے خیز کہ تا بر سرت کنیم نثار

(میرے ہاتھ میں مولانا جلال الدین رومیؒ کے باغ سے حاصل کردہ پھول ہے۔
اے کاش آپ اپنے قدموں پر کھڑے ہو سکتے تو میں یہ آپ کی نذر کر سکتا۔)

ہزار بار مرا آرزوئے دیدن بود
چہ مے شود کہ بینم جمالِ تو یکبار

(ہزاروں مرتبہ میرے دل میں آپ کے دیدار کی آرزو پیدا ہوئی تھی۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ میں ایک بار آپ کا روشن چہرہ دیکھ سکتا۔)

برصغیر کے مسلمان سپاہی ایران میں

گزشتہ صفحات میں مرزا کوچک کے جنگل کے انقلاب کا ذکر آ چکا ہے۔ ان کی سرکوبی کے لیے جب برطانوی افواج کو رضا خان کی حمایت میں گیلان کے جنگلات میں بھجوایا گیا تو ان میں شامل لاتعداد مسلمان فوجی بھی تھے جن کا تعلق برصغیر سے تھا اور وہ مسلمان تھے۔ انہوں نے مرزا کوچک کے لٹریچر کا مطالعہ کیا اور فارسی سمجھنے کی وجہ سے سادہ مزاج انقلابی مسلمانوں سے متاثر ہو کر انہوں نے بھاگ کر مرزا کوچک کے ہمراہ مغربی استعمار کے خلاف جنگ لڑنا شروع کر دی۔ یہ لوگ بعد میں گرفتار ہوئے اور انہیں بغداد لے جا کر پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ اس طرح ایرانی اسلامی اَحیاء کی تحریک میں ہمارا خون بھی شامل ہو گیا۔

دوسری جنگِ عظیم میں اتحادی افواج جب ایران بھجوائی گئیں تو ان میں برطانوی افواج میں شامل برصغیر کے ایسے مسلمان فوجی بھی تھے جنہیں فارسی ادب سے کچھ نہ کچھ حد تک شغف تھا۔ ان میں جناب کرنل خواجہ رشید جیسے عظیم محقق اور فارسی کے اسکالر کرنل حسنین بخاری جیسے فارسی کے شیدائی حضرات کو راقم الحروف ذاتی طور پر جانتا ہے۔ کرنل بخاری تو چند برس پہلے تک زندہ تھے۔ آپ بتاتے ہیں کہ اسلامیہ کالج ریلوے روڈ میں

آپ کی تعلیم کے دوران علامہ اقبال اکثر وہاں پر تشریف لایا کرتے تھے۔ موصوف دوسری جنگ عظیم کے دوران قصرِ شیرین کے مقام پر برطانوی ہسپتال کے سربراہ تھے۔ (ان دونوں کرنل صاحبان کا تعلق میڈیکل کور سے تھا)۔ اپنی ایک اور تصنیف ''اقبالِ عرفانی'' میں ڈاکٹر عرفانی نے کرنل بخاری کے فارسی شعر و ادب سے ذوق کا ذکر بھی کیا ہے اور کرنل خواجہ رشید تو تاریخ اور فارسی ادب کی کئی کتب کے مصنف بھی تھے۔ یہ لوگ ایرانی ادب سے دلچسپی کے باعث اپنے قیام کے دوران ایران سے قریبی روابط کے حق میں تھے۔ مزید برآں سیاسی اور تجارتی مفادات کے مدنظر برطانوی حکومت نے بھی ایران اور ہندوستان کے مابین ثقافتی تعلقات کی تجدید کرنا چاہی۔ اسی مقصد سے ۱۹۴۳ء میں ''انجمن فرہنگیِ ایران و ہند'' کی بنیاد رکھی گئی، جس کی روحِ رواں یہ لوگ تھے۔ ان لوگوں کی کوششوں سے ایران میں فارسی شعر و ادب کی نشستیں منعقد ہوتی رہیں اور ان لوگوں کی کاوشوں کے باعث علامہ اقبال ایران میں بڑے پیمانے پر متعارف ہوئے۔

ایرانی اسکالرز برصغیر میں

اسی دوران ایران کے شعراء اور ادیبوں کے دلوں میں برصغیر کو دیکھنے اور وہاں کے زُعماء سے روابط کی تجدید کی تڑپ پیدا ہوئی۔ ۱۹۴۳ء میں ایران سے ایک ثقافتی وفد نے برصغیر کا مفصل دورہ کیا۔ اس میں ماقبل اسلام کے ایرانی ادب (اوستائی ادب) کے مشہور پروفیسر جناب پورِداوَد بھی شامل تھے، جنہیں بعد از اسلام کے شعر و ادب پر کوئی دسترس حاصل نہیں تھی۔ دہلی یا علی گڑھ میں قیام کے دوران آپ سے کسی صحافی نے علامہ اقبال کی شاعری کی بابت پوچھ لیا تو وہ اپنی لاعلمی کا اظہار کرنے کی بجائے کہنے لگے کہ اقبال ایک مقامی اور محدود علاقے کا شاعر ہے اور انہیں ایران میں کوئی نہیں جانتا۔ برصغیر میں قارئین کو تو دکھ پہنچا ہی ہوگا، مجلّہ محیط (ایران) نے ۱۹۴۴ء میں اس واقعہ پر سخت تنقید کرتے ہوئے شدید رنج و غم کا اظہار کیا۔ دیگر جرائد اور ایرانی عوام میں بھی غم و غصے کی ایک لہر دوڑ گئی۔ ایرانی وفد بعد میں لاہور بھی گیا اور اس نے مزارِ اقبال پر حاضری بھی دی اور ایرانیوں کی جانب سے معذرت بھی کی۔ اور جب یہ وفد ایران واپس پہنچا تو

مجلّہ ''محیط'' کے مطابق اس کے اراکین مدتوں اس واقعہ پر افسوس کا اظہار کرتے رہے۔

اقبال کی ایران میں مقبولیت کا ابتدائی دور

ڈاکٹر غلام سرور مرحوم (سابق صدر شعبۂ فارسی، کراچی یونیورسٹی) کے بقول آپ نے اپنے ۱۹۳۳ء میں سفرِ ایران کے دوران یہ محسوس کیا تھا کہ علامہ اقبال کا نام کم از کم وہاں کے ادیبوں اور شاعروں کے حلقے میں جانا پہچانا جاتا تھا۔ علامہ اقبال کی نظم ''شکوہ'' کا ترجمہ ''بدرگاہِ پروردگار'' کے نام سے ۱۹۲۶ء میں ایران کے رسالہ ''ندائے قدس'' میں چھپ چکا تھا۔ لیکن ابتدا میں معدودے چند ایرانیوں کے علاوہ زیادہ تر علماء کا آپ کے افکار اور کلام کے بارے میں رویہ معاندانہ ہی تھا اور یہ لوگ قدرے تعصب سے کام لیتے تھے۔ ملک الشعراء بہار نے اس کا برملا اعتراف کیا ہے اور کہا ہے کہ ایرانی ذہن یہ ماننے کو مشکل سے ہی تیار ہوسکتا ہے کہ ایران کے باہر بھی کسی دور میں سعدیؒ، فردوسیؒ، نظامیؒ، حافظؒ یا مولانا رومؒ کے پائے کا کوئی شاعر پیدا ہوسکتا ہے۔ ابتدا میں مجھے بھی یہی گمان تھا، مگر جب علامہ اقبال کے کلام پر میں نے توجہ دی تو ''پیامِ مشرق'' کے مطالعہ ہی سے مجھے آپ کے وسعتِ مطالعہ اور غیر معمولی قدرتِ بیان کا احساس ہوا اور آپ کی مثنوی کے مطالعہ سے تو معلوم ہوا کہ مولانا رومؒ کے بعد ایسی مثنوی لکھنے کی سعادت تو کسی کو کم ہی نصیب ہوئی ہوگی۔ آپ کے کلام میں قدیم مطالب کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ طرزِ بیان کی جدت، ایجاز واختصار اور شگفتگی بھی بے مثال حد تک موجود تھی۔ علامہ اقبال کے سفرِ فلسطین کے موقع پر آپ کی ملاقات وہاں پر ایک سابق ایرانی وزیراعظم جناب ضیاء الدین طباطبائی سے بھی ہوئی تھی، جس کا ذکر انہوں نے ۱۹۵۰ء میں علامہ اقبال کی یاد میں ایک اجلاس کے موقع پر بھی فرمایا تھا۔

ملک الشعراء استاد محمد تقی بہار

آپ کو مولانا جامیؒ کے بعد گزشتہ چار سو برسوں کی ایرانی تاریخ میں سب سے اہم فارسی شاعر تصور کیا جاتا ہے۔ آپ پارلیمنٹ کے نڈر رُکن، بادشاہت کے زبردست

مخالف اور اسلامی روایات کے علمبردار تھے اور روایتی صفوی شیعیت اور جاہ پرست علماء کی مخالفت میں آپ نے جو کچھ کہا اور جس عملی جدوجہد کا ثبوت دیا تھا اس طرح آپ کے افکار اور اعمال آپ کو فطری طور پر علامہ اقبال کے بہت قریب لے آتے ہیں۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، ۱۹۴۳ء میں برطانوی افواج میں شامل برصغیر کے مسلمان فوجیوں کی کوشش سے ''انجمن فرہنگیٔ ایران و ہند'' کا وجود عمل میں آیا۔ اس کے زیر اہتمام اسی برس استاد بہار نے دانش سرائے عالی تہران میں اپنی مشہور نظم ''خطاب بہ ہند'' پڑھی، جس میں برصغیر کی فارسی روایات اور شعراء کا ذکر کرتے ہوئے کہا: ؎

ایزدی بود آشنائی ہائے ما
آشنا داند صدائے آشنا

(ہمارے تعلقات کی بنیاد خداوند تعالیٰ پر ایمان کی مشترکہ دولت تھی، اسی لیے ایک آشنا ہی اپنے آشنا کی آواز کو پہچان سکتا ہے۔)

ہند و ایراں آشنایانِ ہم اند
ہر دو از نسلِ فریدون و جم اند

(ہندوستان اور ایران ایک دوسرے سے آشنا ہیں اور آریائی نسل سے تعلق کے باعث دونوں قومیں فریدوں اور جمشید جیسے اساطیری عہد کے ایرانی بادشاہوں کی نسل سے ہیں۔)

پھر آپ ایک دم شعراء کا ذکر کرتے کرتے علامہ اقبال پر آن پہنچتے ہیں اور فرماتے ہیں: ؎

عصرِ حاضر خاصۂ اقبال گشت
واحدے کز صد ہزاراں برگذشت

(موجودہ دور علامہ اقبال کا دور ہے اور وہ اکیلا عظیم انسان ہے جو لاکھوں اشخاص پر سبقت لے گیا۔)

آپ علامہ اقبال کی تجلیل و تمجید کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ؎

نکتہ اے گویم سخن کوتاہ کنم
خاطرِ پاکِ ترا آگاہ کنم

(میں ایک پتے کی بات کرتے ہوئے اپنی حکایت کو مختصر کرتا ہوں اور تیرے پاک ضمیر کو اس بات کی خبر دیتا ہوں۔)

شمّہ اے در حال و استقبالِ تو
ہاں نہ من گویم کہ گفت اقبالِ تو

(مختصراً تیرے حال اور مستقبل کے بارے میں مَیں اپنے پاس سے تو کچھ نہیں کہہ رہا، یہ سب کچھ آپ کے اقبال ہی کا کہا ہوا ہے۔)

زندگی جہد است و استحقاق نیست
جز بہ علمِ انفس و آفاق نیست

(بقول اقبال: حقیقی زندگی جدوجہد سے ہی حاصل ہوتی ہے۔ یہ کسی کا استحقاق نہیں جو خود بخود مل جائے۔ زندگی تو انسانوں اور کائنات کے علوم سے وابستہ ہے۔)

گفت حکمت را خدا خیر کثیر
ہر کجا ایں خیر می بینی بگیر!

(قرآن پاک میں خداوند کریم نے حکمت کو بہت زیادہ خیر کا نام دیا ہے اور حدیثِ مصطفیٰ ﷺ کے مصداق جہاں سے یہ خیر ملے اسے سمیٹ لو!)

غافل از اندیشۂ اغیار شو
قوتِ خوابیدۂ بیدار شو

(اغیار یعنی غیر ملکی حکمرانوں اور حکماء کا خیال دل سے نکال دو اور اے سوئی ہوئی قوت! بیدار ہو جا۔)

پھر اپنے الفاظ میں آپ نے اتحاد کا پیغام دیتے ہوئے فرمایا: ؎

جز براہِ یکدلی سالک مباش
محوِ یکتائی شو و مشرک مباش!

(ایک دل و جان اور متحد ہونے کے علاوہ کچھ مت سوچنا۔ توحید میں محو ہو جا اور کبھی بھی مشرک بننے کا مت سوچنا۔)

سوئے وحدت پوے و دست از شرک شوی
متحد باش و بہ ترکِ کفر گوی

(وحدت کی جانب چل نکلو اور شرک کی راہ چھوڑ دو۔ متحد ہو جاؤ اور کفر سے اپنا دامن بچالو۔)

اس کے بعد ۱۹۵۰ء میں آپ نے تہران میں منعقدہ یومِ اقبال کی تقریب کے موقع پر اپنے صدارتی خطبہ میں فرمایا کہ اب جبکہ پاکستان اور ایران کے درمیان حائل ڈیڑھ سو برس پرانا بوجھل اور بھاری آہنی پردہ جو ہم بھائیوں کے مابین استعماری حکومت نے حائل کر رکھا تھا' اُٹھ گیا ہے تو یوں محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے تمام شیطانی چالیں اس طویل عرصے میں ہماری باہمی ہمدردی' ہم خونی' ہم مذہبی اور ہم زبانی کے تعلقات کو ذرّہ برابر بھی کم نہیں کر سکیں۔ جس طرح فردوسی کی شاعری نے منتشر ایرانی قوم کو مجتمع کر دیا تھا اسی طرح علامہ اقبال کے افکار کے نتیجہ میں ایک عظیم اسلامی ملک وجود میں آ چکا ہے اور اب اُمید کی جاتی ہے کہ علامہ اقبال کے افکار و اشعار کے زیرِ اثر ایران اور پاکستان باہمی ہمدردی' حسنِ تفاہم' دلی دوستی' مضبوط اور مستحکم ایمان کے باعث وسطی ایشیا کے امن اور دوستی کو عظیم اور پائیدار اصولوں پر قائم رکھ سکیں گے۔

ڈاکٹر عرفانی مرحوم اکثر ذکر فرماتے تھے کہ جون ۱۹۴۹ء میں جب آپ کی بہار سے پہلی ملاقات ہوئی تو آپ نے پہلی جنگِ عظیم سے پہلے (۱۲-۱۹۱۱ء) کے زمانے کے بہار کے اپنے اشعار اُن کے دوبارہ گوش گزار کرتے ہوئے کہا کہ بہار اور اقبال کے اشعار و افکار میں ایک کمال ہم آہنگی موجود رہی ہے' تو یہ امر خود اُستاد بہار کے لیے بھی ایک انکشاف سے کم نہیں تھا۔ یہ شعر ملاحظہ ہوں' جو بہار نے ان دنوں عالمِ اسلام' خصوصاً سلطنتِ ترکیہ کے ممکنہ انقراض کے بارے میں کہے تھے: ؎

اے مسلمانانِ عالم تازہ تر شد دردِ ایران
کوسِ مَردی می نوازد' دشمنِ نامردِ ایران

(اے دنیا کے مسلمانو! ایران کا درد ایک بار پھر تازہ ہو کر مزید شدت اختیار کر گیا ہے' کیونکہ اس کا بزدل دشمن پھر مردانگی کی بگل بجا رہا ہے۔)

مادرِ اسلام دارد زیں مصیبت آہ و زاری
اے مسلمانان بود امروز روزِ جان نثاری

(اس کی وجہ سے مادرِ اسلام دوبارہ آہ وزاری میں مبتلا ہے۔ اے مسلمانو! اب جان قربان کرنے کا دن آن پہنچا ہے۔)

ورنہ از ما روحِ ناموسِ شریعت خوار گردد
کیشِ اسلامی اسیرِ پنجۂ کفار گردد

(اگر ہم آگے نہ بڑھے تو یہ اندیشہ ہے کہ شریعتِ محمدیؐ کی آبرو ہماری کوتاہیوں کے باعث خاک میں نہ مل جائے اور دینِ اسلام اور مسلمان ملت کہیں کافروں کے پنجوں میں گرفتار ہو کر نہ رہ جائیں!)

۱۹۵۰ء میں ایران کے بادشاہ محمد رضا شاہ نے دورۂ پاکستان کا پروگرام بنایا۔ ایران وہ پہلا ملک تھا جس نے پاکستان کو تسلیم کیا تھا۔ شاہ کا پاکستان میں انتظار کسی ایک فردِ واحد یا شاہی استبدادی نظام کے مظہر کے طور پر نہیں، بلکہ ملتِ ایران کے سربراہ کے طور پر تھا اور پاکستانی قوم کا فطری جوش و جذبہ دراصل پاکستانیوں کی اہلِ ایران سے محبت کا آئینہ دار تھا۔ ہر چند کہ بہار نے شاہی استبدادی نظام کے ہاتھوں قید و بند، جلاوطنی اور حتیٰ کہ ناکام قاتلانہ حملے تک کے زخم سہے تھے اور ان سے یہ اُمید نہیں کی جا رہی تھی کہ اس موقع پر شاہ کا قصیدہ لکھیں گے، مگر علامہ اقبال کی عقیدت میں آپ نے جناب عرفانی کے ایماء پر ایک قصیدہ لکھا، جس کے چند اشعار قارئین کی دلچسپی کا باعث ہوں گے۔

ز رجسِ شرک بری شد بہ قوتِ توحید
ہمیں بس است بہ دہر افتخارِ پاکستان

(پاکستان کے لیے اس سے بڑھ کر فخر کی کیا بات ہو سکتی ہے کہ وہ ہندوستان سے علیحدہ ہو کر اس جہانِ حاضر میں توحید کی قوت کے بل بوتے پر شرک کی غلاظت سے پاک ہو گیا!)

درود باد بہ روحِ مطہرِ اقبال
کہ بود حکمتش آموزگارِ پاکستان

(حضرت علامہ اقبال کی پاک روح پر خدا کی رحمتیں نازل ہوں جن کی دانائی سے پاکستانی قوم کو علم و دانش کا ایک عظیم سرچشمہ مل گیا۔)

''ہزار بادۂ ناخوردہ'' وعدہ داد کہ ہست
ازان یکیش مئے بے خمارِ پاکستان

(آپ نے اپنے شعر میں جن ہزار باقی بچے ہوئے جاموں یعنی مئے معنی سے لبریز پیالوں کا وعدہ دیا ہے ان میں سے ایک پاکستان کی وہ مے ہے جس کا کوئی نشہ نہیں ہے۔)

جدا نبود و نباشند ملتِ ایران
ز طبع و خوی و شعار و دثارِ پاکستان

(عادات و اطوار' افکار اور لباس کے اشتراک کے باعث ایران اور پاکستان ایک ہیں اور ایک رہیں گے۔)

گمان مبر کہ بود بیشتر ز ایرانی
کسے بہ روے زمین دوستدارِ پاکستان

(یہ کبھی بھی نہ سوچنا کہ ایرانیوں سے بڑھ کر اس روئے زمین پر پاکستان کا کوئی بہتر دوست ہوسکتا ہے۔)

اور یہ علامہ اقبال کے عظیم افکار کے باعث ہے۔ انہی دنوں پاکستان کے وزیر خزانہ غلام محمد (جو بعد میں گورنر جنرل بنے) جناب عرفانی کے ہمراہ استاد بہار سے ملے تو بہار نے خاص طور پر زور دیتے ہوئے پاکستانی قیادت کو علامہ اقبال کے افکار پر عمل پیرا ہونے اور ان کا فکری مشن جاری رکھنے کی تلقین فرمائی۔ اپنے آخری ایامِ زندگی میں تو بہار نے اس خواہش کا بھی اظہار کیا کہ وہ چاہتے ہیں کہ اپنی تمام جائیداد فروخت کر کے لاہور چلے جائیں اور اپنی زندگی کے آخری ایام اقبال کے شہر میں بسر کردیں۔

استاد بہار کی علامہ اقبال سے عقیدت کی بنیادی وجہ بہار کی علامہ اقبال سے فکری ہم آہنگی تھی۔ آپ نے علامہ اقبال کے کلام تک رسائی سے بہت پہلے علامہ اقبال کے اُسلوب کے عین مطابق اتحادِ عالَمِ اسلامی اور مسلمانوں کی فرقہ وارانہ ہم آہنگی' جہد و عمل اور ظاہر پرست علماء کے استحصال' توہمات اور شیعیت صفوی کے استبدادی اثرات کے خلاف شعر کہے ہیں۔ آپ نے فرقہ وارانہ منافرت کے خلاف کہا تھا:۔

ثروت و ملک و ناموس و مذہب
چہار چیز است در ما مرکب

(دولت، ملک، ناموس اور مذہب ہماری ذات کے چار عناصر ہیں جن سے ہماری تکمیل ہوتی ہے۔)

ثروت و ملک و ناموسِ ما را
بردہ این اختلافاتِ مذہب

(ہمارے فقہی اور فرقہ وارانہ اختلافات نے ہماری ناموس، ملک اور دولت سب کو تباہ کر دیا ہے۔)

اختلافاتِ مذہب در اسلام
روزِ ما سیہ کردہ چون شب

(اسلام کے دینِ مبین میں فقہی اختلافات کے باعث ہمارے دن بھی رات کی صورت تاریک ہو چکے ہیں۔)

عزتِ ما بہ دو چیز بستہ است
اتحاد اول و بعد مکتب

(ہمارے اتحاد کی بنیاد دو چیزیں ہیں، سب سے پہلے مسلمانوں کا باہمی اتحاد اور بعد میں مکتبۂ فکر کا خیال۔)

اس کے بعد آپ نے علامہ اقبال کی طرح مسلمانانِ عالم کو اتحاد اور یگانگت کا درس دیا ہے۔ آپ علامہ اقبال کے شعر ؎

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاکِ کاشغر

کے مصداق فرماتے ہیں: ؎

ہند و ترکیہ و مصر و ایران
تونس و قازق و قفقاز و افغان
در ہویت دو، امّا بہ دین یک
مختلف تن ولے متحد جان

(اسلامی ہندوستان، ترکی، مصر، ایران، تیونس، قازقستان، قفقاز اور افغانستان شناخت کے اعتبار سے تو مختلف ہو سکتے ہیں لیکن دینی اعتبار سے ایک ہیں۔ ان کے جسم جدا جدا سہی لیکن جان ایک ہے۔)

جملگی پیروِ دینِ احمدؐ
جملگی پیروِ نصِ قرآن

(سب کے سب محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے دین کے پیروکار ہیں اور سب کے سب قرآن پاک کی حقانیت کے ماننے والے ہیں۔)

مسلمے گر بگرید بہ طنجہ
مؤمنے نالد اندر بدخشان

(انتہائی مغرب میں، یعنی مراکش کے شہر طنجہ میں اگر ایک مسلمان تکلیف کے باعث روئے تو انتہائی مشرق یعنی بدخشان میں مسلمان اس کے درد میں شریک ہوں گے اور اسی کرب میں مبتلا ہو جائیں گے۔)

آرے این راہ و رسمِ عباد است
روز یک رنگی و اتحاد است

(ہاں! نیک لوگوں کا یہی طریق کار ہے۔ آج کے دن پھر اتحاد اور اختلافات مٹانے کی ضرورت ہے۔)

اگر مندرجہ بالا اشعار کا مطالعہ کر کے علامہ اقبال کے ''رموزِ بے خودی'' کے مندرجہ ذیل اشعار کا مطالعہ کیا جائے تو یوں لگتا ہے کہ ان دونوں پیغاموں کا سرچشمہ ایک ہی ہے اور خدا کی طرف سے یہ آواز ایک ہی وقت میں ہزاروں میل کی دوری کے باوجود دو مختلف شعراء کی زبان سے جاری تھی: ؎

آنکہ نامِ تو مسلمان کردہ است
از دوئی سوئے یکے آوردہ است

(وہ خدا جس نے تمہیں مسلمان بنایا ہے، اس نے اختلافات مٹا کر آپ کو ایک وحدت میں سمو دیا ہے۔)

خویشتن را تُرک و افغان خوانده ای
وائے بر تو آنچہ بودی' مانده ای

(تو نے خود کو ترک اور افغان کہلانا نہیں چھوڑا۔ اسلام قبول کرنے سے پہلے تم جو کچھ تھے وہی رہے ہو!)

اے پرستارِ یکی گر تو توئی
تا کجا باشی سبق۔ خوانِ دوئی؟

(اگر تو واقعی اتحادِ اسلامی کا پرستار ہے تو کب تک نسلی ولسانی اختلافات کے راگ الاپتا رہے گا؟)

صد مِلَل از ملّتے انگیختی
بر حصارِ خود شبخوں ریختی

(ایک ملت کی بجائے تو نے سینکڑوں قومیں بنا کر اپنے ہی مستحکم قلعے پر شبخون مار لیا ہے۔)

یک شو و توحید را مشہود کن
غائبش را از عمل موجود کن!

(ایک ہو جا اور توحید پر کاربند ہو جا۔ توحید کے چھپے ہوئے راز دنیا پر آشکار کردے۔ یعنی توحید ملّی پر عمل کر!)

علاوہ بریں علامہ اقبال کے بے شمار اشعار اسی جانب اشارہ کرتے ہیں جن کا مفصل ذکر موضوع کی طوالت کا باعث بن سکتا ہے۔

استاد بہار کی اسی نظم کے آخری اشعار پڑھ کر تو بالکل آنکھیں کھل جاتی ہیں' جہاں وہ معاصر ایران کے مروّجہ شیعہ نظریات کے خلاف اعلانِ جنگ کرتے ہوئے اعلان فرماتے ہیں:۔

حکمِ اسلام و حکمِ پیمبرؐ
بر تو و او و ما جملہ جاری ست

(اسلام کا حکم اور پیغمبرِ اسلام ﷺ کے فرمودات کا ماننا ہم سب مسلمانوں کے

لیے قیامت تک لازمی ہے۔)

ما و اوئی نباشد در اسلام
کاین سخن ہا ز دشمن شعاری ست

(اسلام میں ''ہم'' اور ''وہ'' کا کوئی تصور نہیں ہے اور ایسی بات بھی دشمنی کے جذبات کی عکاس ہے۔)

چار یارِ نبیؐ صلح بودند
زین سبب جنگ ما و تو خواری ست

(آنحضورﷺ کے چاروں اصحاب یعنی حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت علی مرتضیٰؓ محبت اور صلح سے باہم متحد تھے۔ اس کے باوجود اگر ہم آپس میں جھگڑیں گے تو ذلیل و رسوا ہو جائیں گے۔)

تیشۂ ریشۂ دیں، عناد است
روزِ یک رنگی و اتحاد است

(باہمی اختلافات اور عناد دینِ مبین اسلام کے اتحاد کے لیے تیشے کی طرح ہے۔ آج کے دن اتحاد اور اختلافات کو مٹانے کی ضرورت ہے۔)

اتحادِ عالمِ اسلامی اور باہمی تعصّبات کے خاتمے کے ضمن میں استاد بہار کے منظومات قابل مطالعہ ہیں۔ اگر ان کی تفصیلات درج کی جائیں تو ہم اصل موضوع سے دور ہٹ جائیں گے، اس لیے ہم ان کو یہاں بیان کرنے سے قاصر ہیں۔ ''جہنمیہ'' میں آپ نے علماء کو ایک دوسرے پر کفر کے فتوے لگا کر جہنم رسید کرنے کا دلکش منظر پیش کیا ہے کہ کس طرح بات بات پر علماء لوگوں کی تکفیر کرتے ہیں۔ ''صاد اور ضاد'' کی نظم میں آپ نے غیرضروری باتوں میں علماء کو اُلجھتے ہوئے دکھایا ہے۔ پھر آپ کی نظم ''توپِ روس'' ہے جس میں پہلی جنگ عظیم سے پہلے محمد علی قاچار کے باعث مشہد پر روسی بمباری پر زبردست دکھ کا اظہار کیا ہے، جس کے نتیجہ میں امام رضاؒ کے مقبرے کو نقصان پہنچا اور آٹھ سو زائرین مارے گئے۔ اسی کے آخر میں آپ فرماتے ہیں: ؎

ما اگر خانہ خرابیم زِکساں گلہ نیست

کاین خرابی٬ ہمہ ازماست٬ در انجام نظر

(ہمارا اگر بیڑہ غرق ہوا ہے تو کسی سے شکایت نہیں٬ کیونکہ اس خرابی کے درحقیقت ہم خود ہی ذمہ دار ہیں۔)

اے مسلمانان٬ تا چند بہ وہم و بہ خیال؟

اے مسلمانان٬ تا چند بہ بوک و بہ مگر؟

(اے مسلمانو! کب تک وہم و خیال اور توہمات میں مبتلا رہو گے اور کب تک شک وشبہ اور دودلی کا شکار رہو گے؟)

ہر کہ اُو از خود و از خانہ حفاظت نکند

نبود حافظِ اُو نیز خدائے اکبر

(جو بھی کوئی شخص اپنے آپ اور اپنے گھر کی حفاظت نہ کر سکے خدائے برتر بھی اس کی حفاظت نہیں کیا کرتا۔)

نیست انسان را جز آنکہ در او سعی نمود

این چنیں گفت پیمبرؐ بہمایوں دفتر

(لَیۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَاسَعٰی کے مصداق انسان کو وہی کچھ ملتا ہے جس کے لیے وہ کوشش کرے٬ کیونکہ یہی بات آنحضورﷺ کی زبان سے وحی کی صورت میں جاری ہوکر قرآن پاک کا حصہ بن گئی ہے۔)

ایک موقع یہ بھی آیا کہ تنگ نظر علماء نے بہار پر کفر کا فتویٰ لگایا اور خراسان کے عوام کو اُن کے خلاف اُکسایا۔ اس موقع پر بہار نے بالکل علامہ اقبال کے انداز کے مطابق یہ شعر کہے:

ما پاسدارِ دین و کتابِ پیمبریم

ویناں عدوِ دین و کتابِ پیمبرند

(ہم دین اسلام اور اپنے نبیﷺ پر نازل شدہ کتاب یعنی قرآن کے محافظ ہیں٬ جبکہ یہ لوگ آنحضورﷺ کے دین اور قرآن کے دشمن ہیں۔)

دین نیست اینکہ بنی در دستِ ایں گروہ
کاین مفسدہ است و این دینیاں مفسدت گرند

(ان لوگوں کے پاس جو کچھ پیش کرنے کو ہے وہ دین نہیں ہے' بلکہ یہ لوگ فساد کو پھیلا رہے ہیں اور ان کے پاس اس کے سوا کچھ بھی نہیں۔)

دیں' رسمِ پاک نیست کہ دارند این عوام
کاین بدعت واین سفہا بدعت آورند

(دین اسلام روایات کا وہ مجموعہ نہیں ہے جسے یہ لوگ لیے پھرتے ہیں۔ یہ سب کچھ بدعت ہے اور یہ احمق دین کے ٹھیکیدار بن کر بدعت کو فروغ دے رہے ہیں۔)

بہار کے یہ الفاظ علامہ اقبال کے اس مصرعہ یعنی ع ''دینِ ملاّ فی سبیل اللہ فساد'' کی بازگشت ہے۔ علاوہ بریں ایک موقع پر بہار نے واشگاف الفاظ میں فرمایا: ؎

آنچہ پیغمبر گفتہ است' دَ رُو نیست شکی
وحیِ منزل، شمرند آنچہ شنیدند زِ مام

(جو کچھ بھی آنحضور ﷺ نے فرمایا وہ تو شک وشبہ سے بالاتر ہے۔ لیکن ان لوگوں نے جو کچھ اپنی ماں سے سن رکھا ہے اسے اپنے گھر کی وحی سمجھ بیٹھے ہیں۔)

اسلام کی رُوح اور اصل بنیاد پر توجہ دینے کی بجائے' رسوم و روایات کو اسلام سمجھ کر' دنیائے اسلام بشمول ایران میں چند مذہبی اجارہ داروں نے جس طرح عوام کو اپنے مذموم ہتھکنڈوں سے بے وقوف بنایا ہوا تھا' استاد بہار اس پر سخت نالاں تھے۔ انہوں نے عہدِ قاچاریہ میں نام نہاد مذہبی رہنماؤں کا عوام کے مفادات اور آزادیوں کے خلاف رویے کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا تھا۔ خود استاد بہار مرحوم اٹھارہ برس تک مسلسل شاہی اور خانقاہی جبر و استبداد کے خلاف برسر پیکار رہے تھے اور وہ اس امر کے خواہاں تھے کہ اسلام کی صحیح صورت سامنے آ سکے جس میں نہ فرقہ پرستی کی گنجائش ہو اور نہ ہی مذہب کے نام پر جبر و استبداد کی' بلکہ اسلام کی عطا کردہ نعمتیں اور سماجی خوبیاں دنیا کے سامنے آشکار ہوں۔ ظاہر پرستی کی مخالفت میں آپ کی بہترین نظم جو ہماری نظر سے

گزری ہے، وہ تہرانیوں کی ریاکارانہ عزاداری اور ماتم کے بارے میں ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

درِ مُحرّم اہلِ رے خود را دگرگوں می کنند
در زمین، آہ وفغاں را زیبِ گردوں می کنند

(محرم کے مہینہ میں رے یعنی تہران کے لوگ اپنے آپ پر عجیب کیفیت طاری کر لیتے ہیں اور زمین پر اس طرح آہ وفغاں کرتے ہیں کہ ان کے شور سے آسمان لرز اٹھتا ہے۔)

گاہ عریان گشتہ با زنجیر می گو بند پشت
گہ کفن پوشیدہ فرقِ خویش پُر خوں می کنند

(کبھی ننگے ہو کر کمر اور پیٹھ پر زنجیریں مارتے ہیں اور کبھی کفن پہن کر اپنی گردن کو خون آلودہ کر دیتے ہیں۔)

گہ بیادِ تشنہ کامانِ زمینِ کربلا
جوئبارِ دیدہ را از گریہ جیحوں می کنند

(کبھی کربلا کے پیاسے اہلِ بیت کی یاد میں اپنی آنکھوں سے اشکوں کی ندیاں بہاتے ہوئے اپنے آنسوؤں سے دریائے جیحوں کا منظر پیدا کر دیتے ہیں۔)

خادمِ شمرِ کنونی گشتہ وانگہ نالہا
با دو صد لعنت، زدستِ شمرِ ملعوں می کنند

(موجودہ دور کے شمر کے خدمت گزار ہونے کے باوجود روتے دھوتے دو سو لعنتیں ملعون شمر پر بھیجتے ہیں۔)

بر یزیدِ زندہ می گویند ہر دم صد مجیر
پس شماتت بر یزیدِ مردۂ دوں می کنند

(موجودہ دور کے زندہ یزید کی ہر لمحہ خوشامد اور تعریف کرتے ہیں، لیکن مرے ہوئے یزید کو برا بھلا کہتے ہیں۔)

اس کے بعد بہار مرحوم ان لوگوں کے صحیح جذبۂ اسلامی کی ایک خوفناک تصویر کھینچتے

ہیں۔ پہلے اشعار میں شیعیت صفوی کا پہلو سامنے آتا ہے، مگر جب شیعیتِ علوی یعنی اسلام سے وفاداری کا جہاں تک تعلق ہے اس میں ان کے خلوص کا عالم کچھ اس طرح ہے:

حق گواہ است ار محمدؐ زندہ گردد یا علیؓ
ہر دو را تسلیمِ نوابِ ہمایوں می کنند

(خدا گواہ ہے کہ اگر آنحضور ﷺ یا حضرت علی رضی اللہ عنہ زندہ ہو جائیں تو یہ لوگ ان دونوں کو پکڑ کر پولیس کے اعلیٰ افسر کے سپرد کر آئیں۔)

آید از دروازۂ شمران اگر روزے حسینؓ
شامش از دروازۂ دولاب بیروں می کنند

(اگر کسی دن تہران کے شمالی دروازہ یعنی ''دروازۂ شمران'' سے امام حسین رضی اللہ عنہ داخل ہو جائیں تو شام ہونے سے پہلے ہی آپؓ کو جنوبی دروازہ یعنی ''دروازۂ دولاب'' سے باہر نکال دیں۔)

حضرت عباسؓ اگر آید پئے یک جرعۂ آب
مشکِ اُو را در تہ نظمیہ واژوں می کنند

(حضرتِ عباس علمدار رحمۃ اللہ علیہ پانی کا ایک گھونٹ مانگنے آ جائیں تو یہ لوگ ان کی مشکیں باندھ کر پولیس کے صدر دفتر کے نیچے اُلٹا لٹکا دیں۔)

قائمِ آلِ محمدؐ گر کند، ناگہ ظہور
کلّہ اش داغون ٗبضربِ چوبِ قانوں می کنند

(اگر اچانک حضرت امام مہدی علیہ السلام کا ظہور ہو جائے تو آپ کے سر پر قانون کے ڈنڈے برساتے ہوئے کھوپڑی کو زخمی کر دیں۔)

گر یزیدِ مقتدر پا برسرِ ایشان نہد
خاکِ پائش را بآبِ دیدہ معجوں می کنند

(اگر برسرِاقتدار یزید یعنی شاہِ وقت حقارت سے ان کے سر پر پاؤں رکھ دے تو اس کی خاکِ پا پر آنسو بہاتے ہوئے اسے معجون بنا کر استعمال کریں گے۔)

اپنی زندگی کے آخری ایام میں تو بہار علامہ اقبال ہی کے ہو کر رہ گئے۔ اب آپ کی خواہش تھی کہ علامہ اقبال کے انداز پر ایک ضخیم کتاب لکھیں۔ آپ کو علامہ اقبال کی رزمیہ اور جہدِ مسلسل کے بارے میں کی گئی شاعری بہت پسند تھی۔ آپ ایک عظیم اسلامی انقلاب کی راہ دیکھ رہے تھے اور اقبال کو آنے والے دور کا نقیب سمجھتے تھے۔ ایک دن انہوں نے جناب عرفانی مرحوم کو یہ شعر سناتے ہوئے علامہ اقبال کی شاعری کے رزمیہ اور انقلابی پہلو کی جانب توجہ دلائی، جس میں علامہ اقبال نے خطرات میں بے دھڑک کود جانے کی تلقین کی ہے۔

لالۂ این چمن آلودۂ رنگ است ہنوز

سپر از دست میند از کہ جنگ است ہنوز

(اس چمن میں لالے کا پھول ابھی تک رنگ و نسل کی غلاظتوں سے آلودہ ہے۔
اپنے ہاتھوں سے ڈھال مت چھوڑنا کہ ابھی ہماری جنگ جاری ہے۔)

اے کہ آسودہ نشینی، لب ساحل برخیز

کہ ترا کار بگرداب و نہنگ است ہنوز

(اے میرے مخاطب! تو ساحل کے کنارے آرام سے کیوں بیٹھ گیا ہے؟ تجھے تو ابھی بھنور اور مگرمچھوں سے پالا پڑنے والا ہے۔)

اس کے بعد بہار نے فرمایا کہ ہماری موجودہ فارسی شاعری میں فرار، گریز اور مستی، خودفراموشی اور عشرتِ دوام کی خواہش کے اظہار کے فرسودہ موضوعات کے سوا کم ہی نظر آتا ہے۔ پھر فرمایا کہ علامہ اقبال کے ان دو اشعار کی طرح کچھ سال قبل میں نے کچھ شعر کہے تھے جو اس طرح سے ہیں:

مے فروہل زکف اے ترک و بیک سونہ چنگ

جامۂ جنگ فروپوش کہ شد نوبتِ جنگ

(اے میرے محبوب ترک زادے! شراب کے جام توڑ دے اور سارنگی کو ایک طرف پھینک دے، جنگ کا لباس پہن لے کہ اب جہاد کا وقت آ گیا ہے۔)

یہ یاد رہے کہ معاصر فارسی شعروادب میں ترک سے مراد خوبصورت شخص ہوتا ہے۔

از ، بر دوش تفنگ افگن و آسوده گزار
لختی آن دوسرِ زلفِ سیہ غالیہ رنگ
(اپنے کاندھوں پر بندوق ڈال لے اور غالیہ رنگ کی سیاہ زلف کے دونوں سروں کوسکون دے دے۔)

اس سے واضح تھا کہ بہار نے اقبال کی تجلیل و تمجید کے علاوہ اپنی شاعری اور پیغام میں آپ کا تتبع بھی شروع کر دیا تھااور آپ کی پیروی میں اسلامی انقلابی پیغام کوایران کے اہلِ ذوق اور دردمند دل رکھنے والے قارئین میں عام کرنا شروع کر دیا تھا۔ یہ علامہ اقبال کی مقبولیت اور ایران میں پذیرائی کے دور کا آغاز تھا' کیونکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بہار مرحوم کے شاگردوں اور پیروکاروں نے یہ قلندرانہ رسم جاری و ساری رکھی اور ایران میں فارسی شعروادب میں آہستہ آہستہ انقلابی مضامین پختہ تر ہوتے چلے گئے اور ساتھ ساتھ اقبال لاہوری کا نامِ نامی ایرانی ذہنوں پر نقش ہوتا چلا گیا۔ بہار ۱۹۵۱ء میں وفات پا گئے اور پھر اگلے آٹھ دس برس تک اقبال کے پیغام کو آگے بڑھانے کی یہ ذمہ داری ایران کے قومی شاعر صادق سرمد مرحوم نے سرانجام دی۔

استاد حسین خطیبی

آپ استاد بہار مرحوم کے عزیز ترین شاگرد اور شاعری میں جانشین تھے اور تہران یونیورسٹی میں بہار کی فارسی ادب کی خالی کردہ اسامی پر بطور پروفیسر مقرر ہوئے۔ ایران میں آپ اپنے عہد میں فارسی سبک شناسی میں سب سے اہم دانشور کے طور پر جانے اور پہچانے جاتے تھے۔ آپ ایران کی ''شیر و خورشیدِ سرخ'' (ریڈ کراس) کے سیکرٹری جنرل بھی تھے۔ جناب خطیبی کے شاگرد پروفیسر جعفر محبوب تھے' جن سے راقم الحروف کو ایک طویل عرصے تک قریبی کسبِ فیض حاصل ہوا ہے۔ آپ نے ۱۹۵۳ء میں علامہ اقبال کے تمام کلام کا مطالعہ فرمایا اور پھر آپ کے کلام کی عالمانہ' فلسفیانہ اور شاعرانہ پہلوؤں کی نشاندہی کی۔ اس طرح آپ نے اقبال کو حافظ شیرازیؒ کا ہم پلّہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ آپ کی بعض غزلیات پر حافظ کی غزل کا گمان ہوتا ہے' اور جب تک قاری کو

علم نہ ہو وہ علامہ اقبال کے اشعار کو اپنی دانست میں حافظ کے اشعار سمجھنے کی غلطی کا مرتکب ہو سکتا ہے۔ علامہ اقبال کی شاعری کے فنی پہلوؤں پر آپ کے کئی ایک مقالات جب ایران میں شائع ہوئے تو وہاں کے علمی حلقوں میں اچانک ایک ارتعاش سا پیدا ہو گیا اور ایران کی علمی و ادبی محفلوں میں علامہ اقبال کی شاعری کا غلغلہ سنائی دینا شروع ہو گیا۔ آپ کے بقول علامہ اقبال ہی نے فارسی شاعری کے نیم مردہ چراغ کو از سر نو روشن کیا اور اس ابدی نور سے نہ صرف پاکستان بلکہ ایران کو منور فرمایا۔ پروفیسر خطیبی نے جس انداز سے اقبال کی حافظ کی پیروی میں لکھی ہوئی غزلیات اور مختلف شاعرانہ پہلوؤں کا ذکر فرمایا ہے ان کا ذکر ہمارے موجودہ موضوع کی مناسبت سے طوالت کا باعث ہے، لہٰذا ہم فی الحال اس سے صرفِ نظر کرتے ہیں۔

جناب مجتبیٰ مینوی

آپ فارسی، عربی اور انگریزی ادبیات کے ماہر تھے۔ علمی، ادبی، تنقیدی اور تاریخی مسائل پر آپ کے سینکڑوں مقالات اور متعدد کتب تحریر شدہ ہیں۔ آپ کئی برس تک لندن میں مقیم رہے تھے اور وہیں پر بعض ہندوستانی مسلمانوں (قیام پاکستان سے قبل) کے توسط سے علامہ اقبال کی فارسی شاعری سے روشناس ہوئے تھے۔ آپ کی تالیف ''اقبالِ لاہوری'' غالباً فارسی زبان میں علامہ اقبال کی شاعری کے بارے میں ایران میں لکھی گئی پہلی کتاب تھی جو ۱۹۴۹ء میں مجلّہ ''یغما'' کی طرف سے پورے اہتمام کے ساتھ شائع ہوئی تھی۔ اس سے پہلے ہمیں جناب داعیُ الاسلام کے علامہ اقبال کے بارے میں ایک فارسی مقالے کا ذکر ملتا ہے، جو موصوف نے اپنے حیدر آباد دکن کے قیام کے دوران لکھا تھا۔ جناب داعیُ الاسلام حیدر آباد میں فارسی کے لیکچرر تھے اور وہیں پر فوت ہوئے۔ چونکہ وہ مقالہ ہندوستان میں تحریر ہوا اس لیے کتاب ''اقبالِ لاہوری'' ہی پہلی کتاب ہے جو ایران میں چھپی اور اسی کے باعث علامہ اقبال کو ''اقبالِ لاہوری'' کے نام سے پہچانا گیا۔

آپ کے مطابق علامہ اقبال ایک صاحب قدرت شاعر اور بلند مقام مفکر تھے،

جنہوں نے سعی و عمل کے نظریات کا پرچار کرتے ہوئے لوگوں کو زندگی کی اصل حقیقت سے آشنا کروایا۔ برصغیر کی تحریک آزادی اور پھر ایک عظیم اسلامی مملکت کا قیام آپ کے افکار کا مرہونِ منت تھا اور ایران میں بھی کم از کم پچھلے سو برس میں آپ جیسی عظیم شخصیت پیدا نہیں ہو سکی۔ آپ نے مشرقی تصوف اور قدیم عقلی فلسفے کے پیروکاروں کو جھنجھوڑتے ہوئے افلاطونی افکار کو ذہنی پسماندگی کا منبع قرار دیا۔ اسی طرح آپ نے مغربی علم و حکمت کو عشق سے خالی ہونے کے باعث خام اور ناکارہ قرار دیا۔

علامہ علی اکبر دہخدا

آپ کو بلاشبہ ایران میں موجودہ دَور کے عظیم ترین ادیب ہونے کا شرف حاصل تھا۔ آپ نے فارسی زبان میں ''لغت نامہ'' کے نام سے بیس کے قریب جلدیں ترتیب دیں اور آپ کی وفات کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ آپ نے تہران میں ۱۹۵۱ء میں یومِ اقبال کے جلسہ کی صدارت کرتے ہوئے صدارتی خطبہ میں فرمایا کہ ہر چند کہ قیامِ پاکستان کے بعد ایرانیوں نے علامہ اقبال کے شعر و فکر کو سمجھنا اور پہچاننا شروع کیا ہے' مگر ابھی تک کما حقہٗ آپ کے فلسفہ کی گہرائی کو پوری طرح سمجھا نہیں جا سکا۔ آپ نے ایرانی قوم کو فکرِ اقبال کے مزید مطالعہ کی تلقین کی۔ آپ نے فرمایا کہ علامہ اقبال نے ہندوانہ فلسفے میں موجود زندگی سے فرار اور گریز کی خامیوں کو جاننے کے بعد ملتِ اسلامیہ کو اسلامی وحدت میں مربوط کرنے کی کوشش فرمائی۔ ایک اور موقع پر علامہ دہخدا نے علامہ اقبال کو ان الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کیا:

زانگونہ کہ پاکستان با نابغۂ دوران — اقبال شہیرِ خویش بر شرق ہمی نازد
زیبد وطنِ ما بر خویش ہمی بالد — و اندر چمن معنی چون سرو سرافرازد
زآنکہ روئے اقبال خواہد گہ سخن گوید — گنجینۂ قلبِ خود با گفتہ پرد ازد

(جس طرح پاکستان علامہ اقبال جیسی نابغۂ روزگار ہستی اور عظیم مفکر پر نازاں ہوتے ہوئے مشرق میں فخر سے سربلند کرتا ہے' اسی طرح ہمارے وطن یعنی ایران کو بھی حق حاصل ہے کہ معنی کے باغ میں سرو کی طرح سربلند ہو کر فخر کرے'

کیونکہ جب علامہ اقبال بات کرنا چاہتے ہیں تو اپنے روحانی خزانے کو زبانِ شعر کے ذریعے عام کرتے ہیں۔)

از بُعد وطن تاشان کس را بجز ایرانی   شائستہ نہ بیند تا باوے سخن آغازد

(اپنی فارسی زبان کے باعث اپنے ہم وطنوں کے علاوہ ماسوائے ایرانیوں کے کسی کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ ان سے ہم کلام ہو سکے۔)

دُر ہائے ثمن خود در دُرجِ دَری ریزد   از پہنۂ این میدان جولانگۂ خود سازد

(اپنے گوہر ہائے بے بہا کو فارسی زبان کی ڈبیا میں انڈیلتے ہیں اور ایران کے میدان کی وسعتوں کو دہخدا اپنے افکار کی جولانگاہ سمجھتے ہیں۔)

علامہ دہخدا کے اعترافِ حقیقت کے بعد علامہ اقبال غیر متنازعہ طور پر فارسی شعر و ادب میں اہم ترین اور بین الاقوامی طور پر مسلّم مقام کے حامل قرار پائے۔

جناب حسین تقی زادہ

آپ عرصۂ دراز تک سیاسی جلاوطنی کے باعث ایران سے باہر رہے اور اس دوران جرمنی سے علمی مجلّہ ''کاوہ'' شائع کرتے رہے۔ آپ کے یورپ مین طویل قیام کی وجہ سے آپ کا بین الاقوامی، فلسفیانہ اور انقلابی تحریکوں کے بارے میں وسیع مطالعہ تھا۔ حالات کی تھوڑی بہت بہتری کے بعد ایران لوٹنے پر آپ تمام علمی حلقوں میں انتہائی احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے اور ۱۹۵۱ء میں متفقہ طور پر پارلیمنٹ کے ایوانِ بالا (مجلس سنا) کے چیئر مین منتخب ہو گئے۔ آپ نے یومِ اقبال ۱۹۵۱ء کے موقع پر ایک یادگار عظیم خطبہ دیا، جس کی بازگشت تا دیر ایران میں سنائی دیتی رہی۔ اس میں آپ نے علامہ اقبال کی اتحادِ اسلامی کے لیے کی گئی زبردست خدمات کو سراہا۔ آپ کو روایتی متصوفین پر فوقیت دیتے ہوئے فرمایا کہ اقبال کے افکار کا مطالعہ صرف وہی شخص کرے جس کا معاصر انقلابی تحریکوں، فلسفۂ اسلام اور مغربی افکار کا وسیع مطالعہ ہو۔ آپ نے اس یقین کا اظہار فرمایا کہ علامہ اقبال کی خواہش کے مطابق تہران کو عالم اسلام کا مرکز (جنیوا) بننے کی سعادت ایک نہ ایک دن ضرور نصیب ہوگی اور وحدت اسلامی کی تحریک ضرور زور پکڑے گی اور مسلم دنیا کے اتحاد کا دن ضرور طلوع ہو کر رہے گا۔

جناب صادق نشأت

آپ مشہور صوفی بزرگ حضرت خواجہ میر دامادؒ کی اولاد سے تھے اور آپ کو عربی اور فارسی علوم پر تبحر حاصل تھا۔ آپ ۱۹۵۱ء میں علامہ اقبال کے کلام سے آشنا ہوئے۔ آپ نے اپنے ایک مقالے میں فرمایا کہ علامہ اقبال دلی اور روحانی اعتبار سے مکمل طور پر ایک ایرانی مفکر اور شاعر ہیں۔ آپ سنّی مسلمان ہوتے ہوئے بھی تشیع کی روح سے دُور نہیں تھے' بلکہ سرے سے فرقہ وارانہ اختلافات ہی کے خلاف تھے اور تمام مسلمانوں کو ایک نظر سے دیکھتے تھے۔ آپ سید جمال الدین افغانی کی طرح تمام فرقوں کو ایک ہی درخت کی شاخیں قرار دیتے تھے۔ آپ کو ایک نہ ایک دن احیائے اسلام کا یقینِ کامل تھا۔ آپ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے گہری وابستگی اور عقیدت تھی اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے مصائب و آلام کے بیان میں ایرانیوں کے ہم زبان تھے۔

ایران کے قومی شاعر جناب صادق سرمد مرحوم

ملک الشعراء بہار کے بعد آپ سبکِ خراسانی کے عظیم ترین شاعر تھے۔ سرکاری طور پر آپ کو ایران کا قومی شاعر قرار دیا جا چکا تھا۔ آپ کو ابتدا میں شاعرِ دربار کا درجہ بھی حاصل تھا اور شاہِ ایران کے ہمراہ آپ نے ۱۹۵۰ء میں پاکستان کا دورہ بھی کیا تھا۔ مگر ۱۹۵۳ء میں جب آپ نے شاہ کے خلاف انقلابی تحریک میں پوری جرأت کے ساتھ جب جناب مصدق کا ساتھ دیا تو آپ شاہی حکومت کے زیرِ عتاب آ گئے اور آپ کی جملہ مراعات آپ سے چھن گئیں۔ اب آپ شاہ کو چھوڑ کر اقبال کے قصیدہ گو بن گئے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اعلائے کلمۃ الحق کرتے ہوئے اقبال کے رنگ میں پوری طرح رنگے گئے۔ شعر و سخن اور عملی جدوجہد میں آپ علامہ اقبال کے ترجمان بن گئے۔ آپ نے جناب ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی مرحوم کی دعوت پر پاکستان کا خصوصی دورہ کیا اور کراچی' لاہور' پشاور اور ڈھاکہ میں قیام فرمایا۔ آپ کے کلام کا کم از کم ایک تہائی حصہ علامہ اقبال اور پاکستان کی توصیف و تحلیل میں ہے۔ آپ ۱۹۵۹ء میں وفات پا گئے مگر آپ نے اپنی زندگی کے آخری دس برس علامہ اقبال کے افکار کی اشاعت و ترویج کی مساعی میں

وقف کر دیے۔ ڈاکٹر عرفانی مرحوم نے آپ کی زندگی اور شاعری پر ''سرودِ سرمد'' کے نام سے ایک ضخیم کتاب تحریر فرمائی تھی۔ ہر اعتبار سے ایران کی موجودہ تاریخ میں جناب سرمد کو اقبال کا سب سے بڑا مداح اور مبلغ سمجھا جا سکتا ہے۔ آپ کی بے چین روح کسی اسلامی انقلاب کی منتظر تھی اور شاہ کے دربار میں وابستگی کے دوران بھی آپ شاہ کو ملتِ ایران کے انحطاط اور اخلاقی و سماجی مسائل کی بابت خبردار کرتے رہتے تھے اور کبھی کبھی آپ کے شعروں سے بغاوت کی بو آتی تھی۔ یہ سب کا سب علامہ اقبال کی شاعری کے مطالعہ کا اثر تھا۔ ملاحظہ ہو کہ شاہ سے خطاب کرتے ہوئے ایک قصیدے ''کاخِ فساد'' میں فرماتے ہیں:۔

اے کاش غم و بلا فزون گردد   تا کاخِ فساد واژگون گردد
(اے کاش غم اور مصیبتیں حد تک بڑھ جائیں تا کہ فساد کا محل زمین بوس ہو جائے۔)

این بامِ شکستہ پئے کہ ما داریم   بے سایہ و سقف و بے ستون گردد
(ہمارے سر پر جو ٹوٹی پھوٹی چھت ہے میری دعا ہے کہ یہ گر جائے، نہ کوئی چھت بچے نہ ستون اور اس کا منحوس سایہ ہمارے سروں پر نہ رہے۔)

اے زارعِ تیرہ روزِ کم روزی   تا چند نشستہ ای کہ چون گردد؟
(اے غریب اور مفلوک الحال مزارع! کب تک بیٹھ کر یہ سوچتا رہے گا کہ تیرے دن پھر جائیں گے؟)

تو قلبِ زمین بہ پنجہ بشگافی   تا نعمت خواجہ گوناگون گردد
(تو زمین کو اپنے پنجوں سے کھودتا رہتا ہے تا کہ جاگیرداروں کی نعمتوں میں اضافہ ہو جائے۔)

خونِ ظالم چرا نمی ریزی؟   تا زرد رخِ تو لالہ گون گردد
(تو ظالموں کا خون کیوں نہیں بہا دیتا تا کہ تیرا زرد چہرہ لالے کے پھول کی طرح سرخ ہو جائے؟)

این بے خردی کہ عقل می خوانی   اے کاش بدل بہ یک جنون گردد
(جس حماقت کو تو نے عقل سمجھ رکھا ہے خدا کرے کہ وہ جنون میں تبدیل

ہو جائے۔)

انہی ایام میں محمد رضا شاہ پہلوی نے برطانیہ کا شاندار سرکاری دورہ کیا اور شاہ کی واپسی پر بطورِ شاعر دربار آپ کو شاہ کے خیر مقدم کے لیے قصیدہ کہنا پڑا۔ آپ کا قصیدہ ہے تو ایک پند نامہ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس میں ایک ممکنہ اسلامی انقلاب کی جانب اشارے اور 'مروّجہ استبدادی نظام' کے بارے میں اظہارِ مایوسی ہے۔ یہ اعلائے کلمۃ الحق جو انتہائی نامساعد اور خوفناک حالات میں دربار میں برسرِ عام کیا جائے' سنتِ موسوی کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

شہریارا! فاش گویم ہیچ و ہرگز ملتے کاب ساید بے ہدف چون مابہ ہاون دیدہ ای

(اے بادشاہ! میں صاف بتا رہا ہوں اور پوچھتا ہوں کہ کبھی کسی نے ہماری قوم کی طرح کوئی بھی قوم دیکھی ہے جو بے مقصد ہاون میں پانی ڈال کر اسے گھوٹتی رہے؟)

ما گرفتارِ غروریم و اسیرِ مکر و فن الحذر از ہرچہ مکر و حیلہ و فن دیدہ ای

(ہم جھوٹے غرور میں مبتلا ہیں اور فراڈ اور نوسربازی کا شکار ہیں۔ خدا آپ کو اس مکر' حیلہ اور فراڈ سے جو تم نے اپنے اردگرد دیکھا ہے' محفوظ رکھے۔)

شست باید نقشِ زشتی ہا ز روئے اجتماع تا نہ بینی آنچہ نتوان دید لیکن دیدہ ای

(سوسائٹی اور معاشرے کے چہرے سے بدصورتی کے داغ دھو دینے چاہئیں تاکہ وہ چیزیں جو نظر نہیں آنی چاہئیں' لیکن تو نے ان کو پھر بھی دیکھا ہے' اے کاش کہ ان کو مستقبل میں تو پھر کبھی نہ دیکھ سکے!)

سوسنِ آزادخواہی سروِ آزادی نشان تا بروید آنچہ بہ از سرو و سوسن دیدہ ای

(اگر آزادی کے پھولوں کی خوشبو سے غرض ہو تو تمہیں چاہیے کہ آزادی کے سرو اُگانے کی کوشش کرتا کہ جو کچھ تو نے برطانیہ میں سرو اور سوسن دیکھے ہیں وہ یہاں بھی ظاہر ہو سکیں۔) ظلم و استبداد کی کوکھ سے آزادی جنم نہیں لیتی۔

در حسابِ زندگی بر سفرۂ شاہ و گدا قسمتِ ہر کس بمقدار معین دیدہ ای

لالچ اور لوٹ کھسوٹ کا کیا فائدہ؟ (تو نے زندگی کے حساب کتاب کے اعتبار سے ہر شاہ و گدا کا رزق تو اس کے دسترخوان پر اپنی قسمت کے مطابق پہنچتا ہوا دیکھ ہی لیا ہے۔)

آپ کے انقلابی خیالات جب علامہ اقبال کے شعر وفکر کے اسلوب میں ڈھل گئے تو آپ نے شاہ کا تختہ الٹنے پر جناب محمد مصدق کو مبارک باد کا تار دے دیا اور شاہ کے تخت وتاج چھوڑ کر بھاگ جانے پر اپنی دلی خوشی کا اظہار کیا۔ اس واقعے کے بعد تو آپ کا عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا۔ سرکاری رتبہ اور مقام چھن گیا اور آپ پر عسرت وتنگ دستی اور پابندیاں طاری کر دی گئیں۔ ان حالات میں آپ علامہ اقبال کے پیروکار ہو کر رہ گئے۔ لیکن شاہ سے وابستگی کے ایام میں بھی آپ کے ایسے قصائد اور نظمیں دستیاب ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے بہت عرصہ پہلے سے ہی علامہ اقبال کا دقیق انداز میں مطالعہ کیا ہوا تھا۔ اپریل ۱۹۵۰ء میں آپ نے جو اوّلین قصیدہ حضرت علامہ اقبال کی شان میں لکھا اس کے چیدہ چیدہ اشعار کچھ یوں ہیں:

اگر چہ مرد بمیرد بگردشِ مہ و سال ‏ ‏ نمردہ است و نمیرد محمد اقبال

(اگر چہ انسان وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ ایک دن اس دنیا سے چلا جاتا ہے، لیکن علامہ اقبال نہ تو مرے ہیں اور نہ ہی کبھی مریں گے۔)

حیاتِ صورتش ار طے شدہ است طے نشود ‏ ‏ حیاتِ سیرتش ار طے شود ہزاران سال

(ہر چند آپ کی طبعی زندگی ختم ہو چکی ہے لیکن آپ کی فکری زندگی ختم نہیں ہوگی، اگر ہوئی بھی تو ہزاروں سالوں بعد۔)

درود باد بہ لاہور و خطۂ پنجاب ‏ ‏ کہ زاد و پرورد این شاعرِ خجستہ خصال

(شہر لاہور اور خطۂ پنجاب پہ خدا کی ہزاروں رحمتیں ہوں، جہاں یہ عظیم اور عالی فطرت شاعر پیدا ہوا اور پلا بڑھا۔)

چراغِ لالہ شدو آن قدر بصحرا سوخت ‏ ‏ کہ شمعِ محفلِ اقبال گشت و روشن حال

''آپ لالے کا چراغ بن کر صحرا میں اس قدر جلے کہ وہ گلِ لالہ ایک روشن شمع بن گیا جس کے ارد گرد پروانوں نے جمع ہو کر محفل اقبال سجالی۔)

زمامِ ناقۂ اسلام زی قطار کشید ‏ ‏ اگر چہ دستِ طبیعت بدو نداد مجال

(آپ کے ایک مشہور شعر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ (وہ عالم اسلام کی گم شدہ اونٹنی کو مہار سے پکڑ کر قطار میں لے آیا، لیکن آپ کو اپنی وفات کے بعد

کے حالات کا مشاہدہ کرنے کی فرصت نہ مل سکی۔)

قیامِ مردِ خدا کم تر از قیامت نیست ۔۔۔ کہ بعثِ ملّت و دولت کند باستعجال

(آپ جیسے مردِ خدا کا قیام قیامت سے کم نہیں ہے، کیونکہ آپ کے قیام نے قوم و ملت کو ایک دم سے نئی زندگی دی اور تھوڑے ہی عرصہ میں ایک ملک قائم ہوگیا۔)

سخن سرائے اقبال بذرِ دین فشاند ۔۔۔ برغمِ دشمنِ بے دین و کافرِ قتّال

(کافر اور بے دین دشمن کی مخالفت کے باوجود آپ کی شاعری نے دین کے بیج بودیے۔)

رسول وار بہ تبلیغِ حق کتاب نوشت ۔۔۔ کہ قدرِ حق بشناسد منافقِ محتال

(آپ نے پیغمبروں کی طرح حق کی تبلیغ کی اور کتابیں لکھیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایسے عظیم شخص کی قدردانی کوئی حیلہ جو منافق کر سکے۔)

انھی دنوں شاہِ ایران کے ہمراہ آپ کو مشرقی اور مغربی پاکستان کا دورہ کرنے کا موقع فراہم ہوا۔ آپ نے لاہور کے زندہ دل عوام کو شالیمار باغ میں اپنی مشہور نظم سنائی جس میں اپنا ایک انقلابی پیغام دیا، جو علامہ اقبال کے جواب میں پہلا پیغام تھا جو براہِ راست، بزبانِ شاعرِ ایران سے لاہور پہنچا اور ایران نے ہمارے ساتھ بروقت مکمل فکری یک جہتی کا زندہ ثبوت فراہم کیا۔ یہ اشعار ۱۹۵۰ء میں کہے گئے۔ اسی پس منظر میں ملاحظہ کیجیے:

اے مسلمانانِ پنجابی زہے اقبالتان ۔۔۔ کز دمِ اقبالتان مقبول شد آمالتان

(اے پنجاب کے مسلمانو! آپ کا اقبال کتنا عظیم تھا جس کے افکار نے آپ کے لیے ایک راہ متعین کی اور آپ کی آزادی کے حصول کی آرزو پوری ہوگئی۔)

نغمۂ اقبالتان سوئے قطار آورد باز ۔۔۔ اے مسلمانانِ پنجابی زہے اقبالتان

(آپ کے اقبال کے نغمہ نے آپ کے منتشر کاروان کو متحد اور منظم کیا۔ اے پنجاب کے مسلمانو! آپ کا اقبال کس قدر عظیم تھا۔)

گر چراغِ لالۂ صحرائی اقبال نبود ۔۔۔ شمعِ آن محفل نمی شد روشنئ حالتان

(آپ کے اقبال کا لالۂ صحرا نہ ہوتا تو آج کے دلوں کی روشنی ایک شمع بن کر یہ

محفل اپنے گرد سجا نہ سکتی۔)

فکرِ خود کردید و اسرارِ خودی آموختید　　لاجرم بے خودی شد نزدِ خدا اعمالتان

(تم نے اپنی فکر کی اور جدوجہدِ آزادی کے دوران خودی کے راز جان لیے۔
بے شک خداوندِ قدوس کے ہاں آپ کی کوششیں بارآور ثابت ہوگئیں۔)

صادق سرمد نے اس کے بعد ایران میں علامہ اقبال کی شان میں جو قصائد کہے ان میں سے ''مشتے از خروار'' کے مصداق چند ایک قصائد کے چند منتخب اشعار پر اکتفا کرتے ہوئے ہم قارئین کو یہ یاد دلانا چاہیں گے کہ علامہ اقبال کے افکار کی روشنی میں کس طرح اُمتِ محمدیہ میں اسلامی نظریات کے فروغ کے لیے مخلصانہ کوششوں کا آغاز ہو گیا تھا۔ شعراء حضرات چونکہ کسی قوم کے ''دیدۂ بینا'' ہوتے ہیں اس لیے وہ قوم کے درد و آلام کا احساس کرتے ہوئے جو کچھ کہتے ہیں وہ عوام کے مافی الضمیر کا ترجمان ہوتا ہے۔ سرمد کا قصیدہ ''ایامِ بزرگ'' بھی انہی حقائق کا آئینہ دار ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اقوامِ بزرگ اند بہ افکارِ بزرگان　　وین سنّتِ دیرینۂ اقوامِ بزرگ است

(قوموں کی عظمت کا راز اس کے زعماء کے افکار میں پنہاں ہوتا ہے اور یہ عظیم
اقوام کی قدیم روایت رہی ہے۔)

اقبال کہ پیغمبر پیغمبرِ حق بود　　در حضرتِ حق صاحبِ انعامِ بزرگ است

(چونکہ اقبال اللہ کے رسول کا پیغام پہنچا رہے تھے اس لیے وہ خدا کے دربار میں
عظیم نعمتوں سے نوازے گئے ہیں۔)

احرام چہ بندی بر اہرام؟ چو اقبال　　رُو سوے حرم کن کہ بہ احرامِ بزرگ است

(قدیم ادوار کے کھنڈرات مثلاً اہرام مصر کے لیے احرام کیوں باندھ رہے
ہو؟ اقبال کی طرح حرمِ کعبہ کی جانب رخ کرو' کیونکہ اس کا مقام اور حرمت
بہت بلند ہے۔)

یہ دراصل علامہ اقبال کے اس شعر کی طرف اشارہ ہے جس میں آپ فرماتے ہیں:

زمانہ کہنہ بتان را ہزار بار آراست　　من از حرم نگذشتم کہ پختہ بنیاد است

(زمانے نے پرانے بتوں یعنی رنگ و نسل اور تاریخ کے اصنام کو بار بار سجایا۔ میں

حرم سے وابستہ رہا کیونکہ اس کی بنیادیں بہت مضبوط ہیں۔)

اقبال بزرگ است کہ در عالمِ توحید　　از بت شکنی دشمن اصنامِ بزرگ است

(علامہ اقبال کی عظمت کی وجہ یہ ہے کہ آپ توحید کے جہاں میں بڑے بڑے بتوں کو توڑ کر بت شکنی کا شرف حاصل کر چکے ہیں۔)

اقبال بزرگ است کہ بر گردنِ اسلام　　از خدمتِ بے منتِ وے وامِ بزرگ است

(اقبال کی عظمت اس وجہ سے بھی ہے کہ آپ نے اسلام کی بے پناہ خدمت کر کے ملتِ اسلامیہ کے عظیم محسن کا شرف حاصل کیا ہے۔)

اس کے بعد جناب صادق سرمد نے کئی ایک قصائد لکھے جن میں قصیدہ ''دانائے راز'' ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اس میں انہوں نے منہ زور شہنشاہوں اور آمروں کا ذکر کرتے ہوئے مستقبل قریب میں ایک انقلاب کی آمد کی جانب اشارہ کیا ہے جو اسلام کی دعوتِ حق کے باعث رونما ہوگا اور جس کی اساس علامہ اقبال کے افکار پر ہو گی۔ منتخب اشعار حاضرِ خدمت ہیں:

ہزار طالبِ شہرت بہ فکرِ شیطانی　　فریفت جامعہ و فتنہ در سیاست کرد

(ہزاروں شہرت کے بھوکے لوگوں نے اپنی شیطانی سوچوں کے ذریعے عوام کو اُلّو بنایا اور سیاست میں آ کر فتنہ وفساد کا باعث بنے۔)

ہزار حاکمِ مطلق بدین گمان کہ توان　　بخلق روے زمین تا ابد حکومت کرد

(ہزاروں آمروں اور مطلق العنان حکمرانوں کو یہ غلط فہمی ہوگئی کہ اس جہان میں وہ ہمیشہ کے لیے حکومت کرتے رہیں گے۔)

نشست در پسِ دیوارِ آہنی بغرور　　بدین گمان کہ مسخر جہان ز قدرت کرد

(یہ لوگ آہنی پردوں کے پیچھے اپنے غرور اور تکبر میں مست ہو کر تصور کرتے رہے کہ وہ اپنی قوت کے بل بوتے پر دنیا کو فتح کر لیں گے۔)

عجب کہ چوں بسر آمد حیاتِ صورتشاں　　کسے نبود تو گوئی کہ با تو صحبت کرد

(یہ باعث حیرت ہے کہ جب ان کو موت آ گئی تو کوئی بھی شخص ایسا نہ ملا جس نے ان لوگوں کا ذکر تک کرنے کی ضرورت محسوس کی ہو۔)

حیاتشان ہمہ نقش بر آب شد چو حباب — کہ چون حباب شکست آنکہ نقشِ صورت کرد؟

(ان کی زندگی سب کی سب بلبلے کی طرح نقش بر آب ثابت ہوئی۔ جونہی وہ بلبلہ ٹوٹا تو پھر ان کا نام ونشان تک مٹ گیا۔)

ولیک مردِ خدا را خدائے مرگ نداد — مگر کہ قالبِ صورت بدل بسیرت کرد

(لیکن خدا نے اپنے بندوں پر موت طاری نہ کی۔ صرف اتنا ہوا کہ جونہی ان کی جسمانی زندگی ختم ہوئی ان کی سیرت یعنی اعمال کی زندگی شروع ہوگئی۔)

حیاتِ مردِ خدا حیاتِ ملتہاست — کہ مردِ حق سروجان درحیاتِ ملّت کرد

(خدا کے بندے کی زندگی درحقیقت قوموں کی زندگی ہے' کیونکہ خدا کے بندوں نے اپنی زندگی قوموں کی زندگی کے لیے وقف کردی۔)

درود باد بر اقبال و معجز سخنش — کہ معجز سخنش عالمے بحیرت کرد

(خدا کی رحمتیں علامہ اقبال اوران کے شاعرانہ کمال پر ہوں کہ ان کے شعر کے اعجاز نے پوری دنیا کو حیرت میں ڈال دیا۔)

دم زخودی زد و بیگانہ راند از سر خویش — بلے بخود درسد آن کوزحق اطاعت کرد

(انہوں نے خودی کا دم بھرا اور بیگانوں یعنی کفار کو دھتکار دیا۔ ہاں ہاں وہ شخص جو خدا کی اطاعت کرے وہ اپنے حقائق تک پہنچ جائے گا۔)

درود باد بامروز و صاحبِ امروز — کہ روزگار بنامش صحیفہ زینت کرد

(خدا کی رحمتیں علامہ اقبال پر ہوں اور آپ کی حق طلب جان پر۔ انہوں نے جو کچھ بھی کیا وہ حق اور سچائی کی خاطر کیا۔)

ایک بار پھر آپ ۱۹۵۵ء میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر پاکستان تشریف لائے اور لاہور پہنچ کر علامہ اقبال کے مزار پر حاضری دی۔ اب جس وفورِ جذبات سے علامہ اقبال کی قبر پر بیٹھ کر جناب سرمد نے اپنا خراج عقیدت پوری رقتِ قلبی سے پیش کیا وہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ شاعر جو کبھی بادشاہوں کے دربار میں قصیدے پڑھتا تھا' آج وہ ایک فقیر کی قبر پر بلا طمع وہوس اپنے دلی جذبات قصیدے کی صورت میں پیش کر رہا تھا۔ اس قصیدے کے ایک ایک شعر میں علامہ کے کلام کے مختلف اشعار اور پہلوؤں کی

طرف نازک اشارے پائے جاتے ہیں۔

توبہ سیرت زندہ ای کاندر حیاتِ اجتماع ملتے را زندہ کرد اندیشہ و آمالِ تو

(تیری سیرت قوم وملت کی روح کے طور پر زندہ رہے گی' کیونکہ تیری سوچوں اور آرزوؤں نے قوم کو زندگی عطا کی ہے۔)

نقشِ فطرت خواند فکرت از ضمیرِ کائنات مرحبا بر فطرت و بر فکرتِ جوالِ تو

(تیری سوچوں نے ضمیر کائنات میں چھپے ہوئے فطرت کے نقوش بھی پڑھ لیے ہیں۔آپ کی فطرت اور آپ کی شعلہ بار سوچوں پر آفرین ہو۔)

چون بہ تبلیغِ حقائق رہبرِ اُمت شدی تُو بہ پیش اُمت و اُمت شد از دنبالِ تو

(حقائق کی تبلیغ کرتے کرتے آپ اُمتِ محمدیؐ کے رہبر بن گئے۔اب فکری اعتبار سے آپ اُمت کی رہنمائی کرنے لگے اور اُمت بھی آپ کے پیچھے لگ گئی۔)

دولتِ اسلامیان را باز آوردی بہند در حقیقت نازم کہ طے شدہ بازئ دجال تو

(برصغیر پاک وہند میں ایک بار پھر آپ نے حکومت اسلامی کی بنیاد رکھ دی۔اس احیاءِ اسلام پر ہمیں فخر ہے کہ آپ کے دشمن دجال کی چالیں مات ہو گئیں۔)

زندگئ پیشوایان زندگئ اُمت است آفرین ہا بر تو و بر اُمتِ فعالِ تو

(پیشواؤں کی زندگی درحقیقت قوم کی زندگی ہے۔ ہزار آفریں ہو آپ پر اور آپ کی متحرک وفعال قوم پر۔)

اس کے علاوہ آپ نے تحریک پاکستان میں علامہ اقبال اور قائداعظم محمد علی جناح کے کردار کا ذکر کرتے ہوئے اقبال کی فکری اساس کا کس خوبصورت انداز میں اپنی ایک اور نظم میں ذکر فرمایا: ؎

اقبال کشت بذر و جناحش فشاند آب اقبال کشت تخم و جناحش ثمر گرفت

قائد فراشت پرچمِ اقبال تا ابد کز بہرِ خلق پرچمِ فتح و ظفر گرفت

(علامہ اقبال نے کھیتی بوئی اور جناح نے اسے پانی دیا۔اقبال نے بیج بویا اور جناح نے اس کا ثمر حاصل کیا۔قائد نے قیامت تک کے لیے اقبال کے اس

پرچم کو بلند کر دیا جو عوام کے لیے فتح وظفر کی دلیل اور نشان ہے۔)

علاوہ بریں لاہور کے بارے میں آپ کی بے شمار منظومات چھپ چکی تھیں۔ پھر پشاور اور ڈھاکہ کا ذکر آپ کے لاتعداد اشعار میں ملتا ہے۔ فروری ۱۹۵۱ء میں آپ نے کشمیر کی تحریک آزادی کے بارے میں بھی ایک طویل قصیدہ کہا جس کے چند اشعار کا یہاں بیان کرنا برمحل ہوگا:

فریاد کہ از کشمکشِ کشورِ کشمیر — بسیار مسلمان بگذشت از دمِ شمشیر

(آہ کشمیر کی کشمکش میں کتنے مسلمان تھے جو اب تک اسلحے کا نشانہ بن چکے ہیں۔)

بس شہر کہ غارت شد و بس خانہ کہ ویران — ویرانہ تر از آنکہ بود قابلِ تعمیر

(کتنے شہر تھے کہ غارت ہو گئے اور اس قدر ویران ہو گئے کہ ان کی عمارات قابلِ تعمیر بھی نہ رہیں۔)

مغرور مشو اے کہ بہ تقدیر سیاست — تزویر کنی با حق در قالبِ تدبیر

(مغرور مت ہو کہ سیاسی چالیں چل کر آپ حق کو نہیں دبا سکیں گے اور کوئی بھی تدبیر کارگر نہیں ہوگی۔)

تقدیرِ الٰہی را بازیچہ مگیرید — تقدیرِ الٰہی حق و حق است جہانگیر

(خدا کی تقدیر کو کھیل تماشا مت سمجھو۔ تقدیرِ الٰہی حق ہے اور بالآخر حق ہی دنیا میں چھا جاتا ہے۔)

کشمیر بود حق مسلمان و مسلمان — گیرد حق خود، نشود زود شود دیر

(کشمیر پر مسلمانوں کا حق ہے اور مسلمان اپنا حق لے ہی لیتے ہیں، اگر جلدی نہ ہو سکے پھر دیر سے ہی سہی۔)

شورائے ملل گر طلبد صلح جہانے — گو حکم بحق کن نہ بہ تعبیر بہ تفسیر

(اگر اقوام متحدہ دنیا میں صلح و امن کے لیے قرارداد پاس کرتی ہے تو حق بات کرے، اس کی تعبیروں اور تفسیروں میں مت الجھ جائے۔)

امروز اگر ملتِ کشمیر اسیر است — فرداست کہ درہم گسلد رشتۂ زنجیر

(آج اگر کشمیر کی قوم غلام ہے تو کل تو زنجیر کی کڑیاں ٹوٹ کے رہیں گی۔)

امروز اگر نالۂ کشمیر ضعیف است فرداست کہ غوغا فگند نعرۂ تکبیر

(آج اگر کشمیریوں کے آہ و نالہ میں اثر نہیں تو کل تو وہاں پر ضرور نعرۂ تکبیر کا غلغلہ بلند ہوگا۔)

اسی طرح ۱۹۵۳ء میں پاکستانی محققین اور دانشوروں کا وفد جناب مولوی محمد شفیع مرحوم کی قیادت میں ایران پہنچا تو ان کے خیر مقدم کے لیے ایرانی ادیبوں' دانشوروں اور شاعروں نے کئی محفلیں منعقد کیں۔ اس موقع پر جناب صادق سرمد کا قصیدہ پاکستان اور ایران کے دینی' لسانی اور ثقافتی رشتوں کی نشاندہی کرتا ہے۔

کاروانِ علم وایمان شدز پاکستان بہ ایران خیر مقدم' مرحبا' بر کاروانِ علم وایمان

(علم اور ایمان کا کارواں پاکستان سے ایران آیا ہے۔ ہم اس کا خیر مقدم کرتے ہیں اور اس علم و ایمان کے کاروان کو خوش آمدید کہتے ہیں۔)

گر بتاریخ کہن بینی' کہن بینی روابط ہمچنان از عہدِ کورش' ہمچنان از بعدِ ساسان

(اگر قدیم تاریخ کا مطالعہ کریں تو آپ کو کوروشِ اعظم کے دَور میں اور بعد میں ساسانیوں کے عہد میں دونوں قوموں کے مابین مضبوط روابط کا سراغ ملے گا۔)

چون ز ایران رو بہ ہند آورد آئینِ الٰہی فیضِ آئینِ محمدؐ شد شفیع کارہاں

(جب ایران کے راستے اسلام کا آئینِ الٰہی ہندوستان میں داخل ہوا تو آئینِ محمدیؐ کے فیض سے پاک لوگوں یعنی اہلِ پاکستان کی شفاعت کا سامان ہونے لگا۔)

چون شداندر قلبِ پاکاں بذرِ ایمان ریشہ افگن بردمید از خاکِ مردہ باغِ رضوان' آبِ حیواں

(جب پاک لوگوں کے سینوں میں ایمان کا بیج پھلنے پھولنے لگا تو ہندوستان کی مردہ سرزمین میں اسلامی ملت کا باغِ رضوان اور آبِ حیات کا چشمہ اُبلنے لگ گیا۔)

چون ہلالِ پرچمِ اقبالِ پاکستان برآمد درصلیب افتادہ لرزہ' یارِ ترسا گشت ترسان

(جب علامہ اقبال کی خوابوں کی تعبیر کے طور پر پاکستان کے پرچم کا ہلال نمودار ہوا تو برطانیہ کے صلیبی علم پر لرزہ طاری ہوگیا اور عیسائیوں کے دوست لرزنے لگے۔)

اس کے بعد آپ نے ایران اور پاکستان کی محبت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

گر ملل را وحدتِ اوطان فزاید بر اخوت　　　وحدتِ اوطان کجا تا وحدتِ آمالِ اخوان

(ہم آپس میں بھائی ہیں اور بھائیوں کی آرزوئیں وطن کی محبت پر غالب آ سکتی ہیں اور قومیں اسلامی اخوت کے باعث ایک ہو سکتی ہیں۔)

ور ملل راز اختلافِ رنگ و شکل است اختلافی　　　وحدتِ دل ہاز داید اختلافِ شکل والوان

(اگر کبھی قوموں کی پہچان ان کے رنگ اور شکل وصورت کی وجہ سے ہو تو دلوں کی وحدت ایسے رنگ وصورت کے اختلافات کو ختم کر دیتی ہے۔)

لیک اگر سنت شود واحد بحکمِ وحدتِ دیں　　　وحدتِ ملّیت آید رہنمائے نوعِ انسان

(لیکن اگر دینی وحدت کے باعث سنت بھی ایک ہو جائے تو پھر ایسی وحدت جنم لیتی ہے جو بنی نوع انسان کی رہنما بن جاتی ہے۔)

وحدتِ ایران و پاکستان بحکمِ دین وسنت　　　وحدتِ عالم تواند شد ز روئے عقل و میزان

(پاکستان اور ایران کی وحدت کی بنیاد تو ہمارا مشترک دین وسنت ہے۔ دنیا کی وحدت شاید عقل وانصاف کی بنیاد پر قائم ہو سکے۔)

تا بداند دشمنِ بے دین کہ ما را دین چہ باشد　　　دینِ علم و دینِ عدل و دینِ عقل و دینِ برہان

(ہمارے بے دین دشمن کو پتا چلے کہ ہمارا دین کیا ہے۔ دین اسلام تو علم، عدل، عقل اور دلائل کا دین ہے۔)

مرحبا بر خاکِ پاکستان کہ از لوثِ مطامع　　　پاک شد چو کشورِ ایران بہ تعلیماتِ قرآن

(پاکستان کی سرزمین پر آفرین ہو جو ایران کی طرح قرآنِ پاک کی تعلیمات کے باعث لالچ کی گندگی سے پاک ہو گئی۔)

اَلَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا گواہی صادق آمد　　　ہر کہ بر حق زد قدم شد راہِ حق بروی نمایان

(یہ وہ لوگ ہیں جن پر قرآن پاک کی آیت کے مصداق کہ ''جن لوگوں نے ہمارے لیے جہاد کیا'' گواہی صادق آتی ہے۔ جو لوگ حق کی راہ پر چل پڑے پھر راہِ حق کے آثار ان پر واضح ہونے لگے۔)

برتر از دینِ مسلمانی نہ بینی ہیچ دینے　　　کاندر او حریت و عدل و اخوت ہست بنیان

(آپ کو دینِ اسلام سے بہتر کوئی دین نہیں ملے گا جس کی بنیاد ہی آزادی، انصاف اور اخوت پر قائم ہے۔)

یادِ ایا مے کہ من مہمانِ لاہورِ تو بودم　　شعرہا خواندم بہ تحسین و بہ تجلیلِ فراوان

(ان دنوں کی یاد میں جب میں تیرے لاہور شہر کا مہمان تھا اور تحسین و تجلیل میں شعر اور قصیدے کہہ رہا تھا۔)

میز بان از میہمان بشناختن آسان نباشد　　چون مسلمانے درآید بر سرِ خوانِ مسلمان

(جب کسی مسلمان کے دستر خوان پر کوئی مسلمان آن بیٹھے تو پھر مہمان اور میز بان کی شناخت مشکل ہو جاتی ہے۔)

اسی طرح آپ نے کئی خوبصورت اشعار صوفی تبسم، ڈھاکہ کے عندلیب شادانی اور فیض محمد، کراچی کے ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اور بے شمار دیگر زعماء کی ایران میں آمد کے موقع پر کہے۔ صادق سرمد ہی پہلے شخص ہیں جنہوں نے علامہ اقبال کو ''ملاّ'' کہا اور بعد میں علامہ اقبال ایران میں مولانا اقبال کہلائے۔ استاد عرفانی مرحوم کی علامہ اقبال کے بارے میں فارسی میں لکھی گئی اہم کتاب ''رومیٔ عصر'' کی اشاعت پر آپ نے کہا:

رومیٔ عصر نامِ زیبائی است　　کہ چو رومی گزیدہ اقوال است

(علامہ اقبال کے لیے رومیٔ عصر کا خطاب بہت خوبصورت ہے، کیونکہ آپ کے اقوال بھی مولانا روم کی طرح منتخب اور بے نظیر ہیں۔)

گرچہ ملاّی روم یکتا بود　　یک تنہ یک ہزار ملاّ بود

(ہر چند کہ مولانا روم یکتائے روزگار تھے، وہ آدمی تو ایک ہی تھے لیکن ایک ہزار مُلاّ یعنی علماء کے برابر تھے۔)

لیکن اقبال شد ز پیرویٔ اش　　یکے از پیروانِ معنوی اش

(لیکن علامہ اقبال ان کی پیروی میں ان کے روحانی مرید بن گئے۔)

رفت دنبالِ پیر و مُلاّ شد　　آگہ از رازِ پیر و برنا شد

(آپ اپنے پیر کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے خود بھی ملاّ بن گئے اور ہر بوڑھے اور جوان کے راز دان بن گئے۔)

افسوس کا امر ہے کہ جب صادق سرمد ۱۹۵۹ء میں خدا کو پیارے ہو گئے تو پاکستان میں ان کی یاد میں کسی بھی اخبار میں کوئی بھی خبر نہ چھپ سکی۔ ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم اس

عظیم اقبال شناس اور ملّتِ پاکستان کے ہمدردِ صحیح مسلمان ایرانی شاعر کے نام کو یاد رکھیں اور آپ کے لیے کم از کم دعائے مغفرت تو کریں۔ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلَہٗ وَارْحَمْہُ

احمد سروش (درویش اقبال مست)

ایک زمانے تک آپ ریڈیو تہران سے وابستہ تھے۔ مئی ۱۹۴۹ء میں جناب ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید عرفانی کے توسط سے علامہ اقبال کے کلام سے متعارف ہوئے۔ پھر آپ نے اپنی ایک کتاب ''آئینہ حقیقت'' میں کلامِ اقبال سے متاثر ہو کر اس کی روشنی میں مستقبل میں ایران، افغانستان اور پاکستان کے ممکنہ اتحاد کا خاکہ پیش کرتے ہوئے اسے مسلمانانِ عالم کی منزل یعنی اتحادِ عالمِ اسلامی کا پیش خیمہ قرار دیا۔ اس کتاب کی ایک جلد آپ نے صدرِ پاکستان کو بھی بھجوائی۔ آپ نے جلد ہی وفورِ عقیدت میں علامہ اقبال کو مولانا اقبال کہنا شروع کر دیا، بلکہ اکثر اوقات تو مولانا یا مولا کہہ کر علامہ اقبال کا ذکر کیا کرتے۔ پاکستان میں کلامِ اقبال کو فارسی زبان میں ایک ہی جلد میں یکجا کر کے طباعت کا کام ایران میں سب سے پہلے احمد سروش نے ہی سرانجام دیا اور قریباً پچاس صفحات پر مشتمل اس کا مقدمہ فارسی زبان میں خوبصورت علمی اور ادبی پیرائے میں لکھا اور اس میں اس بات کا اقرار کیا کہ ''کلامِ اقبال کے مطالعہ سے میرے اور اقبال کے مابین ایک روحانی رابطہ قائم ہو گیا ہے، اس نے مجھے روحانی اور جسمانی قوت عطا کی ہے۔'' اُس وقت تک پاکستان میں کلامِ اقبال بھی کلیات کی صورت میں نہیں چھپا تھا۔

صدرِ پاکستان محمد ایوب خان کے تہران کے دورے کے موقع پر سروش نے کلیاتِ اقبال کی اپنی مرتب کردہ جلد اپنے ہاتھوں سے صدرِ مملکت کو پیش کی اور صدر نے سروش کو پاکستان آنے کی دعوت دی۔ ایک سرکاری خط کے ذریعے سفارت خانہ پاکستان نے بھی سروش کے نام پاکستان کے سرکاری دورے کا دعوت نامہ ارسال کیا اور ان کا نام اس ایرانی وفد میں شامل کر لیا گیا جسے سرکاری دعوت پر پاکستان کا دَورہ کرنا تھا۔ سروش لاہور اور مرقد اقبال دیکھنے کے لیے بے تاب تھے کہ ایک دن انہیں سفارت خانے کی جانب سے ایک خط موصول ہوا، جس کے مطابق نامعلوم وجوہات کی بنا پر ان کا نام اس وفد کی

فہرست سے ایک دم خارج کر دیا گیا تھا، جس کا انہیں شدید صدمہ ہوا۔ بعد میں آپ نے کئی بار اس ضمن میں اپنے شدید دکھ کا اظہار بھی کیا۔ چونکہ سروش ان دنوں پاکستان اور اقبال کے سب سے بڑے قدر دان کے طور پر ایران کے متوسط طبقے کے شعراء اور ادباء میں جانے اور پہچانے جاتے تھے اس لیے اس طبقہ میں اس وقت کی حکومتِ پاکستان کے خلاف غم وغصہ کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اپنے مستقل طور پر پاکستان منتقل ہو جانے کے بعد جون ۱۹۶۸ء میں جنابِ عرفانی تین ماہ کے لیے ایران تشریف لے گئے تو ان کی ملاقات احمد سروش سے بھی ہوئی۔ جنابِ عرفانی نے کلیاتِ اقبال پر ایک تقریظ مجلہ ہلال (فارسی) میں شائع کی تھی جو سروش تک نہیں پہنچا تھا۔ جب یہ آرٹیکل سروش کے سپرد کیا گیا تو احمد سروش کی آنکھوں میں ایک بار پھر وفورِ جذبات کے باعث ایک زبردست چمک پیدا ہوئی اور انہوں نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے گلوگیر آواز میں کہا:

> ''آقای عرفانی! اگر تم پاکستانی تھے تو تمہارے بعد میں نے کوئی پاکستانی نہیں دیکھا۔ اقبال کو تم نے مجھ جیسے درویش صفت غریب ایرانیوں سے متعارف کرایا تھا، اس وجہ سے ہم لوگ ابد تک آپ کے ممنونِ احسان رہیں گے۔ مولانا اقبال اب ہمارا مسلمہ ہیرو بن چکا ہے۔ اسلامی ہیرو، سیاسی ہیرو، نئی تعلیم یافتہ نسل کا انقلابی ہیرو۔ میرے لیے یہی عظیم صلہ کافی ہے کہ مجھے جہانِ اسلام کے اس مایہ ناز رہبر کے حیات بخش پیغام کی تبلیغ کا موقع میسر ہوا ہے۔''

احمد سروش نے کلیاتِ اقبال کے مقدمہ میں پہلی مرتبہ حواشی و آیات اور احادیث کا ترجمہ، اماکن اور اسامی کا اشاریہ (Index) اور علامہ اقبال کی زندگی کے متعلق تصاویر بھی شائع کی تھیں۔ آپ نے مقدمہ میں لکھا کہ ''ایک وقت تھا جب پڑھے لکھے روشن فکر ایرانی تقسیمِ ہند اور قیامِ پاکستان کے سخت مخالف تھے اور ہندو پراپیگنڈے کے باعث برصغیر کے مسلمانوں پر غداری کا الزام لگاتے تھے۔'' اقبال سے آشنائی کے بعد وہ لکھتے ہیں: ''اقبال کے افکار نہ صرف ہند کی بیداری اور آزادی میں مؤثر ثابت ہوئے تھے بلکہ تمام اقوامِ مشرق کی آزادی اور بیداری میں بھی ان کا گہرا اثر مرتب ہوا، جو اَب بھی موجود ہے اور مستقبل میں بھی موجود رہے گا۔''

آپ کا منظوم کلام ''درای خود فراموشان'' دراصل علامہ اقبال کی فارسی شاعری ہی کا تسلسل معلوم ہوتا ہے اور یہ مجموعۂ کلام اقبال کے کلام کی صحیح ایرانی بازگشت ہے۔ وہی تراکیب، وہی مضامین، وہی طرزِ بیان۔ کچھ نظمیں آزاد بھی ہیں اور کچھ مثنوی اور کچھ غزلیات کی صورت میں۔ علامہ اقبال کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے آپ لکھتے ہیں:

اَدِر کَاْسًا وناوِلھا الا یَا ایُّھا السَّاقی

(دیوانِ حافظ کا پہلا مصرعہ ہے۔ ساقیا! جام کو گردش میں لا اور آگے بڑھ کر پلا!)

کہ آتش ہا بجان دارم زِمہجوری ومشتاقی

(میری کم ظرفی اور عشق کے باعث میرے سینے میں آگ کے شعلے بھڑک رہے ہیں۔)

بلند آہنگ سازی کز، شکستن نیست پروایت

(علامہ اقبال کے ایک شعر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ع من نترسم از شکستِ عودِ خویش '' مجھے تو بلند آواز میں گانے پر مجبور کر رہا ہے اور تمہیں اپنے ساز کے ٹوٹنے کی پرواہ نہیں ہے''۔)

واز شوقِ نوا خود را بہ ہر مضراب می کوبی

(تو اپنے نغمات کو عام کرنے کے شوق میں ہر مضراب کی ضربیں کھا رہا ہے۔)

تو ای خورشیدِ مغرب دیدہ، وے مستِ مۓ صحرا

(تو وہ سورج ہے جس نے مغرب دیکھا ہے مگر پھر بھی صحرائے عرب کی شرابِ روحانی کے نشے سے سرشار ہے۔)

برہمن زادۂ دانا ہندوی آگاہ! کہ دانائے فسونِ عرب

(تو ایک ہندوستانی برہمن زادہ، دانائے حقیقت ہے اور مغرب کے فسون سے باخبر بھی۔)

و رازِ روم ورمز آگاہِ تبریزی

(تو روم کا راز دان ہے اور تبریز کے حالات سے بھی واقف ہے۔)

یہ دراصل علامہ اقبال کے اس شعر کی طرف اشارہ ہے:

مرا بنگر کہ در ہندوستان دیگر نمی بینی
برہمن زادۂ رمز آشنای روم و تبریز ست

(مجھے دیکھو، کہ ہندوستان میں کوئی اور نہ دیکھ سکو گے کہ برہمن زادہ ہو کر روم اور تبریز کا راز دان ہے۔)

وے دانی چسان باید نفس در سینہ بگدازی

(آپ کو معلوم ہے کہ کس طرح سینے میں سانس کو پگھلایا جاتا ہے۔)

بت خانہ با طرحِ حرم ریزی

(اور بت خانے میں تو حرم کی بنیاد رکھ رہا ہے۔)

سخن سربستہ کم تر گو حریفان را بیفگن، راز بر صحرا

(اشاروں میں باتیں نہ کر اور اپنے ساتھیوں کو صحرائے عرب کے راز اُگل دے۔)

اب ہم جنابِ عرفانی کی کتاب ''اقبالِ ایران'' میں شامل سروش کے اشعار پیش کریں گے۔ آپ ان چیدہ چیدہ اشعار کے مطالعے سے ایک بار پھر کلامِ اقبال کی وسعتوں میں پہنچ جائیں گے۔ سروش اقبال کے انداز میں مثنوی ''طرحِ نو'' میں کہتے ہیں: ؎

گفت با من ہمدلے محنت نصیب　　من غریبم، تو غریبی، او غریب

(مجھے ایک محنت کش دوست نے کہا: میں بھی غریب ہوں، تو بھی غریب ہے، وہ بھی غریب ہے۔)

تا نیاز آری نگونسارت کنند　　بہرِ نانے برسرِ دارت کنند

(اگر تو نیاز مندی کا اظہار کرے گا تو تجھے ذلیل کر دیں گے اور ایک روٹی کے لیے تختہ دار پر لٹکا دیں گے۔)

ذرّہ ساں صیاد ہر خورشید باش　　شائق آن گل کہ نتواں چید باش

(ذرے کی طرح ہر ایک سورج کا شکاری بن جا اور وہ پھول جو تجھ سے حاصل نہیں کیا جا سکتا، اس کا قدر دان بن جا۔)

ابتدا باید بخود محکم شوی　　وارثِ تاجِ بنی آدم شوی

(تجھے پہلے اپنے آپ کو مستحکم کرنا ہو گا، پھر تو بنی آدم کے تاج کا وارث بن جائے گا۔)

اسی طرح آپ کی مثنوی ''نائب حق'' بھی دلچسپ ہے۔ آپ فرماتے ہیں: ؎

نائبِ حقی ز کس پروا مکن　　این توئی منظورِ اِنّی جَاعِلٌ

(تو اس دنیا میں خدا کا نائب ہے اور تو ہی تو ''اِنّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً'' کا مصداق ہے۔)

گر بنفسِ خویشتن فرمان دہی　　قادری فرمان بہ ہر انسان دہی

(اگر تو اپنے نفس پر کنٹرول حاصل کر سکے تو پھر تو صاحب قدرت ہو جائے گا اور تیرا فرمان ہر انسان پر چلے گا۔)

زخمہ اے برتارِ جانِ خویش زن　　و آتشے بر عقلِ دور اندیش زن

(اپنی شاہ رگ کے تار پر زخمہ مار کر نغمہ چھیڑ اور اپنی دُور اندیش عقل کو آگ کی نذر کر دے۔)

اپنی مثنوی ''موسیٰ وخضر'' میں فرماتے ہیں:

از شریعت' قصدِ حق' خود پروری است　　خود گرائی' خود تراشی' خود گری است

(شریعت سے مراد اپنی ذات کی تکمیل ہے' یعنی اپنے آپ پر توجہ دینا' خود کو تراشنا اور اپنے آپ کو تعمیر کرنا۔)

اسی طرح آپ کی ایک مثنوی ''وحشتِ عالمی دیگر'' ہے' جس کا محرک بھی علامہ اقبال کا ایک شعر ہے: ؎

خبرے رفت زگردون بہ شبستانِ ازل　　حذر اے پردگیاں پردہ درے پیدا شد

(یعنی آسمان سے ازل کی رات (جنت میں) یہ خبر پہنچ گئی کہ اے پردہ دارو! یعنی اے حورانِ بہشت! ڈر جاؤ! پردہ اٹھانے والا پیدا ہو گیا ہے۔)

اس شعر سے متاثر ہو کر سروش لکھتے ہیں: ؎

وحشیؑ ہنگامہ گرؑ ہنگامہ زاد　　ناگہان در عالمے دیگر فتاد

(ہنگامے پیدا کرنے والا اور ہنگاموں میں پیدا ہونے والا وحشی اچانک دوسرے جہان میں جا پہنچا۔)

پردہ دارانِ ازلؑ مضطر شدند　　چارہ را نزدیکِ یک دیگر شدند

(ازل کے پردہ دار بے چین ہو گئے اور اپنے تحفظ کی خاطر ایک دوسرے کے قریب ہونے لگے۔)

کوفت این فرزند آدم کوسِ ما   کاے دریغا' پردۂ ناموسِ ما

(یہ فرزند آدم تمام مسافتیں طے کر آیا اور اے صد افسوس کہ ہماری عزت کا پردہ چاک ہو گیا۔)

دختران جاودان بکریم ما   ساکنانِ معبدِ ستریم ما

(ہم تو پردوں کی عبادت گاہ کے باسی ہیں اور ہم ہمیشہ زندہ رہنے والی باکرہ دوشیزائیں ہیں۔)

اس مثنوی میں آگے چل کر وہ پردہ داری کا راز علم کو قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح ''زیارت نامہ برائے آدم'' اقبال کی پیروی میں لکھی ہوئی دلکش مثنوی ہے' جس سے اختصار کے باعث ہم صرفِ نظر کر رہے ہیں۔ اسی طرح آپ نے اقبال کی مشہور غزل ''اے جوانانِ عجم'' کے جواب میں ایک طویل غزل کہی ہے' جس کے چند اشعار پیش خدمت ہیں:

ای جوانانِ وطن! جانِ من و جانِ شما   شہسوارے کشتہ می بینم بہ میدانِ شما

(اے میرے وطن کے جوانو! میری جان اور تمہاری جان ایک ہے۔ میں آج تمہارے میدان میں شہسواروں کو مرا ہوا پا رہا ہوں۔)

خانقاہ و مکتب و میخانہ و مسجد تہی است   اے دریغا! بر جوانمردی بدورانِ شما

(میں خانقاہوں' مکتبوں' مے خانوں اور مسجدوں کو خالی دیکھ رہا ہوں۔ آپ کے زمانے کے لوگوں کی جواں مردی پر صد افسوس ہے۔)

قصہ ہا گفتم شما را از نیاگانِ شما   تا چو کوہے' برخودیِ خویشتن قایم شوید

(اس لیے تمہارے اسلاف کی داستانیں تمہیں سنائی ہیں کہ اپنی خودی کے بل بوتے پر پہاڑوں کی طرح ڈٹ جاؤ۔)

تا کہ تقدیرِ شما' آید بفرمانِ شما   خواستم زان حق کہ تقدیراتِ اُو لامنتہاست

(چونکہ خداوند تعالیٰ کے ہاں لامنتہا تقدیریں ہیں' لہٰذا اس سے وہ تقدیر طلب کرو جو تمہاری اپنی مرضی کے مطابق ہو۔)

ایک غزل جو ''خوابِ پریشان'' کے نام سے ہے' یہ دراصل انقلابِ ایران کا پیام

ہے۔ یہ بھی علامہ اقبال کی پیروی میں لکھی گئی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

خواہم اے ایران زمین از نو جہانبانت کنم　　سرفرازِ عالمے از فرِّ یزدانت کنم

(اے ایران کی سرزمین! میری آرزو ہے کہ دنیا پر تیری حکومت پھر سے قائم ہو جائے اور خداوند تعالیٰ کی شان کے باعث تجھے جہان بھر میں معزز کردوں۔)

رقصِ خوں در ہر رگم شورِ جنون افگندہ است　　عیدِ قربان است و خواہم جان بقربانت کنم

(میرے خون کے رقص نے میری ہر رگ میں دیوانگی کا ہنگامہ پیدا کر دیا ہے۔ آج عید قربان کا دن ہے اور میری خواہش ہے کہ قربانی کے طور پر اپنی جان کا نذرانہ پیش کردوں۔)

دیدہ ام خوابے ولیکن می نیارم با تو گفت　　زانکہ می ترسم بدین دستان پریشانت کنم

(میں نے ایک ایسا خواب دیکھا ہے جو تجھ سے بیان نہیں کر سکتا، مجھے ڈر ہے کہ کہیں تم اس کے بیان کرنے سے پریشان نہ ہو جاؤ۔)

اسی طرح علامہ اقبال کی پیروی میں آپ نے دوبیتی یعنی رباعی کی رسم بھی پوری کی ہے اور اس کی بنیاد علامہ اقبال کے اس مصرع ع ''مصرعِ من قطرۂ خونِ من است'' (یعنی میرا مصرع میرا قطرۂ خون ہے!) پر رکھی ہے۔ ان میں علامہ اقبال کی طرح اسلام کی بنیادی تعلیمات کو پیش کیا ہے۔

قرآن ز برائے ہر مسلمان کافی است　　از بہرِ نجاتِ اہلِ ایمان کافی است
امرے نہ کہ این کتاب ناگفتہ گذاشت　　تنہا قرآن ترا بقران کافی است

(قرآن ہر مسلمان کے لیے کافی ہے، کیونکہ نجات کے لیے اہل ایمان کو اس کے علاوہ کیا چاہیے؟ کوئی ایسا حکم نہیں ہے جو قرآن میں موجود نہ ہو، اس لیے قرآن تیرے لیے ہمیشہ کے لیے کافی ہے۔)

قرآن کہ چراغِ روشن راہ است او　　روشن بہ چراغ کلمۃ اللہ است او
در ظلمتِ این شبانِ پُر بیم و ہراس　　روشن نگرِ راہ از چاہ است او

(قرآن ہی راستوں کو واضح کرنے والا ایک روشن چراغ ہے جس کی روشنی کا منبع کلمۃ اللہ ہے۔ ان پُرخطر اور خوفناک راتوں کے اندھیرے میں قرآن ہی

راستوں کو گہری کھائیوں سے ممتاز کرتا ہے۔)

قرآن کہ بہین کلام خوانند او را قولے است کہ خاص و عام خوانند او را
جز با دلِ پاک فہم آن نتوان کرد گو آنکہ "عَلَى الدَّوَام" خوانند او را

(ہر خواص و عام قرآن کو ایک کلام یا کتاب کی صورت میں پڑھ تو سکتا ہے، مگر اس کے معانی و مطالب صرف اس شخص کی سمجھ میں آ پاتے ہیں جس کا ضمیر روشن ہو اور دل صاف ہو اور پھر وہ اسے لگاتار پڑھتا رہے۔)

جانا! چہ کنم کہ آگہ از راز نئ ہشیار دل و بلند پرواز نئ
قرآن چو زمین رازِ خدا می داند یعنی کہ تو با خدا انباز نئ

(اے میرے عزیز! تجھے اصلی راز کا علم نہیں ہے، کیونکہ نہ تیرے دل میں سمجھ بوجھ ہے اور نہ ہی تو بلند پرواز ہے۔ قرآن چونکہ زمین کو خدا کی ملکیت قرار دیتا ہے اس لیے تو خود کو زمین کا مالک قرار دے کر خدا کا شریک بنتا پھرتا ہے جو غلط امر ہے۔)

خدایا ہر زمین ملکِ تو دانم ترا سلطانِ عرش و فرش خوانم
اگر مالک توئی مال الاجارہ چرا گیرد دگر کس من ندانم!

(اے خدا! میں زمین کو تیری ملکیت سمجھتا ہوں اور تجھے ہی عرش و فرش کا بادشاہ مانتا ہوں۔ اگر تو ہی مالک ہے تو یہ بٹائی کی رقم جو جاگیردار لیتے ہیں، مجھے اس کی سمجھ نہیں آتی۔)

ای دوست بیا جمالِ تقدیریت بین پرندگی فکرِ جہانگیریت بین
گر بر خودیٔ خویش مسلط گشتی تقدیر مطیع فکر و تدبیریت بین

(اے دوست! آ اور تقدیر کا جمال دیکھ، تاکہ تیری عقل جہان بین پرواز کر سکے۔ اگر تو اپنی خودی کا نگہبان بن جائے تو تیری تقدیر تیری سوچ اور تدبیر کی فرماں بردار بن جائے گی۔)

ہرچند کہ قلب و جانِ آگہ دارم با چشم خرد نظر بہر راہ دارم
آزادی و اعتبارِ انسانیٔ خویش از قطع نظر ز ماسوی اللہ دارم

(ہر چند کہ میرے قلب و جان حالات سے باخبر ہیں اور میں عقل کی آنکھ سے راستے پر نظر رکھے ہوئے ہوں، لیکن ہر قیمت پر خدا کے ماسوا جو کچھ بھی ہے اس

کے مقابلے میں مَیں اپنی شخصی آزادی اور احترام کو اہمیت دیتا ہوں۔)

آپ دیگر اسلامی تعلیمات کی تبلیغ اور فروغ کے علاوہ شاہ کے دور کے ایران میں پائی جانے والی فحاشی اور بے حیائی کی لہر سے سخت نالاں تھے اور آپ عورتوں کو پردے کی تلقین فرماتے تھے۔

اے خواہر اگر قلعہ نشینت کردند درماندہ و محبوس این چنینت کردند
خوش باش کہ در جمع دل افروختگان شائستۂ افسر و نگینت کردند

(اے بہن! اگرچہ تجھے چار دیواری میں بند کر دیا گیا ہے اور احمقوں کے خیال میں تجھے مجبور اور محبوس کر کے رکھا گیا ہے، لیکن روشن دل لوگوں کی نظر میں تجھے تاج اور ہیروں کے لائق قرار دیا گیا ہے۔)

اب آہستہ آہستہ سروش کے زمانے میں ایران میں بھی آزاد شاعری کا چرچا ہونے لگا جس میں قافیہ و ردیف کی حدود و قیود تو کجا وزن اور ربط کا خیال بھی باقی نہ رہا۔ دراصل یہ جلدی جلدی کی شاعری تھی جس میں فرصت ہی کہاں تھی کہ اسلاف اور اساتذہ کی صحیح انداز میں پیروی کی جائے۔ لیکن سروش نے تو علامہ اقبال کے افکار و تصورات کو آزاد شاعری کی صورت میں بیان کرنا شروع کر دیا۔ کارل مارکس کے بارے میں علامہ اقبال کے مصرع ع ''قلبِ او مؤمن دماغش کافر است'' پر یوں طبع آزمائی فرماتے ہیں: ؎

اے مکار!

کدام این مکتب ات آموخت ای مکار! آن آئین عیاری؟
(کون سے مکتب نے سکھائے تجھے اے مکار! عیاری کے دساتیر؟)
وایں قدسی ترین اسرارِ سبحانی
(اور تو نے اڑائے یہ کہاں سے ہیں اسرارِ نہانِ سبحانی؟)
کہ مزدا قلب و مزدک عقلی و باطن مسلمانی!
(دل تیرا ہے زرتشتی، عقل میں مزدک ہے، باطن میں مسلمانی!)
چہ افگندی در آن ساغر

(پھر تو کون سے ساغر کو لے آیا ہے محفل میں؟)

چہ معجون بامے آمیزی

(ہے جس میں مے رنگین افیون کی آمیزش)

چنیں مست وسر اندازی

(تو مست ہے، باغی ہے، گستاخ ہے، لامذہب ہے)

کدامے مے ز افیوں در سبو ریزی

(کیا جام بھرے تو نے آمیزۂ افیون سے)

آپ کے جو منظومات علامہ اقبال کو مخاطب کر کے لکھے گئے ہیں ان میں ''طرح حرم''، ''پیرانِ بے پیر''، ''نوائے مرغِ قفس افسردہ''، ''افق خون رنگ''، ''اے سیمرغ قاف زن''، ''صفای قلبِ نامیدن'' دل انگیز نظمیں ہیں۔ یہاں پر ان سب کا پوری تفصیل سے بیان کرنا مشکل ہے۔ یہاں پر چند ایک چیدہ چیدہ منظومات آپ کی خدمت میں پیش کیے جا رہے ہیں، تاکہ اس درویش خدا مست شاعر کی علامہ اقبال کی عقیدت کے اظہار کے علاوہ آپ پر یہ واضح ہو سکے کہ علامہ اقبال کا کلام جب ایران پہنچا تو پھر کس نئے اور انقلابی انداز میں ڈھل کر اس کی ایران کے مقامی اور اُس وقت کے مزاج کے مطابق مزید اشاعت ہوئی۔ سروش کی مندرجہ ذیل آزاد نظمیں بھی انقلاب سے پہلے کے دور میں ایران میں علامہ اقبال کے اشعار و افکار کی بازگشت کا ایک اچھوتا نمونہ ہیں جو اس ملک کے طول و عرض سے سنائی دے رہی تھیں۔

معمارِ جہانِ دیگری (جہانِ نو کا معمار)

برہمن زادہ ای پاک اھورائی کجائی؟

(کہاں ہو اے برہمن زادۂ اللہ مست ومؤمن روشن نگہ؟)

کہ معمارِ جہانِ دیگرے اندر ضمیرِ خاوران گردی

(کہ مشرق کے دل وجان میں جہانِ نو کے تم معمار ہو اقبال!)

حرم تب کردہ از انبوہے بت ہاے رنگارنگ

(حرم لات ومنات، اصنام سے پُر ہے، قیامت ہے۔)

مکدّر گشتہ روح شرق زین پیرانِ مسند دار

(مسلط پھر سے مشرق پہ ہے ان گدی نشین پیروں کی چالاکی)

کہ خود را خضرِ رہ دانند

(کہ خود کو خضر رہ مشہور کرتے ہیں زمانے میں)

ولے خضرے کہ ہرگز رہ نبردہ است و بہ ہیچ الہام واشراقی

(خضر کیسے ہیں، بے سیر و سفر، بے نورِ ایمان اور بے الہام وایقان ہیں۔)

الا معمار و طراحِ حرم برخیز!

(حرم کے تم معمار ہو اقبال! پھر اٹھو)

چراغِ جاودانِ سوزِ حرم آیا فرو مردہ است

(اب تک جلنے والے اس حرم کا قمقمہ بجھنے کو آیا ہے۔)

دگر در مزرعِ جانے کلامِ پاک سبحان نمی روید!

(کہ جاں کی کشت ویراں میں نہیں قرآن بار آور)

طراحِ حرم برخیز!

(حرم کی اے بنیاد رکھنے والے کیوں اٹھتے نہیں اقبال مٹی سے؟)

سرودے تازہ و صبح آفرین از مشرق اندیشۂ خلاق خود سر کن

(اک نئے نغمے کو چھیڑو کہ صبح انقلاب افکارِ مشرق میں نمایاں ہو)

بزن دستے بہ فتراکِ ''الم نشرح''

(''الم نشرح'' کی چادر سے جہان کے سر کو پھر ڈھانپو)

وخود را ہمچو شمشیر بروئے روزگاران زن

(کہ خود تلوار بن کر عصر حاضر سے بھی ٹکراؤ)

کہ این قدسی سرودِ آسمانی باطل سحرِ طلسمات است

(کہ شیطانی طلسموں کے فسون کو نغمۂ افلاک بن جانے سے تم روکو!)

یہ نظم علامہ اقبال کے مصرع ؏ ''ساختم طرحِ حرم در کافرستانِ شما'' سے متاثر ہو

کر لکھی گی۔ اسی طرح آپ کا ایک مختصر قطعہ ہے جو حاضر خدمت ہے: ؎

چہ باید کرد ای یاران!

(مرے یارو! ہے کیا تدبیر اب باقی؟)

چہ باید کرد ای یاران!

(مرے یارو! ہے کیا تدبیر اب باقی؟)

کہ من دیوانہ ام مستم

(کہ میں دیوانہ ہوں، مجنون ہوں، پاگل ہوں)

و اینک ہم شما را لاابالی وار وعاشق وار میگویم

(تمہیں میں عاشقوں، دیوانوں کی صورت بلاتا ہوں)

کہ اکنون نیز

(ابھی کچھ وقت باقی ہے)

بسی مفتون تر و عاشق ترم بر خویش

(میں اپنے آپ کا عاشق ہوں، خود آگاہ ہوں یارو!)

و بیش ازین تحمل کردنتوانم

(کہ اس کے بعد نہ باقی بچے گا میری دنیا میں)

نہ مہجوری نہ مشتاقی

(نہ عشق و عاشقی باقی نہ مہجوری رہے گی یاں)

''شعر را مقصود اگر آدم گری ست شاعری ہم وارثِ پیغمبر ست'' (اقبال)

(شعر کا مقصد ہے گر آدم گری۔ شاعری ہے ورثۂ پیغمبری)

در زمانِ مہ نوردو کہکشان پیما گفتگو

(مگر اس میری دنیا میں، جہاں فلک پیمائی وایٹمی ایام میں اب تک)

از شعر بی معنی است

(مروّج ہے ابھی بھی شعر و حرفِ بے معنی و لایعنی)

آپ کی ایک نظم ''میلادِ شعر'' ہے جو آپ نے علامہ اقبال کو خطاب کرتے ہوئے

لکھی ہے۔ اس تمام نظم کا بیان تو طوالت کا باعث ہوگا' صرف اس کے آخری حصے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

میلادِ شعر۔ اہداء بہ مولانا اقبال

(عظیم شاعری کا ظہور! علامہ اقبال کی نذر)

شعرمی جوشد میانِ سینۂ من
(ہیں اُبلتے شعر سینے میں مرے)
شرح کن سینۂ من را
(چاک کر دو اس مرے سینے کو تم)
ای کہ از تو در ضمیرِ من قیامت ہاست
(ہے بپا تیرے ہی دم سے میرے دل میں محشر موعودِ حق)
ای گرفتہ دامنِ من!
(ہاتھ میں تیرے مرا داماں ہے اے اقبال سن!)
در شبانِ تیرہ ام تنہا مگذاری
(مجھ کو تو تاریک راتوں میں نہ تنہا چھوڑ دے)
ای کہ از من بر در و دیوارِ کویت یادگاری ہاست
(میرے دم سے تیرے کوچے کے ہیں ہر دیوار و در پہ یادگاروں کے نقوش)
بیں! چسان عمرے است تا من درمیانِ خون و آتش
(دیکھ! میں نے عمر ساری خاک و خون اور آگ کے درمیان ہی کاٹ دی)
چکہ' چکہ' چکہ' چکہ' چکہ' چکہ
(قطرہ' قطرہ' قطرہ' قطرہ' قطرہ' قطرہ)
آب می گردم
(بن کے شبنم گر رہا پھولوں پہ ہوں)
ہیچ میدانی کہ آتشناک خونے ہم کہ درر گہای من جوشد

(کیا تجھے معلوم' میرا خونِ آتشناک ہے رگوں میں کھولتا کس جوش سے!)
قطرہ' قطرہ' قطرہ' قطرہ' قطرہ' قطرہ
(اور پھر وہ قطرہ' قطرہ' قطرہ' قطرہ)
شعرمی گردد
(شعر کی صورت میں ڈھل جاتا ہے آخرکار آج)
ای انقلاب آموز!
(ہے دکھایا تو نے میری قوم کو اک راہِ پاکِ انقلاب)
باش تا اے انقلاب آموز!
(ٹھہر تو اے عصرِ نو کے انقلابِ عالم اسلام کے اعلیٰ نقیب!)
زین دمِ گرمت
(میں تیری کچھ گرم سانسوں سے اڑا کر آگ کو)
ہاے وہوے در جہان افتد
(کیوں نہ اس عالم میں ہنگاموں کی طرح ڈال دوں)
روشنانِ آسمانے در طرب آیند
(عالم بالا کے افرشتے بھی ہوں نغموں میں مست)
و بہ لاہور و ہرات و گنجہ و تبریز
(لاہور میں' گنجہ' ہرات اور قریۂ تبریز میں)
قندہار و بلخ
(قندہار میں اور بلخ میں)
اصفہان' شیراز' تہران
(اصفہان میں' شیراز میں' تہران میں)
جملگان جشنے بیارایند
(اک جشن برپا ہو چلے ان سارے شہروں میں)
میلادِ شعرے' شعر بکرے' شعر پاکے

(اِک انقلابی شاعری کا ہو چکا آغاز ہے)

احمد سروش کی شاعری انقلابِ ایران کی پیش خیمہ ثابت ہونے والی جدید شاعری کا حصہ تھی۔ راقم الحروف نے ۱۹۷۸ء میں ایران میں علامہ اقبال کے کلیاتِ فارسی کے جو نسخے دیکھے وہ احمد سروش کے مرتبہ نسخہ ہی کی مختلف اَدوار میں طبع شدہ اشاعتیں تھیں اور یہ کتاب اس حالت میں ملک بھر میں بڑے پیمانے پر دستیاب تھی۔

علامہ اقبال اور ڈاکٹر محمد مصدق

جناب ڈاکٹر محمد مصدق کی انقلابی شخصیت کا ذکر ہو چکا ہے' جنہوں نے ۱۹۵۳ء میں انقلابی رہنما کی حیثیت سے ایران کو شہنشاہیت کے پنجۂ استبداد سے وقتی طور پر ایک انقلاب کے ذریعہ چھڑا کر وہاں پر جمہوریہ کا اعلان کر دیا تھا' مگر غیر ملکی استعماری قوتوں کی شاطرانہ کوششوں سے مفرور بادشاہ کے اقتدار کو دوبارہ بحال کر دیا گیا۔ ملک الشعراء بہار کے چچیرے بھائی شیخ احمد بہار نے مصدق کو علامہ اقبال کے استعمار اور مغربی قوتوں کے خلاف پیامِ حریت سے آگاہ کیا۔ اسی طرح مصدق کے معاونِ وزارت اطلاعات آقای فرہمند سے جناب عرفانی کے برادرانہ تعلقات تھے۔ ان کے توسط سے بھی علامہ اقبال کا پیغام مصدق تک پہنچتا رہا اور ڈاکٹر عرفانی کی کئی بار مصدق سے بالمشافہ ملاقات بھی ہوئی۔ ملک الشعراء بہار کی یومِ اقبال (۱۹۵۰ء) کی تقریب میں اس تجویز پر کہ عالم اسلام کے اتحاد کی ابتدا پاکستان اور ایران کے ادغام سے ہونی چاہیے' جناب مصدق نے پاکستان اور ایران کے مابین کسٹم کی پابندی ختم کرنے کی تجویز بھی پیش فرمائی۔ برٹش آئل کمپنی کے خلاف مہم کے دوران مصدق کو علامہ اقبال کا یہ شعر بہت پسند آیا:

ترا نادان امیدِ غمگساری ہا ز افرنگ است؟
دلِ شاہین نسوزد بہر آن مرغے کہ در چنگ است

(اے احمق! تجھے افرنگ سے غمگساری کی توقع ہے؟ شاہین کا دل اس پرندے کے لیے کبھی بھی نہیں تڑپتا جو اس کے اپنے پنجے میں جکڑا ہوا ہو۔)

یومِ اقبال ۱۹۵۲ء کے موقع پر جناب عرفانی اور احمد بخش بہار نے مل کر مصدق کے

لیے علامہ اقبال کے یومِ پیدائش کے موقع پر نشری تقریر کا ایک ڈرافٹ تیار کیا جو مصدق کی زبان سے ریڈیو ایران سے نشر ہوا اور جناب مصدق نے یومِ اقبال کی تقریب کی تمام کارروائی بھی براہ راست قومی ریڈیو پر نشر کرنے کا حکم دیا۔ ڈاکٹر مصدق کی تقریر کے کچھ اقتباسات درج ذیل ہیں:

''اقبال نے استعماریت کے ظلم وستم کے خلاف اپنے عالی مقاصد دلکش پیغام کے ذریعے اعلان بغاوت کیا۔ جو چراغ اقبال نے ملت کی ہدایت' رہنمائی اور قیادت کے لیے جلایا ہے وہ نہ صرف زمانے کے تمام حادثوں میں روشن ومنور رہے گا بلکہ روز بروز اس کی شعاعیں روشن تر اور اس کا نور درخشاں تر اور امید افزا ہوتا چلا جائے گا۔

اقبال نے اپنے افکار کے اظہار کے لیے فارسی زبان کا انتخاب کیا ہے۔ وہ ہمارے مشترک ادب وافکار کو بے حد اہمیت دیتا تھا اور اس کی بنیاد ان دو برادر دوست اقوام کے قدیم اتحاد پر مبنی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے روحانی اور ثقافتی روابط کو مستحکم کرنے کی کوشش کی۔ ایران بھی اس ارتباط کو احترام کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ میرے لیے یہ باعث مسرت ہے کہ میں نے اس پیغام کے ذریعے اس جشن میں شرکت کی۔''

وزیراعظم مصدق کا پیغام نشر ہونے کے بعد کوچہ وبازار کے عام لوگ بھی علامہ اقبال اور پاکستان کے بارے میں سنجیدگی سے غور کرنے لگے۔ چونکہ مصدق کی آواز اس وقت ملت ایران کی آواز تھی اس لیے علامہ اقبال کو ایران اور عالم اسلام کا ہیرو' نمائندہ اور ترجمان تسلیم کرلیا گیا۔ اس موقع پر آذربائیجان (ایران کے صوبہ) کے عظیم شاعر کاظم رجوی نے کہا:

زجوی ایران در جوئبارِ پاکستان — یکی شد آبِ روانی چو ریخت در دریا

(ایران کی ندی کا پانی اور پاکستان کی ندی کا پانی ایک ہوگیا جب ایران کی ندی سے یہ پاکستان کے دریا میں ملا اور پھر سمندر کی نذر ہوگیا۔)

سرکاری اور عوامی طور پر یہ اعلیٰ ترین سطح پر علامہ اقبال کی تائید تھی۔

علامہ اقبال اور ایران کے مذہبی حلقے

پاکستان اور علامہ اقبال کا پیغام جناب آیت اللہ بروجردی (مرجع تقلید) اور آیت اللہ کاشانی تک ڈاکٹر عرفانی نے ابتدا ہی میں پہنچا دیا تھا۔ قیامِ پاکستان کے فوراً بعد قُم کے مشہور مذہبی رہنما علامہ فیض نے بھی ایک کتاب پاکستان کے بارے میں تحریر فرمائی تھی۔ ان ایام میں ہندوستان کا پراپیگنڈا یہی تھا کہ مسلمانوں نے ہندوستان کے مرکز سے علیحدہ ہو کر دراصل قومی غداری کا ارتکاب کیا ہے اور یہ بات کسی حد تک مذہبی حلقوں میں راسخ ہو چکی تھی، لیکن جب ان پر یہ پیغام واضح ہوا کہ دراصل برصغیر کے مسلمان قدیم ایرانی مبلغین کی مساعی کے باعث اسلامی تعلیمات سے بہرہ ور ہوئے تھے اور پھر ہندوؤں نے برصغیر میں مسلمانوں کی آمد کے ابتدائی دور میں مسلمانوں کے خلاف اپنے شدید ردعمل کا اظہار کیا تھا تو ایرانی علماء کے شکوک وشبہات ختم ہوتے چلے گئے۔ بے شمار مذہبی محفلوں میں جب علامہ اقبال کے وہ اشعار پہنچے جن میں حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا، حضرت علی اور امام حسین رضی اللہ عنہما کی تعریف کی گئی ہے تو ان اشعار کی بازگشت لا تعداد مذہبی مقامات پر سنائی دینے لگی اور یہ اشعار مختلف مذہبی مجالس میں دہرائے جانے لگے۔ ہر چند کہ ڈاکٹر شریعتی نے ۱۹۷۳ء میں جب حسینیہ ارشاد میں علامہ اقبال پر ہفت روزہ سیمینار کا انعقاد کیا تو جناب شریعتی کی پُرخلوص کوششوں کی علماء کے ایک مخصوص تنگ نظر گروہ کی جانب سے اس لیے بھی مخالفت کی گئی کہ انہوں نے ایران میں ایک سُنّی مفکر (اقبال) کے پیغام کی اشاعت کی ہے جس نے (بقول ان کے) اہلِ بیت کی توہین کی ہے، لیکن جب اقبال کا صحیح پیغام ان تک پہنچا تو ان کے شکوک وشبہات بھی بتدریج رفع ہوتے چلے گئے۔ یہ امر باعثِ مسرت ہے کہ ایران کے موجودہ مذہبی رہنما آیت اللہ علی خامنائی علامہ اقبال کے زبردست مداح رہے ہیں اور آپ کا قول ہے: ''ایران کا اسلامی انقلاب علامہ اقبال کا مرہونِ منت ہے''۔ جناب عرفانی کی یاد میں کچھ برس قبل حکومتِ ایران کی جانب سے لاہور میں ایک تقریب کا

انعقاد ہوا، جس میں راقم الحروف کو بھی تقریر کے لیے بلایا گیا۔ اس موقع پر تمام ایرانی زعماء نے حضرت خامنائی کے اس پیغام کو دہرایا۔ انقلاب کے بعد کے ایران کے سفر کے موقع پر راقم الحروف کو ایران کے مذہبی حلقوں میں علامہ اقبال کے افکار و اشعار کی بے پناہ مقبولیت کا احساس ہوا اور معلوم ہوا کہ علامہ اقبال کے اشعار و افکار ایک مدت سے ایران کے تمام تر مذہبی حلقوں میں شیعہ و سنی تعصب سے بالاتر ہو کر ایک قدرِ مشترک کے طور پر اپنائے جا چکے ہیں۔

۱۹۵۰ء کی دہائی کے آغاز میں جناب عرفانی کی کتاب ''رومیٔ عصر'' کی اشاعت کے بعد قُم سے علامہ سعدی نے علامہ اقبال کے حالاتِ زندگی اور افکار پر ایک کتاب تحریر فرمائی۔ اس کے بعد علامہ اقبال کی شاعری کا والہانہ ذکر مذہبی حلقوں میں بھی شروع ہو گیا۔ علامہ کی انقلابی روح نے ایران کے روشن فکر مذہبی رہنماؤں کو جذباتی حد تک متأثر کیا۔ علی خامنائی نے بطورِ صدرِ مملکت کئی مواقع پر علامہ اقبال کے ساتھ اپنی زبردست عقیدت کا والہانہ طور پر ذکر فرمایا اور جناب سروش عرفانی کے مطابق ایک موقع پر تو انہوں نے یہاں تک برسرِ عام فرمایا کہ میں علامہ اقبال کا مرید ہوں۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ جملہ آپ مرجع تقلید اور ولایتِ فقیہہ کی پوزیشن میں ہوتے ہوئے تو نہیں کہہ سکتے' لیکن آپ کے ماضی کے ارشادات سے علامہ اقبال سے آپ کی عقیدت واضح ہوتی ہے۔ علامہ اقبال کے وہ خوبصورت اشعار جو اہل بیت کی شان میں کہے گئے ہیں' ان سے کچھ ایسے لوگوں کو بھی علامہ اقبال کے پیغام کو قبول کرنے میں دقت نہیں ہوئی جو اقبال کے غیر شیعہ ہونے کے باعث کسی حد تک آپ سے نالاں ہو سکتے تھے۔ انقلاب سے پہلے اور انقلاب کے بعد انتہائی ذمہ دار مذہبی رہنماؤں نے علامہ اقبال کو بلا تخصیص مکمل یکجہتی کے ساتھ اپنا ہیرو تسلیم کیا ہے اور اب بھی انہیں وہی حیثیت سرکاری طور پر دی جاتی ہے۔

جناب ڈاکٹر علی شریعتی

یہ امر باعثِ دلچسپی ہے کہ ۱۹۴۵ء میں جب جناب عرفانی کا مشہد میں بطور ثقافتی

سفیر برطانوی ہند تقرر ہوا تو انہوں نے اسی برس وہاں پر ''بزمِ اقبال'' کی بنیاد رکھی۔ یہ دراصل علامہ اقبال کے افکار کی ترویج و اشاعت کی غرض سے قائم کی گئی ایران میں اپنی نوعیت کی پہلی سوسائٹی تھی۔ اسی سوسائٹی کے زیرِ اہتمام اقبال کے اشعار کی رو سے ایران کے پڑھے لکھے لوگوں کو ان کی ملت کے درخشاں مستقبل کی نوید دی جاتی رہی۔ علامہ اقبال کے ابتدائی دور کے مداحوں مثلاً ملک الشعراء بہار کا تعلق بھی مشہد ہی سے تھا۔ مشہد ایرانی خراسان کا مرکز تھا اور مشہور تاریخی مقامات مثلاً طوس، سرخس اور نیشاپور کے مابین واقع تھا۔ مشہد کو حضرت امام علی رضاؒ کے مزار کے باعث شیعہ مذہب میں بھی مرکز کا مقام حاصل تھا اور خراسان کے بارے میں ہی ایک حدیث طیبہ میں آنحضور ﷺ نے احیائے اسلام کے آغاز کی نوید سنائی ہے۔ یہیں پر جناب تقی شریعتی نے ۱۹۵۲ء میں جناب طاہر احمد زادہ، جناب ید اللہ اور جناب مہدی بازرگان کے ساتھ مل کر اسلامی محاذ کی بنیاد رکھی۔ یہ زمانہ جناب علی شریعتی کے لڑکپن کا زمانہ تھا، لہٰذا وہ ان تمام سرگرمیوں سے متأثر ہوئے۔ فرانس تشریف لے جانے سے پہلے آپ علامہ اقبال کے اشعار و افکار کی صحیح روح سے روشناس ہو چکے تھے۔ فرانس میں اپنے ڈاکٹریٹ کے تحقیقی کام میں بھی آپ نے علامہ اقبال کے افکار سے روشنی اور راہنمائی حاصل کی۔

وطن واپسی پر آپ سرزمین ایران میں علامہ اقبال کے افکار کے سب سے بڑے مبلغ بن گئے۔ آپ کی جملہ تحریروں میں استعمار اور سامراجیت کے خلاف جنگ، دین اسلام کی صحیح معنوں میں اور اصلی حالت میں ترویج، آنحضور ﷺ کی پیروی اور انبیاء علیہم السلام کے طریق کار کے مطابق اشاعتِ حق و صداقت کی بابت جناب شریعتی کی تحریروں اور تقریروں میں ہمیں ہر مقام پر علامہ اقبال کے افکار کا پرتو ملتا ہے۔ آپ نے علامہ اقبال کے افکار کی روشنی میں ابتدائے آفرینش، رزمِ خیر و شر، غلامی کی موجودہ صورت، شہنشاہیت اور استبداد کی ہر قیمت پر مخالفت، اسلام سے نام نہاد مذہبی اور خانقاہی ٹھیکیداروں کی بالادستی کے خاتمے، اسلام کی صحیح اور سادہ صورت میں اشاعت، لوٹ کھسوٹ کے خاتمے اور کفار کی اسلام اور ملتِ اسلامیہ کے خلاف کی جانے والی سازشوں کے مقابلے میں

اپنے انقلابی افکار کی اشاعت فرمائی۔ آپ نے ایران پر چھائے ہوئے جبر و استبداد کے صدیوں پر محیط جمود کو توڑا، نوجوانوں کو اقبال کا شاہین بنا دیا اور عقابی روح بیدار کر کے انہیں آزادی کے فلک کی وسعتوں میں جرأتِ پرواز دی اور قوم میں ایک ایسی دینی روح پھونکی کہ ہزاروں برس سے قائم بادشاہت کے جملہ نقوش مٹتے ہوئے نظر آنے لگے۔ آپ نے ''اقبال وما'' (اقبال اور ہم) لکھ کر علامہ اقبال کے انقلابی فکر کو متعارف کروایا۔ یہ امر باعثِ دلچسپی ہے کہ جناب ڈاکٹر اسرار احمد مدّ ظلہ العالی نے بھی ''علامہ اقبال اور ہم'' کتاب لکھ کر قریباً قریباً انہی افکار کی انہی ایام میں اشاعت کی ہے، مگر یہ کتاب لکھتے وقت آپ کو جناب شریعتی کی کتاب کا علم نہیں تھا۔ اس مشترکہ آواز کا دراصل سرچشمہ کہیں اور ہی ہے اور صدائے حق ہم دلی کے باعث پھیلتی ہے۔ بقول مولانا رومؒ:

خشک مغز و خشک تار و خشک پوست　　　از کجا می آید این آوازِ دوست؟

(مغز بھی خشک، تار بھی خشک اور جلد بھی خشک، مگر پھر بھی اس ساز سے دوست کی آواز کہاں سے آ رہی ہے؟)

پس زبانِ محرمی خود دیگر است　　　ہم دلی از ہم زبانی بہتر است

(آشنائی کی زبان کچھ اور ہی ہے اور ہم زبان ہونے سے ہمدلی کی کیفیت کہیں بہتر ہے۔)

اور بقولِ عرفانی:

ہر چہ باشد حرف و گفتِ نارسا　　　آشنا داند صدائے آشنا

(حرف اور گفتگو اگر ایک دوست سے دوسرے دوست تک نہ بھی پہنچ پائے پھر بھی آشنا بالآخر آشنا کی آواز کو پہچان لیتا ہے۔)

۱۹۷۳ء میں جناب شریعتی نے تہران میں علامہ اقبال کے افکار کے بارے میں ہفتے بھر کے عرصے پر محیط ایک عظیم سیمینار کا انعقاد کروایا جس کو ایران کے تمام غیر سرکاری حلقوں میں زبردست پذیرائی حاصل ہوئی اور تہران اور ایران کے پُر جوش نوجوان علامہ اقبال کی انقلابی فکر سے بڑے پیمانے پر متعارف ہوئے۔ اس سے پہلے اگرچہ

ایران میں علامہ اقبال کا کلام کوچے کوچے میں پہنچ چکا تھا، لیکن اس کی انقلابی جہت ابھی تک واضح نہیں ہوئی تھی اور نوجوانانِ عجم کی عقابی روح پوری طرح بیدار نہیں ہوئی تھی۔ جناب شریعتی نے علامہ اقبال کو تاریخ اسلام کا غزالیٔ ثانی قرار دیتے ہوئے آپ کے اشعار وافکار کو نوجوانانِ عجم کی زبان سے جاری وساری کروادیا۔ اس دلکش اور انقلابی تحریک کے قبل از انقلاب کے جذباتی مناظر کی تصویر آج بھی راقم الحروف کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ یہ جناب علی شریعتی کی تبلیغ کا اثر تھا کہ آپ کی شہادت کے دو ہی برس بعد مجھے جب ایران جانا ہوا تو ملک کے طول وعرض کے سفر میں سر بکف اور کفن پوش نوجوان ملتے رہے، جن کی زبان پر علامہ اقبال کی یہ غزل تھی:

تیر و سنان و خنجر و شمشیرم آرزوست　　بامن میا کہ مسلکِ شبیرم آرزوست

(مجھے تیر و سنان، خنجر اور تلوار کی آرزو ہے۔ میرے سامنے مت آنا کہ مجھے حضرت شبیر رضی اللہ عنہ کے مسلک کی آرزو ہے۔)

از بہرِ آشیانہ خس اندوزیم نگر　　باز این نگر کہ شعلۂ درگیرم آرزوست

(ایک آشیانہ بنانے کے لیے میرا تنکہ چننے کا عمل دیکھ اور پھر یہ بھی دیکھ کہ اپنے دامن میں کتنے شعلوں کی آرزو لے کر آرہا ہوں۔)

گفتند لب بہ بند و ز اسرارِ ما مگو　　گفتم کہ خیر نعرۂ تکبیرم آرزوست

(انہوں نے کہا کہ خاموش رہو اور ہمارے راز سرِ عام مت کہو، میں نے کہا کہ خیر، مجھے نعرۂ تکبیر کی آرزو ہے۔)

گفتند ہر چہ در دلت آید زما بخواہ　　گفتم کہ بے حجابیٔ تقدیرم آرزوست

(انہوں نے کہا کہ تجھے جو کچھ چاہیے وہ ہم سے مانگ لو۔ میں نے کہا کہ مجھے اپنی تقدیر کی بے حجابی کی آرزو ہے۔)

از روزگارِ خویش ندانم جز این قدر　　خوابم زیادِ رفتہ و تعبیرم آرزوست

(اپنے زمانے اور احوال کا مجھے بس اتنا ہی علم ہے کہ وہ ایک خواب تھا جو بھول چکا، مگر مجھے تو اس تعبیر کی آرزو ہے۔)

کو آن نگاہِ ناز کہ اوّل دلم ربود　　عمرت دراز باد ہماں تیرم آرزوست

(وہ نگاہ ناز کہاں ہے کہ جس نے سب سے پہلے میرا دل اڑا لیا تھا؟ خدا تیری عمر دراز کرے، مجھے نگاہ کے اسی تیر کی آرزو ہے۔)

یہی آرزوئیں دل میں بسائے نعرۂ تکبیر لگاتے ہوئے اور قرآنی آیات کا مسلسل ورد کرتے ہوئے ہزاروں جذباتی انقلابی نوجوان پہلوی استبداد کے جلائے ہوئے شعلوں میں خلیل اللہ کی طرح کود گئے، مگر اس سفر سے پھر وہ کبھی واپس نہ آسکے۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن

خدا رحمت کند این عاشقانِ پاک طینت را!

(خاک وخون میں لوٹ پوٹ ہوکر ان شہداء نے ایک عظیم رسم قائم کردی۔ خدا ان پاک طینت عاشقوں پر رحمت نازل فرمائے۔)

ہر چند کہ جناب شریعتی کے ان خیالات کی وسعت کا یہاں کما حقہٗ احاطہ کرنا ناممکن ہے جو انہوں نے علامہ اقبال کی پیروی میں ایرانی قوم میں عام کیے، تاہم ایک عاجزانہ سی کوشش سہی کہ ان کی تحریروں سے چند اقتباسات پیش خدمت ہیں:

علامہ اقبال کیا ہیں؟ وہ تو ایک باب ہیں اس کتاب کا جس کا دوسرا باب سید جمال الدین افغانی ہیں۔ اگر ہم ان دونوں کو پہچان لیں تو پھر اس کتاب کے مندرجات ہماری سمجھ میں آسکتے ہیں۔ یہ دونوں ہستیاں تو عنوان ہیں جبکہ متن (مضمون) ہم ہیں۔ ہم، ہماری سوچ، ہماری مشکلات، ہمارے مسائل اور ان کا حل۔ وہ اقبال ہی تھے جنہوں نے سید جمال الدین افغانی کے وحدت ملتِ اسلامیہ کے تصور کو ایک جاندار فکری بنیاد مہیا کی۔

علامہ اقبال وہ روشن و منور چہرہ ہے جس نے عالمِ انسانیت کو اس عہد میں اسلام کی بارآور تہذیب وثقافت کا تحفہ پیش کیا۔ اسلام نے زندگی کی تمام صورتوں اور گوشوں میں انسانی روح کا احترام نمایاں کیا ہے۔ دنیائے فانی میں انسانیت کی بہت سی عظیم شخصیات اسلام کی فکر کے باعث سامنے آئی ہیں۔ اقبال ہر چند کہ انہی میں شامل ہے لیکن ان میں ممتاز بھی ہے اور اقبال کا امتیاز یہی ہے کہ اس بلند و بالا اور بارآور درخت نے اُس وقت اپنا سر اٹھایا جب اسلامی تہذیب وثقافت کے گلستان پر خزاں کا دور دورہ تھا اور جب

مغربی سامراج اور استعمار کے طوفانی تھپیڑے اسے ختم کرنے کے درپے تھے۔ اس شدید موسم اور نامساعد حالات میں اسی ویران اور خشک کھیتی میں ایک سروِ آزاد بلند ہوا جس کے وجود نے دوستوں اور دشمنوں کو محوِ حیرت کر دیا۔

اسلام کی کشتِ ویران میں قیمتی بیج ایک سیلِ بلا سے خوف زدہ ہو کر چھپے ہوئے تھے اور اپنی موت کا انتظار کر رہے تھے۔ اس نے یہ پیغام دیا کہ ہماری اس ویران اور آفت زدہ کھیتی کی گہرائیوں میں اب بھی اسلامی روح کا بیکراں اور متلاطم سمندر موجیں مار رہا ہے۔ اس نے یہ پیغام دیا کہ تم اپنی تہذیب کی زرخیز مٹی کو ذرا کھودو تو سہی اور اس زندگی بخش سمندر سے روح اور طاقت حاصل کرو' اس ویران اور بنجر کھیتی کو ایک بار پھر جنت میں بدل دو۔

یہی تو وہ اسلام کی محرک روح تھی جس نے عرب کے تپتے ہوئے صحراؤں میں زندگی کی برق دوڑادی تھی اور پھر اس نے پچیس برسوں میں روم اور ایران کی استعماری زنجیروں کو توڑ کر رکھ دیا' شہنشاہوں' قیصروں' مغوں اور پادریوں کا جابرانہ تسلط ختم کر دیا۔ اقبال نے اپنی شاعری سے اس امر کا انکشاف کیا ہے کہ اس گئے گزرے دور میں بھی اسلام عظیم انسان پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے' جو مغربی استعمار اور سامراج کے بے رحم شکنجوں میں جکڑی ہوئی ایک بے مایہ قوم کے ایک فرد کی صحیح تربیت کر کے اسے ''اقبال'' بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

اللہ تعالیٰ میں وہ تمام جواہر مجتمع ہیں جن کی صورت ہمیں الہامی مذاہب میں ملتی ہے۔ وہ یہودیوں کے عقائد کے مطابق ''پائی جانے والی جباریت کا مظہر بھی ہے اور عیسائیوں کے خدا والی رحمانیت کا بھی۔ قرآن پاک میں تورات والی مدنیت بھی ہے اور انجیل والی روحانیت بھی۔ رسولِ خدا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ایک طرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح آزادیوں اور حریت کے لڑنے والے مجاہد ہیں تو دوسری طرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح عشق و محبت کے مظہر۔ آنحضور ﷺ کی پیروی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ بیک وقت ایک محنت کش' ایک سیاسی مدبّر' ایک فوجی جرنیل' ایک عارف' ایک خوش کلام مقرر اور

تکالیف کو صبر و استقامت اور خاموشی سے برداشت کرنے والے جوانمرد بھی۔ علامہ اقبال میں بھی سنتِ رسول ﷺ کی اتباع کرتے ہوئے اور حضرت علیؓ کی پیروی کرتے ہوئے ایسی خوبیاں پیدا ہوگئی تھیں۔

علامہ اقبال نے مغربی اور مشرقی علوم کو بدرجہ اتم حاصل کیا اور وہ ماضی کے گنبد سے باہر آ گئے۔ جدید علوم و افکار کا براہِ راست مطالعہ کر کے وہ اس صدی کے عظیم انسان قرار پائے۔ آپ کے عقلی فلسفے میں شعر کی چاشنی کی آمیزش ہوگئی۔ شعر کی لطافت اور حسن نے ان کے پیغام کو دلکش بنا دیا۔ اسی طرح شاعرانہ رقت نے آپ کو فلسفیانہ فکر کی گہرائی سے خالی نہیں ہونے دیا۔ آپ کے مذہبی عقائد نے آپ میں تعصب پیدا نہیں ہونے دیا تو دوسری طرف آپ کی عقل و دانش نے آپ کے جذبۂ ایمانی کو کمزور نہیں کیا ۔ وہ برگسان کی طرح سوچتے' رومی کی طرح جذبات کے طوفان میں موج زن ہو جاتے اور جمال الدین افغانی کی طرح وہ مسلم اقوام و ملل کی آزادی کی تڑپ دل میں بسائے سامراج کا مقابلہ کرتے تھے۔ آپ نے مارٹن لوتھر کی طرح عصرِ حاضر میں فکر اسلامی کی تجدید اور تشکیلِ نو کو اپنا نظریۂ حیات بنا رکھا تھا۔

آج کے دور میں ہمارے مغرب زدہ نام نہاد دانشوروں' خوفزدہ عوام اور قدیم و جدید علماء کے لیے علامہ اقبال کے شعر و فکر کا مطالعہ وقت کی شدید ترین ضرورت ہے۔ وہ لوگ جن کا مقصد عوام کی سادگی اور لاعلمی سے فائدہ اٹھانا ہے' وہ علم کی روشنی سے خوفزدہ ہیں اور علامہ اقبال کا نام سننے سے گھبراتے ہیں۔ انہیں یہ کھٹکا لگا ہوا ہے کہ مسلمان عوام ایک نہ ایک دن علامہ اقبال کو پہچان لیں گے اور پھر ان اجارہ داروں کے چنگل سے باہر نکل جائیں گے۔ یہی ان کے خوف کی اصل وجہ ہے۔

اسلام اس دور میں بھی ماضی کی طرح اعلیٰ درجے کے عظیم افراد پیدا کرنے اور اُن کی فطری صلاحیتوں کو جلا بخشنے کی قدرت رکھتا ہے۔ اس کی زندہ مثال علامہ اقبال کی شخصیت ہے۔ عالمی سطح پر بھی اور مسلم معاشرے بالخصوص ایشیائی مسلم معاشرے' یعنی ہندوستان' انڈونیشیا' اور ملائیشیا جیسے ممالک میں بھی اقبال بیداری اور احیائے اسلام کی

ایک بلند آہنگ پکار ہے، جو اسلام دشمن سامراجیوں کے وجود پر ایک کاری ضرب کی حیثیت کی حامل ہے۔

جناب شریعتی کی زندگی کے آخری ایام میں آپ کی تقریر وتحریر پر علامہ اقبال کے اثرات مزید گہرے ہوتے چلے گئے اور آپ کی پریشان روح نے اپنی تحریروں اور خطبات کے ذریعے ایران کے عوام خصوصاً نوجوان نسل کی عروقِ مردہ میں بجلیاں دوڑا دیں۔ پھر ایک بے پناہ سیلاب اٹھا اور اس سیلاب میں سب خشک وتر بہہ کر رہ گیا۔ علامہ اقبال کا مندرجہ ذیل انقلابی پیغام ایران نے سمجھ لیا:

خاور ہمہ مانندِ غبارِ سرِ راہے است
یک نالۂ خاموش واثر باختہ آ ہے است
ہر ذرۂ این خاک گرہ خوردہ نگاہے است
از ہند و سمرقند و عراق و ہمداں خیز
ازخوابِ گراں، خوابِ گراں، خوابِ گراں خیز!
ازخوابِ گراں خیز!!

(مشرق یعنی ایشیا کسی کاروان کے قدموں سے اُٹھنے والے راستے کے غبار کی مانند ہے۔ یہ ایک خاموش نالہ ہے اور ایسی آہ ہے جس کا اثر زائل ہو چکا ہے۔ اس کا ذرہ ذرہ دراصل ایک ایسی نظر ہے جو گرہ کھا کر مجسم ہو چکی ہے۔ ہندوستان، سمرقند، عراق اور ایران کے تاریخی شہر ہمدان کے لوگو اُٹھ پڑو۔ گہری نیند، گہری نیند، گہری نیند سے جاگ جاؤ۔ گہری نیند سے اُٹھ پڑو!)

این نکتہ کشائندۂ اسرارِ نہان است
ملک است تن خاکی و دین روحِ روان است
تن زندہ و جاں زندہ زربطِ تن و جان است
با خرقہ و سجّادہ و شمشیر و سناں خیز
ازخوابِ گراں، خوابِ گراں، خوابِ گراں خیز!
ازخوابِ گراں خیز!!

(یہ نکتہ دراصل چھپے ہوئے رازوں کو افشاء کرتا ہے کہ ملک ایک مٹی کا پتلا ہے اور اس کا روح رواں دین ہے۔ جسم اور جان دونوں کی زندگی دراصل جسم و جاں کے رابطے اور اتصال سے ممکن ہے' درویشی کی گدڑی (جائے نماز یا مسند ارشاد)' تلوار اور نیزے کے ہمراہ اٹھ کھڑے ہو! گہری نیند' گہری نیند' گہری نیند سے جاگ جاؤ۔ گہری نیند سے اٹھ پڑو!)

انقلاب سے چند سال پہلے

اب ۱۹۷۰ء کے عشرے میں ایران کے کونے کونے میں علامہ اقبال کا پیغام عام ہو چکا تھا اور علامہ اقبال کو اب پاکستان کے قومی شاعر ہی کی حیثیت سے نہیں بلکہ فارسی شاعری میں آپ کو سعدی' فردوسی' رومی اور حافظ کا ہم پلہ قرار دیا جاتا تھا۔ علاوہ بریں علامہ کے انقلابی پیغام کو مستقبل کے ایک عظیم اسلامی انقلاب کا محرک قرار دیا جاتا تھا۔ شاہ کا جبر و استبداد ابھی بھی پورے شدّ ومد سے جاری تھا۔ ایک طرف مجاہدین خلق کے نوجوان حصولِ آزادی اور احیائے دین کی کوشش میں خاک وخون میں لوٹ رہے تھے تو دوسری جانب مدرسہ وخانقاہ سے بھی علم ہائے بغاوت بلند ہو رہے تھے۔ قوم میں عظیم مذہبی ولولہ پنپ رہا تھا' مگر بظاہر ہر جانب پُراسرار خاموشی کا دَور دَورہ تھا اور یہ خاموشی ایک زبردست طوفان کا پیش خیمہ تھی۔ زیرزمین گوریلا کارروائیاں جاری تھیں اور لوگ شاہی عقوبت خانوں میں موت کی نذر ہو رہے تھے۔ ایران میں علامہ اقبال کی مقبولیت کا یہ عالَم تھا کہ رسمی اور سرکاری طور پر مصدق کے بعد تمام وزرائے اعظم کے پیغامات بھی یومِ اقبال پر نشر ہوتے رہے' حتیٰ کہ مختلف مواقع پر علامہ اقبال کے بارے میں شاہ کے پیغامات بھی نشر اور شائع ہو رہے تھے۔ ایک موقع پر تو شاہ نے کہا تھا کہ ''اقبال ساری دنیا کا شاعر ہے۔'' سرکاری سطح پر کیے گئے اعلانات کی روشنی میں تو علامہ اقبال معقولیت اور فرزانگی کی علامت تھے' مگر اہل جنون اب ان کے کلام سے درسِ دیوانگی لے رہے تھے۔ آپ کے اشعار جبر و استبداد' معاشی استحصال اور شاہی تخت وتاج کے بتوں بلکہ

بت کدوں کو پاش پاش کر رہے تھے۔

صورت نہ پرستم من بُت خانہ شکستم من
آن سیلِ سبک سیرم ہر بند گسستم من
در بود و نبودِ من اندیشہ گمانہا داشت
از عشق ہویدا شد این نکتہ کہ ہستم من

(میں نے بتوں کی پرستش نہیں کی، بلکہ میں نے تو بت کدہ توڑ دیا ہے۔ میں وہ آگے بڑھنے والا تند و تیز سیلاب ہوں جس نے تمام رکاوٹوں کو ملیا میٹ کر کے رکھ دیا ہے۔ میرے ہونے یا نہ ہونے میں کئی شکوک و شبہات جنم لے رہے تھے۔ عشق نے مجھے یہ واضح کر دیا کہ میں ہوں۔)

عشق کا جوشِ جنون اب بہت تیزی سے ایک طوفان کی طرح آگے بڑھ رہا تھا۔ اور یہ قافلۂ شوق منزل بہ منزل رواں دواں تھا: ؎

اقبال کا ترانہ بانگِ درا ہے گویا
ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

علاوہ بریں ایران کی یونیورسٹیوں، کالجوں اور مکتب و مدرسہ میں اپنے اپنے انداز میں اقبال کے کلام کی شرح و تفسیر جاری تھی۔ علامہ اقبال کے بارے میں مضامین کے سلسلے ایران کے مختلف رسائل و جرائد سے شائع ہو رہے تھے اور اب اہل ایران ہمیں کلامِ اقبال کے سربستہ رموز و اسرار سے آگاہ کر رہے تھے اور پاکستان میں ایرانی علماء کی زبان سے ہم علامہ اقبال کا پیغام سن کر آپ کے شعر و فکر کی نئی جہتوں سے متعارف ہو رہے تھے جو ابھی تک ہماری نگاہوں سے اوجھل تھیں۔ اب یہ آبِ دریا الٹی سمت واپس ہماری جانب بہہ رہا تھا۔ یہاں پر ہم ایرانی زعماء کے ان لیکچروں اور تحریروں کا حوالہ دیں گے جو انہوں نے پاکستان میں آ کر ہمارے ہاں پیش کیں یا مختلف مجلّات میں شائع ہوئیں۔

جناب علی قلی محمود بختیاری نے ۱۹۷۶ء میں اورینٹل کالج لاہور میں ایک لیکچر دیا، جس کا عنوان تھا ''اقبال و پیامِ اُو''۔ مصنف کو یہ لیکچر سننے کا اعزاز حاصل ہوا تھا اور

براہِ راست استاد سے کئی سوالات بھی کیے تھے۔ اس کا متن تہران کے مشہور مجلّہ ''ہنر و مردم'' (ضمیمہ شمارہ ۱۶۲) میں شائع ہوا۔

اقبال و پیامِ اُو

جناب پروفیسر بختیاری نے فرمایا کہ علامہ اقبال کی زندگی مغرب کی اہرمنی شیطانی روح کے خلاف مسلسل نبرد آزمائی اور پیکار میں گزری اور انہوں نے عوام کو خوابِ گراں سے بیداری کا پیغام دیا۔

از غلامی دل بمیرد در بدن   از غلامی روح گردد بارِ تن

(غلامی سے بدن میں دل مردہ ہو جاتا ہے اور اس کے باعث روح بھی جسم پر ایک بوجھ کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔)

از غلامی بزمِ ملت فرد فرد   این و آن با این و آں اندر نبرد

(غلامی کی وجہ سے ملت کی محفل اُجڑ جاتی ہے، افراد میں انتشار کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور مختلف گروہ اور طائفے آپس میں اُلجھ جاتے ہیں۔)

از غلامی مردِ حق زُنّار بند   از غلامی گوہرش نا ارجمند

(غلامی کی وجہ سے حق پرست انسان بھی کافرانہ رسوم اختیار کر کے مالا پہن لیتا ہے اور اس کے جوہر ذاتی میں انحطاط آ جاتا ہے۔)

انہوں نے کہا کہ میں ایک ایرانی اور مشرق کی سرزمین کا فرزند ہونے کے ناطے آپ کے شعروں کا مطالعہ کر کے لرزہ براندام ہو گیا ہوں۔ میری روح میں آگ لگ گئی ہے اور اس کی چنگاریاں میرے جسم اور تصورات میں پھیل گئی ہیں۔ میں پگھل رہا ہوں اور جل رہا ہوں۔ بالآخر اقبال کی آگ میرے رگ و پے میں سرایت کر چکی ہے۔ میں بھی ایرانی اور عجمی رازوں کا اقبال کی طرح امین بن گیا ہوں۔ اقبال کی سوچیں ایرانی قوم کے ذہن سے مطابقت کے باعث صرف انہی کی زبان میں ڈھل سکتی تھیں۔ اقبال کی پیروی میں مجھے بھی دردِ دروں سے آشنائی ہو چکی ہے۔ کئی برسوں سے میرا بھی یہ وطیرہ بن چکا ہے کہ استعماری اور سامراجی قوتوں سے نبرد آزما ہو جاؤں۔ مجھے بھی غلامی

اور غلامانہ ذہنیت کو پروان چڑھانے والے فرسودہ تصورات سے نفرت ہو چکی ہے۔ ہمارے قومی مرض کا علاج مشرق کی سوچوں اور اسلام کے عظیم فلسفہ میں مضمر ہے۔ ہماری قوم بیمار ہے۔ اس کے افراد کی لاپرواہی نے انہیں برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ آؤ مشرق کے باسیو! جاگ اٹھو۔ خصوصاً اہل ایران اٹھ پڑیں اور مشرق کی کمزور اور ناچار مسلم اقوام کے ساتھ مل کر عظیم تحریک کا حصہ بن جائیں، جو کفر، شرک، جہالت، گمراہی، غلامی اور استحصال کے خلاف ہو۔ اپنے فکری اسلحے سے لیس ہو کر وہ کامیاب ہو سکتے ہیں۔ کئی بار آپ اپنے لیکچر میں اپنے فرطِ جذبات پر قابو نہ رکھ سکے اور آبدیدہ ہو گئے۔۔۔ اور پھر حافظ کا شعر پڑھا:

اگر غم لشکر انگیزد کہ خونِ دوستان ریزد
من و ساقی بہم سازیم و بنیادش براندازیم

(اگر غموں کا لشکر ہم پر چڑھ دوڑے اور ہمارا اور ہمارے احباب کا خون بہانا شروع کر دے تو میں اور ساقی آپس میں مل جائیں اور ایسی سوچوں اور غم واندوہ کی بنیاد اُکھاڑ کر رکھ دیں۔)

اگر لیکچر کے اس حصے کا بغور مطالعہ کیا جائے تو اقبال کے فکر کی روشنی میں ایک پڑھے لکھے اور دانشور محقق کے ذہن کی صحیح کیفیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اسی ہیجانی کیفیت نے پوری ایرانی قوم کو سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنا دیا اور پھر اس کے سامنے سامراج کے استعماری ہتھکنڈے بے سود ہو کر رہ گئے۔

صد سالہ علامہ اقبال کانفرنس لاہور (دسمبر ۱۹۷۷ء)

پنجاب یونیورسٹی کے زیر اہتمام علامہ اقبال کی صد سالہ سالگرہ کے باعث ایک بین الاقوامی کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ یہ کانفرنس اس وقت کے انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل میں منعقد ہوئی اور راقم الحروف کو اس میں شرکت کا شرف حاصل ہوا۔ اس کانفرنس کے فارسی مقالات کو خانۂ فرہنگِ ایران لاہور نے ایک کتابی شکل میں شائع کیا۔ اس کی خصوصیت یہ تھی کہ اس کی تدوین علامہ اقبال کے قریبی ایرانی دوست جناب محیط طباطبائی نے فرمائی

اور اس کا پیش لفظ تحریر فرمایا۔ کسی زمانہ میں جناب محیط طباطبائی سے علامہ اقبال کی براہِ راست خط وکتابت بھی رہی ہے اور موصوف کو علامہ اقبال کی زندگی میں ہی اُن کے اوّلین ایرانی پیروکار اور مداح ہونے کا فخر حاصل رہا ہے۔ آپ نے اس سلسلے میں اپنی یادداشتوں کا مختصر ساذکر بھی فرمایا ہے۔

اس مجموعہ کا مقدمہ جناب بہاء الدین اورنگ ڈائریکٹر خانہ فرہنگِ ایران لاہور نے لکھا ہے۔ موصوف ایک استاد تھے اور راقم الحروف سے آپ کی بے پناہ محبت اور عنایت رہی ہے۔ آپ نے علامہ اقبال کی ایرانی عوام میں مقبولیت اور شناسائی کے بارے میں اپنے ذاتی تجربات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اٹھائیس برس قبل ۱۹۴۹ء میں جب انہوں نے تدریس کا آغاز کیا تو ایک دن رشت (صوبہ گیلان کے صدر مقام) میں وہاں کے مرکزی کتاب خانہ (لائبریری) میں چلا گیا اور سڑک کی جانب کھلنے والی کھڑکی کے پاس بیٹھ گیا۔ کچھ پڑھ رہا تھا اور کسی حد تک باہر سڑک پر بارش کا نظارہ کر رہا تھا۔ اچانک ایک سفید ریش مہربان بزرگ جن سے برسوں کی شناسائی تھی، تشریف لائے اور اپنے ہاتھ میں ایک مجلّہ پکڑے ہوئے میرے سامنے آ بیٹھے اور مجھے وہ مجلّہ پڑھنے کے لیے دیتے ہوئے کہنے لگے کہ یہ شعر پڑھیے اور بتایئے کہ آپ کیا سمجھے، آپ کو یہ ضرور متاثر کرے گا، مجھے تو یہ بہت دلکش محسوس ہوتا ہے، اس میں تحرک ہے، جنبش اور مسلسل پیکار کا درس ہے۔ اس بزرگ کے ایماء پر یہ شعر پڑھے:

ساحلِ افتادہ گفت، گرچہ بسے زیستم ۔ ہیچ نہ معلوم شد آہ کہ من چیستم
موجِ زخود رفتۂ تیز خرامید و گفت ۔ ہستم اگر می روم، گر نہ روم نیستم

(صدیوں سے موجود ساحل نے کہا کہ اگرچہ میں نے زندگی بتادی مگر آہ! یہ جان نہ سکا کہ میں کون ہوں۔ سمندر سے ایک لہر اٹھی اور تیز چلتی ہوئی اس سے مخاطب ہوئی کہ مجھے دیکھو! اگر چلوں تو ہوں اور اگر رُک جاؤں تو کچھ بھی نہیں۔)

وہ بزرگ تو اپنی بات کہہ کر چلے گئے مگر میں نے جب اس مجلّے میں شاعر کا نام دیکھا تو لکھا ہوا تھا ''اقبال لاہوری'' اور یہ میرا علامہ اقبال سے پہلا تعارف تھا۔ میں نے بچپن

سے ہی بابا طاہر عریاں کی رباعیات پڑھی ہوئی تھیں۔ اقبال کی رباعیات ان سے وزن اور تاثر میں صدیوں کے فاصلہ کے باوجود پوری طرح سے ہم آہنگ تھیں۔ مجھے اقبال کی رباعیات نے بہت متاثر کیا۔ پھر آپ کا تمام کلام پڑھا اور دن بدن آپ کے کلام میں کھوتا چلا گیا۔

میری نظر میں علامہ اقبال صحیح العقیدہ اور سچے مسلمان ہونے کے باعث ایمان کے اس عظیم درجے پر فائز ہیں کہ تعصب، جمود اور تنگ نظری سے بالاتر ہو چکے ہیں۔ وہ مسلمانوں کے فکری جمود کو ختم کر کے ان میں ذہنی تبدیلی لانے کے لیے کوشاں ہیں اور مسلمانوں کو انسانِ کامل کے روپ میں دیکھنا چاہتے ہیں، ویسا ہی انسانِ کامل جس کی تلاش میں مولانا رومؒ نے کہا تھا: ع کز دام ودد ملولم وانسانم آرزوست (میں چوپایوں اور درندوں سے تنگ آ چکا ہوں اور مجھے انسان کی آرزو ہے) وہ مسلمانوں اور دنیائے اسلام میں انقلاب کے آرزومند ہیں۔ آپ خودشناسی کا درس دیتے ہوئے ان تمام خامیوں کے خاتمے کے آرزومند ہیں جو فکری کمزوری اور خستگی کا باعث ہیں، مثلاً شکستہ نفسی، لاابالی کی کیفیت، بے کاری، مستی، جبر، گوشہ نشینی، خودفراموشی اور پستی اور شکست پیدا کرنے والے نظریات ہیں۔ آپ ایسے پست سطح کے فلسفیانہ نظریات کو موت کے ہم معنی قرار دیتے ہیں۔ آپ کے کلام میں ہمیشہ حرکت، جنبش، کوشش، قوت، تہور، علو ہمتی اور کامیابی وکامرانی کی تعریف کی گئی ہے۔ آپ اس آیت مبارکہ ﴿لَيْسَ لِلْاِنسَانِ اِلَّا مَاسَعٰى﴾ کے مصداق زندگی کو جوش اور حرکت کی راہ پر چلاتے ہیں اور جوش وجذبے سے فرماتے ہیں: ؎

درین دریا چو موجِ بے قرارم　　اگر برخود نہ پیچم نیستم من

(میں اس سمندر میں ایک بے قرار لہر کی طرح ہوں، اگر اپنے آپ سے اُلجھ کر ایک حلقہ نہ بنالوں تو میں کچھ بھی نہیں۔)

یا یہ فرماتے ہیں کہ ع ''زندگی جہد است واستحقاق نیست'' (زندگی کوشش اور جہاد کا نام ہے اور یہ کسی کا استحقاق نہیں ہے۔) علامہ اقبال کی اہم ترین خدمت اس عہد میں

دین اسلام کی اہمیت کا پوری دنیا کے سامنے اثبات ہے۔ آپ نے دین کے احیائے علوم میں سخت محنت کر کے اپنی مشہور کتاب الٰہیاتِ اسلامی کی تشکیلِ نو "Reconstruction of Religious Thought in Islam" لکھ کر پانچویں صدی ہجری کے عظیم اسلامی مفکر امام محمد غزالی کی پیروی کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ استاد ڈاکٹر علی شریعتی نے آپ کو غزالیٔ ثانی کا خطاب دیا ہے۔

اپنے نظریات، شخصیت اور کلام کی رو سے علامہ اقبال نہ تو پاکستانی نظر آتے ہیں، نہ ہندی، نہ ایرانی اور نہ ہی ترک۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی طرح ان کا ملک اور رنگ ونسب سب کچھ ہی اسلام ہے۔ آپ وہ باخبر مسلمان ہیں جو مسلمانوں کی زبوں حالی پر پریشان اور غم زدہ ہیں۔ آپ چاہتے ہیں کہ مسلمانانِ عالم کے مرضِ مزمن اور مہلک بیماری کا علاج ہو سکے۔ آپ ان کو متحد کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کے دردمندانہ نغمات میں ایک بے ریا اور خالص دوا موجود ہے، جو اُن کے درد اور مرض کا تیر بہدف علاج ہے۔

اس اقتباس کے مطالعے سے بھی انقلاب کا تأثر نمایاں ہے اور امر حیرت ہے کہ شاہی حکومت کے ایک کارندے کی زبان پر بھی جناب علی شریعتی کا نام جاری ہے اور اقبال کی فکر کی وہ چھاپ نمایاں ہے جس کی وضاحت خالص ایرانی اسلوب میں جناب علی شریعتی نے فرمائی تھی۔ راقم الحروف کو ابھی تک اچھی طرح یاد ہے کہ جناب اورنگ کی کوششوں سے اس کانگرس کا ایک اہم اجلاس خانہ فرہنگِ ایران لاہور کے زیر اہتمام منعقد ہوا اور خانہ فرہنگ ایران لاہور علامہ اقبال کے نام سے موسوم ہوا۔ خانہ فرہنگ ایران نے علامہ اقبال کی بابت بے شمار مجلات اور کتب مہیا کر کے مفت تقسیم کیں۔ اس کانگرس کے موقع پر چھپنے والے کچھ مضامین (جو اس کتاب میں شامل ہیں) کے اقتباسات قارئین کی نذر کیے جا رہے ہیں۔

بلندیٔ شعرِ اقبال

یہ تقریر جناب ڈاکٹر جعفر محجوب کی تھی۔ آپ ان دنوں پاکستان میں ایران کے ثقافتی کونسلر تھے۔ آپ تہران یونیورسٹی اور دانش سرائے عالی آموزش معلم میں فارسی

کے پروفیسر تھے اور ملک الشعراء بہار کے شاگرد پروفیسر حسین خطیبی کے عزیز ترین شاگردوں میں سے تھے۔ راقم الحروف پر آپ کی خاص نظرِ عنایت تھی۔ آپ نے تہران جانے کے بعد دوبارہ تعلیم و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا اور راقم الحروف کی آپ سے لاہور، راولپنڈی اور پھر تہران میں کئی ملاقاتیں جذباتی ماحول میں ہوئیں۔ بعض نامساعد حالات کے باعث انقلاب کے بعد آپ کو پیرس جلاوطن ہونا پڑا۔ کئی برس قبل معلوم ہوا تھا کہ وہاں آپ عسرت و تنگ دستی کی زندگی گزار رہے تھے۔ آپ کی کتب ''سبک خراسانی''، ''تدوینِ دیوان ایرج مرزا'' اور کچھ دیگر کتب کے مطالعے سے اور آپ سے براہِ راست کسبِ فیض سے آپ کی علمی گہرائی کا پتا چلتا ہے۔ راقم الحروف کو آپ کا لیکچر (جس کے اقتباسات درج ذیل ہیں) براہِ راست سننے کا موقع نصیب ہوا تھا۔ آپ نے فرمایا:

> ''علامہ اقبال کی شہرت اور ہر دلعزیزی کے علاوہ آپ کے خوابوں کی تعبیر کی سچائی (جن کے بارے میں آپ نے ایمان محکم اور اعتماد سے اشارے کیے ہیں) آپ کی وفات کے بعد واضح ہونا شروع ہوئی تھی۔ آج علامہ اقبال اہلِ ذوق اور اہل علم کے دلوں میں ہی نہیں بلکہ فارسی بولنے والے ہر مردِ مسلمان کی روح اور جان میں بس رہے ہیں۔ اس پر بھی مستزاد یہ کہ آپ اسلام کے ہر فدائی کے دل میں زندہ ہیں، اور یہ حالت صدیوں تک قائم رہے گی۔

ہیچ کس رازے کہ من گویم نگفت   ہمچو فکرِ من دُرِ معنیٰ نہ سفت

(کسی بھی شخص نے وہ راز نہیں فاش کیا جسے میں نے بیان کیا ہے اور میری فکر کے مطابق کسی نے بھی معنی کے موتی نہیں پروئے۔)

سرِّ عیشِ جاودان خواہی بیا   ہم زمین ہم آسمان خواہی بیا

(ابدی سکون کا راز چاہتا ہے تو آ جا۔ زمین اور آسمان چاہتا ہے تو آ جا۔)

پیرِ گردون با من این اسرار گفت   از ندیمان رازہا نتوان نہفت!

(بوڑھے آسمان نے مجھے یہ راز بتائے ہیں اور ایسے راز اپنے ہم محفل ندیموں سے تو چھپائے نہیں جاتے۔)

ملاحظہ فرمائیں کہ شوق و جستجو کی کس قدر قوت اور ایمان کی بے کراں طاقت کو

لفظوں کے قالب میں ڈھال کر جان و دل کی دولت کا سامان مہیا کر رہے ہیں۔ آپ کے اشعار اس قدر بلند ہیں کہ مجھے یہ کہتے ہوئے ہرگز عار نہیں کہ آپ فردوسی، سنائی، عطار، رومی اور حافظ کے مرتبے کے عظیم شاعر ہیں۔ اقبال کی یہ خصوصیت کیا کم ہے کہ آپ ان عظیم بزرگوں کی وفات کے طویل عرصے بعد اس دنیا میں آئے اور تنہا ہی آسمانِ فکر و نظر پر پرواز فرماتے رہے ہیں۔ آپ نے اپنے زمانے کے مخصوص حالات اور مسائل کا حل پیش کیا ہے۔

جنابِ استاد کے نپے تلے الفاظ بھی انقلاب کی جانب اشارہ کرنے کو کافی تھے اور آپ کے خطاب سے یہ تو محسوس ہوتا ہی تھا کہ مستقبل قریب میں ایران میں کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔

زندگی و فلسفہ و نظریاتِ سیاسی انقلاب

یہ مقالہ جناب سید غلام رضا سعیدی کا تھا جو شاہ کے آخری ایام میں ایران کے اہم ادیبوں اور دانشوروں میں شمار ہوتے تھے۔ آپ کے مقالہ کے مطابق علامہ اقبال نے شاعری کو محض تفریحِ طبع کے لیے نہیں بلکہ عوام اور ملتِ اسلامیہ کو وجدان عطا کرنے کے لیے استعمال کیا۔ انہوں نے زندہ و جاوید اسلامی حقائق کی تشریح و تفسیر کو مقصدِ حیات بنایا تاکہ نور و ظلمت کے مابین جاری ابدی جنگ میں پردۂ ظلمات کو چاک کر کے ایمان و عرفان کی روشنی کو دنیائے اسلام میں پھیلایا جا سکے۔ خیر و شر کے اس مقابلہ و موازنہ میں آپ نے ''خلافتِ الٰہی'' کے موضوع پر بھی بحث فرمائی ہے۔ علامہ اقبال نے انسانی فطرت میں موجود عظیم ترین طاقت یعنی خودی کو علم و معرفت کی آمیزش سے ایک ایسی جہت عطا کی جس کے مطابق فکر و عمل اور عقل و بصیرت کی راہیں متعین کی جا سکتی ہیں۔ خدا کا خلیفہ دراصل اس دنیا کی روح ہے۔ وہ خدا کا سایہ ہے اور تمام امور کے کلی اور جزوی اسرار کا اصل راز دان ہے۔ وہ خدا کے فرمان کو اس زمین پر رائج کرتا ہے اور غیر اللہ کی اطاعت کی بساط کو الٹ دیتا ہے۔ وہ ایک نئے جہان کی تعمیر کرتا ہے، اس کے تصور اور ارادے سے دنیا میں نئے نئے نقوش اُبھرتے ہیں، اور اقبال ایسی ہی شخصیت کو ''مردِ

مؤمن'' کا خطاب دیتے ہیں۔ اس کی انفرادیت اور ہمہ گیر شخصیت اسے خدا کا مقرّب بنا دیتی ہے۔ وہ جہان میں گم نہیں ہوتا ہے' بلکہ جہان اس میں سما جاتا ہے۔ یہی مردِ کامل خدا سے اشتراکِ کار کا مقام حاصل کر لیتا ہے۔ انسانِ کامل کی خصوصیات عشق' استقامت' صبر' صداقت' اطاعت' استعداد اور خلاقیت ہیں۔

اس کے بعد آپ ''نظریاتِ سیاسی اقبال'' کے عنوان سے تحریر فرماتے ہیں کہ اگر چہ ۱۹۰۵ء (یورپ جانے سے پہلے) تک آپ وطنیت اور ہندوستان کی جغرافیائی وحدت اور قومی خصائص سے متاثر نظر آتے ہیں' لیکن ۱۹۰۸ء (وطن لوٹنے) کے بعد سے آپ وحدتِ عالمِ اسلامی کے داعی بن جاتے ہیں۔ اب آپ رنگ و نسل' طبقہ و قوم' قبیلہ اور معاشرتی حیثیت سے بالاتر ہو کر ملّتِ اسلامی کے مسائل کا حل پیش فرماتے ہیں۔ آپ کے ہاں توحید سے مراد انسانی معاشرے کا معنوی اور روحانی اتحاد ہے اور مشترک روابط اس کی اصل بنیاد ہیں۔

ایک روحانی اسلامی قیادت ہی توحید کی بنیاد پر ایک صحیح اجتماعی نظام قائم کر سکتی ہے۔ توحید ہی آئین کی بنیاد ہے اور ایک مشترک روحانی مرکز کا قیام بھی ضروری ہے۔ انہی بنیادوں پر کام کرتے ہوئے فطرت کی توانائیوں کی تسخیر سے اسلام کی لازوال شوکت و عظمت کا احیاء ممکن ہے جسے انحطاط اور زوال کے خطرات سے محفوظ رکھا جا سکے۔ آخر میں آپ امیر شکیب ارسلان کا ایک جملہ نقل فرماتے ہیں: ''ان ہزار برسوں میں عالمِ اسلام میں اقبال کے پائے کا کوئی عظیم اسلامی مفکر پیدا نہیں ہو سکا۔''

اسی کتاب میں آپ کا مقالہ ''روحِ فرہنگِ اسلام'' یعنی ''اسلامی ثقافت کی روح'' بھی موجود ہے' جس کے بارے میں ہم یہاں اختصار کے باعث مزید بحث کرنے سے معذرت خواہ ہیں۔

غرب و شرق در اشعارِ اقبال

یہ مقالہ جناب فریدون بدرہ ای کا ہے۔ اس کے مطابق ہمارے صوفیاء کے ہاں' خصوصاً مولانا روم کی زبان میں' مغرب سے مراد تاریکی اور ظلمت اور غروب آفتاب کی

سرزمین ہے اور مشرق سے مراد روشنی اور طلوع آفتاب اور مرکزِ اشراق و انوار ہے' لیکن علامہ اقبال کے ہاں مغرب سے مراد یورپ ہے' جہاں انسان ہی قوت اور طاقت کا منبع ہے اور وہی صاحبِ ارادہ و مختار ہے' لیکن مشرقی افکار کا سرچشمہ اسلام ہے اور اس کے مطابق انسان اشرف المخلوقات اور تمام موجودات کا نقطۂ اختتام ہے۔ تمام عالم وجود جو افلاک و عناصر پر محیط ہے اور اس کی علوی اور سفلی جہتیں انسان کی تخلیق کا پیش خیمہ ہیں' لیکن انسان کے تمام تر احترام کا سرچشمہ انسان کا خالق حقیقی سے رابطہ ہے اور اسی تعلق کی بنیاد پر زندگی' وجود' تاریخ اور تمدن کی اہمیت ہے اور یہی جوہر انسان کو دنیا میں خدا کا خلیفہ بنانے میں مددگار و معاون ثابت ہوتا ہے۔

غربیاں را زیرکی سازِ حیات　　شرقیاں را عشق رازِ کائنات
زیرکی از عشق گردد حق شناس　　کارِ عشق از زیرکی محکم اساس
شعلۂ افرنگیاں نم خوردہ ایست　　چشمِ شاں صاحب نظر دل مردہ ایست
زخمہا خوردند از شمشیرِ خویش　　بسمل افتادند چوں نخچیرِ خویش!
سوز و مستی را مجو از تاکِ شاں　　عصرِ دیگر نیست در افلاکِ شاں!
زندگی را سوز و ساز از نارِ تُست　　عالمِ نو آفریدن کارِ تُست

''اہل مغرب کے ہاں زندگی کے ساز و سامان کی اساس عقل ہے' لیکن اہل مشرق کا عشق کائنات کے سربستہ راز افشاء کرنے کی خصوصیت کا حامل ہے۔ عقل اگر کبھی حق کو پہچانتی بھی ہے تو عشق کے باعث' اور عشق کی بنیاد بھی کبھی کبھار عقل سے مستحکم ہوتی ہے۔ اہل یورپ کا شعلہ ٹھنڈا ہو چکا ہے' اگرچہ ان کی آنکھ روشن ہے لیکن دل مردہ ہے۔ وہ اپنی ہی تلوار سے زخم خوردہ ہیں اور شدید زخمی ہو کر اپنا ہی شکار ہو چکے ہیں۔ ان کے شراب میں نہ تو سوز و مستی ہے اور نہ ہی ان کے آسمانوں سے نئے جہان دریافت ہو سکتے ہیں۔ اے اہل مشرق! زندگی کا سوز و ساز تمہاری آگ اور گرمی کا مرہون منت ہے اور نئے جہانوں کی بنیاد رکھنا تمہارا ہی کام ہے۔''

علامہ اقبال نے اہل مشرق کو جو فخر عطا کیا ہے اس نے اہل مشرق کو ایک اعتماد اور

جرأت وعمل کی راہوں کا ذوق عطا کیا ہے اور انہیں مغرب کے چنگل سے رہائی کی راہ دکھائی ہے۔

پیام اقبال (مشرق کا عظیم مفکر)

یہ مقالہ جناب احمد احمدی بیر جندی (مشہد) کا تھا۔ آپ کے مقالہ کے مطابق علامہ اقبال کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ ایک عظیم تحقیقی اور اجتہادی کاوش ہے اور آپ کی سرزمینِ ایران اور وہاں کے افکار سے محبت کا مظہر ہے۔ اس مقالہ میں علامہ تحریر فرماتے ہیں کہ ''ایران کے عوام کا سب سے اہم فکری اور روحانی امتیاز فلسفیانہ تصورات میں ان کی گہری دلچسپی ہے۔'' آپ نے اپنی ہم مذہب مشرقی اقوام کو خطاب کیا ہے اور انہیں بیداری کا پیغام دیا ہے۔ آپ کے نظریات کے مطابق آزادی انسان کا بنیادی حق ہے اور وہ اسی ماحول میں زندہ رہ سکتا ہے جس میں اسے کسی کی غلامی پر مجبور نہ کیا جائے۔ انہیں رسول اللہ ﷺ سے دلی عقیدت تھی۔ آپ کا ملتِ ایران اور فارسی زبان سے مضبوط تعلق تھا۔ آپ نے جمال الدین افغانیؒ کی طرح مسلمان اقوام کو استعماری اور سامراجی نوآبادیاتی نظام کے شکنجے سے آزاد کروانے کی جنگ لڑی اور وحدتِ عالم اسلامی کی راہ ہموار فرما دی۔ آپ نے اسلام کے ابدی مساوات کے اصولوں کا درس دیا۔ علامہ اقبال نے مشرق کے مظلوم عوام کو اُمید اور جرأت عطا کی:

نشود نصیب جانت کہ دمے قرار گیرد   تب و تابِ زندگانی بتو آشکار بادا

(خدا کرے کہ تیری جان کو ایک لمحے کا سکون بھی نصیب نہ ہو اور زندگی کے تب و تاب کا راز تم پر آشکار ہو جائے۔)

تپش است زندگانی، تپش است جاودانی   ہمہ ذرّہ ہائے خاکم دلِ بے قرار بادا

(تڑپنے کا نام ہی زندگی ہے اور تڑپ ہی حیاتِ جاوید کا راز ہے۔ خدا کرے کہ میری مٹی کے ہر ذرے کو بے قرار دل کی صورت عطا ہو جائے۔)

آج ہم اس مقام پر اور اس جگہ (یعنی مشہد) پر اقبال کی یاد میں اپنی آواز بلند کر رہے ہیں۔ ہماری آرزو ہے کہ ہمارے ہم وطن ایرانی جہاں بھی ہوں اقبال کی آتشِ

نغمات پر توجہ مبذول کر دیں اور آپ کے اشعار کی آگ سے اپنی جانوں میں روشنی اور گرمی پیدا کریں۔ ہم اس دن کی امید میں جی رہے ہیں جب ایرانی قوم اقبال کے شعر وفکر سے صحیح معنوں میں آشنا ہو سکے گی (یاد رہے کہ یہ پیغام انقلاب سے ایک دو برس قبل کا ہے)۔

اس کے علاوہ اس مجموعے میں دیگر مضامین کی بھی بھرمار ہے۔ یہاں ہمارا مقصد صرف یہ واضح کرنا تھا کہ انقلاب سے قبل ایران میں سرکاری سطح پر بھی علامہ اقبال کے بارے میں کام ہو رہا تھا اور تمام دانشور اور ادباء آپ کے کلام کی روح سے آشنا ہو چکے تھے اور آپ کا پیغام علمی محفلوں میں عام ہو رہا تھا۔ جناب فضل اللہ رضا (جو اُن دنوں شاہی ایران کے اقوام متحدہ کے ادارے یونیسکو میں مستقل مندوب تھے اور اقبال شناسی میں بین الاقوامی شہرت کے حامل تھے) کی کتاب ''محمد اقبال'' ہمارے ہاتھوں میں ہے' جو موصوف نے پیرس میں تحریر فرمائی تھی اور تہران سے شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب میں علامہ اقبال کے حالاتِ زندگی کے علاوہ آپ کے مختلف فکری پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اس کتاب کا ایک اہم باب بت شکنی پر ہے' ایک آپ کی اسلامی فکر کے بارے میں ہے اور آخری باب کا عنوان ہے ''آزادی ووارستگی''۔ اس باب میں مؤلف رقمطراز ہیں کہ جن لوگوں نے علامہ اقبال کو اس دور کا اہم ترین اسلامی مفکر قرار دیا ہے انہوں نے کسی مبالغہ آرائی سے کام نہیں لیا۔ ان کی سب سے اہم چیز جو قارئین کے دلوں کو موہ لیتی ہے' وہ سادگی اور آزادگی ہے۔ وہ ایک ایسے درویش اور عظیم صوفی منش انسان تھے جو زر و دولت اور مال و جاہ کی آرزو سے مبرا تھے۔ وہ ایک سادہ سے گھر میں چند کتابوں اور سوچوں کی دنیا کے ہمراہ زندگی گزار رہے تھے۔ وہ زیادہ سوچتے اور پڑھتے تھے اور کم لکھتے تھے۔ آخری لمحاتِ زندگی میں بھی فارسی شعر کہہ کر انہوں نے خود کو نظریاتی اعتبار سے ایک ایرانی فلسفی اور فارسی شاعر ثابت کر دیا۔ آپ کا اصل سرمایہ آپ کا تقویٰ تھا۔ آپ نے ایک شکست خوردہ اور مضمحل انسان کی طرح مغرب کی چکا چوند کرنے والی روشن تہذیب کے سامنے نہ تو احساسِ ندامت کا اظہار کیا اور نہ ہی خود کو بے مایہ اور حقیر

تصور کیا۔ آپ ایک دلیر شاعر تھے جنہوں نے عوام کو حرکت اور جرأت کا راستہ دکھایا اور نئے جہان کی تلاش میں سرگرم کیا۔ آپ نے ثابت کیا کہ مغربی تہذیب اور ہوسِ مال وزر زندگی کا مقصد نہیں۔ آپ نے اسلام کے تہورانہ پہلوؤں کی نشاندہی اس انداز میں کی کہ یوں محسوس ہوتا تھا کہ اسلام کے ابتدائی دور کے مجاہدین کی تلوار کے ٹکرانے کی آوازیں اور چکاچوند چمک ان کے سامنے تھی۔ میری زندگی کی یہ آرزو رہی کہ آپ کے نظریات اور افکار کو ایران میں روشناس کرواسکوں' تاکہ آزادی کا درس اور اسلامی ثقافت کے نقوش اس غیور ملت کے سامنے واضح ہوسکیں۔

تا تو بیدار شوی نالہ کشیدم ورنہ
عشق کارے است کہ بے آہ وفغاں نیز کنند

(میں نے یہ آہیں اس لیے بھریں اور اپنا نالہ بلند کیا کہ تو بیدار ہو سکے ورنہ عشق تو ایسا کام ہے کہ آہ وفغاں کے بغیر بھی ممکن ہے۔)

انقلاب کی آمد آمد

اب انقلاب کی آمد آمد تھی۔ اقبال کا کلام مصدق جیسے محبّ وطن کی آواز میں عوام کے دلوں کی دھڑکن بن چکا تھا۔ بہار' خطیبی اور جعفر مجوب جیسے ادباء اور اساتذہ کے توسط سے آپ کا پیغام اہل علم وادب وشعر کی محفلوں میں گونج رہا تھا' صادق سرمد جیسے عظیم قومی شاعر کی زبان سے ادا ہو کر عوامی شاعری میں سرایت کر چکا تھا' احمد سروش جیسے عوامی افراد کی زبان پر آپ کا کلام جاری وساری ہو کر لوگوں کے لبوں پر موجود تھا۔ اسی طرح حکومت' حزب مخالف' نوجوانوں کے گروہوں اور اخبارات ومجلّات میں اقبال کا کلام اپنے اثرات کے ہمراہ پورے طمطراق کے ساتھ موجود تھا۔ جناب علی شریعتی کے خطبات کی گرمی اور چاشنی اقبال کے شعر وفکر پر قائم تھی اور اقبال کے انقلابی نغمات ہر طرف گونج رہے تھے۔ راقم الحروف کو کئی نوجوانوں نے بتایا کہ ہم لوگ ایک عرصہ تک تو علامہ اقبال کو ایران کا فرزند ہی سمجھتے رہے ہیں اور ہمیں صرف اقبال لاہوری کے نام میں لاہور کے لفظ پر تعجب ہوتا تھا۔ اور کچھ نوجوان تو واقعی لاہور کو بھی ایران کے نقشے میں تلاش کرنے کی

کوشش میں مگن تھے۔ حقیقت تو یہ تھی کہ علامہ اقبال قیودِ زمان و مکان سے آزاد تھے‘ آپ استبداد‘ شخصی بادشاہت کے فرعونی نظام اور استحصال کے دشمن تھے۔ آپ روشنیوں کے امین تھے اور یہ روشنی ملت ایران کے رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی۔ واقعی اس خستہ حال اور دبی ہوئی قوم کو ایک روشنی‘ گرمی‘ حرارت اور نغمے کی ضرورت تھی۔

باضعیفان گاہ نیروے پلنگان می دہند　　　شعلۂ شاید برون آید ز فانوسِ حباب!

انقلاب! انقلاب! اے انقلاب!

(کبھی کبھی کمزوروں کو شیروں کی طاقت عطا ہو جاتی ہے اور بلبلوں کے فانوس سے شعلے اٹھنے لگ جاتے ہیں۔ انقلاب! انقلاب! اے انقلاب!)

دراصل علامہ اقبال کے کلام کی ایران میں ترویج اور اشاعت ہمیں مشیت ایزدی محسوس ہوتی ہے‘ کیونکہ ایران میں شاہی ادوار میں اس طرح کے انقلابی خیالات کا اظہار قطعی طور پر ناممکن تھا اور اگر یہی خیالات کسی ایرانی مفکر نے پیش کیے ہوتے تو اسے یا تو ختم کروا دیا جاتا یا اس کی کتب کو تلف کروا دیا جاتا۔ علامہ اقبال ایران سے باہر لاہور میں اپنے کلام و افکار کو مرتب فرماتے رہے اور جب اقبال کے شعری مجموعے ایران پہنچنا شروع ہوئے تو ساوک اور شاہ کے کارندوں نے شروع شروع میں اسے کسی ہندی یا پاکستانی شاعر کی عاشقانہ غزلیات اور نغمات سمجھ کر ان سے تعرض کیا۔ پھر پاکستان کی جانب سے سرکاری طور پر بھی فکرِ اقبال کی ترویج ہوئی۔ ایران میں روشن فکر علماء اور نوجوانوں نے آہستہ آہستہ اس فکر میں انقلاب کی روشنی دیکھنا شروع کی اور انہیں اپنے ذہن و قلب کے دریچے کھلتے ہوئے نظر آنا شروع ہوئے۔ کمیونسٹوں نے فکرِ اقبال کو اپنے زاویۂ نگاہ سے لینا شروع کیا اور خالص خانقاہی اور مذہبی حلقوں کو اس میں اپنی مرضی کا مواد ملنا شروع ہوا۔ اسی طرح ڈاکٹر شریعتی جیسے دانشوروں کو اپنے افکار کی وضاحت کے لیے ایک سرچشمۂ فکر عطا ہو گیا۔ پھر فکر اقبال کے وہ پہلو بھی واضح ہونا شروع ہوئے جو برصغیر کے مفکرین اور شارحین اقبال کی نگاہوں سے ابھی تک اوجھل رہے تھے۔ سرکاری سطح پر بھی کلامِ اقبال کی مسلسل اشاعت ہوتی رہی۔

ایک چیز جو ہمیں متاثر کرتی ہے، وہ یہ کہ علامہ اقبال جب شعر کہتے ہیں تو ہمیں ایک خالصتاً ایرانی شخصیت کے روپ میں نظر آتے ہیں۔ بقول سروش عرفانی اگر ہم تناسخ روح کے قائل ہوتے تو ہم کسی ایرانی شاعر یا مفکر خصوصاً امام غزالیؒ کا دوسرا جنم اقبال کی صورت میں دیکھ سکتے تھے۔ لیکن چونکہ ہم ان کافرانہ نظریات کے منکر ہیں، اس لیے ہمیں کہتے ہوئے عار محسوس نہیں ہوتی کہ علامہ اقبال الہامی کیفیت میں شعر کہتے تھے اور الہام کی حالت میں آپ خود کو ایران میں محسوس فرماتے: ؎

من از بود و نبودِ خود خموشم اگر گویم کہ ہستم خود پرستم
ولیکن این نوائے سادۂ کیست کسے در سینہ می گوید کہ ہستم

(میں اپنے ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں کوئی رائے نہیں دے سکتا۔ اگر کہوں کہ میرا وجود ہے تو مجھ پر خود پرستی کا الزام آ جائے گا، لیکن یہ معلوم نہیں ہو رہا کہ سادہ سی آواز جو میرے اندر سے اٹھ رہی ہے، وہ کس کی ہے۔ کوئی نہ کوئی میرے سینے میں موجود ضرور ہے جو یہ کہہ رہا ہے کہ میں ہوں اور موجود ہوں۔)

یہاں پر ہمیں منوچہر طالقانی کے چند اشعار بیان کرنے میں کوئی قباحت دکھائی نہیں دیتی:

من عارفے و عالمے و سائسے بزرگ چون حضرتش بہ عرصۂ دوران ندیدہ ام

(میں نے حضرت اقبال کے پائے کا کوئی اس قدر عظیم عارف، عالم اور سیاستدان شخص اس دور میں نہیں دیکھا ہے۔)

بیشک بہ دورِ فتنۂ عصرِ روان ازو آگہ ترے بہ مسلک قرآن ندیدہ ام

(بلاشک وتردید اس موجودہ دَور کے فتنہ و آشوب میں آپ سے بڑھ کر مسلک قرآن کا رازدان مجھے کوئی نظر نہیں آیا۔)

شعرے کہ شاعرش نبود پارسی زبان اینساں روان چوں چشمۂ حیواں ندیدہ ام

(ایک ایسے شاعر کا فارسی شعر میں نے آبِ حیات کے چشمے کی طرح رواں کبھی نہیں دیکھا جس کی مادری زبان فارسی نہ ہو۔)

اسی طرح ہم جناب علی صدارت نسیم کے چند اشعار یہاں پیش کرتے ہیں:

شاہبازے کہ زیرِ شہپرِ او باختر تا بہ خاوران دیدم
(اقبال وہ شاہین ہیں جن کے پروں تک مشرق سے مغرب تک کی سرزمین ہے۔)

زیرِ ہر بیتے از سفینۂ او ژرفِ دریائے بیکران دیدم
(آپ کے کلام کے ہر شعر کی گہرائی میں مجھے ایک بیکران اور گہرا سمندر نظر آتا ہے۔)

فرخا' کاروانِ نہضتِ شرق کہ وز امیرِ کاروان دیدم
(مشرق کی تحریک آزادی وحریت کا کاروان مبارک ہو' جس کا میر کارواں مجھے اقبال کی صورت میں نظر آتا ہے۔)

دودمانے است خاور و او را سرو سالارِ دودمان دیدم
(مشرق ایک خاندان ہے اور آپ اس خاندان کے سربراہ اور سالار ہیں۔)

مجدِ اسلام و رستگارئے شرق در جہان اینش آرمان دیدم
(آپ کی دلی خواہش یہی تھی کہ اس جہان میں اسلام کا احیاء ہو اور اس کی عظمت کا دور دورہ ہو کر مشرق غلامی اور استبداد کے شکنجوں سے نجات پا سکے۔)

شرق را زد صلائے استقلال رستخیزے بپا از آن دیدم
(آپ نے مشرق کو آزادی کا جو درس دیا تھا اس کے باعث ایک قیادت برپا ہو چکی ہے۔)

خاکِ لاہور را بہ اقبالش برمہ و ہور سرگران دیدم
(آپ کے بلند اقبال کے باعث لاہور کی خاک بھی چاند اور سورج سے زیادہ عظیم ہو چکی ہے۔)

اسی طرح انقلاب سے ذرا پہلے جناب کاظم رجوی نے اقبال کو بہترین الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے فرمایا:

گاہ با تجدیدِ افکارِ مسلمانی کند
چشمِ گیتی خیرہ از اسلام و از اعمالِ اُو

(آپ کبھی تو اسلام کے افکار کی تجدید کر کے دنیا کی آنکھ کو اسلام اور اس کے عقائد و اعمال کی روشنی سے خیرہ کر دیتے ہیں۔)

مے ستاید از دل و جان، دینِ حق مصطفیٰ

مے سپارد راہِ نیک مرتضیٰ و آلِ او

(آپ دل و جان سے رسول اللہ ﷺ کے دین کی تعریف و تمجید میں رطب اللسان ہیں اور پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ اور آپ کی آل کی پُر خطر راہوں کے مسافر بن کر میدانِ عمل میں نکل آتے ہیں۔)

روحِ او ایرانی است و گفتہ ہائش پارسی است

فیض ہا در یافتہ از چشمۂ سیالِ او

(آپ کی روح ایرانی ہے اور آپ کا کلام فارسی ہے، اسی لیے ہماری ملت ان کے چشمۂ زلال سے سیراب ہو رہی ہے۔)

مولوی و سعدی و حافظ تجلی کردہ اند

در ہمہ افکار و در آمال و در امیالِ او

(آپ کے تمام افکار، آرزوؤں اور جذبات میں مولانا رومؒ شیخ سعدی شیرازیؒ اور حافظ شیرازیؒ کی تجلیات عود کر آتی ہیں۔)

حکمتِ یزدانی ایران زمین چون مطلعے است

کز ہمانجا شد فروزان اخترِ اقبالِ او

(ایران کی اسلامی اور خدائی حکمت ایک مطلع کی طرح ہے، جہاں سے علامہ اقبال جیسا چمکتا ہوا ستارہ طلوع ہوا ہے۔)

مندرجہ بالا اشعار کے مطالعہ سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اقبال کی وفات کے چالیس برس بعد (۱۹۷۸ء کے لگ بھگ) آپ کی ایرانی روح ایران میں اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہو چکی تھی اور آپ کا کلام ایران کے کونے کونے میں ہر جگہ پہنچ چکا تھا۔ یہاں ایک دلچسپ واقعے کا ذکر دلچسپی کا باعث ہوگا۔ راقم الحروف کو ایران جانے سے قبل جناب عرفانی مرحوم نے بتایا ہوا تھا کہ ایرانی قوم میں بہائیت کے خلاف

جو نازک جذبات موجود ہیں ان کے باعث وہاں کسی بھی محفل میں طاہرہ قرأۃ العین (ایک مشہور بابی شاعرہ) کا ذکر مناسب نہیں ہوگا۔ ہر چند کہ ایران میں طاہرہ کے اشعار کو چھپنے نہیں دیا گیا' لیکن مشہور بہائی مصنفہ مارتھا روٹ (امریکی خاتون) نے اس صدی کے آغاز میں طاہرہ کی شخصیت اور کلام پر تحقیق کے سلسلے میں چپکے سے ایران اور ہندوستان کا سفر کیا تھا اور اپنے قزوین میں قیام کے دوران اس کے ہاتھ طاہرہ کی کچھ نادر قسم کی غزلیات بھی لگی تھیں' جنہیں اس نے اپنی انگریزی کتاب ''طاہرہ'' کے اختتام پر شامل کیا ہے۔ وہ لکھتی ہے کہ بمبئی میں اس کی ملاقات سروجنی نائیڈو سے ہوئی اور سروجنی نائیڈو نے اس سے طاہرہ کی غزلیات کو نقل کرنے کی اجازت طلب کی جو موصوفہ نے مشہور فارسی شاعر ڈاکٹر سر محمد اقبال کی خدمت میں پیش کرنا تھیں۔ یہ غزلیات جب علامہ تک پہنچیں تو آپ نے ان کے پس منظر میں طاہرہ کی بے چین روح کا ''جاوید نامہ'' میں ذکر کرتے ہوئے اس کی مشہور غزل نقل کی جس کا مطلع ہے:

گر بتو افتدم نظر چہرہ بہ چہرہ رو بہ رو
شرح دہم غم ترا نکتہ بہ نکتہ مو بمو

(اگر میری نظر تجھ پر اس طرح پڑے کہ میں تیرے روبہ رو ہوں اور تیرے چہرے کے سامنے میرا چہرہ ہو تو میں تمہیں اپنے غم کی بابت اس طرح شرح وبسط سے بیان کروں کہ تمام نکات اور رموز واضح ہو جائیں۔)

اس مقام پر اقبال نے اسے غالب اور حلاج کے ہمراہ ایک ایسی روح قرار دیا ہے جسے جنت تو نصیب نہ ہوئی لیکن حیاتِ جاودان حاصل ہوگئی۔ یہ ذکر آپ نے ''جاوید نامہ'' میں کیا ہے۔ راقم الحروف نے مقدور بھر اس کا ذکر کرنے سے تعرض کیا۔

انہی دنوں (۱۹۷۸ء میں) حیدرآباد سندھ کے فارسی کے مشہور پروفیسر جناب حضور احمد سلیم بھی تہران کا دورہ فرما رہے تھے اور ہم اکٹھے ہی کتاب خانہ ملی (قومی لائبریری) پہنچے' جہاں ہماری راہنمائی عبداللہ لک مظاہری (سابق کلچرل کونسلر ایران در اسلام آباد) نے فرمائی۔ یہ ایک عظیم ترین کتاب خانہ ہے جہاں قلمی نسخوں اور نادر کتب

کے انبار موجود ہیں۔ یہاں ہماری ملاقات ایران کے مشہور فلسفی جناب عبداللہ انوار مشکوٰۃ سے ہوئی، جن سے جناب عبداللہ آرین پور نے علامہ اقبال کے ڈاکٹریٹ کے مقالہ کے فارسی زبان میں ترجمہ میں مدد لی تھی۔ ان کے سامنے پروفیسر حضور احمد سلیم نے طاہرہ کی شاعری پر علامہ اقبال کے تبصرے کا ذکر کر دیا اور اس کی ''جاوید نامہ'' میں موجود غزل کے بارے میں گفتگو شروع کر دی۔ جناب انوار مشکوٰۃ تو ایک دم غصے سے آگ بگولہ ہو گئے اور کہنے لگے ہاں اقبال نے اس کافرہ کی تعریف کی ہے اور اس بابی عورت کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ اس موقع پر کتاب خانہ میں موجود بہت سے اسکالر بھی علمی شور سن کر جمع ہو گئے۔ جناب مشکوٰۃ نے اقبال کے ڈاکٹریٹ کے مقالہ پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ آخر میں آپ نے یہ کہا ہے کہ ایرانی قوم اب مایوسی کا شکار ہو کر بہائیت کی جانب مائل ہو رہی ہے اور یہ کہ اقبال ایک عظیم شاعر ضرور تھے مگر فلسفی ہرگز نہیں تھے۔ راقم الحروف نے دیکھا کہ حاضرین ان کی علامہ اقبال پر تنقید پر سیخ پا ہو رہے ہیں اور بالآخر ضبط کا بندھن ٹوٹا تو نوجوان اسکالرز نے جناب مشکوٰۃ کو خاموش کروا دیا اور کہا کہ آپ اقبال لاہوری کی شان میں گستاخی سے باز رہیں اور عظیم شاعر مشرق کے بارے میں زبان مت کھولیں۔ اس پر ناچیز نے ۱۹۰۵ء۔۱۹۰۸ء کے ایران کے حالات اور قاچاری دور کے آخر کی سیاسی اور سماجی صورت حال کا ذکر کرتے ہوئے اس مایوسی کی جانب توجہ دلائی جس دور میں جرمنی اور انگلستان میں بیٹھ کر اقبال فکر ایرانی کے احیاء کی بات کر رہے تھے، اور پھر اقبال کے وہ اشعار سنائے جو انہوں نے بہاء اللہ کی نبوت کی مخالفت میں کہے تھے اور کہا کہ آپ نے تو طاہرہ کی بے چین روح کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ اس کی بے چین روح غلامی اور گھٹن کے ردعمل کے طور پر تاریخ کے ایک نازک دَور میں ایک احتجاجی صدا کی صورت میں اُبھری تھی اور پھر طاہرہ نے حلاج کی طرح اپنی بات پر ڈٹ کر برملا موت کا گھونٹ پی لیا لیکن وہ اپنی باغیانہ آواز کو دبا نہ سکی۔ ہم اس کے افکار پر نہیں بلکہ اس کے اس فعل پر بحث کرتے ہیں جو غلامی کے خلاف ایک آن کی لہر کی صورت میں جلوہ گر ہوئی تھی؛ جس نے ایک عظیم طوفان کی صورت اختیار کر کے بادشاہت

کے وجود کے لیے ایک خطرناک چیلنج کی صورت اختیار کر لی تھی۔ تاہم ان سب پہلوؤں کے باوجود اقبال نے نہ تو اس کے مذہبی نظریات سے کبھی اتفاق کیا ہے اور نہ ہی اس کے شدت پسندانہ افکار و نظریات اور رجحانات کی تعریف کی ہے۔ ناچیز کے اس بیان کی حمایت تمام حاضرین نے کی، خصوصاً جب بیسویں صدی عیسوی کے ابتدائی دور کے ایران کے حالات کی منظر کشی کی گئی۔ اس موقع پر اقبال کے پیغام سے والہانہ عقیدت کا مظاہرہ دیکھنے میں آیا۔

اگلے دن دانش گاہِ آموزش معلّم میں جناب پروفیسر جعفر محجوب سے ملاقات ہوئی اور آپ سے گزشتہ روز کے واقعہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے گفتگو کی اور شکایت کی کہ آپ کے لاہور میں دیے گئے دسمبر ۱۹۷۷ء کے لیکچر (بلندیٔ شعر اقبال) کے برعکس جناب مشکوٰۃ کے خیالات سن کر دکھ ہوا تو انہوں نے بتایا کہ یہ ایک فردِ واحد کی رائے تو ہو سکتی ہے، خصوصاً جب ایک دم وہ بہائیت یا بابیت کے بارے میں کہے گئے کسی بھی جملے سے وقتی طور پر مشتعل ہو گیا ہو، اسے آپ ملت ایران کی رائے قرار نہیں دے سکتے، کیونکہ ملتِ ایران کی وہی رائے ہے جس کا اظہار میں نے لاہور میں کیا تھا۔ اور پھر مجھ سے پوچھا کہ کیا پاکستان میں ایک بھی ایسا شخص نہیں جو علامہ اقبال کے افکار کے تصورات کی تضحیک کا مرتکب نہ ہوتا ہو؟ تو ناچیز کا جواب تھا کہ ایسے کچھ لوگ تو بہر حال وہاں بھی موجود ہیں جو علامہ اقبال کے نظریات کو اب فرسودہ سمجھتے ہیں اور ناقابلِ عمل قرار دیتے ہیں۔ اس پر موصوف نے فرمایا کہ ایران میں پاکستان کے مقابلہ میں ایسے لوگ اور بھی کم ہوں گے، اور پھر فکرِ اقبال کے ایران پر موجود گہرے اثرات کے بارے میں مزید وضاحت کی۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، جناب پروفیسر جعفر محجوب، جناب محمد حسین خطیبی کے شاگرد تھے جو ملک الشعراء محمد تقی بہار کے شاگرد اور جانشین تھے اور یہ گروہ شروع سے ہی علامہ اقبال کا زبردست مداح اور مؤید تھا، اور بہار کے ہاں تو رسول اللہ ﷺ کے چاروں اصحاب (خلفائے راشدین) کی تعریف میں شعر ملتے ہیں اور آپ شیعیت صفوی کے اہم ترین ناقدین میں شمار ہوتے تھے اس لیے اس وسیع النظر اور کھلے دل والوں کے

غیر متعصبانہ مکتبہ فکر کی علامہ اقبال سے محبت اور لازوال عقیدت کی تو ان دنوں بات ہی کچھ اور تھی۔

اس ایک انفرادی واقعہ کے علاوہ ایران کے طول وعرض میں حضرت اقبال سے ایرانی قوم کے جوانوں، مفکرین، شعراء، صحافی حضرات اور صاحبانِ اقتدار کے حلقوں میں یکساں طور پر علامہ اقبال سے عقیدت کا ثبوت ملتا ہے، لیکن علامہ اقبال کی انقلابی روح ایک آتش مواج کی طرح ایرانی قوم کی نئی جہتوں کا تعین کر رہی تھی۔

انقلاب سے قبل جب حالات نے نازک رُخ اختیار کیا تو راقم الحروف بھی وہاں سے پاکستان واپس آ گیا۔ مجھے یہ کہنے میں قطعاً کوئی عار نہیں ہے کہ ایران کے بچے بچے کی زبان پر کلامِ اقبال جاری تھا اور یہ لوگ علامہ اقبال کے عظیم افکار کی روشنی میں اپنی قومی جہت کا تعین کرتے ہوئے اکثر ہمیں طعنہ دیتے تھے کہ ہم نے اقبال کے پیغام کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ یہاں مجھے ملا طاہر غنی کاشمیری کا وہ شعر یاد آتا ہے جس کا تکرار علامہ اقبال نے اپنی شاعری میں ''خطاب بہ نوجوانانِ اسلام'' میں کیا ہے:

غنی روزِ سیاہِ پیر کنعاں را تماشا کن
کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را!

(غنی اس بدقسمت پیر کنعاں یعنی حضرت یعقوبؑ کا حال دیکھ جن کی آنکھوں کا نور چھن کر زلیخا کے گھر کی روشنی میں تبدیل ہوگیا ہے۔)

❁ ❁ ❁

برصغیر میں شیعیت کا فروغ

مغلیہ دَور

مغلوں کے ابتدائی دَور میں ہمیں دکّن کی تین ایسی ریاستوں کا وجود ملتا ہے جو گولکنڈہ، بیجاپور اور احمد نگر سے موسوم تھیں۔ یہاں کے شیعہ حکمران سیاسی اور مذہبی اعتبار سے ایرانی صفوی بادشاہوں کے مکمل طور پر وفادار تھے اور وہاں پر صفوی بادشاہوں اور ائمہ دوازدہ کے نام ہی کا خطبہ منابر مساجد پر پڑھا جاتا تھا۔ یہ حقیقت بھی دل کو لگتی ہے کہ یہاں پر بھی صفوی طرز کی ملوکیت مبنی بر عقائد شیعہ صفوی رائج تھی اور سنیوں کا استیصال یہاں کے مقامی حکمرانوں کے ہاں بھی مروج تھا۔ اسی وجہ سے مغل بادشاہ اور ان کے دربار اور افواج کے سُنّی سردار اِن ریاستوں کے وجود سے برافروختہ تھے اور وہ سرزمینِ ہند میں صفوی بادشاہت کے وفادار حکمرانوں کو سیاسی اور فوجی اعتبار سے زیر کرنے کے درپے تھے۔ بالآخر شاہجہاں کے دور میں پے درپے فوجی مہمات کے نتیجہ میں انہیں عملی طور پر ختم کر دیا گیا۔ یہ ایک منطقی امر تھا کہ اس کے بعد صفویوں اور مغلوں کے تعلقات سردمہری کا شکار ہو گئے، لیکن کثیر تعداد میں برصغیر کے مختلف خطوں میں شیعہ احباب باقی رہ گئے جن کے ذہنوں پر صفوی طرز کے عقائد چھائے رہے۔ اسی طرح مغلوں کی آمد سے تھوڑا عرصہ قبل کشمیر میں بھی چک بادشاہوں کی متعصب شیعہ حکومت قائم تھی۔ یوسف شاہ چک اس سلسلے کا آخری تاجدار تھا جسے اکبر نے زیر کیا اور کشمیر پر قبضہ کر کے اسے وہ ہندوستان لے آیا۔ مغلوں کے مقابلے سے یوسف شاہ کی فوج کے سُنّی دستوں نے جنگ میں مغلوں کا ساتھ دے کر شیعہ کشمیری فوج کی شکست کو یقینی بنایا تھا، پھر مرکزِ کشمیر میں شیعہ آبادی کا دباؤ کم ہو گیا اور یہ لوگ کارگل، سکردو اور گلگت کے دور افتادہ علاقوں میں باقی رہ گئے۔

ہمایوں کے ہمراہ ہندوستان آنے والے ایرانی فوجیوں کا ذکر گزر چکا ہے۔ یہ لوگ شمالی ہندوستان میں مختلف شہروں میں مرتکز ہو کر چھوٹے چھوٹے گروہوں (pockets) کی شکل میں باقی رہ گئے۔ یہ برصغیر میں موجود دراصل چھوٹے چھوٹے ایرانی جزائر تھے جہاں یہ لوگ صفوی طرز کی روایتی شیعیت پر کاربند تھے۔ ان لوگوں کے حلقوں میں مجالسِ عزاء کا انعقاد، تعزیہ نکالنا، علم اور ذوالجناح کے جلوس اور عاشورہ کے ماتم کے مناظر پورے طمطراق اور مذہبی عقیدت سے دیکھے جا سکتے تھے۔ مغلیہ دور میں مقامی سنی آبادی ان سے کوئی معاندانہ رویہ نہیں رکھتی تھی، بلکہ ان لوگوں سے یک جہتی کا اظہار کیا جاتا تھا۔ اس دور میں فرقہ وارانہ تعصب کم از کم مغلیہ ہندوستان میں کہیں نظر نہیں آتا (ماسوائے اِکا دُکا معمولی واقعات کے جو قابل ذکر نہیں ہیں)۔ اس آبادی کی مذہبی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ایران سے علماء و مجتہدین بھی آتے رہے اور انہوں نے ایرانی مذہبی گروہ سے بھی اپنے روابط برقرار رکھے۔

مغلیہ خاندان میں بہت سی ایرانی خواتین بیاہ کر لائی گئی تھیں۔ ان میں سے سب سے زیادہ مقتدر نورالدین محمد جہانگیر کی ملکہ نور جہاں اور شاہجہاں کی اہلیہ ممتاز محل ہیں (جو پھوپھی بھتیجی بھی تھیں)۔ ان خواتین کے خاندان کے عمائدین اعلیٰ عہدوں پر تعینات تھے۔ نور جہاں کے والد مرزا غیاث الدین تہرانی وزیر اعظم ہند کے عہدے پر فائز رہے ہیں۔ ان کے بیٹے آصف الدولہ (جن کا مزار شاہدرہ میں ہے) پنجاب کے گورنر اور اعلیٰ عسکری عہدوں پر فائز رہے ہیں۔ مغلوں کے ان سسرالی عزیزوں کا اقتدار ہمیں تاریخ کے دھندلکوں میں اپنی آب و تاب کے ساتھ نظر آتا ہے۔ یہ لوگ عملی طور پر شیعہ عقائد کے پابند رہے اور محلات میں اپنی مذہبی رسوم پورے جوش و جذبے سے ادا کرتے رہے، اور کبھی کبھی اعلانیہ بھی مذہبی تقریبات کا اہتمام کرتے رہے۔ ایران سے آنے والے علماء و مجتہدین کو بھی ان کی سرپرستی حاصل رہی۔

کئی وجوہات کے باعث (جن کا ذکر گزر چکا ہے) مغلیہ عہد میں ایرانی شعراء و ادباء دربارِ ہند کا رخ کرتے رہے۔ ان میں سے کچھ لوگ مثلاً نظیری نیشاپوری آہستہ

آہستہ سنی عقائد اختیار کر گئے اور یہیں بس گئے' مگر کچھ لوگ جیسے مشہور فارسی شاعر عرفی شیرازی (جن کی شاعری کی تعریف علامہ اقبال نے کی ہے) بدستور کٹر شیعہ عقائد کے پیروکار رہے۔ ہر چند کہ وہ لاہور میں وفات پا کر مدفون ہوئے' مگر ان کی وصیت کے مطابق ان کی ہڈیاں نجف لے جا کر دفن کی گئیں۔ شعراء و ادباء کے علاوہ وزراء اور فوجی سردار بھی ایران سے آتے رہے۔ یہ لوگ بھی اپنے عقائد پر نہ صرف کاربند رہے بلکہ کسی حد تک ان کا اثر ورسوخ عوام الناس پر ہونے کے باعث یہ لوگ برصغیر میں شیعیت کی ترویج میں مددگار ثابت ہوتے رہے۔

یہ وہ وجوہات تھیں جن کے باعث یہاں شیعیت کو فروغ حاصل ہوا۔ ہر چند کہ انہوں نے ہند کی غیر متعصّبانہ فضا میں رہتے ہوئے آہستہ آہستہ کسی حد تک اپنے خیالات میں مصلحتاً یا دانستہ طور پر نرمی پیدا کر لی' مگر صفوی اثرات کا کچھ نہ کچھ اثر ان پر باقی رہا۔

مغلوں کے زوال کے زمانے میں برصغیر میں سنی شیعہ اختلافات سر اٹھانے لگے اور نوبت کھلی جھڑپوں اور ایک دوسرے کی تکذیب و تکفیر تک آن پہنچی۔ اس مکدر فضا کو ختم کرنے میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ پیش پیش تھے' جنہوں نے شیعوں کو اسلام کا فرقہ قرار دے کر انہیں اُمت مسلمہ کا جزو قرار دیا۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے صاحبزادے شاہ رفیع الدینؒ اس حد تک آگے بڑھ گئے تھے کہ متعصب سنی علماء نے ان پر تشیع کا الزام لگایا تھا۔ اس کا ذکر ہمیں ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی کتاب ''برصغیر کی ملتِ اسلامیہ'' میں ملتا ہے۔

انگریزوں کا دَور

انگریزوں نے اپنے زمانۂ اقتدار میں دانستہ طور پر شیعہ سنی اختلافات کو ہوا دی۔ کئی مقامات پر ایرانی النسل شیعہ نوابوں کی سرپرستی میں دیسی ریاستیں بھی قائم ہوئیں اور اِکا دُکا اختلافات سامنے آنا شروع ہوئے' جس کے نتیجے میں کبھی کبھار لڑائی جھگڑے کی نوبت آتی رہی۔ یہ صورت حال یا تو شیعہ اکثریت کے علاقوں میں پیش آتی یا پھر اس جگہ جہاں شیعہ احباب کثیر تعداد میں ہوتے تھے۔ انگریز ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کی پالیسی پر عمل کرتے رہے' جبکہ ان کے ایجنٹ ملتِ اسلامیہ کے دونوں فرقوں میں نفرت

کے بیج بوتے رہے۔

انگریزوں کے دور میں ایک گہری سازش کے تحت برصغیر کے مسلمانوں کے ملتِ ایران سے سیاسی، سماجی، ادبی اور لسانی روابط منقطع کر دیے گئے اور برصغیر کے مسلمان ثقافتی اور لسانی اعتبار سے اہلِ ایران سے دور ہٹتے چلے گئے۔ ہرچند کہ زائرین ہندوستان سے ایران آتے جاتے رہے، مگر ان کی تعداد بہت کم تھی۔ یہ لوگ ایران میں مختصر قیام کے دوران اور پھر لسانی مشکلات کے باعث وہاں کے لوگوں سے زیادہ قرب حاصل نہ کر سکتے تھے۔

جنگل کے انقلاب کو کچلنے کے لیے جب انگریز فوج گیلان بھیجی گئی تو وہاں پر مرزا کوچک کے خیالات اور تحریروں سے متأثر ہو کر برصغیر کے بہت سے مسلمان فوجی باغی ہو کر مرزا کوچک کے لشکر سے جا ملے۔ یہ لوگ جذباتی ہندوستانی مسلمان تھے، جنہیں بعد میں مرزا کوچک کی حکومت اور تحریک کے خاتمے پر پکڑ کر بغداد لایا گیا اور پھانسی دے دی گئی۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران ایران میں تعینات مسلمان ہندوستانی فوجیوں نے تہران میں ''بزمِ اقبال'' کی بنیاد رکھی، جس کے پلیٹ فارم سے ایران میں فکرِ اقبال کی اشاعت ہوئی اور ایران میں اسلامی انقلاب کی بنیاد رکھ دی گئی۔

قیامِ پاکستان کے بعد

ایران میں شیعیت اصلاحی تحریکوں کے باعث مسلسل ارتقاء کے مراحل سے گزر کر عملی طور پر ایک متحرک قوت کے روپ میں قومی اور ملکی سیاست میں پوری طرح داخل ہو چکی تھی اور روشن فکر مصلحین کے اثرات وہاں کے عوام کے دلوں میں گہرے ہونا شروع ہو چکے تھے، مگر پاکستان کے شیعہ احباب ایران اور ہند کے مابین آہنی پردے کے باعث ان اصلاحی تحریکوں کے ثمرات اور اثرات سے لاعلم رہے تھے، اور ابھی تک ان پر صفوی دور یا زیادہ سے زیادہ ابتدائی قاچاری دور کے اثرات باقی تھے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ انگریزوں نے ایران اور برصغیر کے مسلمانوں کے درمیان اپنے دورِ اقتدار میں

ایک دبیز آہنی چادر (iron curtain) کے ذریعے دونوں اقوام کی ایک دوسرے سے مکمل طور پر علیحدگی قائم کر دی تھی۔ آپس کے لسانی، فکری، ادبی، سماجی اور مذہبی روابط عملی طور پر منقطع ہو چکے تھے۔ امتدادِ زمانہ سے فارسی کا ایرانی لہجہ تک برصغیر میں اب اجنبی ہو چکا تھا، جب کہ یہی لہجہ مغلیہ دور میں برصغیر میں مروّج اور متداول تھا، ورنہ نظیری، عرفی، صائب اور ابوطالب کلیم جیسے لوگ برصغیر میں آنے کے بعد یہاں کے ادبی حلقوں سے رابطے کی سہولت سے محروم رہ جاتے۔

اس دوران برصغیر کے شیعہ احباب ایک خوفناک اور مایوس کن فکری خلا سے گزر رہے تھے، کیونکہ ایرانی فکری سرچشمہ سے ان کے دل و دماغ کی آبیاری اب قطعی طور پر ناممکنات میں سے تھی اور بہت ہی کم تعداد میں زائرین کو ایران جانے کا موقع فراہم ہوتا تھا۔ ایک تو ان لوگوں کا قیام مختصر عرصہ کے لیے ہوتا، دوسرے یہ کہ زائرین کی اکثریت نیم خواندہ لوگوں پر مشتمل ہوتی تھی جو وہاں کی فکری تحریکوں سے واقفیت حاصل نہیں کر پاتے تھے۔ اس لیے ہمارے ہاں کے شیعہ احباب قنوطی اور قدیم روایتی صفوی شیعیت ہی کی قدرے تبدیل شدہ زوال پذیر فکری حالت پر قائم تھے۔ ان پر جمود کی کیفیت طاری تھی۔

قیام پاکستان کے فوراً بعد جب ایران سے ہمارے روابط ایک بار پھر استوار ہوئے اور لوگوں کی آمدورفت آزادانہ طور پر شروع ہوئی تو وہاں کی فارسی کے اجنبی لہجے اور فکری بُعد کے باعث شروع شروع میں باہمی رابطوں کے دوران زبردست مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ دونوں ممالک کے عوام کے مزاج اور طرزِ فکر میں جو تبدیلی آ چکی تھی اس نے دونوں قوموں کے درمیان ایک تناؤ پیدا کر رکھا تھا۔ برصغیر کے لوگ مغرب زدگی کے مراحل سے گزر چکے تھے، جبکہ ایرانی اپنی روایتی تاریخ کے تسلسل میں انقلاب اور اصلاح کی جانب گامزن تھے۔

تھوڑے عرصے کے لیے ایران جانے والے لوگوں کو جب وہاں کے بڑے بڑے شہروں میں جانا ہوتا تو خلاف توقع وہاں پر وہ مغربی تہذیب کی یلغار، میکدوں کی رونق

اور قمار خانوں کی چکا چوند روشنیاں دیکھتے۔ شراب وشباب کے کھیل، جن کی ہر طرح سے سرپرستی امریکی اور مغربی استعمار کی آلۂ کار پہلوی بادشاہت کر رہی تھی، اس کے شرمناک مظاہرے اہل ضمیر لوگوں کو ملول ومشوش کر دیتے۔ اکثر لوگ تو ظاہری طور پر یہ سمجھ بیٹھتے کہ ایران میں اب فحاشی، عریانی، اخلاقی انحطاط اور بے راہ روی کا عروج اور غلبہ قائم ہو چکا ہے اور اس قوم سے بہتری کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ حالانکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس تھی۔ عوام کی غالب اکثریت خصوصاً دیہی علاقوں کے لوگ اپنے سادہ مزاج، روایتی اقدار پر عمل کرنے اور مذہبی جذبات سے سرشار ہونے کے باعث اپنے ماضی کی عظیم اسلامی روایات سے منسلک تھے۔ روایتی علماء کے پراپیگنڈا کے باعث ضعیف الاعتقادی، توہمات اور مافوق الفطرت کہانیاں لوگوں کے ذہنوں میں ابھی تک رچی بسی تھیں۔ شہروں کے لوگ اور تعلیم یافتہ حضرات اگرچہ مغرب کے جدید فکر سے آگاہ ہو رہے تھے، مگر معاشرے میں مذہب سے گہری جذباتی وابستگی اپنی جگہ پر بہرصورت قائم تھی۔ پہلوی دور میں سرکاری سرپرستی میں زبردستی مغربی لباس، کلچر اور رہن سہن کو فروغ دینے کی جو بھی کوششیں ہو رہی تھیں، عامۃ الناس انہیں سخت ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھ رہے تھے۔ مغربی تہذیب وتمدن کے جبراً فروغ کے خلاف عوامی جذبات اکثر بھڑک اٹھتے تھے اور لوگ شاہی پولیس اور دیگر ایجنسیوں کے جبر واستبداد کا مقابلہ کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔ مولانا روم، سعدی، حافظ اور جامی کے اشعار کی بازگشت ابھی بھی سنائی دیتی تھی، مگر سرسری نظر دوڑانے سے لوگوں کو ایرانی قوم کے دلوں میں لپکتے ہوئے شعلوں کا علم نہیں ہو سکتا تھا۔ شاہ کی بدنامِ زمانہ خفیہ ایجنسی ''ساواک'' کی دہشت دلوں میں بیٹھی ہوئی تھی اور اس کے کارندوں کے خوف سے لوگ اجنبیوں کے سامنے زبان کھولنے سے پرہیز کرتے تھے اور زیادہ تر اشاروں اور کنایوں کی زبان استعمال ہوتی تھی۔ حق گوئی کے پیکر زیب دار ہو رہے تھے، مگر کانوں کان خبر نہیں ہوتی تھی۔

پاکستان سے جانے والے شیعہ احباب ایران میں فروغ پانے والے اخلاقی انحطاط اور ظاہری وضع قطع سے کچھ نہ کچھ باخبر تو تھے، اور اس پر اپنے کرب وملال کا چسکے

چسکے اظہار بھی کر رہے تھے' مگر اندرونِ خانہ آنے والی ذہنی اور فکری تبدیلیوں سے عموماً بے خبر تھے۔

انقلابِ اسلامی سے قبل کی تحاریک کو پہلوی دور میں پریس اور دیگر ذرائع ابلاغ اکثر چھپاتے رہے تھے۔ سرکاری سنسرشپ اور سختی کے باعث عموماً خبریں باہر نہیں آتی تھیں۔ سرکاری سطح پر حکومت پاکستان کے شاہی ایران سے روایتی دوستانہ اور برادرانہ تعلقات تو قائم تھے ہی' ہمارے ہاں بھی ایران کی شہنشاہیت کے ایوانوں کو خوش رکھنے کے لیے ایسی خبروں کو خفیہ رکھا جاتا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ایسی خبروں کا علم ہی ہمیں کم ہوتا تھا۔ یہ پردہ داری اور گہرا سکوت عظیم طوفان اور انقلاب کا پیش خیمہ تھا۔

شروع شروع میں جب انقلابِ اسلامی کی تحریک کی روزافزوں مقبولیت کی خبر پاکستان میں پہنچی تو پاکستان کے پڑھے لکھے لوگوں نے بڑی حد تک حیرت واستعجاب کا اظہار بھی کیا اور کچھ لوگ تو بڑی حد تک کنفیوژ بھی ہو گئے۔ انہیں یہ سمجھنے میں بڑا عرصہ لگا کہ یہ سب کچھ اچانک کیسے رونما ہو گیا کہ یکا یک ایران کے در و بام سے اللہ اکبر اور اسلام کی صدائیں آنے لگیں اور پہلی بار وہاں کے لوگوں کو اسلام سے جذباتی وابستگی اور شیفتگی کا ثبوت ملا' حالانکہ اس تحریک کے پس منظر میں ایک صدی کی محنت اور جوش و ولولہ تھا۔

ایران کے اسلامی انقلاب کی مکمل کامیابی سے تمام مذہبی حلقوں کو حیرت اور کسی حد تک خوشی ہوئی اور پاکستان کی غیر شیعہ مذہبی تنظیموں نے بھی اس پر اپنی خوشی کا برملا اظہار کیا' مگر ہمارے شیعہ احباب کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہ رہا۔ چونکہ ہمارے ہاں کے شیعہ حضرات نے اہلِ ایران کے ساتھ سو برس سے زائد عرصہ تک عظیم فکری سفر طے نہیں کیا تھا' اور وہ ایران کے موجودہ حالات سے لاعلمی کے باعث ایک فکری خلاء میں معلق تھے' لہٰذا یہ تمام حالات انہیں خوشگوار حیرت واستعجاب کی کیفیت میں لے آئے' جہاں ان کے اپنے مذہبی جذبات برانگیختہ بھی ہوئے اور انہیں عرصہ دراز کے بعد دل کی گرمی کا سامان بھی میسر آیا۔ ابھی وہ حیرت واستعجاب کی حالت میں ہی تھے کہ شروع شروع میں ایران

کے کچھ غیر ذمہ دار اور جذباتی حلقوں کی جانب سے انقلاب کو دیگر اسلامی ممالک میں برآمد کرنے کی باتیں ہونے لگیں۔ پاکستان ایران کا ہمسایہ تھا اور یہاں کی اکثریت سنی آبادی کے دلوں میں وسوسوں نے جنم لینا شروع کیا۔ اس جذباتی دَور میں کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا اور کنفیوژن کے دھندلکوں سے جو صورتِ حال اُبھرنا شروع ہوئی وہ حقیقت سے قدرے مختلف تھی۔ اس جذباتیت کی فضا میں دونوں جانب سے کسی حد تک غیر حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کیا گیا۔ سید جمال الدین افغانی، علی شریعتی مرحوم، آیت اللہ خمینی اور سب سے بڑھ کر حضرت علامہ اقبال کے جن افکار و نظریات نے یہ انقلاب برپا کیا تھا، ان پر نسبتاً کم توجہ دی جانے لگی اور ذہنوں پر دھند چھا گئی۔

اسی حالتِ استعجاب میں دنیا بھر کے غیر شیعہ افراد نے انقلابی ایرانیوں کی وقتی جذباتیت کو غلط انداز میں سمجھنا شروع کر دیا اور پھر دونوں جانب ہی سے غیر ذمہ داری کے مظاہرے ہونا شروع ہوئے۔ درحقیقت دونوں جانب کی خاموش اکثریت باہمی اختلافات اور اِکا دُکا تصادم کے ان غیر ذمہ دارانہ واقعات اور حالات سے قطعاً لاتعلق، بلکہ کسی حد تک بیزار رہی اور دونوں جانب کے ذی شعور حلقوں کی طرف سے افہام و تفہیم اور خوشگوار فضا کی بحالی کی مخلصانہ کوششیں بھی ضروری سمجھی گئیں، لیکن یہ تمام کی تمام کوششیں اس جذباتی فضا میں صدا بصحرا ثابت ہونے لگیں۔ فقہی اور گروہی اختلافات کی آگ کو بھڑکانا کچھ تنگ نظر لوگوں کے مفاد میں تھا، اس لیے یہ لوگ قتل و غارت کی راہوں پر چل نکلے۔ اس دوران بدقسمتی سے ہمارا ملک عمومی طور پر دہشت گردی کی سرگرمیوں کی لپیٹ میں آ گیا۔ مزید برآں دہشت گردوں نے اپنے مذموم عزائم کی تکمیل کے لیے لسانی، قبائلی اور گروہی اختلافات کے ساتھ ساتھ فرقہ وارانہ جذبات کو ہوا دینے کے لیے ایسی سرگرمیاں شروع کر دیں جو نہ صرف نفرت پر منتج ہوتی تھیں، بلکہ مزید خون خرابے کا باعث بنتی تھیں۔

محبِ وطن اور ذی شعور حلقوں کی جانب سے اس امر کی ضرورت محسوس کی جانے لگی کہ پاکستان کی سلامتی اسی میں ہے کہ فرقہ واریت کو ختم کیا جائے، جذباتیت کی بجائے

حقیقت پسندی کا مظاہرہ کیا جائے اور باہمی ہم آہنگی اور اخوت کی فضا پیدا کی جائے' تا کہ اسلام کی صحیح روح بیدار کی جا سکے اور یہ بتایا جائے کہ ہم سب کے سب مسلمان ہیں اور شیعہ وسنی حضرات میں کوئی بھی عملی وفکری اختلاف اس نوعیت کا قطعاً نہیں ہے کہ آپس میں افہام وتفہیم میں مشکل پیدا ہو سکے۔ یہ سوچ شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی سوچ کی عکاس تھی اور یہ راستہ کانٹوں سے اٹا ہوا تھا۔ ملک کی فضا کچھ اس طرح کی بن چکی تھی کہ ایسی سوچ کے حامل افراد کو یہ کام بہت مشکل محسوس ہو رہا تھا' اور بہت چاہتے ہوئے بھی لوگ ہمت کرنے سے گھبرا رہے تھے اور ایک مصلحت آمیز خاموشی ہی میں عافیت سمجھ رہے تھے' مگر یہ کام بہت ہی ضروری تھا اور فوری کرنے کا بھی تھا۔

کسی حد تک اس طرح کی کوششیں برادر اسلامی ملک ایران سے بھی کی گئیں کہ کسی طرح ذہنی ہم آہنگی کی داغ بیل ڈالی جا سکے۔ کسی ایرانی شاعر نے پاکستانی قوم کو کیا خوب پیغام دیا ہے کہ :ے

رشتۂ پیوندِ ما حبل المتین دینِ ماست

زین سبب دل ہای ما از مہر ہم آگندہ است

(ہمارے باہمی اتحاد کا رشتہ ہمارے دین کی مضبوط رسّی ہے اور اسی کے باعث ہمارے دلوں میں محبت کی مہک اور خوشبو موجود ہے۔)

ہم لوگوں کے لیے بھی نیت پر شک کرنے کی بجائے خیر سگالی اور محبت کے ایسے جذبات کا جواب نیک جذبات سے دینا ضروری ہے۔ دریں اثناء یہ بھی بہت اہم ہے کہ ہم لوگ غیر مسلم قوتوں اور استعماری طاقتوں کے ہتھکنڈوں کا مقابلہ کرنے کے لیے باہمی مفاہمت اور اتحاد کو فروغ دینے کا سوچیں۔

شیعہ اور سُنّی فرقے صدیوں سے قائم ہیں۔ شیعہ حضرات قرآن وسنت ہی کو اپنی تعلیمات کا ماخذ قرار دیتے ہیں' وہ نہ تو اسلام کے کسی رکن سے انکار کرتے ہیں اور نہ ہی حدیث کے منکر ہیں۔ ان کے ہاں احادیث کے مجموعے تو مختلف ہیں اور راوی بھی مختلف ہو سکتے ہیں' مگر ڈاکٹر حمید اللہ کی کتاب ''خطباتِ بہاولپور'' کی رو سے اکثر احادیث سُنّی

اور شیعہ ماخذوں میں مشترک ہیں۔ تاریخ میں ہمیں کسی ایسے جید سُنّی عالم یا فقیہہ کا ذکر نہیں ملتا جس نے شیعہ حضرات کی تکفیر کی ہو۔ کسی فردِ واحد یا ایک مخصوص گروہ کے عقائد قابل اعتراض ہو سکتے ہیں' ایسے لوگ سنیوں میں بھی پائے جاتے ہیں' مگر شیعہ حضرات اجتماعی طور پر ایسے خیالات کا اظہار نہیں کرتے۔ شیعہ سنی معاملات افہام و تفہیم سے طے بھی ہو سکتے ہیں اور مصالحت کی راہیں بھی دریافت ہو سکتی ہیں' مگر اس کام میں سخت محنت' دیانت داری اور تدبّر کی ضرورت ہے۔

قیام پاکستان برصغیر کے مسلمانوں کی طویل جدوجہد آزادی کا نتیجہ تھا اور یہ قائداعظم کی عظیم قیادت کے باعث ممکن ہوا۔ تاہم تحریک پاکستان کی فکری بنیاد علامہ اقبال کی سوچ پر قائم ہے۔ حضرت علامہ اقبال پاکستان' ایران اور دیگر فارسی بولنے والے ممالک میں یکساں مقبول ہیں۔ علامہ اقبال کو ایران میں احتراماً مولانا محمد اقبال لاہوری کہا جاتا ہے۔ ہم لوگ اگر اپنے مشترک مفکر کی سوچوں پر عمل کریں تو ہم اسلام کی وسیع اور متحرک جہتوں سے روشناس ہوں گے۔ فکرِ اقبال ہم سب کے لیے یکساں طور پر قابل قبول بھی ہے اور ہم سب ان کے افکار کے حامی اور مؤید ہیں۔ علامہ اقبال کی سوچ کا سرچشمہ قرآن کا ابدی پیغام اور توحید و رسالت کے مشترک نظریات ہیں جس پر ہم سب متفق ہیں۔ اگر ہم فکر اقبال کو مخلصانہ طور پر اپنا لیں تو ہمیں اپنی نظریاتی بنیاد کو مستحکم بنانے کا موقع بھی مل سکے گا اور ہم اپنی فکری میراث کے حصول میں کامیاب بھی ہو سکیں گے۔

❁ ❁ ❁

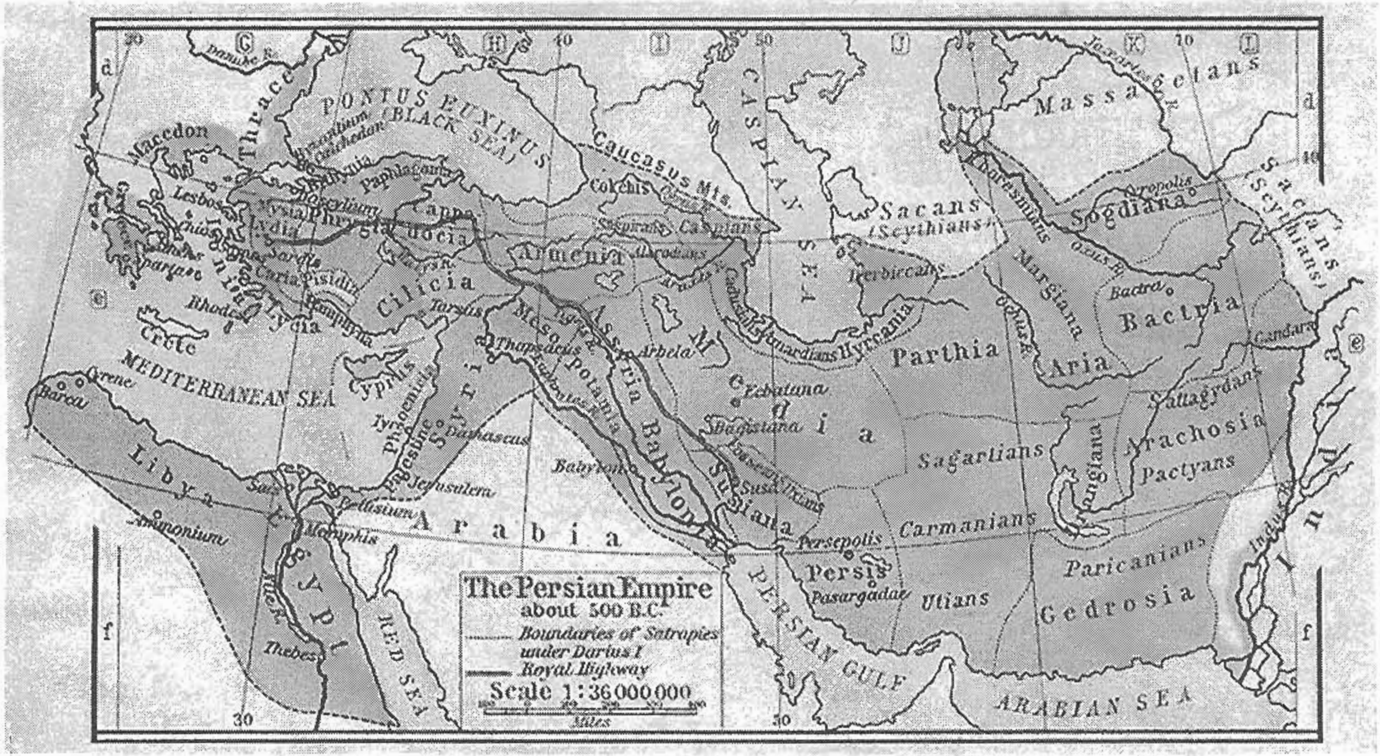

(سلطنت فارس تقریباً 500 ق م میں)

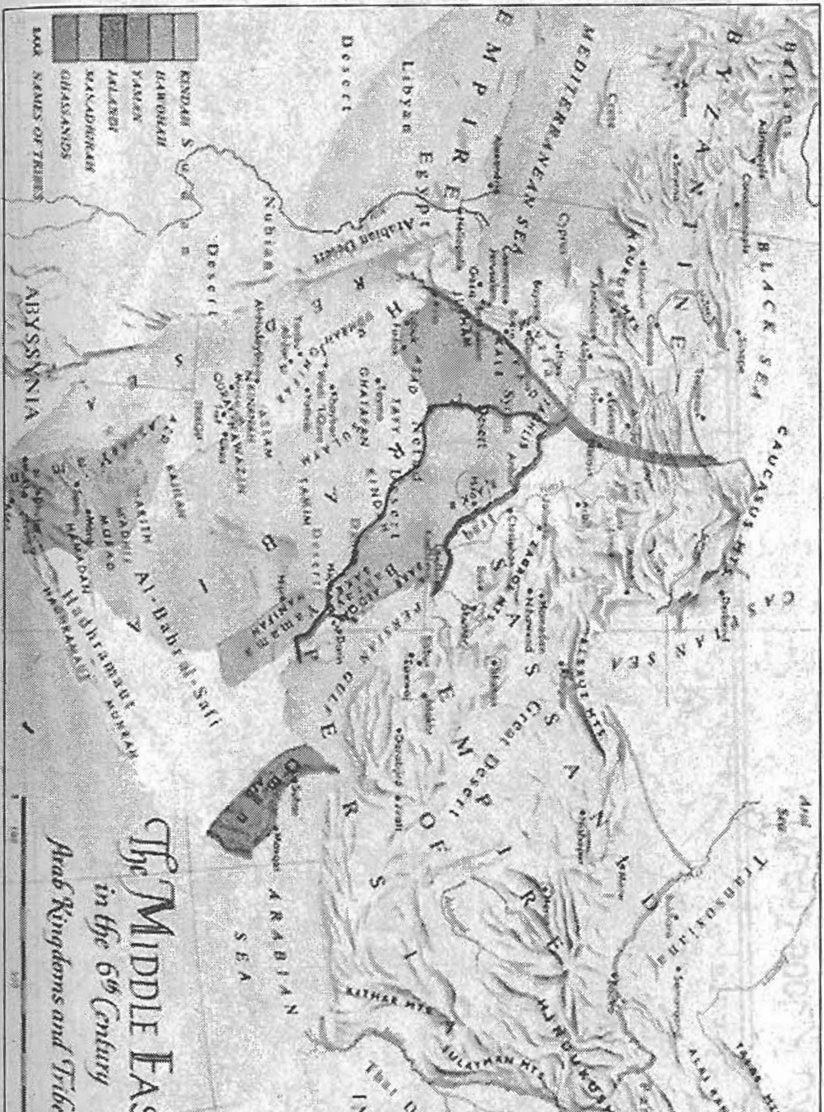

(مشرق وسطیٰ۔ چھٹی صدی عیسوی میں)

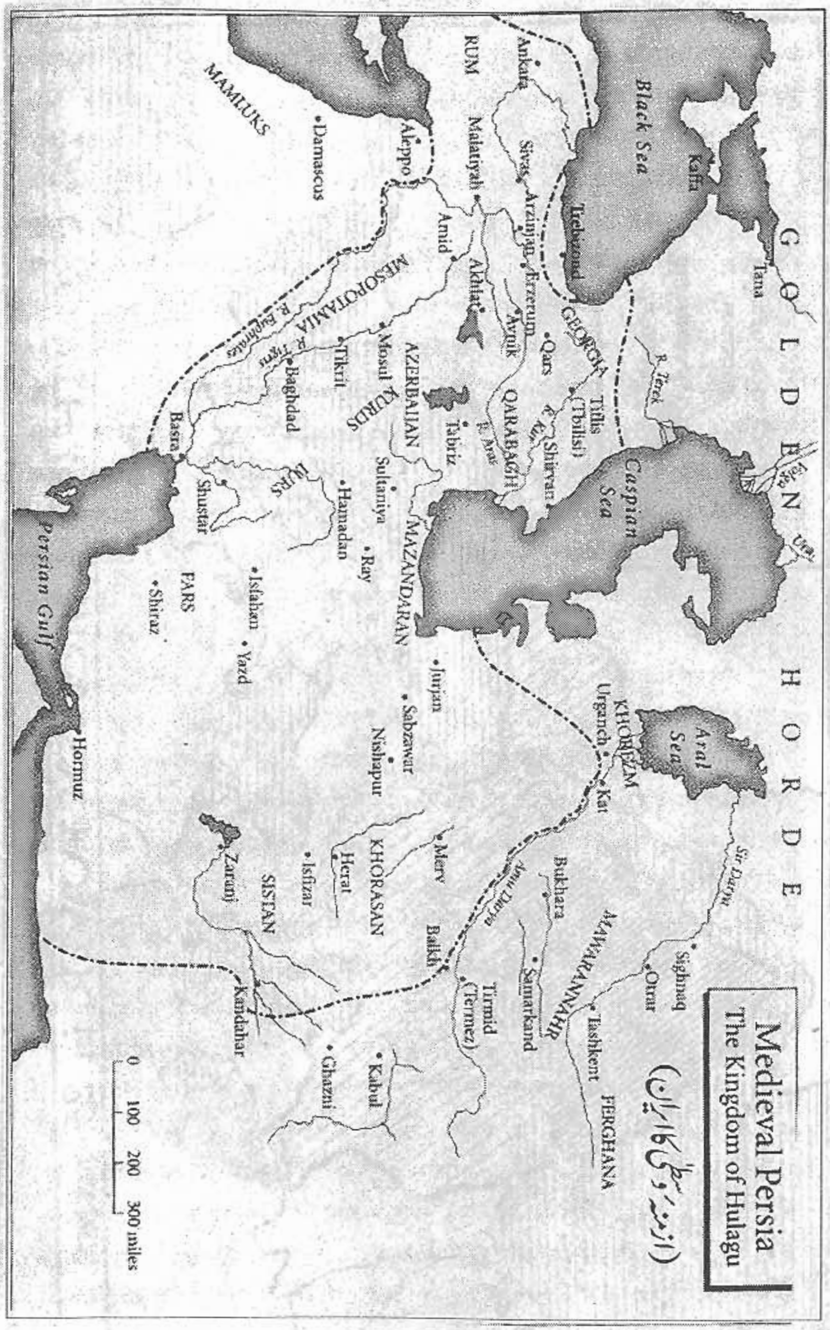
Medieval Persia
The Kingdom of Hulagu
(ازمنہ وسطیٰ کا ایران)
GOLDEN HORDE
Black Sea
Caspian Sea
Aral Sea
Persian Gulf
Kaffa
Tana
Trebizond
Volga
Ural
R. Terek
GEORGIA
Tiflis (Tbilisi)
Shirvan
R. Kur
R. Aras
QARABAGH
Qars
Avnik
Erzerum
Arzinjan
Sivas
Ankara
RUM
Malatiyah
Akhlat
Amid
Aleppo
Damascus
MAMLUKS
MESOPOTAMIA
R. Euphrates
R. Tigris
Mosul
Tikrit
Baghdad
Basra
KURDS
AZERBAIJAN
Tabriz
Sultaniya
Hamadan
LURS
Shustar
MAZANDARAN
Ray
Isfahan
Yazd
FARS
Shiraz
Jurjan
Sabzawar
Nishapur
KHOREZM
Urgench
Kat
Bukhara
Amu Darya
Sir Darya
Sighnaq
Otrar
MAWARANNAHR
Samarkand
Tashkent
FERGHANA
Tirmid (Termez)
Balkh
Merv
Herat
KHORASAN
Isfizar
SISTAN
Zaranj
Kandahar
Kabul
Ghazni
Hormuz
0 100 200 300 miles

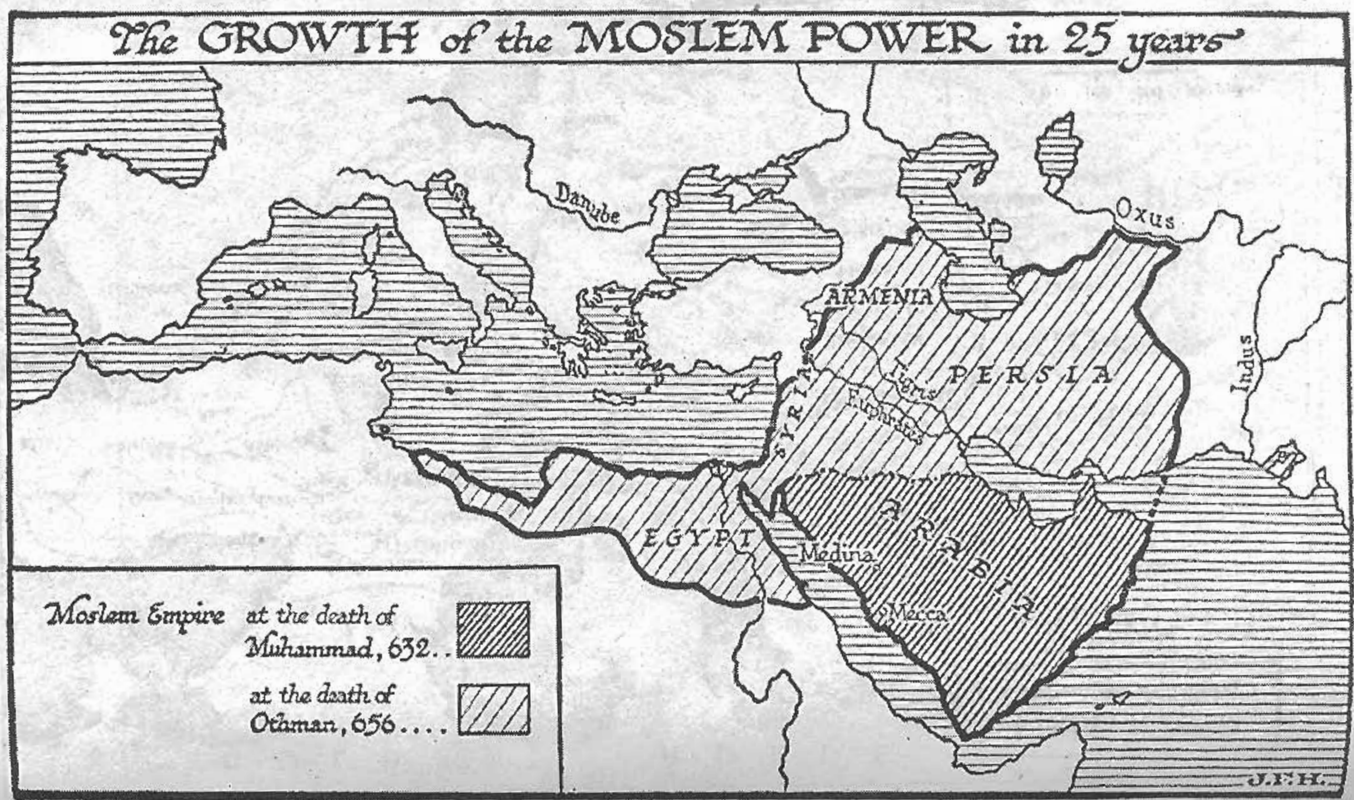

(اسلامی سلطنت ـ خلافت راشدہ کے دوران)

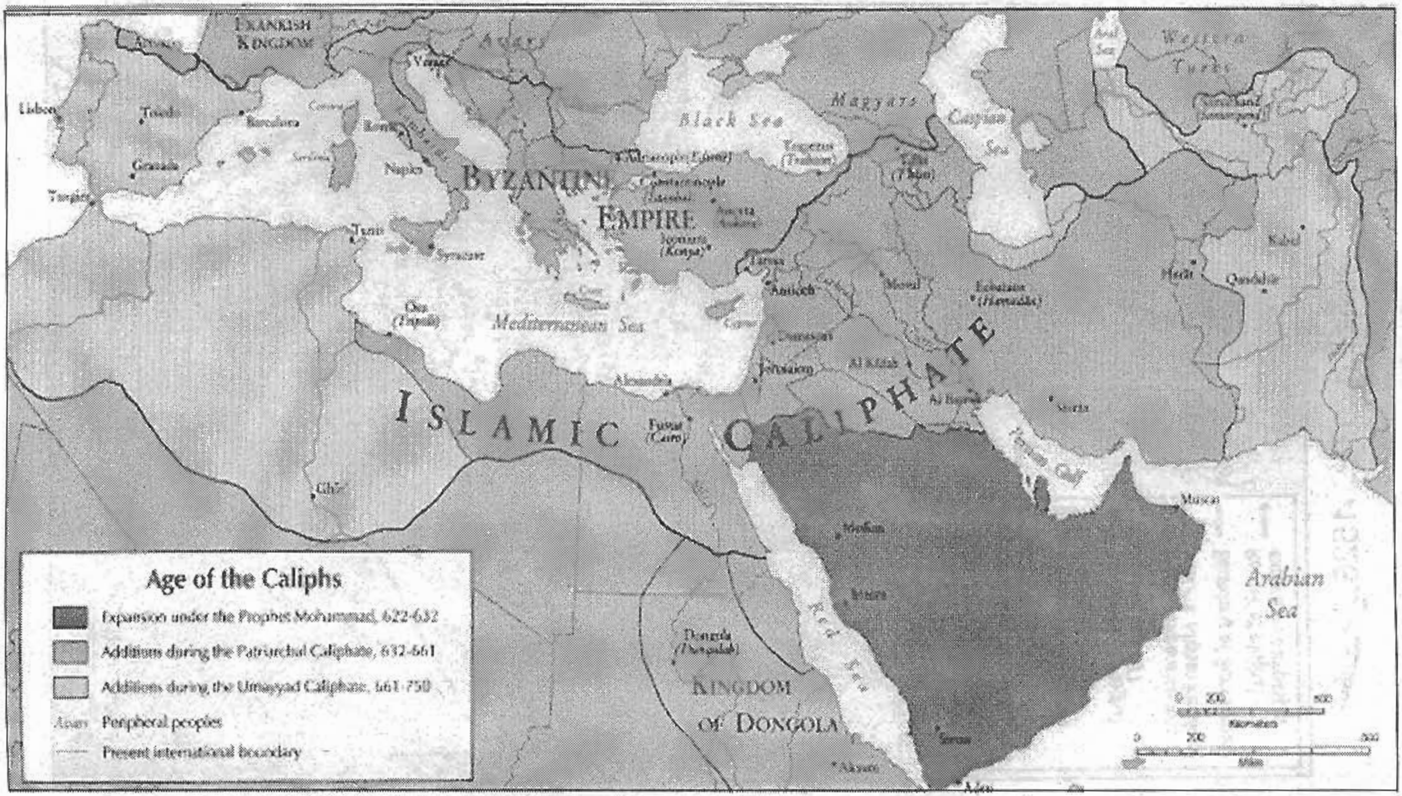

(اسلامی سلطنت کی توسیع۔ دورِنبویؐ، دورِخلافت راشدہ اور دورِبنواُمیہ میں)

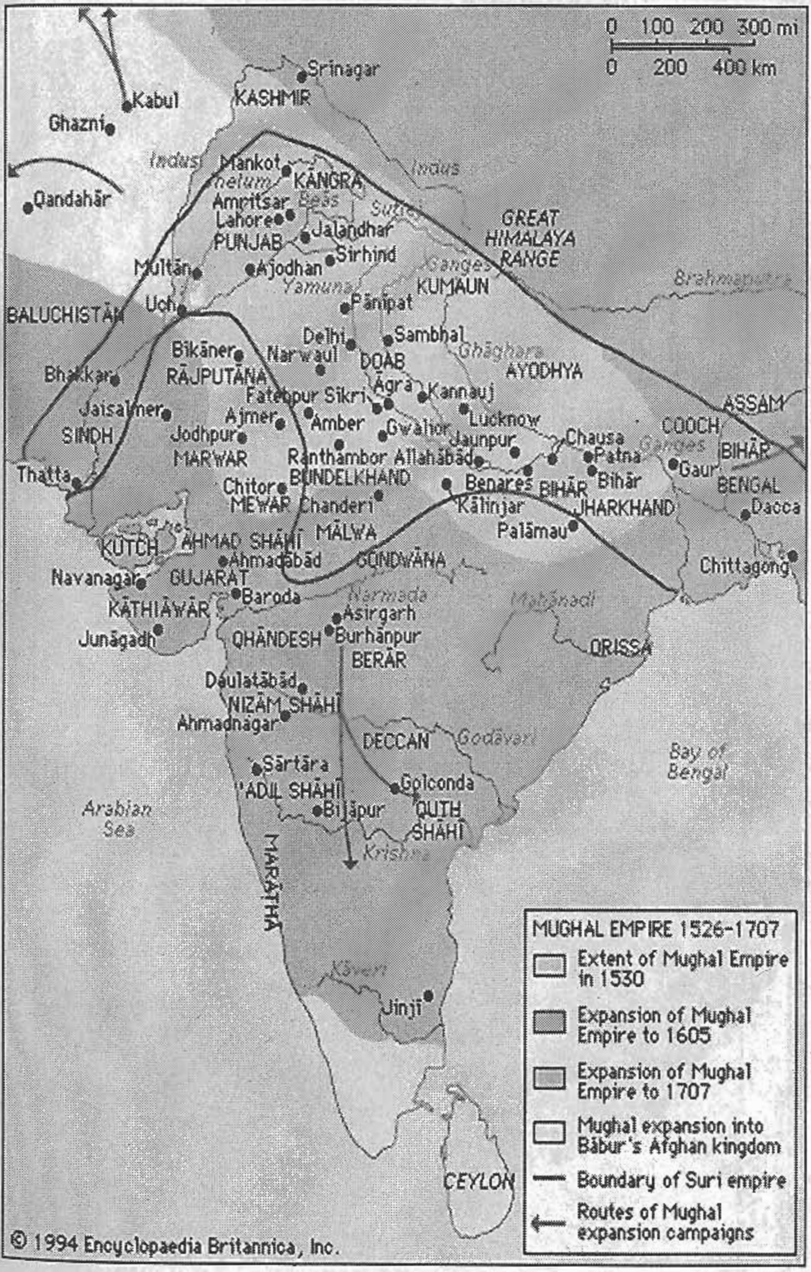

سلطنت مغلیہ 1526ء سے 1707ء کے دوران

مرکزی **انجمن خدّام القرآن** لاہور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان ــــــ اور ــــــ **سرچشمۂ یقین**

قرآنِ حکیم

کے **علم و حکمت** کی

وسیع پیمانے ــــــ اور ــــــ اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمّتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں **تجدیدِ ایمان** کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اِس طرح

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ ــ اور ــ **غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی**

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ